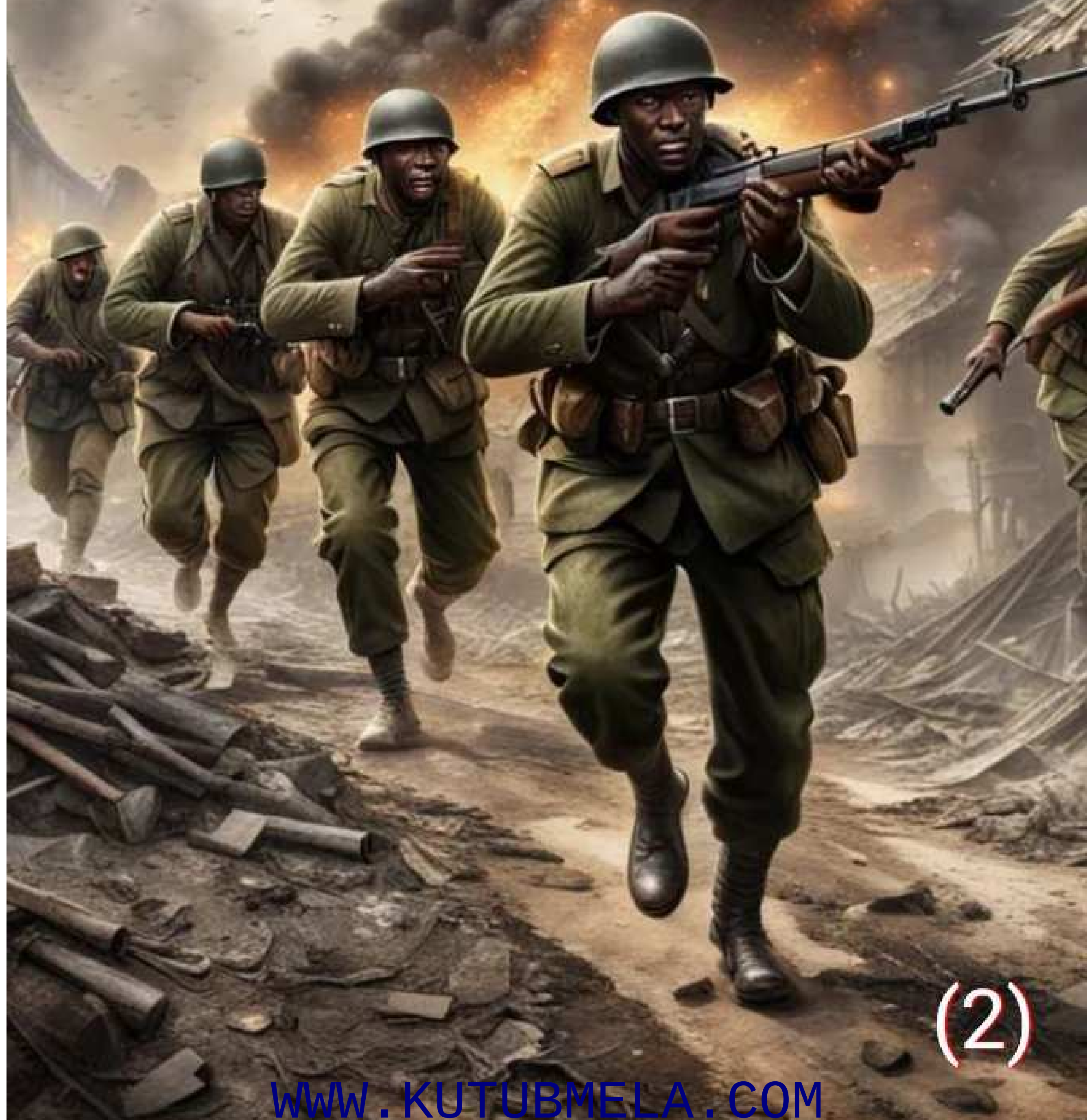
دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

(ڈائجسٹوں سے دوسری جنگ عظیم کی کہانیوں کا انتخاب)



(2)

دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

(ڈائجسٹوں سے دوسری جنگ عظیم کی کہانیوں کا انتخاب)




Compiled by
Abdul Basit

SOUNITY IS WOID WA

دوسری جنگ عظیم کی ناقابل فراموش داستانیں

سرگزشت، سیارہ اور اردو ڈائجسٹ سے انتخاب



معصوم جان

انوکھا فرار

خونخوار عورتیں

سمندر کے قیدی

کالا طوفان

گیارہ جرمن جرنیل

مجرم سٹالن تھا؟

میں ایک جاسوس تھی

جب فلپائن سرنگوں ہوا

کریٹ کا ہیرو

کولڈز کیمپ سے فرار

قیدیوں کے قیدی

فضائی معرکہ

مہربان

عیار حسینہ

خطرناک مہم

زندگی جیت گئی

میرا فرار

گمنام جاسوس

جرم وفا

عقوبت خانہ

برلن سے فرار



معصوم جان

سبین طاہر

فوجی زندگی کے اپنے ہی قواعد وضوابط ہیں۔ یہ اُس چھ سالہ بچی کا سچا واقعہ ہے جو اچانک فوج کے ڈسپلن کی راہ میں حائل ہوگئی تھی اور چند فوجیوں کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران پیش آنے والا ایک دل گداز واقعہ

سرد اور تاریک رات کا دوسرا پہر تھا۔ ستاروں کی بے نام ٹمٹماہٹ میں زمانۂ جنگ کے اتحادیوں کے جہاز اٹلی کے ساحل سے کچھ فاصلے پر لنگرانداز ہوئے۔ فوجی دستے پانی میں اترے اور کمر تک پانی میں چلتے ہوئے خشکی کی طرف بڑھے۔ پوری احتیاط کے باوجود وہ اس مدھم شڑاپ شڑاپ کو نہیں روک سکے جو ان کی ٹانگوں اور پانی کے ٹکراؤ سے پیدا ہو رہی تھی۔

ساحل پر انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اطالوی یا جرمن فوجی کہیں مورچا بند نہیں ملے۔ شاید پیچھے ہٹ کر پہاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ حملہ آوروں نے گھنے جنگل میں پوزیشن سنبھال لی۔ برٹش یونٹ کے پانچ جوان کھوجی بن کر روانہ ہوئے۔

انہیں علم تھا کہ دشمن نے زیرِ زمین بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ انہوں نے چھ انچ چوڑی سفید ٹیپ زمین پر بچھا رکھی تھی

اور اس پر قطار میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ آگے آگے کرسٹوفر ہیز تھا۔ پانچوں آدمی بموں اور آتش گیر مادہ کو ناکارہ بنانے کے اسکواڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ نہایت چوکنا تھے۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ جیسی معمولی آواز بھی ان کے قدم روک دیتی اور وہ برین گن کی لبلبی پر انگلی رکھ دیتے۔

معاً ایک جھاڑی کے عقب سے خشک ٹہنی پیروں تلے آجانے کا کڑاکا سنائی دیا اور سسکیاں ابھریں۔ یقیناً کوئی انسانی وجود تھا۔ پانچوں آدمیوں کے قدم بیک وقت رک گئے۔ انہوں نے دم سادھ کر فضا میں کان لگا دیے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بچہ منہ بند کیے رو رہا ہو۔ زمین پر بچھائی گئی ٹیپ سے کسی بھی فاصلے پر بارودی سُرنگ کی موجودگی قرین قیاس تھی۔ لیکن ساتھیوں کے روکتے روکتے ہیز اس آواز کی سمت میں بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس طرف بارودی سُرنگ نہیں ہوگی۔ اگر ہوتی تو کسی ذی روح کی موجودگی ممکن نہ ہوتی۔

جھاڑی کے پیچھے ایک بچی لمبی گھاس میں دبکی ہوئی تھی۔ اس کی فراک دھجیوں کی شکل میں لٹکی ہوئی تھی۔ پاؤں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ عمر کوئی چھ سال رہی ہوگی۔ خوب صورت بچی تھی۔ ہیز نے برین گن شانے سے لٹکائی اور ایک ہاتھ سے بچی کو اٹھا لیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تو انہیں حیرت بھی ہوئی اور بچی پر ترس بھی آیا۔ بچی نے سر ہیز کے شانے سے ٹکا دیا تھا اور شاید تھکن سے چُور تھی۔ کیوں کہ فوراً سو گئی تھی۔ گروپ آگے بڑھتا رہا اور متعینہ حد سے الٹے قدموں لوٹا۔

۲۲ جنوری ۱۹۴۴ء کی صبح نمودار ہوئی تو اتحادیوں نے دیکھا کہ قریبی گاؤں آن زیو ویران تھا۔ پوری آبادی انخلا کر چکی تھی۔ کوئی چرند پرند بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر سو سکوتِ مرگ سا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں بچی ان پانچوں کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ اس معصوم جان کو کس کے حوالے کریں۔ نہ کریں تو کیا اسے بھوکی پیاسی مرجانے دیں! ساتھ رکھنا فوجی قواعد کی خلاف ورزی ہوتا۔ کمانڈنگ آفیسر قوانین کی رو سے ہرگز کسی غیر فوجی سویلین کو کیمپ میں رہنے کی اجازت نہ دیتا، خواہ وہ چھ سال کی بچی ہی کیوں نہ ہو جس کا کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔

بچی کی خوش قسمتی سے اس گروپ کے انچارج سارجنٹ پیٹ گریو کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے تعاون سے ان لوگوں نے ایک خندق کھودی اور اسے بچی کی آرام گاہ بنا دیا۔ وہ ان کی توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلی۔ ان کے اشاروں کے مطابق کام کرتی تھی اور اپنی ضرورت اشارے سے بتاتی تھی یا کبھی اطالوی زبان میں منمناتی تھی۔ اسے انگریزی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی اور وہ لوگ اطالوی نہیں سمجھتے تھے۔

"مِی ہیز" ہیز نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ پھر اسے بچی کے سینے پر رکھ کر پوچھا "یو وھاٹ؟"

اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بچی اس کا سوال سمجھ گئی، وہ بولی "آنجلیٹا" سب اسے پیار سے لٹل اینجل کہنے لگے۔

راشن میں ان کے پاس سخت بسکٹ، خشک گوشت کے پارچے، چاول سے بنی ہوئی پڈنگ اور چائے تھی۔ سخت بسکٹ وہ چبا نہ سکتی تھی اور چائے اسے ناپسند تھی۔ چناں چہ اس کی خاطر ہیز اور اس کے ساتھیوں کو امریکی یونٹ کے فوجیوں سے تازہ بسکٹوں اور کافی کی بھیک مانگنا پڑی۔ آنجلیٹا کی "قیام گاہ" کیمپ سے خاصے فاصلے پر تھی۔ معدودے چند فوجیوں کو اس کا علم تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے کانوں میں اب تک بچی کی موجودگی کی بھنک نہیں پڑی تھی۔ ہیز اور اس کے ساتھی نگاہ رکھے ہوئے تھے کہ ریڈ کراس کی کوئی ایمبولینس کسی زخمی کو شہر کے اسپتال لے جائے تو وہ اس میں بچی کو بھیج دیں۔ لیکن محاذ خاموش تھا اور کوئی ایمبولینس بھی کسی شدید بیمار کو لے کر شہر نہیں جا رہی تھی۔

فرصت کے اوقات میں انہوں نے گاؤں کا ہر ویران گھر دیکھ ڈالا کہ کہیں کوئی کھلونا مل جائے کہ بچی کا دل بہلتا رہے لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ شاید گاؤں والوں نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نقلِ آبادی کی تھی۔ بالآخر ایک مکان سے خالی الماری کے پیچھے لکڑی کا پہیوں والا گھوڑا مل گیا، لیکن آنجلیٹا کے لیے وہ بے کار تھا۔ وہ اگر زمین پر اس سے کھیلتی تو ان تمام لوگوں کی نظروں میں بھی آجاتی جو اَب تک اس کی موجودگی سے لاعلم تھے۔ لہٰذا ہیز نے بدقت تمام ایک بھدی، بے ڈول گڑیا بنائی۔ آنکھوں کی جگہ کف کے بٹن لگائے اور آنجلیٹا کو کھیلنے کے لیے دی۔ وہ اس تحفے سے خوش ہوگئی۔ ہر دم اسے سینے سے لگائے رکھتی۔ اپنی زبان میں اس سے سرگوشیاں کرتی وہ اتنی سمجھ دار تھی کہ بلند آواز نہ نکالتی۔

آنجلیٹا کے کھانے پینے اور رہنے کا مسئلہ وقتی طور پر حل ہو گیا تھا لیکن لباس کا مسئلہ ابھی موجود تھا۔ گاؤں والے اس عمر کی لڑکی کی کوئی فراک اور زیرِ جامہ پیچھے نہیں چھوڑ گئے تھے۔ گھروں میں چند ایک فالتو کپڑے پڑے مل گئے۔ ہیز نے مونچھیں تراشنے کی قینچی اور بلیڈ کی مدد سے ان کی کاٹ پیٹ کر کے بچی کا تن ڈھانکنے کے لیے تھیلا نما جھبلا بنا دیا اور زیرِ جامہ کی جگہ کپڑا لپیٹنے کے لیے دے دیا۔

ایک اتنی بڑی بات بھلا کیسے چھپی رہ سکتی تھی، کمانڈنگ آفیسر کو آنجلیٹا کے بارے میں علم ہو گیا۔ اس نے ہیز کو پیش ہونے کا حکم بھیجا۔ اس کے ساتھیوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ ذہنی طور پر دفاعی اقدامات کے لیے تیار ہو گئے۔

"تم نے جانتے بوجھتے ہوئے آرمی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی؟" کمانڈنگ آفیسر نے ڈانٹ پلائی۔

"انسانیت کے رشتے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مجبور کر دیا تھا سر" ہیز نے تعظیم کے ساتھ کہا۔

"تم جانتے ہو کہ آرمی میں خصوصاً محاذ پر انسانیت کے جذبے پس پشت ڈال دیے جاتے ہیں۔ گولہ باری سے چشم زدن میں سیکڑوں افراد لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں جن میں شیر خوار بچے تک شامل ہوتے ہیں۔ تم کہاں تک انسانیت کا اظہار کرو گے؟"

"کسی ذی روح کو مرنے سے تو کوئی نہیں بچا سکتا لیکن اس کے تڑپنے اور سسکنے کا مداوا کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے سر؟"

"یہاں منطق کا نہیں ضابطے اور قواعد کا تقاضا ہے۔ تمہارا کورٹ مارشل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

ہیز جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے اس "جرم" میں پورا ہائنز گروپ شریک تھا۔ علاوہ ازیں ہمدردوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اس اکیلے کا کورٹ مارشل کیا جانا کوئی بھی پسند نہ کرتا۔

"معذرت کے ساتھ کہوں گا سر کہ مجھے سزا قبول ہوگی" اس نے کہا "بہرحال ہم انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی ریڈ کراس کی ایمبولینس شہر جائے تو بچی کو اس میں بھیج دیں۔"

کمانڈنگ آفیسر بھی افہام و تفہیم کے ذریعے معاملے کو نمٹانا چاہتا تھا۔ اس نے ہیز کی بات سے اتفاق کیا' تاہم اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لیے کہا کہ ہیز یا کوئی بھی آدمی ڈسپلن توڑنے سے ہر قیمت پر اجتناب کرے ورنہ آرمی ڈسپلن اپنی مخصوص شناخت کھو دے گا۔

ہیز اور دوسرے اسی ٹوہ میں رہے کہ کب کوئی ریڈ کراس کی گاڑی کسی غرض سے شہر یا کسی آبادی کی طرف جاتی ہے اور وہ ننھی سی جان کو اس ہولناک ماحول سے نجات دلائیں۔ دس روز گزر چلے تھے۔ اس دوران میں آنجلینا اپنے محسنوں سے مانوس ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی منہ بسورنے اور ہونٹوں کو دبا کر آنسو بہانے لگتی۔ اس وقت دیکھنے والوں کے دل پر گھونسا سا لگتا۔ اس معصوم پر بے پناہ ترس آتا۔ جب وہ ذی شعور اور پختہ کار ہو کر اپنی بیوی بچوں یا ماں باپ کو بھلانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتے تھے تو ایک چھ سال کی بچی سے اس کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی!

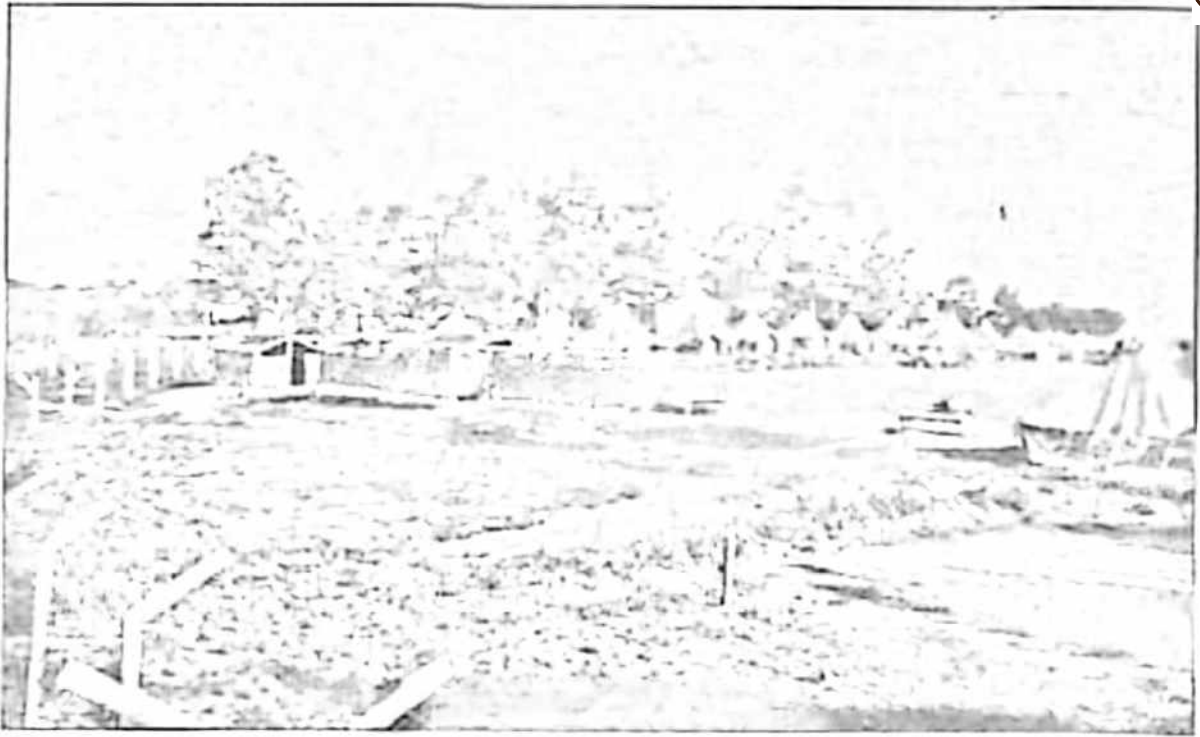
بالآخر وہ دن آپہنچا جس کا ہیز اور اس کے ساتھیوں کو انتظار تھا۔ ایک پک اپ کسی ضروری کام سے ہیڈ کوارٹر جا رہی تھی۔ ہیز اور سارجنٹ پیٹ گریو نے کمانڈنگ آفیسر سے اجازت لے کر آنجلینا کو اس میں بٹھایا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ بچی کو شہر میں محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر دے۔ آنجلینا اپنی دھن میں خوش خوش پک اپ میں بیٹھ گئی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اکیلی جا رہی ہے اور اپنے مربیوں سے بچھڑ جائے گی تو وہ چیخیں مار کر رونے لگی۔ ہیز اور دوسروں نے باری باری اسے سینے سے لگایا اور جھوٹی تسلی دی کہ دوسری گاڑی میں وہ بھی اس کے پیچھے آ رہے ہیں کیوں کہ وہ فوجی ہیں عام آدمی نہیں ہیں۔ تب جا کر بچی نے رونا بند کیا۔ پک اپ روانہ ہوئی تو ان لوگوں کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ انہیں بھی آنجلینا سے گہری انسیت ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی ان میں سے کسی کو ستایا یا ناراض نہیں کیا۔ بے چون و چرا سب کی بات مانتی تھی۔ اپنی ذہانت کی بنا پر انگریزی کے چند الفاظ بولنا سیکھ گئی تھی۔ بیشتر الفاظ سمجھ بھی جاتی تھی۔ رات کو خندق میں جب کپڑوں کا گدا سا بنا کر اسے سلایا جاتا تو نیند آنے تک ہیز یا کسی اور کے ساتھ سرگوشیاں کرتی۔ وہ جان گئی تھی کہ رات کے وقت اونچی آواز سے بولنا نہیں چاہیے۔ کبھی اسے ماں کی یاد بھی آجاتی تھی۔ اسے "موی' موی" کہتے ہوئے آنسو بہاتے دیکھ کر وہ سمجھ جاتے تھے۔

جب تک پک اپ نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی آنجلینا بھی ہاتھ ہلاتی رہی اور وہاں جمع سارے فوجی بھی ہاتھ ہلاتے رہے۔ اچانک وقت نے دغا کی۔ دشمن کا ایک بمبار طیارہ ناگہاں فضا میں نمودار ہوا۔ فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بعض نے کاشن ملنے پر پوزیشن سنبھال لی اور بعض پناہ گاہوں میں اتر گئے۔ طیارہ شکن توپیں اور مشین گنیں دشمن کا نشانہ لینے کی کوشش کرنے لگیں۔ بمبار بم چھوڑتا ہوا تیزی سے ان کے اوپر سے گزر گیا۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا لیکن دس منٹ بعد وائرلیس پر اطلاع ملی کہ دشمن طیارے نے کیمپ سے روانہ ہونے والی پک اپ کے پرخچے اڑا دیے۔ ہیز اور جس نے بھی سنا دل پکڑ کر رہ گیا۔ آہ آنجلینا!

اس المناک واقعہ کو بیس سال گزر گئے۔ ایک روز مانچسٹر کے ایک ریسٹورنٹ میں اچانک ہیز اور پیٹ گریو کی ملاقات ہو گئی۔ بعد از جنگ کی باتوں کے ساتھ آنجلینا کا تذکرہ بھی آیا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی روداد کو اخبارات میں چھپوائیں گے۔ شاید آنجلینا کے والدین یا بہن بھائیوں میں سے کوئی اسے پڑھ لے اور انہیں بیس سال پہلے بچی کا انجام معلوم ہو جائے۔

ان کی خواہش کا اثر صرف یہ ہوا کہ آنجلینا کے آبائی گاؤں آنزیو کے لوگوں نے ان دونوں کو گاؤں میں مدعو کیا۔ صرف ہیز بیوی بچوں کے ساتھ جا سکا اور دو دن گاؤں میں گزارے۔ وہاں کسی نے آنجلینا کا نام تک نہیں سنا تھا' البتہ کچھ لوگوں نے اس کی روداد پڑھ لی تھی۔

۱۹۴۸ء میں ہیری ٹرومین امریکا کا صدارتی انتخاب لڑ رہا تھا تو اس کے مخالف امیدوار تھامس ای ڈیوی کے جیتنے کے اتنے قوی امکانات تھے کہ الیکشن کی رات کو اخبار "شکاگو ٹربیون" نے شہ سرخی جمائی "ڈیوی نے ٹرومین کو شکست دے دی۔" اگلے روز پتا چلا کہ ٹرومین نے ۲۱۸۸۰۵۴ ووٹوں سے کامیابی حاصل کر لی۔



انوکھا فرار

رانامحمد شاھد

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تقدیر عاجز اور تدبیر کارگر ہو جاتی ہے. اس فرعون صفت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا .وہ سیکڑوں بے گناہوں کا قاتل تھا ۔اس نے اٹلی کی سرزمین کو مظلوموں کے لہو سے سرخ کر دیا تھا. بعد میں جب مظلومین کے وارثین نے واویلا کیا تو اسے پابندِ سلاسل کر دیا گیا .ایسی قیدِ تنہائی دی گئی کہ اس کا تصور بھی محال ہے پھر بھی وہ فرار ہو گیا مگرکتنے انوکھے انداز میں ۔

جنگ عظیم دوم کی کوکھ سے ابھری ایک دلچسپ کتھا

قید خانوں سے فرار کی کہانیاں تو آپ نے پڑھ رکھی ہوں گی اور یقیناً فرار کی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔ مگر اگست 1977ء میں اٹلی کی قید سے ستر سال کی عمر کا ایک بوڑھا ایسے طریقے سے فرار ہوا جو فرار کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اتنا انوکھا اور دلچسپ تھا کہ سننے کے بعد بھی یقین نہیں آتا تھا۔

ہربرٹ کیپلر نام کے اس بوڑھے کا تعلق جرمنی سے تھا۔ 1948ء میں اسے جنگی جرائم کی پاداش میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا 1939ء میں جرمنی نے کی تھی اور 6 سال بعد 1945ء میں جرمنی کو جب شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے حکمران ہٹلر نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے قریبی ساتھی، مختلف مشیر و جرنیل پکڑے گئے تھے اور ان کے خلاف جنگی جرائم کے تحت مقدمے چلائے گئے تھے۔ بعض افراد کو سزائے موت

دی گئی اور بعض کو عمر قید۔
ہربرٹ کیپلر جنگِ عظیم دوم میں میجر کے عہدے پر تھا اور وہ جرمنی کی خفیہ پولیس "ایس۔ ایس" میں تھا۔ ابتدا میں اٹلی، جرمنی کا اتحادی تھا لیکن بعد ازاں اٹلی نے ہتھیار ڈال دیے اور جرمنی سے تعلقات توڑ لیے تھے۔ البتہ اٹلی کا کچھ علاقہ جرمنی کے قبضے میں رہا۔ اس مقبوضہ علاقے میں جرمن پولیس "ایس۔ ایس" نے وہاں پہ بسنے والوں پر بہت ظلم کیے۔ شاید اس کی ایک وجہ اٹلی کا جرمنی سے تعلقات توڑنا ہو۔ وہاں کی پولیس "ایس ایس" کا انچارج میجر ہربرٹ کیپلر تھا جو ظلم وتشدد کے حوالے سے ایک بدنام شخص تھا۔ اٹلی کے باشندے اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس دوران میں جب وہ روم میں تھا اس کے زیرِ نگیں علاقے کی پہاڑیوں کے اندر جرمنوں نے گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ رکھا ہوا تھا۔ میجر ہربرٹ کیپلر کے ظلم وتشدد کے خلاف اٹلی کے کچھ گروہ بھی کام کر رہے تھے انہیں اس کی خبر ہوگئی۔ اس زمین دوز گروہ نے جو جرمنی کے خلاف کام کر رہا تھا اور جرمنی سے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا انتقام لینا چاہتا تھا، اس نے گولہ بارود کے ذخیرے میں بم رکھ دیا۔ بم پھٹا اور ذخیرہ تباہ ہوگیا اور تقریباً 33 جرمن فوجی بھی ہلاک ہوگئے۔
میجر ہربرٹ کیپلر اس انتقامی کارروائی سے بوکھلا گیا اور اس نے اپنے ظلم کی روایت برقرار رکھی۔ میجر نے اصل مجرموں کو پکڑنے کے بجائے اٹلی کے تین سو تیس بے گناہ قیدیوں کو اکٹھا کیا اور انہیں مشین گنوں سے چھلنی کروا دیا۔ یوں ایک خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ زمین دوز گروہوں نے تواتر سے حملے شروع کر دیے۔ اتحادیوں کی بمباری اور ان گروہوں کی کارروائی سے بالآخر جرمن فوج کو اٹلی سے پسپا ہونا پڑا۔
جب جرمن فوج پسپا ہوئی تو میجر ہربرٹ کیپلر گرفتار ہوگیا، اسے جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ جب جنگ باقاعدہ طور پر ختم ہوئی تو اٹلی کے مظلوم باشندوں نے میجر ہربرٹ کیپلر کے ظلم و تشدد کی داستانیں سنائیں جس سے کیپلر کو جنگی مجرموں میں شامل کر لیا گیا اور یوں 1948ء میں اسے عمر قید کی سزا سنا دی گئی جس میں سے اسے 15 سال قید تنہائی یعنی ہر وقت ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں بند رہ کر گزارنے تھے۔
اس نے 15 سال ایک بدبودار، تنگ وتاریک کوٹھری میں گزارے۔ اس کے بعد اسے جیل خانے کے اندر دوسرے قیدیوں کی طرح رکھا گیا۔ 22 سال گزرنے پر یعنی 1970ء میں اس سے مغربی جرمنی کی ایک خاتون ملنے آئی جس کی عمر تقریباً 50 سال تھی۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ ہربرٹ کیپلر کے ایک پرانے دوست کی بیٹی تھی اور اس کا خاوند کچھ عرصہ پہلے وفات پا چکا تھا۔ وہ بعد میں بھی ہربرٹ کیپلر سے ملنے جیل خانے میں آتی رہی۔ 1972ء میں اس نے ہربرٹ سے شادی کر لی۔ یہ شادی کیا تھی صرف برائے نام تھی۔ اس خاتون نے کیپلر کی رہائی کی مہم شروع کر دی جو مغربی جرمنی تک محدود تھی۔ وہ اپنی حکومت سے اپیلیں کر رہی تھی کہ اٹلی کے ساتھ سفارتی سطح پر میجر ہربرٹ کیپلر کی رہائی کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ جرمن حکومت نے سفارتی سطح پر کوشش کی لیکن اٹلی کی حکومت رضامند نہ ہوئی کیونکہ اخبارات شور مچانے لگے تھے۔ ان لوگوں نے بھی واویلا برپا کر دیا تھا جن کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ انہیں کیپلر کی وہ قتل وغارت گری یاد آ گئی تھی جو اس نے اٹلی کے عوام پر کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پر کچھ سنگین الزامات بھی تھے مثلاً یہ کہ وہ لاشوں کی تلاشی لے کر نقدی اور قیمتی اشیا نکال لیا کرتا تھا۔
ہربرٹ کیپلر بوڑھا ہوگیا تھا۔ قوتِ مدافعت بھی کم ہوگئی تھی۔ اور معدے میں سرطان ہوگیا تھا۔ اس کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ اسے ایک اسپتال میں منتقل کر دیا گیا اور اس کے کمرے کے آگے سنتری کھڑے کر دیے گئے۔ دم بہ دم وہ موت سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اٹلی کی حکومت نے اس پر یہ رحم کیا کہ اس کی بیوی کو اس کے کمرے میں آنے جانے کی اجازت دے دی۔
ہربرٹ کیپلر کی بیوی ایک ملنسار خاتون تھی۔ چنانچہ اس نے سنتریوں اور اسپتال کے عملے کے ساتھ ایسا دوستانہ رویہ رکھا کہ وہ اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کی مدد کرنے لگے۔ اس دوران اس نے کیپلر کی رہائی کی کوششیں جاری رکھیں مگر اٹلی کی حکومت کے رویے نے اسے مایوس کر دیا۔
اگست 1977ء تک میجر ہربرٹ کیپلر کی عمر 70 سال اور اس کی بیوی کی عمر 57 سال ہو چکی تھی۔ کیپلر تقریباً ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کا وزن ایک من سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اب اس پر نظر رکھنے والے بھی کوتاہی برتنے لگے تھے۔ پہرے دار صرف آ کر رجسٹر میں دستخط کرتے اور کسی کونے میں بیٹھ کر اونگھتے رہتے۔ اسی دوران کا ذکر ہے، ایک روز اس کی بیوی کمرے سے نکلی۔ وہ ایک گھسیٹنے والی چھوٹی سی ریڑھی ساتھ لا رہی تھی جس پر ایک سیاہ اٹیچی کیس رکھا تھا۔ سنتریوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ سامان اور لانڈری سے کپڑے وغیرہ لے جاتی رہتی ہے۔ ان کی نگاہوں میں وہ ایک ملنسار، معزز اور قابلِ اعتماد خاتون تھی۔ ایک سنتری نے احتراماً

ریڑھی پکڑلی اور اسپتال کے باہر تک چھوڑ آیا۔ باہر ایک چھوٹی سی کار کھڑی تھی۔ اس خاتون نے اٹیچی کیس کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور کار چلا کر لے گئی۔ سنتری واپس کمرے کی طرف آئے اور کمرے کا دروازہ کھول کر دو تین بار جھانکا اور دروازہ بند کر دیا۔ کیپلر منہ سر چادر میں لپیٹے گہری نیند سو رہا تھا۔ یوں سنتری کو بھی تسلی سی ہوگئی۔

اگلی صبح ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کیپلر کے منہ سے چادر ہٹائی......اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں کیپلر نہیں تھا بلکہ چادر کے نیچے تکیے اس طرح رکھے گئے تھے جیسے کوئی سو رہا ہو۔ سر کی جگہ ایک وگ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے پہرے داروں کو مغالطہ ہوا تھا۔ وہ جب بھی جھانکتے انہیں چادر سے نکلا کیپلر کا آدھا سر نظر آ جاتا۔ گویا وہ بے خبر سو رہا ہے۔

پولیس فوراً پہنچ گئی۔ تفتیش شروع ہوگئی۔ کیپلر کو کسی نے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا اور سنتریوں کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گزشتہ روز وہ کیپلر کی بیوی کا جو اٹیچی کیس ریڑھی پر اس کی کار تک چھوڑ کر آئے تھے' اس اٹیچی کیس میں میجر ہربرٹ کیپلر بند تھا۔

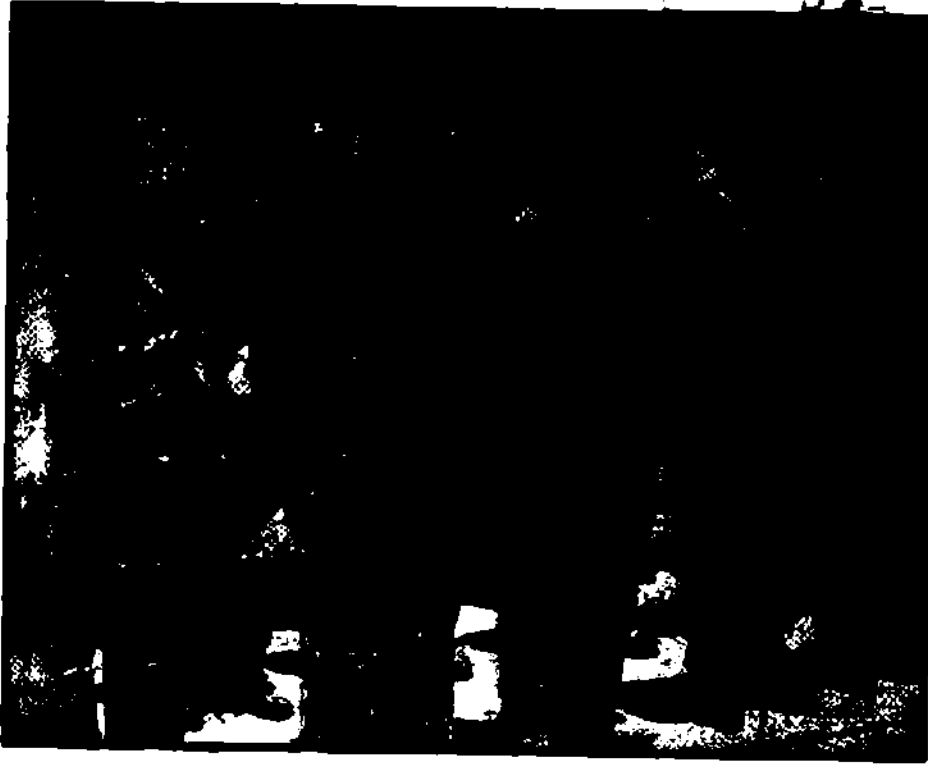
سنتری نے تو کیپلر کی بیوی کی خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کی مدد کی تھی اور اس بڑھیا نے کام دکھا دیا تھا۔ یہ اس لیے ممکن ہوا تھا کہ بڑھتی عمر اور بیماری کی وجہ سے کیپلر اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ وہ اس اٹیچی کیس میں دوہرا ہو کر سما سکتا تھا۔ اسی بات کا اس کی بیوی نے فائدہ اٹھایا تھا۔

پولیس اسے اٹلی میں ڈھونڈ رہی تھی اور وہ اپنی بیوی کی کار میں مغربی جرمنی پہنچ چکا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے ایک جگہ چھپایا اور اپنی حکومت کو اطلاع دے دی۔ اٹلی کے اخبارات نے اس خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ لوگوں نے اپنی حکومت کے خلاف جلوس نکالے' مظاہرے کیے' جلاؤ گھیراؤ کیا اور اپنی حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے خود کیپلر کو فرار کرایا ہے۔

عوام کے دباؤ پر اٹلی کی حکومت نے مغربی جرمنی کی حکومت سے احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ ہمارا قومی مجرم ہمیں واپس کیا جائے۔ مغربی جرمنی کی حکومت یہ مطالبہ بھلا کیسے تسلیم کرتی۔ لہٰذا ہربرٹ کیپلر کو جرمن حکومت نے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں ہربرٹ کیپلر کی بیوی نے اپنی ذہانت کی بنیاد پر اسے ایسے طریقے سے فرار کرایا کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔



اے آر راجپوت



عورت پھول ہے، خوشبو ہے، سُبک چاندنی ہے ، خدا کا بہترین تحفہ ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ مگر وہ عورتیں..... جذبۂ انتقام میں اندھی ہوچکی تھیں۔ انسانیت کی تذلیل بن چکی تھیں۔ قیدیوں کو کیسی کیسی عجیب وغریب ایذائیں دیتی تھیں مگر جب ان کی مظالم کا اختتام ہوا تو بھی وہ باز نہ آئیں، اور خود پر ظلم کرنے پر اتر آئیں۔

دوسری جنگ عظیم کا ایک دل دہلا دینے والا قصہ

فروری 1945ء میں فیلا کے تمام امریکی جنگی دستے جنرل ڈگلس کی کمان میں دیے جا چکے تھے مگر امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے ہنوز لایٹ کے علاقے میں نو تعمیر شدہ ہوائی اڈے استعمال کر رہے تھے۔ ان اڈوں سے پرواز کرنے والے بی 24 بمبار طیارے جنگی سمندروں پر جنوب میں بورنیو سے سلیبس تک اور شمال میں فارموسا اور روکویو کے جزائر پر بھرپور بمباری کر رہے تھے۔ ان حملوں کا مقصد سمندری اور خشکی کے راستوں سے جاپانیوں کی فوجی سپلائی اور سامانِ رسد کا راستہ منقطع کرنا تھا۔

15 جنوری کو، بی 24 بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن اپنے مشن پر روانہ ہوا جنہیں فارموسا پر بمباری کرنا تھی۔

گرین گوز نامی طیارہ اس فارمیشن کے آخر میں تھا

رہ وہ ہٹ بھی اچھی حالت میں نظر نہیں آ رہے تھے مگر مونرو کو یقین تھا کہ وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود ہوگی۔

دوپہر میں میڈم اوکاٹسو اپنے ہٹ سے باہر نکلی، یہ ہٹ اس کے دفتر کے علاوہ رہائش گاہ کا کام بھی دے رہا تھا، وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی رہی پھر بڑے نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں آ کر رک گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا کوڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں میگا فون، جسے منہ سے لگا کر وہ چیختے ہوئے بولی۔

''امریکی کتو! میری بات غور سے سنو۔ آج کی ڈاک سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے بے شمار جوان امریکی بھیڑیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ان جاپانیوں کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور ہم ان کے ایک ایک قطرۂ خون کا بدلہ لیں گے۔''

اس کی تقریر ختم ہوتے ہی محافظ لڑکیاں ہاتھ والی دو گاڑیاں کھینچتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں۔ یہ ''ہتھ گاڑیاں'' گدھا گاڑیوں سے مختلف نہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں گدھوں کے بجائے لڑکیاں کھینچ رہی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر محافظ لڑکیوں نے گاڑیاں چھوڑ دیں، ایک گاڑی میں میڈم اوکاٹسو اور دوسری میڈم یوکا سوار ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی چمڑے کا کوڑا نظر آ رہا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے دو قیدیوں کو ایک سائبان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور انہیں کھینچنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں ڈھانچوں سے مختلف نہ تھے۔ ان کے لیے اپنے جسموں کا بوجھ گھسیٹنا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ گاڑیاں کھینچنے پر مجبور تھے۔ وہ چیونٹی کی رفتار سے گاڑیاں کھینچ رہے تھے۔

دفعتاً فضا میں زناٹے کی آواز اُبھری۔ میڈم اوکاٹسو کے کوڑے نے اس کی گاڑی کھینچنے والے قیدی کی پشت سے کھال اُدھیڑ دی تھی۔ یہ گویا میڈم یوکا کے لیے سگنل تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی میں جتے ہوئے قیدی پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چابک پڑتے ہی قیدیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو برف پر دوڑنے لگیں۔

میڈم اوکاٹسو اور یوکا پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنی گاڑیوں سے جتے ہوئے قیدیوں پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ وہ اس طرح چیخ رہی تھیں جیسے اس ریس سے پوری طرح محظوظ ہو رہی ہوں۔

دفعتاً میڈم اوکاٹسو کی گاڑی والے قیدی کا پیر برف پر پھسل گیا، اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکتا، وہ اوندھا پڑا تھا کہ دوسری گاڑی کا پہیا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ قیدی کے گرنے سے گاڑی اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ اس صورتِ حال نے میڈم اوکاٹسو پر جنون سا طاری کر دیا۔ وہ گاڑی سے نیچے کود آئی، اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کوڑے کے دستے سے قیدی کی پسلیوں پر ضرب لگائی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میڈم نے اس کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی مگر بے سود۔ قیدی کے جسم میں حرکت تک نہیں ہوئی۔

بالآخر میڈم اوکاٹسو چیختی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس طرح یہ کھیل ملتوی ہو گیا۔

اگلے سوموار کو اگرچہ کیمپ کے قیدیوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آج کی ڈاک سے کیمپ کی محافظ عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ منیلا میں جاپانی فوجوں نے جنرل میک آرتھر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ایک اور محاذ پر میڈم اوکاٹسو کا باپ جس رجمنٹ کی کمان کر رہا تھا، امریکی فوج نے اس کا مکمل صفایا کر دیا تھا۔

اس مرتبہ اپنے وحشیانہ کھیل کے لیے میڈم اوکاٹسو نے مونرو اور اس کے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ اوکاٹسو اور یوکا نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی ان کے سائبان کے سامنے رک گئیں اور انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سب اپنے سائبان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور میڈم اوکاٹسو اس طرح ان کا جائزہ لینے لگی جیسے قسائی بکروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کون سا اس کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ بالآخر میڈم نے رچرڈ اور سیکنڈ ریڈیو آفیسر برٹرام کولائن سے الگ کر لیا۔

''تم دونوں قد و قامت میں ایک جیسے لگتے ہو، اپنی اپنی قمیص اُتار دو۔'' میڈم نے حکم دیا۔ انہوں نے قمیص اتار دیں۔ وہ خاصے تندرست اور تنومند تھے، میڈم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''مجھے تم جیسے تنومند اور مضبوط آدمیوں کی ضرورت تھی۔ پرانے قیدیوں میں اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی سکت بھی نہ رہی لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ آج کے مقابلے میں مزہ آ جائے گا۔''

محافظ عورتیں انہیں رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں اور ایک بار پھر درندگی اور

بربریت کا ایک نیا مظاہرہ ہونے لگا۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں اس قابل بھی نہ رہے کہ اپنے قدموں سے چل سکتے، میڈم اوکاٹسو اور یوکا کے لیے اب ان میں کوئی دلچسپی کی بات نہ تھی۔ وہ دونوں اس کھیل کے اختتام کا اعلان کر کے رخصت ہو گئیں۔
رچرڈ کے چہرے، سر اور جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا اس نے سر جھٹکتے ہوئے برٹرام کی طرف دیکھا جو اس سے بھی بدتر حالت میں تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ممکن ہے موسم کی یخ بستگی ان کے زخموں کو انفیکشن سے بچالے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں توانائی کی ضرورت تھی جس کا حصول بہ ظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ رچرڈ سوچ رہا تھا کہ اگر مناسب خوراک کا انتظام نہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ بھی پرانے قیدیوں کی طرح ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔
لیکن سوال تو یہ تھا کہ خوراک کہاں سے آتی؟ امریکیوں سے نفرت کیمپ کی محافظ عورتوں کے انتقامی جذبے میں شامل تھی۔ رچرڈ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک حاصل کرنا ہے تو اسے انہی عورتوں میں سے کسی ایک کو قابو میں کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے اور پھر بالآخر محض اتفاق سے اسے وہ موقع مل گیا جس کا وہ منتظر تھا۔ اس روز حسبِ معمول ان کے سامنے کتوں کی طرح کھانا ڈالا جا رہا تھا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا محافظ لڑکی کو پتیلے میں سے چاول نکال نکال کر ان کے سامنے زمین پر ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو برف پر لڑکی کا پیر پھسل گیا اور چاولوں سے بھرا ہوا مگا رچرڈ کے پیر پر پلٹ گیا۔
”گومن ناسائی!“ لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
لڑکی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ معذرت کے ان سیدھے سادے الفاظ نے رچرڈ کے دماغ میں ایک جھماکا سا پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کیمپ کی خونخوار محافظ لڑکیوں میں سے کسی کی ہمدردی حاصل کی جاسکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے۔ کیمپ کے پُرانے قیدیوں سے رچرڈ کو اس محافظ لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ناما تھی، اس کا تعلق ہنان کے ایک ایسے کلب سے تھا جہاں جاپانی فوجی افسر تفریح کے غرض سے جاتے تھے۔
رچرڈ تین دن تک گہری نظروں سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا، وہ اس سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا، بالآخر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس روز ناما محافظوں والے بیرکس کے قریب ایک شیڈ میں اسٹاک کا جائزہ لے رہی تھی کہ رچرڈ بھی نہایت خاموشی سے رینگتا ہوا شیڈ میں داخل ہو گیا۔
”ناما......!“
رچرڈ نے دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا، اس کے لہجے میں بے پناہ درد تھا، اس ایک لفظ سے وہ ناما کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہمدردی کا مستحق ہے۔
ناما اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، رچرڈ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب چمک اُبھر آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔
سب کچھ رچرڈ کی توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا، ناما، رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو چوری چھپے اضافی راشن فراہم کرنے لگی، کبھی وہ انہیں چاول پہنچا دیتی اور کبھی ڈبل روٹی وغیرہ۔
مارچ کا مہینا ختم ہوتے ہی برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اس سائبان کے علاوہ قیدیوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بارش کی تیز بوچھار میں وہ رات دن بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہتے۔
اپریل کے وسط میں میڈم یوکا کو اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اوکی ناوا کے محاذ پر امریکیوں کے ہاتھوں مارا جاچکا ہے۔ وہ ایک بنکر میں مشین گن سے فائر کر رہا تھا کہ دشمن کی توپ کا گولا بنکر کے اندر آ کر گرا اور مشین گن کے ساتھ اس کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔
یوکا نے میڈم اوکاٹسو سے ”شکار“ کی اجازت مانگی جو بلا جھجک مل گئی۔ اس مقصد کے لیے یوکا نے لیفٹیننٹ مونرو کا انتخاب کیا تھا۔
قیدیوں کو کچھ علم نہ تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے، وہ تو صرف ایک رات پہلے ناما نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اشاروں کی زبان میں رچرڈ کو بتا دیا تھا کہ

شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لیے یوکا کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

دوسرے دن صبح دو محافظ لڑکیاں مونرو کو گھسیٹتی ہوئی میدان کے وسط میں لے گئیں اور مونرو کو کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر خونخوار بلیوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ مونرو کی قمیص تار تار ہوگئی۔ لڑکیوں کے نوکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے اور جسم پر گہری خراشیں آ گئی تھیں جن سے خون رسنے لگا۔ ایک لڑکی نے اس کے گلے میں جھولتی ہوئی قمیص کھینچ کر دور پھینک دی پھر وہ دونوں رائفلیں تان کر دور کھڑی ہوگئیں۔ اب یوکا کی باری تھی، وہ قہر برساتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی، اس کے اشارے پر دو محافظ لڑکیوں نے مونرو کے بازو پشت پر جکڑ لیے، یوکا کے پاس اس وقت کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے مونرو کی طرف جھکتے ہوئے اچانک ہی اپنی انگلیاں اس کی ایک آنکھ میں گاڑ دیں۔ مونرو بلبلا اُٹھا۔ یوکا نے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔ مونرو کی آنکھ کا ڈیلا (Eye ball) گویا ابل کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ مونرو کی دوسری آنکھ بھی نکال چکی تھی۔

مونرو اس گروپ کا طاقت ور ترین آدمی تھا۔ پہلی آنکھ نکلتے وقت اس کے منہ سے بس ایک چیخ نکلی تھی، اس کے بعد پھر اس نے اُف تک نہ کی۔ جبکہ یوکا اس سے کسی خاص ردِعمل کی توقع کیے ہوئے تھی، اسے یقین نہ آیا کہ مونرو اس طرح خاموشی سے یہ اذیت برداشت کر جائے گا۔ اس کی قوت برداشت نے یوکا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس نے ایک محافظ لڑکی سے رائفل چھینی اور چھینتے ہوئے رائفل کی سنگین سے مونرو کے بازوؤں اور ٹانگوں پر وار کرنے لگی۔ سنگین اُتار کر رائفل پھینک دی اور قسائی کی طرح مونرو کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پھینکنے لگی۔ مونرو کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے اب تک کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ اس کا ایک بالائی دانت نچلے ہونٹ میں پیوست تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یوکا اب بھی بربریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مونرو نیچے گر گیا۔ یوکا کا جنون اس وقت کم ہوا جب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک لاش پر سنگین چلا رہی ہے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد سارجنٹ میٹ ٹیلر نے کیمپ کے خاردار تاروں کو پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے بھی اسی طرح اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ کیمپ کے قیدی لرز اُٹھے۔ اس کے چند روز کے بعد جہاز کے گن پورٹر نے میڈم اوکاٹسو پر حملہ کر دیا، اس کا شاید دماغ چل گیا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سنگینوں کے کچوکے دے دے کر میڈم اوکاٹسو سے الگ کیا اور میڈم اوکاٹسو نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر پورٹر کے سر میں گولی اُتار دی۔

جون کے شروع میں جب کیمپ میں اوکی ناوا کے سقوط کی بازگشت سنائی دی تو رچرڈ کے دل میں بھی امید کی کرن جگمگا اٹھی، اسے یقین تھا کہ اوکی ناوا کے بعد اب فارموسا کی باری آئے گی۔ اس میں چند مہینے بھی لگ سکتے تھے اور اس دوران انہیں صبر واستقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

پھر وہ ہوا جس کا رچرڈ کو خطرہ تھا۔

کیمپ کے کچن سے راشن کی چوری کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میڈم اوکاٹسو نے کچن کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز ناما راشن چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ پہلے تو ناما سے ویسے ہی پوچھ گچھ کی جاتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ راشن کس کے لیے چرایا کرتی تھی پھر اسے گھسیٹ کر میدان کے وسط میں لے آیا گیا اور تمام قیدیوں کے سامنے اس پر تشدد کرتے ہوئے اصل بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ناما کا جسم خون سے تر ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی مگر اس کی زبان نہیں کھل سکی۔ بہرطور اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد ناما کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو اضافی راشن کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دوسری طرف امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے جاپانیوں کی بیشتر سپلائی لائنیں کاٹ چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپ میں بھی راشن کی قلت پیدا ہوگئی۔ مزید برآں جون کی چلچلاتی دھوپ نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برف پگھلنے کے بعد کیمپ میں پڑی ہوئی لاشوں سے سڑاند اُٹھنے لگی۔ اگست کے شروع میں قیدیوں کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ رچرڈ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بے بسی کی موت مرنے کے بجائے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس روز میڈم اوکاٹسو کے ہٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ اندر سے آنے والی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب کر ڈالیں اور وہ

رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے اندر رینگ گیا، اندر پہنچنے کے بعد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو اس پر سحر طاری کر رہی تھی لیکن میڈم اوکاشو بھی ہٹ میں موجود تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ رچرڈ نے دروازہ مقفل کر دیا اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معمولی سی آہٹ سن کر میڈم اوکاشو تیزی سے گھوم گئی، رچرڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دیوار پر ٹنگے ہولسٹر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے اس نے پیر کی ٹھوکر سے کھانے کی میز الٹ دی۔

ہولسٹر سے ریوالور کھینچتے ہی اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے مگر بدحواسی میں اس کی کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بھاری ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپ رہا ہے۔

میڈم اوکاشو کی یہ بدحواسی دیکھ کر رچرڈ کے ذہن میں شاید یہ شیطانی خیال ابھرا ہو کہ اگر وہ اوکاشو کی انا کو مجروح کر سکے تو......؟

شاید یہی سوچ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بن کر ابھر آئی تھی۔ میڈم اوکاشو نے ایک اور فائر کیا مگر نشانہ اس مرتبہ بھی خطا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے چھلانگ لگا دی۔ دنیا کی سفاک ترین عورت میڈم اوکاشو بے بس چڑیا کی طرح رچرڈ کی گرفت میں تھی۔ رچرڈ پر جنون سا طاری تھا۔ فائرنگ اور میڈم کی چیخوں کی آواز سن کر محافظ لڑکیاں ہٹ کے باہر جمع ہو چکی تھیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا مگر رچرڈ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر تو جنون طاری تھا۔ اس نے میڈم اوکاشو کو نیچے گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ انتقام کا جذبہ اب بھی شدید تر تھا۔

اس نے میڈم کے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ممکن ہے وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتا لیکن اس لمحے محافظ لڑکیاں دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں۔ وہ رچرڈ کو بڑی مشکل سے گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔

میڈم اوکاشو کے چہرے پر لاتعداد خراشیں تھیں۔ ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دو محافظ لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے غرائی۔

"تم امریکی کتے! تمہاری یہ جرأت۔ تمہیں اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دوں گی کہ تمہاری چیخوں سے آسمان تک کانپ اٹھے گا۔"

میڈم اوکاشو، میڈم یوکا اور میڈم بار دا حکامات جاری کرتی رہیں۔ رچرڈ کو ہٹ سے باہر لایا گیا۔ تین محافظ لڑکیوں نے اپنی رائفلیں اس کی پشت سے لگا رکھی تھیں۔ کیمپ کے آخری سرے پر خاردار تاروں کے قریب اسے روک لیا گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی جنگلے کے دوسری طرف گندگی کا ایک جوہڑ تھا۔ رچرڈ کے ہاتھ میں ایک بیلچا دے کر گڑھا کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تین رائفلوں کے سائے میں وہ گڑھا کھودتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھی پانچ گھنٹے تک گڑھا کھودتے رہے، ان میں جو بھی ذرا سستی دکھاتا، میڈم یوکا کا ہنٹر اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا۔

نو فٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد پانی نکل آیا، اس کے باوجود وہ گڑھا کھودتے رہے۔ بدبودار پانی تیزی سے گڑھے میں بھر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پانی پنڈلیوں تک پہنچ گیا تو انہیں رسیوں کے ذریعے باہر نکال لیا گیا۔

قیدیوں کو دو محافظوں کی نگرانی میں ان کی بیرک میں واپس پہنچا دیا گیا اور میڈم یوکا کے حکم پر چار محافظ لڑکیاں جنگلے کے دوسری طرف جوہڑ کے بدبودار پانی سے بالٹیاں بھر بھر کر اس گڑھے میں انڈیلنے لگیں۔ ان کا یہ کام تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ پھر اطلاع پا کر میڈم اوکاشو بھی اپنے ہٹ سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔ رچرڈ کی قمیص پھاڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دی گئی اور پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دھکیلتے ہوئے گڑھے کے قریب لے آیا گیا۔ اس وقت تک تقریباً چار فٹ پانی جمع ہو چکا تھا۔

میڈم اوکاشو چند لمحے خونخوار نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھتی رہی پھر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے تم بہت اچھا کھانا کھاتے ہو امریکی کتے! آج میں نے تمہارے لیے ایک بہت خاص ڈش تیار کرائی ہے۔ اسے ہماری زبان میں لنقاہی کہا جاتا ہے۔"

میڈم اوکاشو بات کرتے ہوئے رچرڈ کے قریب آ گئی تھی۔ آخری الفاظ منہ سے نکالتے ہی اس نے رچرڈ کو دھکا دیا۔ رچرڈ قلابازی کھاتا ہوا گڑھے میں گر گیا۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمر اور ٹانگوں پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس کرنے

وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کمر سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ کوئی چیز اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی جسے اس نے نوچ لیا پھر اپنے ہاتھ میں تقریباً پانچ انچ لمبی جونک دیکھ کر اسے اپنے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک جونک اس کے پیٹ پر چپک گئی تھی جسے کوشش کے باوجود وہ نوچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور پھر تو اسے محسوس ہوا جیسے پیٹ سے نیچے جسم کے ہر حصے پر نشتر چل رہے ہوں۔

جونکیں اب اس کی کمر اور پیٹ پر رینگتی ہوئی جسم کے ہر حصے پر پہنچ رہی تھیں اور وہ بڑی آزادی سے اس کا خون چوس رہی تھیں۔ رچرڈ چیختا ہوا گڑھے کی دیوار کی طرف لپکا' اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر چکنی مٹی پر اس کے ہاتھ پھسلتے رہے۔ اس نے بے بسی سے اوپر دیکھا، اس کے ساتھی گڑھے کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ رچرڈ اپنے جسم سے جونکیں نوچتا پانی میں ناچتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا۔ اس مرتبہ اسے کوئی محافظ لڑکی دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ اس کا ایک ساتھی گڑھے کے کنارے پر لیٹا اپنا ہاتھ نیچے لا رہا تھا۔ رچرڈ نے پوری قوت کے ساتھ اُچھل کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کی انگلیاں مس ہوئیں مگر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کے ہاتھ پر گرفت نہ جما سکا۔ بالآخر تیسری کوشش میں وہ مائز کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ایک اور ساتھی کوبرنے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ تان کر گڑھے سے باہر نکال لیا۔

ہوا اور دُھوپ کے باعث اس کے جسم پر جونکوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رچرڈ اور اس کے ساتھی اس کے جسم سے جونکیں نوچ نوچ کر پھینکتے رہے۔

''کک...... کیا ہوا......؟ یہ...... یہ خونخوار بلیاں یہاں سے کیوں چلی گئیں؟'' رچرڈ نے حواس بحال ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

''پپ...... پتا نہیں۔'' مارٹر بولا'' کچھ دیر پہلے ایک کار گیٹ پر آ کر رکی تھی، نیچے اُترنے والے ایک جاپانی فوجی نے چیخ کر انہیں بلایا تھا شاید اس کے ساتھ کچھ اور بھی تھے، تمام لڑکیاں دوڑتی ہوئی کار کے قریب چلی گئیں۔ وہ لوگ اب بھی گیٹ کے پاس جمع ہیں۔''

رچرڈ نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ کیمپ کی تمام محافظ لڑکیاں جاپانی بحریہ کے ایک آفیسر کے گرد جمع تھیں۔ چند منٹ بعد لڑکیاں اس آفیسر کو چھوڑ کر اپنے ہٹس کی طرف چلی گئیں۔ جاپانی آفیسر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر بے تلے قدم اُٹھاتا ہوا رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔

چھ اگست کے دن...... امریکی فضائیہ کے بی 29 طیارے نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا دیا تھا۔ اس کے تین دن بعد ایک اور ایٹم بم نے ناگاساکی کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ چودہ اگست کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس طرح جنگ ختم ہو گئی تھی اور جنگی کیمپوں میں تمام امریکی قیدی اب آزاد تھے۔ رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ کے تمام قیدیوں کو یہ خوشخبری سنائی، ہر وہ شخص جو چلنے پھرنے کے قابل تھا، خوشی سے اُچھل پڑا اور پھر انہوں نے محافظ لڑکیوں کے ہٹس کو گھیرے میں لے لیا۔ اب وہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں شدید نفرت تھی اور وہ کیمپ کی ان درندہ صفت محافظ لڑکیوں سے انتقام لینا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ سب کے سب محافظ لڑکیوں کے ہٹس کی تلاشی لیتے رہے مگر ان لڑکیوں کو تو جیسے زمین نے نگل لیا تھا۔ تمام ہٹس خالی پڑے تھے۔ ماسوائے ایک ہٹ کے جو میٹنگ ہال کہلاتا تھا اور جہاں وہ محافظ لڑکیاں اہم معاملات پر مل جل کر غور و خوض کیا کرتی تھیں۔ میٹنگ ہال کا دروازہ اندر سے بند دیکھ کر انہیں اطمینان ہو گیا کہ محافظ لڑکیاں اندر موجود ہیں اور اپنی حفاظت کے لیے وہ سہم کر میٹنگ ہال کے کونے کھدروں میں چھپی بیٹھی ہیں۔

''دروازہ توڑ ڈالو۔'' زخمی رچرڈ نے نقاہت کے باوجود چلّا کر کہا اور سب دروازے پر پل پڑے۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ گر پڑا۔

واقعی ان کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ تمام محافظ لڑکیاں میٹنگ ہال کے کونے کھدروں میں نہیں بلکہ کمرے کے بیچوں بیچ اس میز کے گرد موجود تھیں جہاں وہ اپنے اہم معاملات پر غور و خوص کیا کرتی تھیں...... مگر اس حال میں کہ ان کے جسموں سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ ان تمام جاپانی لڑکیوں نے اپنے اسلاف کی روایات پر عمل کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ''ہاراکاری'' پر عمل کرتے ہوئے اپنی جانیں ختم کر لی تھیں۔

سمندر کے قیدی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

رائے فیرن' دوسری جنگ عظیم کے دوران بہت سے جنگی قیدیوں میں شامل تھا' جنھوں نے جرمن نازیوں کی خوں ناك قید سے فرار ہونے کی کوشش کی اور خوش قسمتی سے اس عظیم فرار میں کامیاب بھی ہوئے۔ رائے فیرن 1941ء میں یونان کے نزدیك ''کریٹ'' نامی جزیرے کی ایك لڑائی میں شدید زخمی ہوکر جرمن فوج کے ہاتھوں قید ہوگیا تھا۔ اس کا ایك بازو اور دونوں پاؤں بری طرح زخمی تھے۔ بالخصوص ایك ٹانگ کا زخم تو ناسور بنتے بنتے رہ گیا تھا اگر اسے فوری آپریشن کی غرض سے ایك ''ایمبولینس طیارے'' کے ذریعے یونان نہ بھیج دیاگیا ہوتا...... اسپتال ہی وہ ایسی جگہ تھی جہاں اس نے فرار ہونے کے امکانات پر بڑی شدومد کے ساتھ غوروفکر کرنا شروع کردیا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا یوں بعد میں اس نے اپنے اس ''کامیاب فرار'' کی داستان مصائب و آلام کو باقاعدہ ایك کہانی کی شکل میں بہ قلم خود ترتیب دیا تھا جس کا نام ''ونگڈ ڈیگر'' تھا۔

یہ جنگی قیدیوں کی بلند و بالا سفید عمارت تھی جو یونان کے دارالحکومت ایتھنز کے مضافات میں واقع تھی۔ اس میں جنگ سے پہلے ایک گرلز اسکول ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت کو جدید طرزِ تعمیر کے خطوط پر بہت مضبوط بنایا گیا تھا جو صلیب کی شکل کی طرح تھی۔ یہ عمارت ایک کھلے اور بڑے وسیع میدان میں کوکینا نامی قصبے میں بنائی گئی تھی۔ یہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر قصبے کے مکانات کے درمیان یونانی فوج کی کچھ پرانی بیرکیں بھی تھیں جن میں نسبتاً کم بیمار یا اسپتال سے ڈسچارج ہونے والے جنگی قیدیوں کا کیمپ بنادیا گیا تھا۔

اسپتال کا نظم و نسق زیادہ تر قید ہونے والے برطانوی ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں تھا جو جرمن فوجی افسروں کے زیرِ نگرانی چلایا جاتا تھا۔ یہاں دواؤں کی کمیابی کے باوجود علاج معالجے کے سلسلے میں مریضوں سے عملے کا برتاؤ اچھا تھا۔ اسپتال کے تقریباً تمام وارڈ برطانوی جنگی زخمیوں سے بھرے پڑے تھے' جنہیں یونان یا کریٹ کے محاذوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ جوں ہی کوئی زخمی قیدی چلنے پھرنے کے ذرا قابل ہوتا' اسے فوراً جنگی کیمپ میں منتقل کردیا جاتا۔ کیمپ اور اسپتال دونوں ایک ہی جرمن آفیسر کے ماتحت تھے جو چیکوسلواکیا کا باشندہ تھا۔ وہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت گیر اور غصیلا تھا۔ ابتدا میں تو ہمارے تعلقات اس سے بہت دوستانہ تھے مگر فرار کے پہلے واقعے کے بعد ہی سے اس نے بہت تنگ نظری اور غیر مصلحت اندیشی کے ساتھ ہمیں دی جانے والی رعایتوں میں کمی کرنا شروع کردی۔

اسپتال میں کھانے کا انتظام بہت خراب تھا لیکن ہم اس کے لیے جرمنوں کو بہر حال دوش نہیں دے سکتے تھے کیونکہ جتنی گنجایش پیش نظر رکھی گئی تھی' زخمیوں کی آمد اور تعداد اس کے حساب سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ناشتے میں صرف پودینے کی چائے ہوتی تھی جسے پینے کے بعد کم بخت بھوک کا احساس



مزید سوا ہونے لگتا تھا۔ اس پر مستزاد دوپہر کے کھانے میں سڑی بسی ڈبل روٹی کا صرف ایک توس اور بکری کے دودھ کا پنیر اور رات میں کھانے کے نام پر شوربے کا ایک پیالا اور روٹی کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا۔ کھانے کی یہ مقدار ان زخمیوں کو زندہ رکھنے کے لیے تو کافی تھی جو چوبیس گھنٹے پلنگ پر پڑے رہا کرتے تھے لیکن جو لوگ چلنے پھرنے کے قابل تھے ان کے لیے بالکل ہی ناکافی تھی۔

نیوزی لینڈ کے کئی زخمی قیدیوں کے پاس موسیقی کے آلات تھے جنہیں انہوں نے یکجا کر کے ایک بینڈ کی شکل دے رکھی تھی اور گاہے گاہے مختلف وارڈوں میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتے رہتے تھے۔ ابتدا میں یونان کی ریڈ کراس کے افراد کو ہم لوگوں سے ملنے اور تحائف دینے کی اجازت تھی مگر جب یہ شبہ پیدا ہوا کہ اس طرح ہم لوگ بیرونی ہمدرد تنظیموں سے روابط استوار کر رہے ہیں تو اس سہولت کو ختم کر دیا گیا۔ ہمیں ہر دس دن بعد اپنے عزیز و اقارب کے نام ایک مختصر سا خط لکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یوں اسپتال میں چھ ہفتے گزارنے کے بعد ہمیں ان خطوط کے جوابات بھی ملنا شروع ہو گئے تھے۔

بہر طور بہ حیثیت مجموعی اسپتال میں ہمارے ضبط اور حوصلے کا معیار اتنا زیادہ بلند نہ تھا۔ کئی لوگ تو اس بات سے ہی نالاں تھے کہ جنگ...... غلط حکمتِ عملی کے تحت لڑی جا رہی ہے کیونکہ وہ یونان اور کریٹ میں اپنی شکست اور گرفتاری کو غلط حکمتِ عملی کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ کچھ لوگ خوش بھی تھے کہ وہ جنگ کی قیامت خیزیوں سے محفوظ ہیں اور لڑائی کے بعد یقیناً خیر و عافیت سے اپنے عزیزوں سے جا ملیں گے مگر بیشتر تعداد ایسے افراد پر مشتمل تھی جو ہماری پے در پے شکستوں سے بالکل ہی ہمت ہار چکے تھے۔ ان میں سینئر افسروں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ آدمی جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس میں خطرات اور ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کی استعداد اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے' اگرچہ عام فوجی زندگی میں اس رجحان کا اندازہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر منصوبہ بنایا گیا کہ کیمپ کے تمام قیدی یکبارگی ہلہ بول کر فرار ہو جائیں۔ تقریباً ایک ہزار قیدی تھے جن کی نگرانی ایک وقت میں صرف چار سنتری کرتے تھے۔ ویسے ان کی کل تعداد بھی تیس سے زیادہ نہ تھی۔ آس پاس کی تمام یونانی آبادی دوست تھی اور عین ممکن تھا کہ سنتریوں کا اسلحہ چھین کر اس کی مدد سے ہم ساحلِ سمندر پر موجود کسی جنگی کشتی پر قبضہ کر لیں۔ بحریہ کے ایسے تجربے کار افسر موجود تھے جو اس کشتی کو بہ حفاظت مصر لے جا سکتے تھے۔ فضائیہ کے ایسے پرجوش نوجوان بھی ہمیں میسر تھے جو قریبی ہوائی اڈے ''تاتوئی'' پر حملہ کر کے وہاں کھڑے ہوئے تمام طیاروں کے ذریعے ہمیں ترکی یا مصر پہنچا سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک خطرناک منصوبہ تھا لیکن نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے قابل افسران کی موجودی میں اس کی کامیابی کا ففٹی ففٹی چانس تھا۔ مگر اس منصوبے کو صرف اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ ہمارے سینئر افسر اس کی ناکامی اور نتیجے میں ملنے والی سزا سے خوف زدہ تھے پھر انہیں جانوں کی ہلاکت کا بھی خطرہ تھا۔ ان کے دماغوں میں یہ بات کسی طرح نہیں اتاری جا سکی کہ ''قیدیوں'' کی حیثیت سے ہم اپنے ملک و قوم اور اس کی جنگی جدوجہد کے لیے بہر حال قطعی بیکار اور لاحاصل ہو چکے ہیں۔

ہمارے شب و روز اپنے جنگی نقصانات شمار کرنے یا اگلے کھانے کا انتظار کرنے میں بیت رہے تھے۔ ہمیں ہر ماہ کچھ مارک (جرمن سکے) دیے جاتے تھے جنہیں ہم اسپتال کی کینٹین میں خرچ کرنے کے ہی مجاز تھے۔ یہ کینٹین ایک یونانی ٹھیکے دار چلاتا تھا۔ بعد ازاں ان مارکوں نے ایک خصوصی اہمیت اختیار کر لی کیونکہ رفتہ رفتہ ہمیں پتا چلا کہ اگر ہم چاہیں تو ان جرمن سکوں کو مقامی کرنسی میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں' یوں جیسے جیسے ہماری صحت بحال ہوتی جا رہی تھی' ہمارے درمیان ''فرار'' کے امکانات پر غور و خوض بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ویسے تو اس بارے میں باتیں تو بہت سے لوگ بناتے ہی رہتے تھے لیکن ان میں ان لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو پوری سنجیدگی سے کسی منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار تھے۔ وارڈ کے اس گوشے میں جس میں ہم لوگ تھے' ایک کمانڈو آفیسر نے ایک ''فرار کمیٹی'' تشکیل دی جس میں صرف چار افراد تھے ایک وہ خود' ایک دوسرا کمانڈر۔ ایک نیوزی لینڈ کا پرجوش باشندہ اور چوتھا میں تھا۔

اس کمانڈو آفیسر کا نام رابن تھا۔ وہ ملکہ کے خاص باڈی گارڈ دستے میں شامل تھا۔ دوسرا کمانڈر میکسول نامی تھا جبکہ نیوزی لینڈ کے باشندے کا نام سن کلیئر تھا۔ رابن اور میکسول کے زخم معمولی نوعیت کے تھے جو اس ٹرک کے اچانک ہی الٹنے سے لگے تھے جس میں انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ سنکلیئر کے چہرے پر گولی لگی تھی اور اسے کھانا کھانے میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت میری تھی' میری ران میں کافی چوڑا اور بہت گہرا زخم تھا۔ جرمن سرجن نے آپریشن کر کے بم کا وہ ٹکڑا نکال دیا تھا جو میری ران میں پیوست ہو گیا تھا۔

بہر طور اب میں تیزی سے رو بہ صحت تھا۔

ہمارے زیادہ تر منصوبے محض خیالی اور ناقابلِ عمل

ہوتے تھے‘ ہم فالیرون کے ساحل سے ایک بحری طیارہ چرانے کے امکانات پر بحث کرتے رہتے تھے مگر مجھے خوشی تھی کہ ہم نے کبھی اس خیال کو بروئے کار لانے کی حماقت نہیں کی...... ویسے ہماری باہمی ملاقاتوں میں زیادہ تر جس بات پر توجہ مرکوز رکھی جاتی تھی‘ وہ یہی تھی کہ ہم اسپتال کے سنتریوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں اور قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونے کے امکانات کا بہ غور جائزہ لیں‘ اس بات پر تقریباً ہم سب کا ہی اتفاق تھا کہ ہم جسمانی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ پیدل مارچ کر کے ترکی پہنچنے کی کوشش کریں اور یہ کہ یونان سے ہمارے کامیاب فرار کی اگر کوئی صورت ممکن ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ ہم سمندری راستہ اختیار کریں۔

یہ افواہیں سننے میں آئی تھیں کہ ایتھنز میں کوئی خفیہ دوست تنظیم ہے جو بھاگنے والے قیدیوں کی ہر ممکن مدد کرتی تھی۔ مگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا یقینی علم حاصل نہ تھا کہ بہ حیثیت مجموعی یونان کی عام آبادی کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا ہوگا! رابن نے البتہ وعدہ کیا تھا کہ وہ قیدیوں کے کیمپ سے جہاں وہ بہت جلد منتقل کیا جانے والا تھا‘ مجھے مفید معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ باہمی رابطے کے لیے ان خاکروبوں کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا جو روزانہ اسپتال میں صفائی کرنے آتے تھے۔

عام یونانی آبادی کے دوستانہ طرزِ عمل کی یقینی معلومات ہمیں پہلی بار اس وقت حاصل ہوئیں جب قیدیوں کے کیمپ سے ایک کنسرٹ پارٹی کو اسپتال بھیجنے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ موسیقی کا پروگرام پیش کر کے مریضوں کی تفریح اور دل بستگی کا سامان کرے۔ اس پارٹی کا سربراہ ایک میجر رائے تھا اور چونکہ وہ پائپ (فوجی بین) بجاتا تھا اس لیے لوگ اسے پائپ میجر ہی کہتے تھے۔ جب یہ پارٹی کیمپ سے روانہ ہوئی تو میجر پائپ نے قصبے کی سڑکوں پر اپنا ساز بجانا شروع کردیا جسے سن کو لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ پائپ میجر‘ کیمپ سے اسپتال تک بین بجاتا ہوا آیا اور اس کے اس اقدام سے لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا ہوگیا کہ جرمن سپاہی طاقت کا انتہائی مظاہرہ کر کے ہی اس خطرے کو دبانے میں کامیاب ہوسکے تھے جو ایک متوقع فساد کی صورت میں سامنے نظر آرہا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی فرار کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس کی پاداش میں اسپتال اور کیمپ دونوں کے قیدیوں کو یکساں طور پر نت نئی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے نیوزی لینڈ کے دو باشندوں نے اسپتال کی لانڈری کے میلے کپڑوں میں چھپ کر بھاگنے کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو چادروں کے ایک بنڈل میں لپیٹ لیا اور جرمن سپاہی انہیں دوسرے میلے کپڑوں کے ساتھ اسپتال کی سیڑھیوں سے لے کر اترے۔ عجیب بات تھی کہ انہوں نے اس اضافی وزن کی طرف بھی کوئی توجہ نہ دی جو کپڑوں میں پیدا ہوگیا ہوگا۔ بعد میں ان دونوں نے ہمیں بتایا کہ وہ تقریباً دو گھنٹے تک دھوپ میں سیڑھیوں پر پڑے پڑے دم گھٹنے کے قریب ہو چکے تھے کہ آخر لانڈری کی وین میلے کپڑے لینے آگئی اور انہیں اٹھا کر وین میں ڈال دیا گیا۔ یہ ان کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے جس وقت وین سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تو اس وقت وین پرانی یونانی بیرکوں کے درمیان گزر رہی تھی چنانچہ انہیں فوراً دیکھ لیا گیا۔ نتیجتاً وہ دھر لیے گئے اور انہیں بری طرح مارنے پیٹنے کے بعد دوبارہ اسپتال بھیج دیا گیا۔ اس سے اگلی کوشش زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ نیوزی لینڈ کا ایک فوجی ”جم کریگ“ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سنتریوں کے درمیان زمین پر رینگتے ہوئے کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔

اس کے چند روز بعد..... جولائی کے آخر میں‘ دو آسٹریلین ایک نہایت دلچسپ منصوبے کے ذریعے اسپتال سے بھاگ نکلے‘ صورت حال یہ تھی کہ اسپتال کے مریضوں کو جو چلنے پھرنے کے قابل تھے‘ شام کے چار بجے نصف گھنٹے کے لیے کمپاؤنڈ میں نکلنے کی اجازت تھی۔ یہ کمپاؤنڈ‘ اسپتال کی عمارت اور خاردار تاروں کی چار دیواری کے درمیان واقع تھا۔ آسٹریلین یہ وقت عموماً ایک خاص کھیل میں گزارتے تھے جسے وہ لوگ ”ٹواپ“ کہتے تھے۔ مزید برآں ایک برطانوی سپاہی جو اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم تھا۔ بہت اچھا مصور تھا اور سنتریوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے فالتو اوقات میں ان کی شبیہ بنایا کرتا تھا۔ فرار والے روز اس مصور سپاہی نے اسپتال کے عقبی حصے میں متعین ایک سنتری کو اس کی تصویر بنانے کے بہانے اپنی طرف متوجہ رکھا اور وہ دونوں آسٹریلین اپنا کھیل کھیلتے ہوئے بڑی پھرتی سے تاروں کے نیچے سے رینگ کر نکلے اور باہر جا کر دو گہرے گڑھوں میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ انہیں رات کی تاریکی پھیلنے کا انتظار تھا تاکہ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر آگے بڑھ سکیں۔ زمین کی سطح سے تو وہ ان گڑھوں میں چھپے ہوئے نظر نہیں آسکتے تھے مگر اسپتال کی بالائی منزل سے ہم اپنی کھڑکیوں سے جھانک کر انہیں بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں بڑا اشتیاق ہوتا کہ ہم انہیں آزادی کی طرف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا دیکھیں لیکن اس طرح ان بے چاروں کے منصوبے کے کھل جانے کا خطرہ تھا لہٰذا ہم بڑی مشکل سے خود کو اس منظرِ آزادی سے

لطف اندوز ہونے سے روک سکے۔

فرار کے ان دونوں کامیاب واقعات نے باقی قیدیوں کی دشواریوں میں نمایاں اضافہ کردیا۔ جواب میں قیدیوں کی جانب سے بھی اصول و قواعد کو توڑنے کا سلسلہ شروع ہوگیا جو خاصی طویل مدت تک جاری رہا اور اس کے نتیجے میں وہ کچھ مراعات دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جرمنوں نے ہمیں بہلانے پھسلانے کی ایک اور صورت اختیار کرنی چاہی۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ اگر ہم اپنے عزیزوں، رشتے داروں کے نام مختصر پیغامات ریکارڈ کرادیں تو وہ انہیں ریڈیو سے نشر کردیں گے۔ دراصل منفی پروپیگنڈا کرنے کے لیے دشمن کا ایک حربہ یہ بھی ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ ایک عام قیدی اس کے نفسیاتی اثرات سے واقف نہیں ہوتا۔ چنانچہ بہت شدید زخمی قیدی جن کی قوت مدافعت تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے کمزور پڑ چکی تھی، ایسے پیغامات ریکارڈ کرانے پر آمادگی کا اظہار کر بیٹھے۔ نہایت شرمندگی کے ساتھ مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں بھی ان میں شامل تھا لیکن خوش قسمتی سے ہمارے نسبتاً تندرست اور ہوشیار ساتھیوں نے ہمیں اس اقدام کے خراب نتائج و عواقب سے آگاہ کردیا اور میرا خیال ہے کہ بعد میں تقریباً سبھی نے اس پیش کش کو سر بہ سر ٹھکرادیا۔

میں نے شروع میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ اسپتال اور کیمپ کا ایک ہی کمانڈر تھا جو چیکوسلواکیا کا باشندہ تھا۔ اب یہ شخص انتہائی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ اس نے اپنے دو جاسوس رائل آرمی میڈیکل کور کے اردلیوں کے بھیس میں اسپتال بھیجے جن کا کام یہی تھا کہ وہ قیدیوں کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اسے پہنچاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ایک برطانوی باشندے کی طرح انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ اس خامی کو چھپانے کے لیے یہ عذر تراشا گیا کہ وہ دونوں ایک طویل مدت غیر ممالک میں رہے ہیں اس لیے ان کا لب و لہجہ بدل چکا ہے مگر اس بہانے کو جلد ہی پکڑ لیا گیا۔

ایک رات چار آسٹریلین فوجیوں نے ان میں سے ایک جاسوس کی خوب مرمت کی اور اسے ایک کوٹھری میں بند کردیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاردار چار دیواری کے تاروں کو اور زیادہ مضبوط کردیا گیا اور ایک دن کمانڈر نے انتہائی غصے اور جھنجلاہٹ میں تمام زخمیوں کی پٹیاں نوچ کر پھینک دیں۔ اسے شک تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ سرے سے زخمی ہی نہیں ہیں بلکہ زخمی ہونے کا بہانہ کررہے ہیں، یہ حرکت ہماری قوتِ برداشت کے لیے آخری تازیانہ ثابت ہوئی اور ہم نے اجتماعی حکم عدولی کا فیصلہ کرلیا۔

اسپتال کے چلنے پھرنے والے مریضوں اور کیمپ کے صحت مند قیدیوں نے ''رول کال'' (اجتماعی حاضری) میں گڑبڑ کرنا شروع کردی۔ نام پکارے جانے پر بھی وہ اپنا عہدہ کچھ سے کچھ بتاتے اور کبھی کسی دوسرے کی باری پر خود بول پڑتے۔ یہی نہیں بلکہ آگے چل کر وہ اس وقت تک قطار میں کھڑے نہ ہوتے تھے، جب تک سنگینوں کی آہنی نوک چبھو کر انہیں مجبور نہ کردیا جاتا۔ کیمپ یا اسپتال کی چھت کے باہر پہرا دیتے ہوئے سنتریوں پر سڑے ہوئے ٹماٹر پھینکے جاتے یا ان کے سروں کا نشانہ لے کر کنکر نما پتھر مارے جاتے۔ جواب میں سنتریوں نے یہ کیا کہ انہیں چھت پر جو بھی نظر آجاتا، بلا تعویق و تامل گولی چلادیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سنتریوں کی سائیکلوں کے ٹائروں سے مستقل ہوا نکال دی جاتی تھی اور دیواروں پر کھریا مٹی سے توہین آمیز نعرے اور فقرے بڑے بڑے نمایاں حروف میں لکھ دیے جاتے تھے۔

ایک طرف ہماری یہ کارروائیاں تھیں تو دوسری طرف کمانڈر کے انتقامی احکامات کا سلسلہ بھی جاری و ساری تھا۔ کسی نے بتایا کہ...... ہم لوگ کینٹین میں فروخت ہونے والی مٹھائیوں اور ٹافیوں کے ذریعے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کررہے ہیں چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ تمام ٹافیوں اور چاکلیٹ کے پیکٹوں سے ان کے پیکنگ پیپر پھاڑ پھینک دیے جائیں اور اس پر فوراً عمل درآمد شروع کردیا گیا۔ پھر ایک اور حکم جاری ہوا کہ ہر قیدی، خواہ کسی بھی حالت میں ہو، کمانڈر کو دیکھتے ہی سیلوٹ کرے گا۔

خلاف ورزی کرنے والے کو تین دن کی قید تنہائی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں اگست کے شروع میں اس قابل ہوگیا تھا کہ بیساکھیوں کے سہارے تھوڑا بہت چل سکوں۔ ایک صبح میں کمانڈر کو سیلوٹ نہ کرسکا۔ اس نے ایک سنتری کو حکم دیا کہ وہ پوری قوت سے میری پشت پر لات مارے اس نے بلا تامل تعمیل کرڈالا اور میں ایک ہی لات سے راہداری میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے اتنا تاؤ آیا کہ میں نے کوئی ایسی حرکت کرنے کا ارادہ کرلیا جس سے کمانڈر کو اس ظالمانہ حکم کا پورا پورا بدلہ دیا جاسکے۔ میں نے باہر میدان میں ایک طرف لکڑی کی کچھ پیٹیاں رکھی دیکھی تھیں۔ جن میں صرف بھوسا بھرا ہوا تھا۔ اس شام میں نے انہیں ماچس دکھادی۔ یہ شاید ایک احمقانہ حرکت تھی کیونکہ اس سے کمانڈر کو مزید غصہ دلانے کے

علاوہ کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا البتہ نقصان یہ پہنچا کہ اس نے سزا کے طور پر سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کر دی اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ جو بھی اس کے خلاف کرے گا اسے نہ صرف تین دن کی قید تنہائی میں رہنا ہوگا بلکہ اسے راشن بھی آدھا دیا جائے گا مگر اس حکم سے سگریٹ نوشی پھر بھی بند نہ ہوئی' ہر شخص سگریٹ پیتا تھا اور پکڑا جاتا تھا پھر داخلِ زندان کر دیا جاتا تھا۔ کوٹھریوں کی تعداد محدود تھی' بہت جلد تمام کوٹھریاں قیدیوں سے بھر گئیں۔ آخر کار کمانڈر کو اپنا یہ حکم "دانت کوستے" ہوئے واپس لینا پڑا۔

پھر جب ہماری کنسرٹ پارٹی نے اپنے موسیقی کے پروگراموں میں دو تین قابلِ اعتراض گانے شامل کیے تو کمانڈر نے اس پارٹی ہی کو توڑ دیا اور تفریحی پروگرام بالکل ہی ختم کر ڈالے۔ اس دوران میں ایک آسٹریلوی اور ایک نیوزی لینڈ کے باشندے نے انتہائی غیر معمولی نوعیت کے فرار کا مظاہرہ کیا۔ ان دونوں نے ایک ایک بانس اٹھایا۔ دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور بانس کی مدد سے خاردار چاردیواری کو بہ آسانی پھلانگنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگرچہ ان پر بے شمار گولیاں برسائی گئیں مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب رہے۔

اس روز خاکروبوں کے ساتھ رابن مجھ سے ملنے اسپتال آیا۔ وہ بہت زیادہ خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کیمپ سے باہر کچھ یونانی دوستوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ کسی صراحت میں نہیں گیا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ فرار ہونے سے ایک دن پہلے وہ مجھ تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرے گا جس میں یہ تمام تفاصیل شامل ہوں گی۔

اس رات زبردست طوفان آیا۔ ہوا اتنی تیز اور پرشور تھی کہ خود اپنی آواز سنائی دینا مشکل تھی۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ یوں اس طوفان باد و باراں میں قیدیوں کے کیمپ سے تیرہ آفیسر اور تیرہ ہی جوان فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں میرے تمام ہی دوست شامل تھے۔ رابن' میکسول' سنکلیئر اور بائیپ میجر رائے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس واقعے پر خوش ہوں یا افسردہ' میں خود کو اب بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان پر غصہ بھی آرہا تھا' انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے مجھے ضروری معلومات فراہم کر دیں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔ اب میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

کمانڈر کا پیچ و تاب کھانا ایک فطری بات تھی۔ اس نے ہم سب کو جمع کیا اور کہا کہ اب اگر کوئی قیدی بھاگا تو اسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہی نہیں بلکہ سزا پانے کا بھی پورا امکان تھا اس لیے خواہ کچھ ہو جائے' اب وہ کسی کو فرار ہونے کا ذرا بھی موقع نہیں دے گا۔ اس نے قیدیوں کے کیمپ کے گرد آٹھ مشین گنیں نصب کر دیں' خاردار چاردیواری کو مزید اونچا اور مضبوط کر دیا گیا۔ اس طرح پہرے داروں کی تعداد بھی دگنی کر دی گئی۔ اسپتال میں بھی اس اعتبار سے حفاظتی اقدامات کیے گئے۔ اس سے پہلے مقامی آبادی کے لڑکوں کا دستور تھا کہ وہ سائیکلوں پر خاردار چاردیواری کا چکر لگاتے رہتے تھے اور ہم لوگوں کے لیے سگریٹوں کے پیکٹ اور دوسری اشیا پھینکتے رہتے تھے۔ اس سلسلے کو بھی جبراً روک دیا گیا۔ انہیں سبق دینے کے لیے گولیوں کی باڑ ماری گئی۔ دس لڑکے وہیں ڈھیر ہوگئے۔ باقی اپنی جان بچا کر بھاگے اور پھر انہوں نے پلٹ کر آنے کی ہمت نہ کی۔

اس کے تقریباً پندرہ روز بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میں اتنا چل پھر سکتا ہوں کہ اپنے فرار ہونے کے امکانات کا سنجیدگی سے جائزہ لے سکوں۔

☆☆☆

بہ ظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونا اسپتال سے بھاگنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ یہ کیمپ ایک کھلے میدان میں تقریباً ایک ہزار مربع گز کے قطعۂ زمین پر واقع تھا۔ خاردار چاردیواری کی اونچائی بھی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ چاردیواری کے ہر گوشے میں ایک سنتری موجود رہتا تھا اور اندھیرا ہونے پر ایک مسلح ٹکڑی رات بھر باہر کی جانب گشت کرتی رہتی تھی۔ پھر کیمپ سے یونانی آبادی بھی بہت قریب تھی۔ صرف ایک سڑک درمیان میں پڑتی تھی اور سب سے بڑی اور اہم بات اس اجمال کی یہ تھی کہ ابھی تک اسپتال کے مقابلے میں کیمپ سے زیادہ لوگوں نے فرار کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہے تھے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بھی قیدیوں کے کیمپ میں منتقل کیے جانے کے سلسلے میں اقدامات کرنے چاہئیں۔ میری ران کا گہرا زخم مندمل ہونے کے لیے ابھی کافی وقت درکار تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے برطانوی ڈاکٹر کو مجبور کر دیا کہ وہ مجھے کیمپ بھیجنے کی ہدایت کرے۔ کچھ ایسی افواہیں سننے میں آرہی تھیں کہ شاید ہم سب کو جرمنی یا اٹلی بھیج دیا جائے اس لیے یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ میں جو کچھ کروں جلد کروں لیکن میرے زخم کا حال یہ تھا کہ جب آخر کار مجھے کیمپ منتقل کرنے

کے احکامات آ گئے اور میں پیدل مارچ کرتا ہوا اسپتال سے کیمپ تک پہنچا تو تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ دو دن تک تو میں چلنے پھرنے کے بالکل ہی قابل نہ ہو سکا تھا۔

کیمپ میں داخل ہو کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ قیدیوں کے آخری بڑے فرار کے بعد سے جرمنوں نے حفاظتی انتظامات بہت سخت کر دیے تھے۔ اتنے سخت کہ مجھے بھاگنے کا کوئی راستہ کوئی طریقہ نہیں سجھائی دیا۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ کیمپ اور یونانی آبادی کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ سڑک کے دوسری جانب یونانیوں کے مکانات قطار در قطار بنے ہوئے تھے اور ان مکانات میں سے ایک کی چھت پر ایک حسین یونانی لڑکی اپنی دلکش سریلی آواز میں روزانہ خوبصورت گیت گایا کرتی تھی۔ روزانہ شام کو ایک مقررہ وقت پر اس کی سریلی آواز ہمارے کانوں میں رس گھولا کرتی۔ اتنا ہی نہیں ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس مکان کی کھڑکی سے ایک بھاگے ہوئے فوجی کو جھانکتے دیکھا تھا۔ اگر یہ سب کچھ جرمن خفیہ پولیس گستاپو کا کوئی جال نہیں تھا تو وہ مکان اور اس کے رہنے والے یقیناً ہمارے دوست معلوم ہوتے تھے۔ مجھے کیمپ میں آئے ہوئے دو دن ہی گزرے تھے کہ ایک اسکاٹ ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے کان میں سرگوشی کی کہ شام کو چہل قدمی کے وقفے میں اس سے جھونپڑی کے باہر ملوں۔ پھر شام کو میں اس سے ملا تو اس نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے میکسول کا پیغام دیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے باورچی خانے میں متعین ایک نیوزی لینڈ کے کارپول سے رابطہ کرنا چاہیے۔

میں اگلی صبح اس کارپول کے پاس گیا۔ پہلے تو اس نے سختی سے انکار کیا کہ وہ میکسول یا کسی بھی اور دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن جب میں اس سے کافی دیر تک اصرار کرتا رہا تو وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور دبے لہجے میں بولا۔

''اگر تم واقعی فرار ہونا چاہتے ہو تو میں تمہارا یہ پیغام باہر کچھ دوستوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے راشن کے ٹرک کے ساتھ ہر روز باہر جانے کا موقع ملتا رہتا ہے اور جب ٹرک میں کھانے پینے کی اشیا رکھی جاتی ہے تو اس دوران میں کوئی بھی پیغام مزدوروں کے ذریعے متعلقہ افراد کو دے سکتا ہوں۔ اب تم اگلے منگل کو مجھ سے آ کر ملو میں ان کا جواب لا دوں گا۔

اگلے منگل میں اس کے پاس پہنچا اس نے کہا اگر میں کسی طرح کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں تو یہاں سے پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک تباہ شدہ مکان میں کچھ دوست جمعرات کی رات کو میرا انتظار کریں گے۔ اس نے مزید بتایا کہ میں جمعرات کی صبح کو اسے یقینی طور پر بتا دوں گا کہ میں اس مکان تک پہنچ سکتا ہوں کہ نہیں۔ یہ ایک بہت دشوار اور کارِ محال تھا اس لیے کہ ہنوز میری سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ نہیں آیا تھا کہ جس سے میں سنتریوں کی عقابی نظروں کو چکما دے کر کیمپ سے باہر جا سکوں میری ٹانگ ہلنے جلنے کے قابل نہ تھی۔ اس حالت میں کسی خاص مقررہ وقت میں نکل بھاگنا تو ماہر سے ماہر مفروروں کے لیے بھی تقریباً ناممکن ہی تھا۔ بہر طور جمعرات کی صبح کو مجھے بادلِ نخواستہ اس سے کہنا پڑا کہ میں آج رات اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

چند روز کیمپ میں گزارنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں حفاظتی انتظامات اتنے سخت اور کڑے تھے کہ کم از کم مجھ جیسا ''نیم لنگ'' آدمی تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ میں اسپتال واپس جا کر قسمت آزمائی کروں جہاں کے سنتری اتنے ہوشیار اور چوکس نہیں رہتے تھے۔ اتفاق سے مجھے بخار ہو گیا اور بخار کے عالم میں میں نے اپنے جرمن ڈاکٹر کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کر ڈالی کہ میرا زخم پھر سے بگڑنے لگا ہے جب بھی وہ میری زخمی ٹانگ کو ہاتھ لگاتا میں اس بری طرح چیختا اور کراہتا کہ وہ اچھل پڑتا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ زخم واقعی خراب ہو رہا تھا مگر زخم سے زیادہ میری بھرپور اداکاری نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے اس ڈاکٹر کے خلاف رپورٹ کر دی جس کی ہدایت پر مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تھا اور مجھے بلا تاخیر دوبارہ داخل کرنے کا حکم دے دیا۔ اگر میں چاہتا تو چل کر اسپتال جا سکتا تھا مگر اس نے مجھے تقریباً زبردستی ایک اسٹریچر پر لٹا دیا جسے جرمن بوبی (سپاہی) اٹھا کر اسپتال لے گئے۔

جب میں اپنے پرانے وارڈ کے بستر پر پہنچ گیا تو میں نے پورا ایک ہفتہ فرار کے لیے ضروری اشیا فراہم کرنے میں صرف کیا۔ اپنے محفوظ شدہ جرمن مارک کو میں پہلے ہی اسپتال کی کینٹین کے تعاون سے مقامی کرنسی میں تبدیل کر چکا تھا۔ میں نے مختلف اوقات میں بچائی ہوئی یا باورچی خانے سے چرائی ہوئی کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی جمع کر رکھی تھیں ایک زخمی پادری کے پاس یونان کا چھوٹا سا نقشہ تھا۔ اس کی کاربن کاپیاں ہم میں سے بہت سوں نے اتار کر محفوظ کر لی تھیں۔ فرار سے قطع نظر میری سب سے بڑی پرابلم شہری کپڑوں کا حصول تھا۔ میں نے دو پاجاموں کو ایک مرہم کی مدد سے گہرا نیلا رنگ کیا تھا۔ یہ مرہم رگوں اور پٹھوں کے درد کے لیے تھا

اور بہ آسانی اسپتال سے مل جایا کرتا تھا۔

کسی نے میرے ہاتھ ایک سفید قمیص فروخت کردی تھی اور میں نے اپنے اوورکوٹ کے بدلے آسٹریلیا کے بنے ہوئے براؤن بوٹ بھی حاصل کرلیے تھے لیکن یہ جوتے اتنے نئے لگ رہے تھے کہ انہیں پرانا بنانے کے لیے مجھے ان پر مٹی رگڑنا پڑی۔ پھر اتفاق سے ایک روز ایک یونانی پلمبر اسپتال میں پانی کا ایک پائپ درست کرنے آیا تو میں نے اس سے اس کا ہیٹ خریدنے کی کوشش کی مگر وہ بہت خوف زدہ تھا' بار بار یہ کہہ کر انکار کردیتا تھا کہ جرمن بولی (سپاہی) اسے شوٹ کردیں گے۔ اس نے کام کرنے کے دوران ہیٹ اتار کر رکھا تو مجبوراً میں نے اسے چرالیا۔

اپنا یہ تمام زادِراہ میں نے ایک بڑے تکیے کے غلاف میں چھپا کر اپنے پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ فرار کے بارے میں' میں نے سوچا تھا کہ راشن کے ٹرک کو ذریعہ بنایا جائے جو روزانہ مین گیٹ سے اسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی پھر بھی میں نے روزانہ اس تکیے کے غلاف کے ساتھ (جو تمام چیزیں اندر بھرنے کے بعد ایک تکیے کی ہی صورت اختیار کرگیا تھا) سیڑھیوں پر بیٹھنا شروع کردیا۔ ہاتھ میں ایک کھلی کتاب پکڑلیتا تاکہ سنتری یہ سوچیں کہ میں وہاں بیٹھا مطالعہ کررہا ہوں جبکہ میں کتاب کی اوٹ سے اس امر کا جائزہ لیتا رہتا تھا کہ یہاں سے بھاگ کر راشن کے ٹرک میں چھپنے کے امکانات کس حد تک روشن ہیں؟ آغاز میں تو سنتری مجھے وہاں بیٹھنے نہیں دیتے تھے اور ڈانٹ ڈپٹ کر اٹھا دیتے تھے مگر میں بار بار ٹھیک اسی جگہ پر پہنچ جاتا بالآخر وہ اس صورت حال کے عادی ہوکر رہ گئے اور میرے چہرے کے سپاٹ پن نے انہیں غالباً یہ باور کروادیا کہ میں کسی قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ٹرک میں گھس کر کسی طرح اسے اسٹارٹ کرلوں تو یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ اسے لے کر گیٹ سے نکل جانے میں کامیاب ہوسکتا ہوں لیکن اگر بدقسمتی سے ٹرک اسٹارٹ نہ ہوسکا تو پھر اس ناکامی کے جو بھیانک نتائج برآمد ہوں گے وہ ہر اعتبار سے میرے لیے سنگین ترین حد تک جان لیوا ثابت ہوسکتے تھے۔

اس دوران میں روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد اسپتال کی چھت پر جاکر ڈیڑھ دو گھنٹے تک دھوپ میں لیٹا رہتا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ دھوپ کی گرمی سے میرے چہرے اور جسم کی رنگت تانبے جیسی ہوجائے تاکہ دیکھنے والے مجھے یونان کا باشندہ خیال کریں۔ اگست کے وسط میں ایک روز میں نے اچانک دیکھا کہ گیٹ پر کھڑا سنتری ایک یونانی عورت کو گھوررہا تھا جو گیٹ کے باہر ایک گوشے میں رکھے ہوئے کوڑے کے ڈرم میں غالباً سوکھی روٹی کے ٹکڑے تلاش کررہی تھی۔ وہ کچھ سوتا جاگتا معلوم ہورہا تھا۔ میں اس سنتری کو بہت دنوں سے جانتا تھا۔ وہ ایک آنکھ سے محروم اور کچھ احمق آدمی تھا۔ یہ ایک سنہرا موقع تھا' اسے ہاتھ سے ضائع کردینے کی صورت میں خود کو میں کبھی معاف نہیں کرسکتا تھا۔ میں تیزی سے دوڑ کر اپنے وارڈ میں آگیا۔ پلنگ کے نیچے سے تکیے کا غلاف نکالا اور گیٹ کی طرف چلا۔ میرا خیال ہے کہ عقبی جانب کھڑے ہوئے دوسرے سنتری نے مجھے کوئی جمعدار سمجھا ہوگا جو ڈرم میں کوڑا کرکٹ ڈالنے جارہا ہو۔

میں گھوم کر گیٹ کی طرف بڑھا تو اس کا سنتری بہ دستور مخالف سمت میں اس عورت کی طرف دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں سیدھا خاردار چاردیواری کی طرف بڑھتا چلا گیا اور جب قریب پہنچا تو زمین پر لیٹ کر تار کے نیچے سے رینگتے ہوئے باہر چلا گیا۔ میں اس وقت عجیب ذہنی کیفیات سے دوچار تھا۔ صرف ایک خیال میری تمام حسیات پر مسلط تھا کہ کہیں سنتری گھوم کر نہ دیکھ لے' اس لیے مجھے کچھ احساس نہیں تھا کہ خاردار تار کے نیچے سے نکلتے ہوئے میں اس سے الجھا تھا یا نہیں...... البتہ جب باہر نکل کر چند قدم چلا تو میں نے دیکھا کہ میری ران کی پٹی کھل کر نیچے گرگئی ہے مگر وہ وقت اس کی فکر کرنے کا نہیں تھا' میں لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک نظر اب بھی سنتری پر لگی ہوئی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے اپنی گردن گھمائی' میں لپک کر فوراً ایک گڑھے میں چھپ گیا۔

میں دیر تک گڑھے میں لیٹا ہانپتا رہا۔ میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا اور مجھے یقین نہ آرہا تھا کہ میں اس آسانی کے ساتھ اپنی قید سے رہائی پانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد سنتری پھر پلٹ کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا' میں پہلی کوشش میں خاردار تاروں سے تقریباً ڈیڑھ دو سو گز دور آچکا تھا۔ اب سنتری کی نگاہ ہٹی تو میں پھر اٹھا' گڑھے سے نکلا اور جس حد تک تیز رفتاری سے ممکن تھا' چلتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف واقع یونانی گھروں کی جانب بڑھنے لگا۔ میری نزدیک ترین منزل ایک جھونپڑی تھی۔ اس کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو اسپتال کی چھت سے کسی نے رومال لہرا کر الوداع کہا۔ جواب میں' میں نے بھی اپنا ہاتھ ہلادیا۔ اب میں اتنی دور آچکا تھا کہ اسپتال کی حدود سے دیکھنے والا کوئی شخص مجھے نہیں پہچان سکتا تھا' چنانچہ میں نے اپنی رفتار کچھ ہلکی کردی اور آرام سے چلنے

لگا۔
پہلی جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر میں اس کی آڑ میں آتے ہوئے ایک تنگ اور کچی گلی میں گھوم گیا۔ یہاں کچھ عورتیں ایک پھلوں کے ٹھیلے والے سے مول تول کر رہی تھیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اپنے حلیے پر شرمندگی محسوس کرتا لیکن اس وقت ذہن اپنی آزادی کی مسرت کے علاوہ ہر خیال سے عاری تھا۔ ایک بوڑھی کسان عورت میرے پاس آئی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ بوڑھی عورت نے اشاروں کی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کہیں جرمنوں نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ عورت نے ایک چھوٹی لڑکی کو میرے ساتھ کر دیا۔ لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گلی میں لے آئی۔

میں اس کے ساتھ چلتا رہا کچھ دور جا کر ایک لڑکا بھی ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے گاؤں کے تقریباً وسط میں ایک چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں لائے جہاں ایک خوب صورت کسان عورت نے، جس کا نام ماریا تھا، ہمارا استقبال کیا۔ اس نے اس طرح میری آزادی پر حیرت کا اظہار کیا اور پھر مجھے بیرونی کمرے میں بٹھا کر چلی گئی جہاں میرے علاوہ تقریباً ایک درجن بچے بھی موجود تھے۔ کمرے کا بڑا حصہ ایک ڈبل بیڈ سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر ہر عمر کے بچے بڑی خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ مجھے تو کمرے میں ہر طرف بچے ہی بچے نظر آ رہے تھے۔ میں ایک جانب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قلب و ذہن ابھی تک آزادی پر مسرت سے جھوم رہے تھے۔

عورت نے نہ صرف کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے بلکہ جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر گئی تھی لیکن میں بہرحال مشکوک تھا اور ہر آواز پر چونک پڑتا تھا۔ ایک بار کسی ٹرک کے انجن کی گھرگھراتی آواز ابھری اور معاً میرے کھٹکے ہوئے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کہیں ان لوگوں نے مجھے جرمنوں کے ہاتھوں فروخت تو نہیں کر دیا؟ مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ کچرا اٹھانے والا ٹرک تھا۔

تقریباً گھنٹے بھر بعد ملاقاتیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جو میرے لیے طرح طرح کے تحائف لے کر آنے تھے۔ سب سے پہلے آنے والا ماریا کا شوہر تھا۔ وہ نارنگیاں فروخت کرتا تھا اور اسے انگریزی زبان کا صرف ایک فقرہ یاد تھا "سر! نارنگیاں بہت اچھی ہیں۔" مگر ظاہر ہے کہ اس سے ہمیں گفتگو میں مدد ملتا تھی۔ اس لیے میں نے ایک کاغذ پر نقشے اور شکلیں بنا کر انہیں سمجھایا کہ میں کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوا ہوں۔ پھر کچھ لوگ آئے جنہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑی پلیٹ میں خستہ نمکین سیو میرے سامنے ڈھیر کر دیے اور میری جیبیں ڈوبائن سگریٹ کے پیکٹوں سے بھر دیں۔ کچھ لوگ اپنا قومی گیت گاتے ہوئے میرے اردگرد رقص کرنے لگے پھر ایک بہت خوب صورت لڑکی آئی جو بدقسمتی سے ایک آنکھ کھو چکی تھی۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ اس کا شوہر البانیہ کی جنگ میں مارا گیا تھا اور وہ چاہتی تھی، میں اس سے شادی کر لوں۔ ماریا نے دیکھ لیا کہ میں بری طرح الجھ گیا ہوں کیونکہ یہ سب کچھ غیر متوقع اور عجلت میں پیش آ رہا تھا اور اس نے اپنے شوہر کو سمجھا دیا کہ اس نوعیت کے مسئلے پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔

دوسری طرف میں سوچ رہا تھا کہ ابھی میں جرمن کیمپ سے اس قدر نزدیک ہوں کہ خود کو قطعی غیر محفوظ سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں شادی کر کے یہیں اپنا گھر بسانے کا کوئی خیال تک نہیں تھا چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اندھیرا ہونے پر میں کیمپ کے سامنے واقع اس گھر تک پہنچنے کی کوشش کروں گا جس کی چھت پر وہ حسین لڑکی گانا گاتی رہتی تھی۔ میرے اس فیصلے سے ماریا کے شوہر کو بہت افسوس ہوا اور ماریا تو باقاعدہ رو دی مگر میں اپنے دوستوں کے پاس پہنچنے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے پر میں ماریا کے شوہر کے ساتھ اس مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ہم متعدد سڑکوں اور گلیوں سے گزرے۔ ایک بڑی سڑک جس پر بہت سے کیفے اور ریسٹورنٹ واقع تھے، جرمن سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم ان کے درمیان سے گزرتے رہے مگر انہوں نے ہماری طرف بالکل توجہ نہ دی۔ آخرکار ہم ایک پتھر سے بنی ہوئی دیوار تک پہنچ گئے۔ دیوار کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا باغ نظر آ رہا تھا ہم دیوار پھلانگ کر باغ میں پہنچے۔ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں بڑی سی قینچی لیے درختوں کی شاخیں اور پتے تراشنے میں مصروف تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کہا کہ میں ایک برطانوی آفیسر ہوں۔ مارے حیرت کے اس کے ہاتھ سے قینچی چھوٹ کر گر پڑی، اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی پھر ایک قریبی مکان کی طرف اشارہ کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس مکان میں فاشسٹ نظریات کے حامل لوگ رہتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں جرمنوں کے ساتھ تھیں۔ وہ مجھے باغ میں بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد ایک پری جمال لڑکی اندر داخل ہوئی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی لڑکی تھی

جو مکان کی چھت پر گایا کرتی تھی۔ شروع میں وہ لوگ کچھ مشکوک سے معلوم ہوئے لیکن جب میں نے ان سے اپنے دوست میکسول کا ذکر کیا تو وہ ایک دم خوش ہو گئے۔

لڑکی نے میرے سر سے پرانا ہیٹ اتار کر ایک نئی ٹوپی دی پھر اس نے ماریا کے شوہر کو سمجھایا کہ...... مجھے لازمی طور پر اپنے دوستوں کے پاس جانا ہے۔ اس کا چہرہ کچھ اداس ہو گیا۔ مجھے اسے چھوڑتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ یونان کی سرزمین پر میرا پہلا مددگار تھا اور انتہائی مخلص اور ہمدرد بھی معلوم ہوتا تھا۔ غالباً میرا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دنوں یونان کی فضا ایسی تھی کہ ہمیں ان میں سے ہر گھر سے اپنے ہمدرد اور بہی خواہ مل سکتے تھے۔ بلاشبہ یونانی دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ مہمان نواز ہیں' ان کے بارے میں میرے جذبات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ جنگ نے انہیں جس پریشان کن صورت حال سے دوچار کر رکھا تھا' اس کو دور کرنے کے لیے میں ان کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

ماریا کا شوہر اداس واپس چلا گیا۔ باقی لوگ ایک گوشے میں جا کر اپنی زبان میں کچھ مشورے کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد میں اس لڑکی اور اس کی ماں کے ساتھ گلی میں کھڑا تھا اور اس کا بھائی آگے ہی کہیں جا چکا تھا۔ ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ گلیوں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم اٹلی کی فوجی بیرکوں کے سامنے جا نکلے۔ باہر ایک سپاہی بگل بجا رہا تھا۔ ایک دوسرے اٹالین سپاہی نے ہمیں غور سے دیکھا اور مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے مگر جلد ہی پتا چل گیا کہ وہ مجھ میں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہا تھا بلکہ اس کی توجہ لڑکی پر مرکوز تھی۔

بہر طور...... اس خطرناک مقام سے نکل کر ہم ایک بازار میں پہنچے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور چاروں طرف خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اس جگہ لڑکی کا بھائی کسی اور یونانی کے ساتھ ہم سے آملا' اس یونانی نے مجھے بتایا کہ اس کا نام سارٹیرس ہے۔ اس نے مجھ سے بہت سے سوالات کیے۔ پوچھا کہ میں انگلینڈ میں کہاں رہتا تھا؟ میں نے بلاتامل برمنگھم بتا دیا جو سراسر غلط تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنے شہر کا نام لیا تو ضروری نہیں کہ سارٹیرس اس سے واقف ہو جبکہ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ میں کسی ایسی جگہ کا نام لوں جسے وہ یقینی جانتا ہو۔ اس طرح وہ مجھ پر جلد اعتبار کر لے گا پھر اس نے پوچھا کہ میں کہاں گرفتار کیا گیا تھا اور فوج کے کسی یونٹ سے تعلق رکھتا تھا' اس کا میں نے بالکل درست جواب دیا۔ آخر کئی دوسرے سوالات کے بعد اسے اطمینان ہو گیا کہ میں واقعی کوئی برطانوی آفیسر ہوں اور جرمن خفیہ پولیس ''گسٹاپو'' کا کوئی جاسوس نہیں ہوں۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

سارٹیرس مجھے ایک مکان میں لے گیا۔ ہم سیڑھیاں طے کر کے ایک کمرے میں آئے۔ اندھیرے سے ایک دم روشنی میں آنے کی وجہ سے میں ابھی کھڑا اپنی آنکھیں ہی جھپکا رہا تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں اس وقت تک صرف اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ ایک میز کے گرد تین یونانی بیٹھے تھے' جن میں سے کوئی بھی میرا شناسا نہیں تھا لیکن دوسرے لمحے ان میں سے ایک مجھے اپنے گلے سے لگائے بھینچ رہا تھا۔ یہ میکسول تھا' اس نے اپنا حلیہ قدرے بدل رکھا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ بال رنگے ہوئے تھے۔ کانوں کے دونوں طرف قلمیں خوب بڑھائی تھیں اور ہونٹوں کے اوپر باریک سی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ اتنا مکمل بھیس تھا کہ بہت غور سے دیکھنے پر ہی میں اسے پہچان سکا۔

اپنے دوست سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اسے اور دوسرے لوگوں کو کیمپ سے فرار ہوئے ایک مہینا ہو چکا تھا اور اس دوران اسے بڑے بڑے تجربات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ ہم دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے اور ہم سے کچھ دور ہمارے یونانی مہربان بھی بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بعد میں ہمارا تعارف بھی کرایا گیا' مجھے بتایا گیا کہ یہ جو موٹا آدمی ہے۔ یہ ایک دنداں ساز ہے اور اس کا نام مینو ہے۔ یہ گھر بھی اس کا ہے' سارٹیرس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک بہترین ملاح ہے اور اس نے اپنے کچھ دوستوں کو ساتھ ملا کر ایک گروہ ترتیب دیا ہے جو بھاگے ہوئے جنگی قیدیوں' بالخصوص برطانوی قیدیوں کی مدد کرتا ہے' مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس گروہ میں دو افراد بہت نمایاں تھے۔ ایک کا نام والسیا کی تھا جو یونانی بحریہ میں کپتان تھا اور دوسرے کا نام پاپاسٹیسرس تھا۔ مشہور سگریٹ ساز کمپنی کے مالک مینو کی بیوی ایک خوبصورت عورت تھی اور وہ میرے خیال میں میکسول سے بری طرح متاثر تھی مگر یہ بات ہمارے یونان سے فرار ہونے کے منصوبے کے حق میں نہ تھی۔

وہیں پر مجھے یہ بھی پتا چلا کہ رابن محلہ پیروس کے ایک جوہری کے گھر میں پناہ گزیں ہے اور سنکلیئر ساحل سمندر کے قریب ایک مکان میں پوشیدہ ہے' معلوم ہوا کہ انہیں عنقریب ایک موٹر بوٹ حاصل ہونے کی پوری امید تھی جس کے ذریعے ہم ترکی یا مصر تک پہنچ سکتے تھے لیکن ابھی مجھے آئے

ایک دن ہی ہوا تھا کہ وہ ذریعہ ہی ہاتھ سے نکل گیا' جس کی وساطت سے بوٹ ملنے کی امید تھی۔ میں تقریباً ایک ماہ یونان میں رہا اور اس دوران ہمیں کم و بیش پندرہ مرتبہ کسی موٹر بوٹ یا کسی آب دوز کے ذریعے نکل جانے کی امید پیدا ہوئی اور ٹوٹ گئی۔ ہماری ناامیدیوں کا سلسلہ اس قدر طوالت اختیار کرنے لگا کہ ہمیں شک ہوا کہ ہمارے یونانی دوست ہمیں مصر یا ترکی بھیجنے کے معاملے میں مخلص نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کی خواہش ہے کہ ہم ان کے ساتھ ہی رہیں اور اس عام بغاوت میں ان کا ساتھ دیں' جس کا وہ منصوبہ بنا رہے تھے لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہ شکوک وشبہات ان کے خلوص کے ساتھ قطعی ناانصافی پر مبنی تھے۔ وہ اپنی جگہ پوری طرح کوشاں تھے مگر حالات ہی ایسے تھے کہ ان کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہورہی تھیں۔ قصور کچھ ہمارا بھی نہیں تھا' جب کوئی اتنی طویل مدت تک دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہو تو اس کا ذہن اور اعصاب متاثر ہو ہی جاتے ہیں۔

بہرحال' بات اس رات کی ہو رہی تھی۔ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ میرے بالوں کا رنگ کالا کر دیا گیا۔ یہ کام ٹینو کی بیوی نے انجام دیا۔ اس نے کوئی ایسی چیز استعمال کی تھی جو بالوں پر لگتے ہی انہیں کالا کر دیتی تھی۔ بالوں کا رنگ نہ صرف میرے یونان کے دوران قیام باقی رہا بلکہ مصر پہنچنے کے دو ماہ بعد تک بھی قائم رہا تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ بال بڑھنے کی وجہ سے ان کا قدرتی رنگ ظاہر ہوا تو میں اپنے کھچڑی بالوں کے ساتھ کافی دنوں تک دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا تھا۔ اس رنگ سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے میں مجھے چھ ماہ لگے تھے۔ اس رات میں اور میکسول بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن رات کو دیر سے سونے کے باوجود ٹینو نے ہمیں دوسرے دن علی الصباح اٹھا دیا۔ اس نے بتایا کہ جرمن سپاہی پورے ''کوکینا'' میں ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہے ہیں سپاہیوں کا ایک دستہ اس محلے تک پہنچ گیا تھا لیکن ٹینو ان کی آمد سے قطعی ہراساں نہ تھا اس نے ہم سے کہا کہ اگر ہم چاہیں تو بالکنی میں دو کرسیاں ڈال کر بیٹھ جائیں اور جرمن سپاہیوں کی پریشانی کا تماشا دیکھیں۔

لیکن میں یہ خبر سن کر سخت پریشان ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گھر گھر' تلاشی کا یہ نیا دورہ محض میرے فرار ہونے سے شروع ہوا ہے مگر میکسول نے مجھے تسلی دی۔ اٹالین سپاہی لوہے کا ہیٹ سر پر اوڑھے چار چار کی قطار بنائے سڑکوں پر گشت لگا رہے تھے جبکہ جرمن سپاہی ٹرک سے اتر اتر کر گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے تمام کیفوں اور چائے خانوں سے سارے گاہکوں کو باہر نکال کر بھگا دیا تھا اور ہر اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا تھا جس کے پاس اس کا شناختی کارڈ موجود نہ تھا۔ جب سپاہی تلاشی لیتے ہوئے ٹینو کے گھر کے قریب پہنچے تو اس نے ہمیں اندر بلا کر بیڈ روم کی کھڑکی کے قریب سے گزرتا ہوا ڈرینج پائپ دکھایا تاکہ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہم اس کے ذریعے اتر کر بھاگ نکلیں اور پھر کمرے کی ایک بڑی الماری کے پیچھے چھپا دیا لیکن میرے اندیشے بیکار ہی ثابت ہوئے۔ ٹینو نے نیچے اتر کر جرمن سپاہیوں کو ایسے ایسے خوب صورت جھوٹ سنائے کہ انہوں نے گھر میں قدم رکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور دروازے سے ہی لوٹ گئے۔

کافی دیر کے بعد سارٹیرس ہم سے ملنے آیا۔ وہ بہت اداس اور چڑچڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک جرمن آفیسر آج صبح چار بجے اس کے بھائی کے گھر پہنچا۔ اس وقت سارٹیرس اپنے گھر میں نہیں تھا' کہیں گیا ہوا تھا۔ جرمن آفیسر نے اس کے بھائی الیاس کو گرفتار کر لیا۔ اس کی بیوی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور بیمار پڑ گئی۔ ان حالات سے سارٹیرس بہت فکرمند بھی تھا اور خود بھی روپوش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ان حالات میں موجودہ جائے پناہ ہمارے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے ہمیں آج ایتھنز چلے جانا چاہیے جہاں اس نے ایک دوسری جگہ ہمارا انتظام کر دیا ہے۔ یہ دونوں بھائی بہت وفادار اور بہادر تھے مگر انہوں نے حماقت یہ کی تھی کہ گرد و پیش کی پروا کیے بغیر بازاروں اور کیفوں میں دوسرے لوگوں سے ہمارے بارے میں باتیں کی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بے احتیاطی کی وجہ سے جرمن افسروں کو ان پر شک ہوا اور وہ ان کے پیچھے پڑ گئے۔

الیاس کو ناقابل بیان اذیتیں پہنچائی گئیں۔ گسٹاپو نے اپنا ہر حربہ اس پر آزمایا تھا مگر یہ جوان مرد ثابت ہوا اور اس نے اپنی زبان کھولنے سے انکار کر دیا اور وہ یہی کہتا رہا کہ اسے برطانوی فوجیوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ آخرکار جرمنوں کو اسے رہا کرنا پڑا اور یہ ایک مثال صرف الیاس ہی کی نہیں تھی' ہمارے علم میں ایسے کئی واقعات آئے تھے جہاں یونانی باشندوں نے ہر قسم کے ظلم وستم کا سامنا کیا مگر کبھی کسی اتحادی فوجی کے بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات فراہم نہ کیں۔ بے چاری ایک عورت کے ناخنوں میں ماچس کی تیلیاں داخل کی گئیں اور اپنے مقصد میں

ناکام رہنے پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ یہ عورت ہم سے ملنے ایتھنز آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حالت دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ یونان کے لوگ اتحادیوں کی خاطر جو قربانیاں دے رہے تھے ان کا چرچا خاطر خواہ طور پر برطانوی اخبارات میں کیوں نہ کیا گیا تھا؟ کیوں ہمارے ہم وطنوں کو نہیں بتایا گیا کہ دنیا میں ان کے کیسے کیسے بہادر دوست موجود ہیں؟

جب ہمارا روانگی کا فیصلہ ہوگیا تو شام کے وقت ایک لڑکی جس کا نام ڈولی تھا' ہماری رہبری کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ وہ ہمیں بہ حفاظت ایتھنز میں ہماری نئی پناہ گاہ تک پہنچا دے۔ دیکھنے میں وہ ایک بدصورت لڑکی تھی لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اس کی بہادری کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہوچکی ہیں۔ اس کے بارے میں ایک بات مشہور تھی' وہ اپنا خالی وقت رنگین کاغذ میں وی "V" بنانے میں صرف کرتی ہے اور پھر کاٹی ہوئی "ویز" پر کوئی لیس دار چیز لگا کر جرمن آفیسروں کی کاروں کی سیٹ پر اس طرح رکھ دیتی ہے کہ جب جرمن آفیسران سیٹوں پر بیٹھتے ہیں تو یہ "وی" ان کی پشت پر چسپاں ہوجاتی تھی۔ ہمارے لیے دو رہنما بھیجے گئے تھے۔ میکسول ایک اور آدمی کے ساتھ روانہ ہوا اور میں ڈولی کے پیچھے قصبے کی سڑکوں پر نکل آیا۔ بھرے بازاروں اور سیکڑوں جرمن' اٹالین سپاہیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ کچھ دیر بعد بس آئی اور ہم اس میں بھی چڑھ گئے۔ ڈولی نے اپنے اور میرے لیے ٹکٹ خریدے۔ اس وقت تک کوئی خاص بات پیش نہیں آئی تھی لیکن جب ہم اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تو میں نے دیکھا کہ دور ایک شخص سفید گبرا ڈین کا کوٹ پہنے اپنی نیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا اور کچھ ایسے انداز سے کہ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ ضرور گسٹاپو کا کوئی جاسوس ہے۔ ڈولی نے یہ منظر دیکھا تو کہنی مار کر سرگوشی میں بولی کہ میں اس کی طرف بلاوجہ نہ دیکھوں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگوں۔

پیروس کے اسٹاپ پر ہم بس سے اتر گئے اور میرا شک تقریباً یقین میں بدلنے لگا جب میں نے دیکھا کہ وہ آدمی بھی ہمارے ساتھ ہی بس سے اترا اور ہمارے تعاقب میں چلنے لگا۔ ہم بائیں جانب ایک گلی میں مڑے تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی مڑ گیا۔ درمیان میں تقریباً پچاس گز کا فاصلہ دے کر وہ بہ دستور ہمارے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں نے ڈولی کو اس طرف متوجہ کیا تو اس نے مجھ سے تو کہا کہ میں اسی طرح سیدھا آگے بڑھتا چلا جاؤں اور خود وہ ایک قریبی دکان میں گھس گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ مجھ سے آن ملی اور بتایا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں اس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکا کہ اس نے اس آدمی کے ساتھ کیا سلوک کیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس آدمی کے سینے میں بڑی صفائی سے چاقو اتارنے کی بھی جرأت رکھتی تھی۔

ہم لوگ مسٹر کیزرسس جوہری کے مکان پر پہنچے تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ رابن بلاشبہ وہیں تھا۔ ہماری ملاقات ایک ماہ کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی کہ وہ اس قدر اچانک اور میرے لیے کوئی پیغام چھوڑے بغیر کیمپ سے فرار ہوگیا تھا۔ اس نے کیزرسس سے میرا تعارف کرایا۔ کیزرسس ساٹھ برس کی عمر کا ایک بہت ہی نستعلیق قسم کا آدمی تھا۔ اس کی صورت کے ساتھ ہی اس کا لباس بھی بالکل بے عیب نظر آتا تھا۔ جوتے اس قدر چمکتے رہتے تھے کہ کوئی چاہے تو ان میں اپنا عکس دیکھ لے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا تھا کہ وہ کسی انگریز سے بھی زیادہ انگریز ہے کیونکہ وہ جو انگریزی بولتا ہے' وہ ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی انگریزی ادبی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں ہماری فوجوں کے ساتھ ایک مترجم کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور اس پر اسے بڑا ناز تھا۔ رابن کو اس بات سے قطعی اتفاق تھا کہ اب کوکینا کا قصبہ ہمارے لیے لمحہ بہ لمحہ خطرناک بنتا جارہا ہے اس نے مشورہ دیا کہ ایتھنز کے لیے روانہ ہونے سے پہلے جس کا پروگرام اگلے دن طے تھا' یہ رات ہم سنکلیئر کے ساتھ گزاریں۔ اس نے بتایا کہ وہ خود ابھی کچھ دنوں کے لیے پیروس میں رہے گا تاکہ جب تک ممکن ہوسکے اپنے دوستوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا رہے۔

مجھے بتایا گیا کہ ایتھنز میں ایک سوسائٹی ہے جو سارٹیرس اور اس کے ساتھیوں کو ہمارا محافظ دیکھنا نہیں چاہتی' ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر وہ لوگ ہمیں سارٹیرس اور اس کے ساتھیوں کے پاس سے ہٹا کر خود اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ گروہ بھی ایک ہی تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا وہ سوسائٹی اور سارٹیرس ایک ہی تنظیم کے افراد تھے چنانچہ جب اس گروہ کی لیڈر مادام کاربانی نے اپنی بیٹی الیکٹرا کو ہمارے پاس بھیجا کہ ہم اس مقام سے کہیں اور منتقل ہوجائیں تو فطری طور پر رابن کو شکوک و شبہات نے آن گھیرا۔ مجھے اب اس گفتگو کی تفصیلات تو یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ان تمام باتوں کا تعلق کسی نہ کسی انداز میں

یونانی فضائیہ کے ایک آفیسر سے تھا جس کا نام انجلو تھا اور جو اس دوسری سوسائٹی کا ایک نمایاں ”کارپرداز“ تھا۔ اسے بعد میں گستاپو نے گرفتار کرلیا تھا۔

بہرطور ان حالات میں باہمی گفتگو کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ہم اپنے مددگاروں کو اپنی مرضی پر مجبور نہیں کرسکتے ہیں اور ہمیں حالات کے پیشِ نظر وہی کرنا پڑے گا جو ہمارے ہمدرد چاہتے ہیں۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم ڈولی کے ساتھ ایتھنز روانہ ہوجائیں تو بہتر ہے۔

جس مکان میں سنکلیئر پناہ گزیں تھا وہ کافی دور واقع تھا' ہم پیدل جارہے تھے۔ نتیجہ اتنی دور چلنے کا یہ نکلا کہ ہم جب اس مکان تک پہنچے تو میری ران کے زخم سے خون بہنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا اور ساحلِ سمندر کے قریب واقع تھا۔ اس کے آہنی گیٹ پر رک کر ہم نے اطلاعی گھنٹی بجائی' جواب میں ایک مضحکہ خیز بوڑھے آدمی' جس نے ایشیائی لباس پہن رکھا تھا' گیٹ کھولا۔ معلوم ہوا کہ اس شخص کا نام کانسٹن ٹائن تھا۔ وہ البانیہ کا باشندہ ہے اور کوئلے کی تجارت کرتا ہے' یہی شخص ہمارا نیا محافظ تھا۔ وہ ہمیں گھر کے اندر لے گیا جہاں ہماری ملاقات سنکلیئر سے ہوئی۔

اس نے اپنے بال سرخ رنگ سے رنگ لیے تھے' اس نے نیلی قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی اور کسی ہالی وڈ کا اداکار نظر آتا تھا۔ یہاں بھی ایک ”رومانی مسئلہ“ درپیش تھا۔ کانسٹن ٹائن کی ایک جوان رعنا بیٹی تھی...... الیلی وہ سنکلیئر سے محبت کرنے لگی تھی اور سنکلیئر کو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل معلوم ہورہا تھا۔ الیکی ایک دولت مند باپ کی لاڈلی اور بگڑی ہوئی بیٹی تھی۔ ایک طرح سے خوبصورت بھی تھی لیکن اس کا جسم بے ڈول تھا۔ بالخصوص اس کی کمر کا نچلا حصہ زیادہ تھلتھلا تھا۔

بہرطور خون بہہ جانے کی وجہ سے اور راستے کی تھکان سے میں بہت کمزوری محسوس کررہا تھا۔ اس وجہ سے اس بہترین کھانے سے بھی لطف اندوز نہ ہوسکا جو کچھ دیر پہلے ہمارے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ بوڑھا کانسٹن ٹائن ہمیں اپنی بیٹی الیکی کے پاس چھوڑ کر آرام کرنے چلا گیا۔ ہم نے اپنے طور پر فرار ہونے سے پہلے ہی آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ ہم اسے اس طرح کے جذباتی معاملات آوارگی سے گریزاں ہی رہیں گے کیونکہ اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور خطرہ پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے لیکن اب تجربات سے ثابت ہورہا تھا کہ یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنا ہم نے سوچا تھا۔

دوسرے دن الیکی اور اس کی دوست لڑکیوں کے ساتھ کور میں گزرا۔ ان لڑکیوں میں ایک فیلیٹی بھی تھی' جو واقعی بہت حسین تھی۔ ہم بڑی ہوشیاری' ذہانت کے ساتھ بہت ہی محتاط طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے ان پیچیدگیوں سے بچ سکے جو فرار کے لیے ہمارے تمام منصوبوں کو خاک میں ملاسکتی تھیں۔ سہ پہر کو سارٹیرس بھی آ گیا۔ اس کے طرزِ عمل سے یہ بات صاف ظاہر تھی جس سے ہم بچنا چاہتے تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ ہمیں اس رات ہی وہاں سے آگے روانہ ہوجانا تھا۔ ورنہ ہمارا قیام کچھ بھی طویل ہوتا تو لازمی طور پر جھگڑا ہوکر رہتا۔

رات ہوتے ہی ڈولی دو لڑکیوں کے ساتھ آ گئی۔ وہ ہمیں کسی نئی پناہ گاہ تک لے جانے آئی تھی۔ ہم لوگ تین جوڑوں کی صورت میں روانہ ہوئے۔ میں اور ایک لڑکا آگے چل رہے تھے' ہم سے پچاس گز پیچھے دوسرے لوگ تھے۔ باہمی رابطے کے لیے یعنی ایک دوسرے کی موجودگی اور خیریت سے آگاہ رہنے کے لیے ہم یونان کا ایک قومی گیت سیٹی کی دھن پر گارہے تھے۔ ڈولی بڑی مہارت سے سیٹی بجارہی تھی' جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا ایک سامنے کا دانت ٹوٹا ہوا تھا۔

ساحلِ سمندر پر ہم بہت سے ملاحوں کے درمیان سے گزرے' ان میں سے دو نے ہمیں روک کر وقت پوچھا۔ لڑکے نے کمال پھرتی سے ہمیں بولنے سے بچانے کے لیے انہیں جواب دے دیا۔ ساحل سے گزرتے ہوئے میں نے بڑی توجہ سے وہاں لنگر انداز جنگی کشتیوں کا شمار کیا۔ صرف اس خیال سے کہ شاید آگے چل کر ہمیں ان کی ضرورت پڑے۔ انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن پر لڑکے نے ہمارے لیے ٹکٹ خریدے اور مجھے یونانی اخبار پکڑا دیا۔ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہم پلیٹ فارم پر گھومتے رہے پھر جب ہم ٹرین میں سوار ہوئے تو اگرچہ ہم سب ایک ہی ڈبے میں تھے مگر ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننے سے گریز کیا۔ میں اپنا اخبار کھول کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اچانک ایک یونانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے ہوئے کوئی سوال کیا۔ میں اس کا سوال ہی سمجھنے سے قاصر تھا جواب کیا دیتا مگر اس موقع پر بھی لڑکے نے میری مدد کی اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔ ٹرین کے آخری اسٹاپ پر ہم اتر گئے۔ راستے میں بہت سے جرمن سپاہیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم ایمونش اسکوائر پہنچ گئے۔ جہاں ٹرام کا اسٹاپ تھا۔ ٹرام میں ہم اس طرف بیٹھے جہاں ٹرام کے اندر جلنے والی روشنی بہت ہلکی تھی۔ میرے مقابل بیٹھا ہوا ایک یونانی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور میں اس امکان کا جائزہ لینے لگا کہ اگر مجھے

ٹرام سے نیچے کودنا پڑا تو دروازہ بہتر رہے گا یا کھڑکی.....؟ یونانی ہنوز مجھے گھورے جا رہا تھا لیکن یہ تکلیف دہ نظر بازی اس وقت ختم ہو گئی جب وہ ایک اسٹاپ پر اتر گیا، اترتے وقت اس نے عجیب حرکت کی، میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور انگوٹھے کو کھڑا کر کے اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ مجھے شبہ تھا کہ میرے بدلے ہوئے بھیس کے باوجود اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔

ٹرام سے اتر کر ہم پھر کچھ دیر تک پیدل چلتے ہوئے ایک بنگلے میں پہنچے جہاں ہمیں اگلے دس دن گزارنا تھے، اس میں چھ مفرور قیدی پہلے ہی موجود تھے۔ جن میں ایک تو وہی شہرت یافتہ پائپ میجر رائے تھا۔ دو آسٹریلین تھے، ایک پولینڈ کا یہودی تھا جس کا نام جارج فلیر تھا، دو فلسطینی تھے اور دونوں کا نام کرسٹو تھا۔ ان تمام قیدیوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت ڈولی اور اس کی ماں کے سپرد تھی جسے وہ مادام کاربانی کی ہدایت کے مطابق انجام دیتی تھیں۔ ان کی زبانی فرار ہونے کی عجیب عجیب کہانیاں سننے کو ملیں۔ جارج فلیر ایک فلسطینی دستے میں سارجنٹ تھا اور یہودی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو کورنتھ کے جنگی قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونے میں مدد دے چکا تھا پھر جب اسے کوکینا میں ہمارے کیمپ منتقل کیا گیا تو اس نے وہاں بھی بہت سے افراد کو بھاگنے کا موقع دیا۔ آگے چل کر وہ ہماری پارٹی کا ایک بہت ہی قابل اعتماد اور ذمے دار ساتھی ثابت ہوا، خاص طور سے اس لیے کہ اس نے بہت جلد یونانی زبان سیکھ لی تھی اور بڑی روانی سے بول لیتا تھا، دونوں آسٹریلین، سالوونیکا کے کیمپ سے دریا میں تیرتے ہوئے فرار ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا راستہ روکنے والے ایک جرمن سپاہی کو ختم بھی کر دیا تھا۔

اس بنگلے سے ہم سے اتنے لوگ ملنے آنا شروع ہو گئے وہ اپنے ہمراہ اتنے تحائف اور کھانا لائے کہ ہمیں خطرہ ہونے لگا کہ...... ہمارا یہ ٹھکانا سابقہ پناہ گاہوں سے بھی کم محفوظ ثابت نہ ہو۔ مادام کاربانی بہت ہی شریف عورت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہمارے ساتھ سب کچھ کر کے بھی وہ مطمئن نہیں اور یہی سوچتی ہے کہ اسے کچھ اور کرنا چاہیے۔ جنگ کے آخری دور میں جب ہمارے فوجی پیراشوٹ کے ذریعے میگارا کے ہوائی اڈے پر اترے تو گستاپو نے مادام کو گرفتار کر کے گولی مار دی۔ اس کی موت کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں کچھ شبہات پیدا ہوئے۔ یہ سوال کیا جانے لگا کہ مادام کاربانی واقعی کوئی بہادر عورت تھی۔ میں کسی بحث میں تو پڑنا نہیں چاہتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ مادام نے ہماری خاطر بے شمار خطرات کا سامنا کیا تھا۔ کرسٹو ہمیں بہت پریشان کرتا تھا۔ وہ رات کے وقت گھر سے باہر جانے کی ضد کرتا تھا۔ اگرچہ ہم سب نے فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں غیر ضروری خطرات سے بچنا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں، وہ گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے سے بھی باز نہیں آتا تھا، خواہ کتنا ہی منع کیا جائے!

تقریباً دس دن کے بعد ایک اجنبی شخص نے ہمیں ایک آبدوز کے آنے کی اطلاع دی اور وعدہ کیا کہ وہ رات کے وقت ٹیکسی میں ہمیں آب دوز دکھانے لے جائے گا، ہمیں اس پر کچھ شبہ سا رہا حالانکہ وہ ہمارا کوئی ہمدرد بھی ہو سکتا تھا۔ دن کے وقت ایک یونانی انٹیلی جنس آفیسر، جس کا نام جیکسن تھا، آیا اس نے ہمیں کچھ مفید باتیں بتائیں اور ہم سے کہا کہ ہم انہیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں۔ شاید آگے چل کر ہمیں ان کی ضرورت پڑے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ہمارے اعصاب اس شدید انتظار سے شکستہ ہوتے جا رہے تھے۔ دوسری جانب پکڑے جانے کا خوف الگ دامن گیر تھا۔ ہماری یہ حالت تھی کہ ذرا سے کھٹکے پر بھاگنے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ ایک دن تو غیر متوقع طور پر کوئی کار بنگلے کے آگے آ کر رکی اور ہم سے دو افراد عقبی کھڑکی سے باغ میں کود گئے حالانکہ اس کا بنگلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کے بعد آگے بڑھ گئی اور ہم اپنی گھبراہٹ پر کھسیا کر رہ گئے، یہ تو حال تھا ہمارا!!

رابن نے ساحل سے ایک ای بوٹ چرانے کا منصوبہ سوچا مگر مجھے اس منصوبے سے قطعی اتفاق نہ تھا۔ اس طرح کبھی میرے ذہن میں کوئی بات آتی تو دوسرے اسے رد کر دیا کرتے...... بالآخر یہ دیکھ کر ہم کسی ایک پلان پر متفق نہیں ہو رہے ہیں اور دوسری طرف وہ آبدوز بھی کسی طرح تو نہیں آ رہی ہے جس کی ہمیں اطلاع ملی تھی۔ ہم نے طے کیا، ہم دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جائیں۔ میں نے مادام کاربانی سے درخواست کی، وہ میرے اور سنکلیئر کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام کر دے جبکہ رابن اور میکسول کسی اور دوست کے گھر چلے گئے مگر ہمارے درمیان یہودی جارج فلیر کے ذریعے تھوڑا بہت رابطہ برقرار تھا۔

مجھے اور سنکلیئر کو ایک دوسرے گھر میں بھیج دیا گیا جس کے مالک کا نام آرسٹڈ تھا۔ اس کی دو بہنیں ایلپس اور کیتھیا تھیں اس کی ماں بھی اسی گھر میں رہتی تھی، اس کا بھائی الیاس (یاد رہے کہ سارٹیرس کے بھائی کا نام بھی الیاس تھا) ایک تجارتی بحری جہاز کا کپتان تھا مگر اس کا جہاز ایک سفر کے دوران بمباری کی زد میں آ کر غرقاب ہو چکا تھا اور وہ آج

کل خالی بیٹھا تھا۔ الیاس کبھی کبھی ہم سے ملنے آ جایا کرتا تھا۔ یہ بہت اچھا گھر تھا اور ہم یہاں کافی خوش تھے۔

ہر روز صبح آرسنڈ کی ماں ہمیں بیدار کرتی تھی اور بیڈ ٹی کی جگہ دودھ کا گلاس پیش کرتی تھی۔ اس وقت تک مادام نے ہمیں دو جعلی شناختی کارڈ بھی فراہم کر دیے تھے۔ میرے حصے میں جو کارڈ آیا تھا' اس پر نکولائڈ کا نام تحریر تھا۔ پیشے کے کالم میں بینک کلرک تحریر تھا۔ کئی روز تک ایسا ہوتا رہا کہ ایلپس مجھے شناختی کارڈ کے مندرجات زبانی طور پر یاد کراتی رہی۔ مثلاً تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟ تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟ تم کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے سوال وجواب یونانی زبان میں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ہم یونانی زبان سیکھ رہے تھے اور کچھ ہی دنوں میں اس قابل ہو گئے کہ روز مرہ کی سیدھی سادی بات چیت چھوٹے چھوٹے فقروں میں کر سکیں۔ ہم دن بھر تاش کھیلتے تھے اور رات کے اوقات میں کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سینما دیکھنے بھی گئے اور اتفاق سے مجھے جو سیٹ ملی وہ بالکل ایک جرمن آفیسر کے قریب تھی۔ فلم بالکل واہیات تھی اور ہمیں قطعی پسند نہ آئی تھی۔ بہرحال جو دن بھی اس مکان میں گزرے' بہت ہنسی خوشی سے گزرے' اور میں اب بھی اکثر انہیں یاد کرتا ہوں۔ اگرچہ یہاں بھی ہمیں رومان سے مفر نہ تھا۔ ایلپس میری ذات میں غیر معمولی دل چسپی لے رہی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ زیادہ جذباتی نہیں تھی اور میں اس کی طرف سے کچھ زیادہ پریشان بھی نہ تھا۔

ایک رات ہماری رائل ایئر فورس نے تاتوئی کے ہوائی اڈے پر بڑا زبردست حملہ کیا اور اسے بمباری کر کے شدید نقصان پہنچایا۔ اپنے گھر کی چھت سے ہم نے اس حملے کا نظارہ کیا اور ہوائی اڈے کی تباہی پر بہت خوش ہوئے۔ اگرچہ ہمارے یونانی دوست دوسرے دن بہت اداس نظر آئے کیونکہ خبر ملی تھی کہ اس بمباری میں بہت سے یونانی شہری بھی مارے گئے تھے لیکن ان کی جذباتی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ جرمنوں کو پہنچنے والے نقصانات کو انتہائی مبالغے کے ساتھ بیان کر کے بہت خوش بھی ہو رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ وہ دور جرمن افواج کی کامیابی کا دور تھا مگر یونانیوں کا یہ یقین کبھی متزلزل نہ ہوا کہ آخر کار فتح برطانیہ اور اتحادیوں کی ہی ہوگی۔

ستمبر کا وسط تھا کہ کیپٹن الیاس نے پہلی مرتبہ ہم سے فرار کے امکانات پر گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ بہت سے یونانی' مصر جانا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس ایک موٹر بوٹ خریدنے کے لیے رقم نہیں ہے۔ وہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہم انہیں کچھ فنڈز فراہم کر سکیں۔ جارج فلیر اس دوران اتنی اچھی یونانی زبان بولنے لگا تھا کہ اکثر دن کے وقت بھی بغیر کسی خوف کے بازاروں اور گلیوں میں نکل جاتا تھا۔ دراصل وہ بیرونی دنیا کے اور ہمارے درمیان ایک رابطہ تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ ان تمام یونانی اداروں کے سربراہوں سے رابطہ قائم کرے جو ہمارے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں اور ان سے فنڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو ان لوگوں سے یہ وعدہ بھی کر سکتا ہے کہ سردست ہم انہیں رقم کی رسید دے دیں اور بعد میں جب ہم اتحادی فوجوں میں واپس پہنچ جائیں تو ان رسیدوں کی رقوم کی ادائیگی کا انتظام کر دیں گے۔ جارج فلیر کی یہ کوشش کامیاب رہی اور بہت سے لوگوں نے مدد کی۔ خاص طور سے یونانی بحریہ کے ایک سابقہ آفیسر نے ہمیں لگ بھگ دوسو پاؤنڈز کے برابر یونانی کرنسی نوٹ بھجوا دیے۔ کچھ لوگ ہم سے ملنے بھی آئے اور حتی الامکان اپنے تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ ایک مرتبہ میں بھیس بدل کر رابن سے ملاقات کرنے بھی گیا جو ایک شاندار فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ اس فلیٹ کی مالکہ نے بھی ہمیں کچھ رقم عطا کی۔ میں نے رابن اور میکسول سے اپنے پلان کا ذکر کیا مگر وہ دونوں ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ غالباً انہیں توقع نہ تھی کہ ہم کبھی کوئی موٹر بوٹ خرید سکیں گے۔ بہرحال ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا لیکن خود نہ جانے کے باوجود رابن نے ہمارے منصوبے میں اس حد تک دلچسپی لی کہ دوسرے لوگوں سے بھی رقمیں لے کر ہمیں بھیجتا رہا اور جس روز ہم اپنے سفر پر روانہ ہوئے' اس نے خاص طور سے مسٹر کیرزسں کو یہ دیکھنے اور اطمینان کرنے کے لیے بھیجا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم جا رہے ہیں' وہ ہمیں کسی طرح دھوکا نہ دے سکیں۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ہم ایک مچھیرے کی جھونپڑی میں منتقل ہو گئے جو پیروس کے قریب واقع تھے' یہاں ہماری ملاقات لیفٹرس نامی ایک شخص سے ہوئی۔ یہ ایک میرین انجینئر تھا اور اسے ہماری موٹر بوٹ کے انجن کی نگہداشت سپرد کی گئی تھی کہ وہ ہمیں بحیرۂ روم سے بہ عافیت گزار کر مصر تک پہنچا دے۔ وہ ایک خوبصورت اور باہمت انسان تھا۔ ہم کافی پیتے ہوئے کئی گھنٹے تک اپنے سفر کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ ہمارا پرانا دوست الیاس (سار میرس کا بھائی) موٹر بوٹ کا کیپٹن بنایا گیا تھا۔ کچھ دن ہم اس جھونپڑی سے ایک اور مکان میں چلے گئے۔

اس کے مالک کا نام پینٹور یلی تھا اور وہ لیفٹرس کا دوست تھا۔
اس کے مالی حالات ٹھیک نہ تھے' وہ اپنی ماں اور ایک نوعمر بھائی کے ساتھ بڑی عسرت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بھائی کا نام اسپانک تھا۔ میں غالباً یہ بتانا بھول گیا کہ اس دوران ہمیں اپنی موٹر بوٹ کے لیے دو اور مسافر مل گئے تھے۔ ان میں ایک آسٹریلین تھا اور فوج میں اس کا عہدہ سارجنٹ تھا جبکہ دوسرا شخص بھی سارجنٹ ہی تھا مگر وہ برطانوی تھا اور اس کا نام چارلس تھا۔ آسٹریلین سارجنٹ بہت سخت مزاج اور جفاکش آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسپانک ہم سب لوگوں سے بہت مانوس ہو گیا' خاص طور سے آسٹریلین سارجنٹ سے' جو اسے طرح طرح کے گانے سنایا کرتا تھا۔
تیاریاں آخری مراحل میں تھیں کہ ایک بار پھر ناامیدی کی دھند چھانے لگی۔ جو موٹر بوٹ ہم خرید رہے تھے' اس کے مالک کا نام یانی تھا۔ بالکل آخری لمحات میں اس نے مطالبہ کیا کہ جب تم ہم اسے مزید سو پاؤنڈز نہیں دیں گے' وہ کشتی فروخت نہیں کرے گا۔ وہ مجھ سے ملنے آیا اور میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے سابقہ وعدے سے نہ پھرے اور ہم سے مزید رقم کا مطالبہ نہ کرے مگر وہ اپنی ضد پر اَڑا رہا' میں نے اسے قرض کی رسید دینے کے لیے کہا کہ یہ رقم ہم بعد میں ادا کر دیں گے مگر وہ نقد اور اسی وقت لینے پر ہی مصر رہا اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ وہ صورت ہی سے سنگ دل اور دولت کا حریص معلوم ہوتا تھا مجھے خطرہ تھا کہ وہ نہ صرف ہم سے ہمارا تمام سرمایہ چھین لے گا بلکہ اس کے بعد جرمن افسران یا گستاپو کو اطلاع دے کر ہماری گرفتاری کے لیے مقرر کردہ انعام بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔
اس مشکل وقت پر بحریہ کا وہی افسر جس نے نقد رقم سے ہماری مدد کی تھی اور جس کا نام ایوروف تھا' ایک بار پھر ہمارے کام آیا' اس نے یانی سے وعدہ کیا کہ جو وہ مزید رقم مانگ رہا ہے' اسے ادا کر دی جائے گی مگر اس وقت جب ہم لوگ مصر پہنچ جائیں گے اور قاہرہ ریڈیو سے ایک کوڈ پیغام اپنے خیریت سے پہنچنے کا نشر کریں گے۔ آخر بڑی مشکل سے یانی اس تجویز پر آمادہ ہوا اور میرے خیال کے مطابق غالباً اس لیے کہ اسے ایوروف جیسے آدمی کی دشمنی مول لینا پسند نہ تھی۔

حالات بھی کیسی غیر متوقع صورت اختیار کرتے رہتے ہیں۔

صبح کو یہ بات طے ہوئی اور شام کو پینٹور یلی بڑا گھبرایا ہوا سا آیا اور اس نے بتایا کہ لیفٹرس اور ایک دوسرے یونانی کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ یہ سنتے ہی جو پہلا خیال ہمارے ذہنوں میں آیا وہ یہی تھا کہ لیفٹرس موٹر بوٹ کے لیے بلیک مارکیٹ سے ڈیزل آئل خرید خرید کر بوٹ پر پہنچا رہا تھا اس لیے اسے گرفتار کرلیا گیا۔ مگر یہ شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بعد میں مصدقہ اطلاع ملی کہ اسے محض شراب نوشی کے الزام میں پکڑا گیا تھا مگر کچھ دیر کے لیے تو بالکل ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ہماری تمام جدوجہد رائگاں گئی۔
اگلے دن لیفٹرس ایک پولیس مین کے ساتھ ملنے آیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ اسے پولیس نے گرفتار ضرور کیا تھا مگر شراب پینے کے الزام میں پکڑا تھا۔
مگر جیسے ہی اس نے پولیس والوں کو یہ بتایا کہ وہ چند برطانوی افسروں کو فرار ہونے میں مدد دے رہا ہے' اسے فوراً رہا کر دیا گیا بلکہ وہ اس سے اس بات پر ناراض بھی ہوئے کہ اس نے یہ بات کیوں نہ بتائی۔ جو پولیس افسر بعد میں ہم سے ملنے آیا' بڑی گرم جوشی سے ملا۔ اس نے کھانے پینے کی کچھ اشیا تحفے میں دیں۔ اتنا ہی نہیں' اس نے اپنا ریوالور بھی مجھے دیا تاکہ اپنے پاس رکھوں' شاید اس کی کبھی ضرورت پیش آ جائے۔ وہ مخلص شخص اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ جب ہم موٹر بوٹ پر روانہ ہونے لگیں گے تو وہ اور اس کے ساتھی ساحل کی نگرانی کے لیے موجود رہیں گے تاکہ کوئی ہماری روانگی میں حارج نہ ہو سکے' میں حالات کی اس تبدیلی سے بہت خوش تھا۔ خاص طور پر پولیس کے تعاون نے اب یہ بات یقینی بنادی تھی کہ موٹر بوٹ کا مالک اب ہمارے ساتھ اور شرارت نہیں کر سکے گا۔
مقررہ دن کرفیو لگنے کے بعد (وہاں رات کے وقت کرفیو نافذ کر دیا جاتا تھا) تقریباً گیارہ بجے ہم لوگ ایک ایک' دو دو کر کے ساحل پر پہنچنے لگے۔ ہمیں بہت خاموشی سے چلنے اور کسی بھی قسم کا کوئی شور وغیرہ نہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی کیونکہ جس جگہ ہماری بوٹ لنگر انداز تھی اس کے قریب ہی ایک جنگی کشتی پر کچھ جرمن سنتری موجود تھے۔ وہ دس یونانی باشندے جنہیں ہمارے ساتھ چلنا تھا۔ ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور موٹر بوٹ کے اندرونی حصے میں چھپے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہیں ایک مسئلہ درپیش ہے' ہوا یہ کہ پینٹور یلی کا چھوٹا بھائی اسپانک دن ہی میں آ کر موٹر بوٹ میں چھپ گیا تھا اور اب ہمارے ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے روتے ہوئے جواب دیا

کہ وہ اپنے غریب بھائی اور ماں پر ایک بوجھ ہے' یہاں رہ کر وہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ پھر یہ کہ اس کی خواہش ہے کہ فوج میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوکر ظالم جرمنوں کے خلاف جنگ کرے۔ میں نے اسے زبردستی اتارنا چاہا تو اس نے دھمکی دی اگر اسے ساتھ چلنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ چیخ چیخ کر پورے ایتھنز کو جگادے گا۔ پینٹوریلی نے بھی اس سے بہت کچھ کہا سنا مگر اسپاٹک کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ ہر صورت میں ہمارے ساتھ جائے گا۔ آخر مجبور ہوکر میں نے اس کے بھائی سے کہا کہ وہ اسے جانے دے اور اسے اطمینان دلایا کہ مصر پہنچنے تک میں اس کی دیکھ بھال اور نگرانی بالکل اپنے چھوٹے بھائی کی طرح کروں گا۔

''لیکن تم سمجھتے نہیں' وہ بہت بیمار ہے۔'' پینٹوریلی بولا۔

''میں جانتا ہوں اور اس کے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے ہر ہفتے انجکشن لگنا ضروری ہوتا ہے' وہ ایک خوفناک مرض میں مبتلا ہے۔''

''کوئی بھی مرض ہو' میں مصر پہنچ کر اس کے علاج کا پورا بندوبست کردوں گا۔''

آخر پینٹوریلی بھی بھائی کی ضد سے مجبور ہوگیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم نے اپنی موٹر بوٹ سمندر کی لہروں کے حوالے کردی۔ اس طرح جب ہم کافی دور نکل آئے تو لیفڑس نے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا اور اس طرح ہمارے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ موٹر بوٹ کچھ زیادہ بڑی نہ تھی۔ تقریباً تیس فٹ لمبی ہوگی' اس اعتبار سے اس کا کیبن اور بیٹھنے کی جگہ بھی مختصر سی تھی اور اس چھوٹی سی جگہ میں ہم چودہ مسافر بڑی تنگی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی میں مستول لگنے کی بھی گنجائش تھی۔ مگر جہاں کسی وقت مستول لگا ہوگا' وہاں اب صرف ایک بڑا سا سوراخ جھانک رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کشتی چلانے میں مستول' بادبان اور ہوا کے رخ سے مدد نہیں لے سکتے تھے۔ کشتی کھینے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک ہی چیز تھی یعنی اس کا انجن جو ڈیزل آئل سے چلتا تھا۔ ہم نے حساب لگایا کہ اگر موسمی اور دوسرے حالات ٹھیک رہے تو ہم چار دن میں اسکندریہ پہنچ جائیں گے اور یہ کہ ہمارے پاس صرف اتنا ہی ڈیزل ہے جو چار دن بوٹ کو سمندر میں رواں دواں رکھ سکے۔ اپنا راستہ پہچاننے کے لیے ہم ایک ''اسٹول اٹلس'' سے مدد لے رہے تھے جس میں صرف جزیرہ کریٹ تک واقع جزیرے دکھائے گئے تھے۔ اس کے آگے صرف سمندر ہی سمندر نظر آرہا تھا۔ ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔ ہمارے پاس خشک روٹیوں کی ایک بوری اور تھوڑی سی پیاز تھی۔ کچھ اور متفرق چیزیں بھی تھیں۔ مگر سب ملا کر بھی کچھ زیادہ قابلِ اطمینان حالت نہ تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے اثرات یونان کی غذائی صورتِ حال پر بھی پڑے تھے۔

ایتھنز میں قحط جیسے حالات پیدا ہونا شروع ہوچکے تھے اور اتنا کچھ غذائی سامان بھی ہم بہت کوشش کے بعد ہی حاصل کرسکے تھے۔ ہم نے اپنی موٹر بوٹ کا نام ''ایلپس'' رکھا تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ ہمیں ہمارے یونانی دوستوں کی یاد دلاتا رہے بلکہ اس لیے بھی کہ یونان میں بحری سفر کی دیوی کو (یا غالباً روحِ سفر کو) ایلپس کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دو گھنٹوں میں ہم میں سے بہت سے سمندری بیماری (SEA SICKNESS) یعنی جی متلانا' قے کرنا وغیرہ میں مبتلا ہوئے لیکن جلد ہی ہم اپنی چھوٹی سی موٹر بوٹ کے اتار چڑھاؤ اور ہچکولوں کے عادی ہوگئے۔

ہم راہ میں ملنے والے پہلے جزیرے سے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ ہمیں ایک گشتی بوٹ دکھائی دی اور ہم جلدی سے کشتی کے زیریں حصے میں چھپ گئے۔ الیاس نے جلدی سے بہت سے جال نکال کر عرشے پر پھیلا دیے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ہم مچھیرے ہیں اور سمندر میں مچھلیاں پکڑنے نکلے ہیں۔ شکر ہے کہ گشتی بوٹ نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا اور ہم جلد ہی خطرے سے باہر نکل گئے۔ سفر کے دوسرے دن ایک جرمن طیارہ اُڑتے اُڑتے ایک دم ہماری طرف متوجہ ہوا۔ اس کا پائلٹ طیارے کو بہت نیچے اتار لایا اور غور سے ہمیں دیکھنے لگا مگر پھر غالباً مطمئن ہوگیا کہ اس کے بعد پھر بلند ہوکر اپنی راہ پر چلا گیا۔ ہم بہت پرامید دلوں اور بشاش چہروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جزیروں کے درمیان سمندر پر بہتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ہم میں سے بیشتر عرشے پر لیٹے رہتے تھے اور بوٹ سے ہاتھ نیچے لٹکا کر لہروں کو چھونے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ الیاس بڑی خوبی سے بوٹ کا اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے اسے اپنی منزل کی طرف لے جارہا تھا۔

دوسری رات الیاس کو آرام کا موقع دینے کے لیے ایک اور یونانی جارجیو نامی شخص نے وہیل تھاما اور وہاں سے ہماری آزمائشوں کا آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

ایک جزیرے کی شکل سے اسے کچھ غلط فہمی ہوگئی اور وہ بوٹ کو موڑ کر ہمارے مقررہ راستے سے بہت دور لے گیا۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ راہ میں آنے والے جزیروں کی ہئیت ان جزیروں سے نہیں ملتی جو اٹلس میں دیے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً الباس کو اٹھایا۔ پہلے اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا اور بوٹ اسی راستے پر چلتی رہی مگر جلد ہی اس نے بھی دیکھ لیا کہ ہم راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ رات کا وقت تھا۔ طے ہوا کہ صبح تک ایک بڑی چٹان کے کنارے لنگر انداز ہو جائیں پھر صبح کو دیکھ بھال کر آگے بڑھیں گے۔

ابھی ہم چٹان کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ہمارے ایک ساتھی نے دور ایک سایہ سا دیکھا۔ جس پر اسے دوسری کشتی کا گمان گزرا۔ لیفٹرس نے جلدی سے بوٹ کا انجن بند کر دیا۔ خاموشی چھا گئی اور ہم اس خاموشی میں دیر تک سانسیں روکے بیٹھے رہے لیکن اس سائے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سورج نکلا تو پتا چلا کہ وہ ایک چٹان تھی۔

راستے سے بھٹک جانا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ ہمارے پاس ڈیزل آئل کی بہت محدود مقدار تھی۔ اس میں اتنی گنجایش نہیں تھی کہ ہم غلط سمت میں چل کر آئل ضائع کریں اور پھر واپس صحیح راستے پر آئیں۔ تب بھی وہ ہماری منزل تک پہنچنے کے لیے کافی ہو۔ بہ نظر احتیاط ہم نے آئل کے ڈبوں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے کہ کسی نے (ہمارا شبہ فوراً دو افراد پر گیا تھا' ایک بوٹ کا مالک یانی اور دوسرے پینٹور یلی) ان میں سے تین ڈبے چرا لیے ہیں۔ واپس جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب ہم صرف یہ دعا ہی کر سکتے تھے کہ کریٹ سے دوسری جانب پہنچنے کے بعد کوئی برطانوی بحری جہاز یا کشتی ہماری مدد کے لیے راستے میں مل جائے۔

اگلے دو دن ٹھیک گزرے اور ہم نے خاصا راستہ طے کر لیا۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے کوئی حصہ اتنا خوبصورت اور نظر فریب نہیں جتنے یونانی جزائر ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ شہرت اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ ہم اس حسن و دل فریبی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر رہے تھے۔ سمندر بہ دستور پُرسکون تھا اس لیے ہم اطمینان سے عرشے پر لیٹے آس پاس کے جزائر کی خوبصورتی اور سرسبز و شادابی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

مجھے بحری سفر کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے یہ دیکھ کر خاص حیرت ہوتی تھی کہ بہ ظاہر جو جزیرہ اس قدر قریب نظر آ رہا ہے۔ حقیقت میں اتنی دور ہوتا تھا کہ اس تک پہنچنے یا اس کے پاس سے گزرنے میں اندازے سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا تھا۔ غروب آفتاب کا منظر بھی بڑا ہی مسحور کن ہوتا تھا۔ سائے دراز ہو جاتے تھے' جزیروں کے نشیب و فراز سنہری دھوپ میں چمکنے لگتے تھے اور ہماری کشتی جیسے سونے کا روپ دھار لیتی تھی۔ چاروں طرف نظر آتی ہوئی سرسبزی و شادابی کے درمیان کچھ یوں لگتا تھا جیسے ہماری کشتی ابھی دوسرے ہی لمحے کسی خوب صورت رنگ برنگے پھول کی شکل میں کھل جائے گی۔

جب ہم اس سفر کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو ہم نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ہمارے لیے خطرے کا سب سے زیادہ پریشان کن وقت وہ ہوگا جب ہم کریٹ اور روہوڈز آئی لینڈ کے درمیان ہوں گے' ہمیں معلوم تھا کہ اس جگہ جرمن "ای" بوٹس گشت کرتی رہتی ہیں اور ان میں سے کسی کی بھی نظر ہم پر پڑنا گویا موت کے مترادف تھا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم یہ فاصلہ رات کی تاریکی میں طے کریں گے۔ راستے سے بھٹک جانے کی غلطی پورے ایک دن کی حد تک ہمیں اور ہمارے اثاثوں کو متاثر کر چکی تھی۔ ہم نے سفر کا مرحلہ وار جو پروگرام بنایا تھا' وہ بے ترتیب ہو چکا تھا اور میں افسوس کر رہا تھا کہ جب ہمارے درمیان یہ مسئلہ درپیش ہوا تھا کہ ہم مصر چلیں یا ترکی کا رخ کریں تو میں نے اس بنیاد پر ترکی جانے کی مخالفت کی تھی کہ ترکی کی غیر جانبداری کے باوجود وہاں کسی وقت بھی جرمن پہنچ سکتے تھے لیکن اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ تھا؟ اب یہی چارۂ کار باقی تھا کہ جس طرح بھی ہو بس آگے بڑھتے جائیں چونکہ ہمارے پاس پانی اور خوراک کی بہت قلیل مقدار تھی اور ہمیں دونوں چیزوں کی شدید ضرورت تھی اس لیے میں نے الباس کو اس رائے سے اتفاق کیا کہ ہم جزیرہ سانٹورین سے ہوتے ہوئے چلیں۔

اپنے سفر کی چوتھی صبح کو ہم اس جزیرے پر پہنچے جسے ہمارے خیال میں سارنٹورین ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہم اس کی جس سمت میں تھے' وہاں ہمیں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

ہم نے بوٹ ساحل سے لگا دی۔ اٹلس کے مطابق اس جزیرے کی بندرگاہ مشرقی سمت میں تھی۔ اس لیے ہم نے اس طرف بڑھنے کی کوشش نہ کی کیونکہ اس بات کا پورا خطرہ تھا کہ وہاں ہمارا سامنا جرمن سپاہیوں سے ہو جائے۔ البتہ ایک یونانی ملاح نے جس کا نام کرسٹو تھا' اپنا چاقو منہ میں دبایا اور سمندر میں کود پڑا کہ پانی میں تیرتے ہوئے دوسری طرف کی خبر لائے۔ کافی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو بڑی خراب خبر لے کر آیا۔

معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ سرے سے سارنٹورین ہے ہی

نہیں، بلکہ ایک دوسرا اور قطعی غیر آباد جزیرہ ہے جس کا مشرقی ساحل لنگر انداز ہونے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

الیاس، بوٹ کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے دوسری طرف لے گیا۔ یہاں ایک محفوظ خلیج میں بوٹ کا لنگر ڈال دیا اور ہم سب کنارے پر چڑھ گئے کہ اپنے مطلب کی جو شے بھی پائیں، اٹھا لائیں۔ معلوم ہوا کہ جزیرہ ہمیشہ سے غیر آباد نہیں تھا۔ آبادی کے نشانات ہر طرف دکھائی دیے۔ تب یہ گمان ہوا کہ شاید لوگ صرف کھیتی باڑی کے دنوں میں اس جزیرے کا رخ کرتے تھے۔ اور جب فصلیں پک کر کٹ جاتی ہیں تو وہ غلہ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔

اس خیال کی وجہ وہ پھیلے ہوئے کھیت تھے جہاں کٹے ہوئے گندم کے کچھ خوشے اب بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس وقت تک ہماری بھوک بھی چمک اٹھی تھی اس لیے ہم گندم کے خوشے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جتنے بھی راستے میں ملتے گئے، اٹھا اٹھا کر کھاتے چلے گئے۔

جزیرے کی جنوبی سمت انسانی آبادی کے یقینی نشانات دیکھنے میں آئے، جگہ جگہ پہاڑی غاروں کو کاٹ کر کمروں اور کوٹھریوں کی شکل دے دی گئی تھی جس کے سامنے لکڑی کے کواڑ بھی لگائے گئے تھے۔ ایک سی پہاڑی پر چھوٹا سا گرجا گھر بھی ملا۔ میں نے گرجے میں جا کر دعائیں مانگیں اور میرے یونان کے جو بھی سکے رہ گئے تھے، وہ سب وہیں پر رکھے ہوئے چندہ جمع کرنے والے ایک بکس میں ڈال دیے۔

دفعتاً کرسٹو نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا۔ معلوم ہوا کہ اسے میٹھے پانی کی ایک بھری ہوئی ٹنکی مل گئی تھی۔ ہم نے پہلے اپنا پانی کا ڈرم بھرا پھر خوب جی بھر کر پانی پیا، منہ ہاتھ دھویا بلکہ نہائے بھی۔ آسٹریلین سارجنٹ کو پھلوں سے بھری ہوئی دو ٹوکریاں بھی مل گئیں جو ایک چٹان کی آڑ میں چھپا کر رکھی گئی تھیں۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دور سمندر میں جزیرہ کریٹ کی جانب مچھلیاں پکڑنے والی دو کشتیاں نظر آئیں۔ یہ پھل یقیناً مچھیروں کے ہی ہوں گے۔ گویا ہماری دعاؤں کا ثمر مل گیا تھا۔ میں تو دونوں ٹوکریاں لے جانے کے حق میں تھا مگر الیاس نے اختلاف کیا کہ کہیں ان مچھیروں کو فاقہ کشی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بات معقول تھی چنانچہ ایک ٹوکری لی گئی اور اس کی قیمت کے طور پر ہم میں سے ہر شخص نے وہ تمام یونانی سکے دوسری ٹوکری میں ڈال دیے جو ہمارے پاس تھے۔

ہم واپس اپنی بوٹ میں آ گئے اور سفر پھر شروع ہو گیا۔

☆☆☆

اسی رات ہم جزیروں کی حدود سے نکل کر اس کھلے سمندر میں آ گئے جو اب ہمارے اور مصر کے درمیان حائل تھا۔ ہمیں جزیرہ کریٹ کے مشرقی کنارے پر ایک لائٹ ہاؤس دور ہی سے نظر آرہا تھا اور ہم اپنی بوٹ سے ہیرک لائن نامی ہوائی اڈے پر جرمن طیاروں کو بھی اترتے اور پرواز کرتے دیکھ رہے تھے۔ فاصلے کی یہی تھوڑی سی پٹی ہمارے لیے زیادہ اہم تھی اور ہم بڑی خاموشی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ نصف سے زیادہ راستہ طے کر چکے تھے کہ اچانک گہری دھند نے ہمیں گھیر لیا، پہلے تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اس دھند کی وجہ سے ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے مگر جب اس دھند نے طوفان کی اس ابتدائی علامت کی شکل اختیار کرنا شروع کی جو اس موسم میں عموماً بحیرۂ روم میں آتے رہتے تھے تو ہم گھبرائے کہ ہماری چھوٹی سی موٹر بوٹ کسی بڑے طوفان کا مقابلہ کس طرح کر سکے گی؟ ایک گھنٹے کے اندر اندر سمندر کی پُرسکون سطح نے سرکش موجوں کی شکل اختیار کر لی۔ الیاس نے بڑی ہوشیاری سے وہیل سنبھالتے ہوئے بوٹ کو ایسا رخ دے دیا کہ بپھری ہوئی لہریں ہمیں کم سے کم نقصان پہنچا سکیں لیکن ظاہر تھا کہ اب ہم طوفانی ہواؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ جدھر چاہتی تھیں، ہماری بوٹ کو اڑائے پھر رہی تھیں۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ دن تک ہماری کشتی سمندر کی متلاطم لہروں پر پلاسٹک کی کسی چھوٹی گیند کی طرح اِدھر سے اُدھر ڈولتی رہی۔ اڑتالیس گھنٹے تک ہمارا اور طوفان کا مقابلہ ہوتا رہا اور اس دوران اگر ایک موج کشتی کی مخالف سمت سے اٹھ کر ہماری طرف آ جاتی تو ہم کبھی کے تہ نشین ہو چکے ہوتے لیکن آفرین ہے الیاس کی چابک دستی اور ہوشیاری پر کہ وہ ہوا کے ساتھ ہی کشتی کا رخ بھی بدلتا رہا۔ ان اڑتالیس گھنٹوں میں اس نے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کیا۔

ایسی بے مثال صلاحیت کا مظاہرہ کوئی ہوشیار اور ماہر ملاح ہی کر سکتا تھا۔

آخر کار خدا خدا کر کے طوفان ختم ہوا اور وہ جس طرح یکبارگی ظاہر ہوا تھا، اسی طرح چلا بھی گیا۔ ایک بار پھر ہم نے اپنے چاروں طرف سمندر کو پُرسکون دیکھا۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب ہم سمندری لہروں کے ساتھ اسی رخ پر صرف بہنے کے لیے مجبور تھے کیونکہ ہماری بوٹ پر موجود تمام ڈیزل آئل اس مدت میں ختم ہو چکا تھا۔ اتنا ہی نہیں، میں نے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ تمام خوراک اور بیشتر پانی بھی صرف ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس بے پروائی کے لیے خوب برا بھلا کہا۔ آخر میں نے کچھ اور سختی کے ساتھ پانی اور خوراک کی

راشننگ کیوں نہ کی؟ ہم سب لوگ ہی طوفان کا مقابلہ کرتے کرتے' آنے والے سمندری پانی کو کشتی سے نکالتے نکالتے تھک کر چُور ہو چکے تھے اور نیم مدہوش عرشے پر لیٹے ہوئے تھے۔ بہرحال مرتا کیا نہ کرتا' میں نے باقی رہ جانے والے پانی کو ہی آخری امکانی حد تک احتیاط سے خرچ کرنے کی خاطر انتہائی سختی کے ساتھ سب کا برابر حصہ مقرر کردیا اور یہ حصہ جیلی کے ایک خالی ڈبے کا تہائی' فی یوم فی کس تھا۔ میں خود اپنا ریوالور ہاتھ میں لے کر پانی کے ڈرم کے پاس بیٹھ گیا کہ اگر کسی نے بھی زیادہ پانی لینے یا دوسرے کو محروم کرنے کی کوشش کی تو اسے بے دریغ گولی سے اُڑا دوں گا۔ دن تو جیسے تیسے سورج کی حرارت کے سہارے گزر گیا مگر رات کو سردی تھی۔ ہمارے پاس صرف دو کمبل تھے اور ہم چودہ آدمی ان کے ایک ایک گوشے کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح لیٹ گئے۔

چھٹے دن کی صبح طلوع ہوئی تو شدید مایوسی نے ہمیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے اور ایک دوسرے سے بدکلامی کرنے پر مجبور کردیا۔ جارج فلیز' وہ پولینڈ کا یہودی' میں نے اسے اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ ناامیدی اور افسردگی کی حالت میں جھلایا ہوا پایا۔ وہ الیاس کو کوس رہا تھا کہ اس نے روانگی سے پہلے ہی کیوں ڈیزل آئل چیک نہیں کیا تھا۔ یہ کیوں نہیں دیکھا کہ ان میں سے تین ڈبے کم ہیں؟ اس کا اہتمام کیوں نہیں کیا کہ ہمارے پاس اتنی وافر مقدار میں آئل ہوتا کہ ہم دو چار دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے باوجود سلامتی سے مصر پہنچ جاتیں۔ وہ تو لیفٹرس کو بھی برا بھلا کہہ رہا تھا کہ آئل کی چوری اس کی مرضی یا اس کے اشارے سے ہوئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ لیفٹرس کو اس چوری سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ کیونکہ ہم محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ وہ تو بس اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا اور نکال رہا تھا پھر جب پانی کے راشن کو تقسیم کرنے کا وقت تو میں ایک آسٹریلین سے لڑ پڑا۔ وہ قسم کھا رہا تھا کہ اسے اپنے حصے کا پانی نہیں ملا حالانکہ میں نے خود اسے اپنے ہاتھ سے پانی دیا تھا۔

اس نے غصے میں آکر میری ٹھوڑی پر گھونسا مارا' تمام یونانی بپھر گئے کہ اس جھوٹی قسم کھانے والے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ بہرحال...... خدا خدا کر کے ہنگامہ ختم ہوا۔ ویسے جہاں تک یونانی لوگوں کا تعلق تھا ان میں اکثر اس صورتِ حال کو اپنی بدقسمتی کا نتیجہ کہتے اور سمجھتے ہوئے.... کسمپرسی کے عالم میں ایک طرف ڈھیر ہو گئے تھے لیکن لیفٹرس بڑے عجیب موڈی انداز میں ایک جانب بیٹھا ہوا سمندر کو گھور رہا تھا۔ چونکہ ہمارے پاس آئل نہ تھا اور ہم لہروں کے سہارے بہہ رہے تھے' اس لیے ہماری کشتی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے میں نے بادبان لگانے کی سوچی۔ لیفٹرس جو خاموش بیٹھا ہوا تھا مجھے کام کرتے دیکھ کر میرے ساتھ آملا۔ ہم نے دونوں کمبلوں کے بادبان بنائے اور لکڑی کی ایک بڑی سی پیٹی کے تختوں کو توڑ کر اور پھر انہیں لمبائی میں جوڑ کر مستول بنایا اور اسے اس سوراخ میں جمادیا جہاں کبھی مستول ہوا کرتا تھا اور اپنے بنائے ہوئے بادبان اس مستول سے باندھ دیے۔

سہ پہر کو ہم نے آپس میں دو پارٹیاں بنالیں اور باری باری لکڑی کے تختوں کی مدد سے کشتی کو کھینے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر جلد ہی تھک گئے اور بے دم ہو کر گر پڑے۔ شام کو ایک بار اور کوشش کی مگر ہمارے جسموں میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ اس محنت کو برداشت کرسکتے۔ ساتویں دن ہم سب کے سب انتہائی کمزوری اور ناتوانی محسوس کرنے لگے جب پانی کی آخری تقسیم کا وقت آیا تو میں اسپاینک کا طرزِ عمل اور حوصلہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ وہ اپنا حصہ لینے سے انکار کررہا تھا' اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اور تقریباً زبردستی صرف اپنی مرضی سے کشتی میں سوار ہوا تھا۔ اس لیے اسے ہمارے حصے کا پانی پینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ بڑے حوصلے کی بات تھی۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ وہ بیمار اور ہم سب سے زیادہ کمزور تھا مگر ہم نے اسے پانی پینے پر مجبور کردیا بلکہ اسے اس کے حصے سے بھی زیادہ دے دیا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ جہاں بھی ہوگا' بہت آرام سے ہوگا اس کے بارے میں جو آخری اطلاع مجھے ملی تھی۔ اس کے مطابق وہ یونان کی فضائیہ میں بہ طور اپرنٹس بھرتی ہوگیا تھا۔

پورے گروپ میں اپنی تکالیف اور مایوسی کے باوجود جو شخص سب سے زیادہ مستعد اور سرگرم عمل تھا۔ وہ سارجنٹ چارلس تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ' سمندر میں ڈالا اور دیکھا کہ وہ کتنی دیر میں کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتا ہے اور اس کی رفتار کا حساب لگا کر اس نے بتایا کہ اس وقت ہماری کشتی سمندری لہروں کے سہارے تقریباً ڈیڑھ ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس نے دو لکڑیوں کی مدد سے ایک زاویہ بنایا اور پتا نہیں کس طرح کیا کچھ کر کے یہ اندازہ لگایا کہ اس وقت ہم افریقا کے ساحل سے تقریباً سو میل شمال میں ہیں۔ وہ لوگ جو

کچھ حرکت کر سکتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حرکت کی ''زحمت'' کر سکتے تھے اپنے آپ کو سمندری پانی سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے' ہم نے اپنے سروں کے گرد اپنی اپنی قمیص گیلی کر کے باندھ لی تھی' کچھ یونانی باشندوں نے سمندر کا پانی پینے کی کوشش کی مگر ایک دو گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکے اس سے انہیں کچھ فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوا۔ ان میں سے ایک تو کسی طرح کے پاگل پن میں مبتلا ہو کر سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں نچانے لگا۔

آٹھویں دن پیاس اور تھکن سے ہماری بری حالت ہو رہی تھی۔ ہمارے ہونٹ چٹخنے لگے اور زبانیں متورم ہو گئی تھیں۔ ہم صرف اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے اِدھر اُدھر حرکت کر سکتے تھے۔ میں ہمیشہ سے یہ سنتا چلا آیا تھا کہ جب کسی کو یقینی موت سامنے نظر آ رہی ہو تو وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھتا ہے جنہیں وہ اپنے پیچھے گھر چھوڑ آیا ہے یا پھر اپنی زندگی کے خوش گوار دن یاد آتے ہیں یا جنت دوزخ کا تصور سامنے آ جاتا ہے مگر میرے ساتھ ان میں سے کوئی بات نہیں ہو رہی تھی' میں جب بھی کچھ سوچنے کی کوشش کرتا تو مجھے اپنے خیالات محض کھانے اور ٹھنڈی شراب کے گرد گھومتے محسوس ہوتے' آٹھویں دن جب سورج غروب ہو رہا تھا تو ہم نے اچانک ایک طیارے کے انجن کی آواز سنی۔ ہم نے فوراً سفید تولیے لہرانے شروع کر دیئے' میں نے کشتی کے سفید بادبان پر میلے اور سیاہی مائل ڈیزل آئل سے موٹے موٹے حروف میں لکھ دیا کہ ہمارے پاس پانی نہیں ہے' ہم نے یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا کہ اس حالت میں جو بھی بحری یا ہوائی جہاز نظر آیا' ہم اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں گے خواہ دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا؟ کیونکہ اب سوال دشمن کی قید یا آزادی کا نہیں تھا بلکہ ہماری اپنی جانوں پر بنی ہوئی تھی۔ ہم نے آئل میں بھیگے ہوئے کپڑے لکڑی کے تختوں کے سرے پر باندھ کر انہیں مشعل کی شکل دے دی تھی تاکہ اگر رات کے وقت اشارہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو انہیں جلا کر کام نکالا جائے۔

ایک سمندری طیارہ ہمارے سروں کے اوپر سے اتنا نیچے آ گیا کہ ہم اس کے بازوؤں کے نیچے بنے ہوئے نشانات بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ غالباً طیارے نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ہمارے چاروں طرف چکر کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ پائلٹ نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ بھی لہرائے' جوابی طور پر ہم نے بھی ہاتھ ہلائے۔ اپنے انگوٹھے اوپر اٹھا کر اشارے کیے اور خوشی کے جوش میں ایک دوسرے کو جھنجوڑ ڈالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طیارہ سمندر میں اترنے والا ہے مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ یکدم اوپر اٹھا اور رفتہ رفتہ ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔

ہم بڑے پُرامید تھے کہ طیارہ غالباً مدد لینے گیا ہے اور ایک دو گھنٹے کے اندر جنگی کشتیاں ہمیں بچانے کے لیے پہنچ جائیں گی لیکن جب رات ہو گئی اور کسی کشتی کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آیا تو ہمیں کچھ مایوسی ہوئی مگر زیادہ نہیں کیونکہ ہم سوچ رہے تھے کہ اگر اندھیرے کی وجہ سے وہ ہماری مدد کو اس وقت نہ آ سکے تو صبح کو ضرور آئیں گے مگر جب نویں دن بھی کہیں سے کوئی جنگی کشتی ہم تک نہ پہنچی تو ہم پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور دل گرفتہ ہو گئے۔ امید کا سہارا ٹوٹتا ہے تو ناکامی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک دکھائی دیتی ہے۔ اب ہم اتنے کمزور اور خستہ حال ہو چکے تھے کہ انتہائی کوشش کے بعد ہی کچھ حرکت کر سکتے تھے' ہمارے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور زبانیں اس قدر سوج گئی تھیں کہ بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

سفر کے ابتدائی دنوں میں جب پانی کی قلت محسوس ہونے لگی تو میں نے سمندری پانی کو گرم کر کے بھاپ بنانے اور پھر اس بھاپ کو مقطر پانی کی صورت میں ٹھنڈا کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر دوسروں نے اس کا مذاق اُڑایا تھا اور اگر کسی نے سنجیدگی سے میری اس تجویز کو سنا بھی تھا تو یہ اعتراض کر کے مسترد کر دیا تھا کہ ہمیں بہت زیادہ مقدار میں حرارت درکار ہو گی جو ہم اس موٹر بوٹ پر مہیا نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر میں نے دوبارہ اپنی تجویز پیش کی۔ کسی خاص مقدار میں پانی حاصل کرنے کی توقع کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس خیال سے کہ ہمارا دھیان بٹے اور خواہ کتنی ہی موہوم سہی مگر ایک امید ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے' سارجنٹ چارلس یہ سنتے ہی اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھا اور کسی نہ کسی طرح رینگتے ہوئے انجن تک جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ انجن سے جڑا ہوا ایک تانبے کا پائپ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچ گیا اور اس کی مدد کرنے لگا۔ ہم نے ایک پیٹرول کے ٹین کو آدھا کاٹا اور اس میں سوراخ کر کے پائپ لگا دیا۔ یہ ٹین گویا مقطر پانی کے لیے تھا۔ ایک دوسرا ڈھکنے والا ٹین لے کر اس میں نصف حصے تک سمندر کا پانی بھرا۔ یہ گویا ہمارا بوائلر تھا۔ اب وہ پائپ جو پہلے ٹین میں لگایا تھا' اس کا دوسرا سرا اس بند ٹین میں سوراخ کر کے داخل کر دیا۔ دونوں ٹینوں میں جہاں پائپ جوڑا تھا' اس کے کھلے ہوئے حصوں کو کپڑے کے ٹکڑوں سے اس طرح بھر دیا کہ بھاپ باہر نہ نکل سکے۔ پھر پائپ کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے گیلے کپڑے لپیٹ دیے گئے اور اس پر مسلسل ٹھنڈا پانی گرانے کا

انتظام کیا۔ ایک چولھا بنا کر پانی سے بھرا ہوا ٹین اس پر رکھ دیا گیا اور بہت سے پھٹے ہوئے کپڑے، ٹاٹ کے ٹکڑے، انجن صاف کرنے کی ڈیزل میں لتھڑی ہوئی صافیاں اور رومال ان سب کو ڈیزل آئل میں ڈبو کر چولھے میں ڈالا اور ماچس جلا کر آگ لگا دی۔

چند منٹ کے بعد بھاپ بننا شروع ہوگئی۔ ہم نے جوڑوں میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔ پھر بھی باریک باریک سوراخوں سے بھاپ باہر نکل رہی تھی، لیکن اس کے باوجود یقیناً بھاپ کا بڑا حصہ پائپ میں جارہا تھا۔ ہم بڑی مستعدی سے پائپ پر لپٹے ہوئے کپڑوں پر مسلسل سمندر کا ٹھنڈا پانی ڈالے جارہے تھے۔ مزید ٹھنڈک پہنچانے کے خیال سے ہم نے پہلے ٹین کو بھی بھیگے کپڑوں سے لپیٹ دیا۔ جب دوسروں نے ہمیں یہ سب کچھ کرتے دیکھا تو پہلے تو وہ چپ چاپ بیٹھے رہے مگر جب پائپ سے بھاپ ٹھنڈی ہوکر قطروں کی صورت میں پہلے ٹین میں گرنے لگی تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے اور چولھے کو برابر تیزی سے جلتا رکھنے اور پائپ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے میں ہماری مدد کرنے لگے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ٹین میں اتنا پانی جمع ہوگیا کہ ہم میں سے ہر ایک کے حصے میں تین تین گھونٹ آ گیا۔ پانی کی یہ مقدار قلیل ہی سہی مگر ہماری زندگی کا چراغ جلتا رکھنے کے لیے کافی تھی۔ خدا نے ہمیں بچالیا تھا۔ اب اس میں ہمیں شک نہیں رہ گیا تھا کہ آخرکار ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔

ہم محسوس کررہے تھے کہ اگر غذا نہ بھی ملے تب بھی ہم اس صورت سے پانی بنا کر کئی دنوں تک زندہ رہ سکتے ہیں اور اس دوران میں ہمارا ساحل تک پہنچنا یا کسی بحری جہاز اور جنگی کشتی وغیرہ کا ہمیں دیکھ لینا لازمی تھا۔

تین راتیں قبل ہم نے جرمن بمبار طیاروں کو نہر سوئز پر بمباری کرنے کے لیے جاتے دیکھا تھا اور ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر جرمن طیارے پھر بھی رات یا دن کے دوران دکھائی دیے تو ہم ضرور انہیں سگنل دیں گے۔ خواہ اس کے نتیجے میں ہمیں دوبارہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہی کیوں نہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد ہم نے تین چار گروپ بنائے تھے جو رات میں جاگ کر طیاروں کا انتظار کرتے تھے۔ ساتھ ہی مشعلیں بھی تیار تھیں تاکہ فوراً ہی انہیں جلا کر مدد کے لیے اشارہ دیا جاسکے۔

رات کے ایک بجے مجھے ایک یونانی باشندے نے سوتے سے اٹھا کر بتایا کہ وہ کسی انجن کی آواز سن رہا ہے۔ میں نے کان لگا کر غور سے سنا اور مجھے بھی کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کچھ طیارے ہماری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے فوراً مشعل روشن کی اور اسے آگے پیچھے لہرانے لگے۔

چند منٹ کے بعد انجن کی آواز پہلے سے زیادہ تیز اور زیادہ قریب سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے دل یہ دیکھ کر تقریباً دھڑکنا بھول گئے کہ رات کی تاریکی میں دو سیاہ دھبے اوپر فضا میں نہیں بلکہ سطح سمندر پر ہماری جانب بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ اور قریب آنے پر ہم نے پہچان لیا، وہ بحری جہاز تھے۔ ہم اپنے خشک گلوں اور سوجی زبانوں سے جتنا بھی چیخ سکتے تھے، چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگے۔ دو اور مشعلیں روشن کردیں اور باری باری انہیں زور زور سے ہلانے لگے۔ جہاز اور قریب آئے مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ ہماری چیخ پکار سے بالکل بے پروا اپنے راستے پر لگے چلے جارہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہماری آنکھوں سے حسرت کے مارے آنسو بہہ نکلے، مایوسی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم شاید اس حد سے بھی گزرنے والے تھے۔ جسم و جان کی پوری قوت سے ہم ایک بار پھر چیخے اور اس مرتبہ سب کے سب ایک ساتھ چیخے۔ مشعلیں لہرائیں اور تب آخرکار ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ان میں سے ایک جنگی جہاز واپس لوٹا اور اس بار بالکل ہماری سیدھ میں آگے بڑھا۔ پھر وہ ہماری کشتی کے جتنا قریب آ سکتا تھا آ کر رک گیا۔

''اے! تم لوگ کون ہو؟'' وہاں سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔

''ہم برطانوی جنگی قیدی ہیں اور یونان سے بھاگ کر آرہے ہیں۔''

چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر جہاز سے سرچ لائٹ کی روشنی ہماری طرف ڈالی گئی ''کشتی پر تم لوگ کتنے افراد ہو؟'' ہم سے پوچھا گیا۔

''چار انگریز، ایک پول اور دس یونانی۔ تم لوگ کون ہو؟''

''یہ ایک برطانوی جنگی جہاز ہے، جس کا نام 'جیکال' ہے۔'' جواب ملا ''تیار رہو، ہم تمہاری کشتی پر آرہے ہیں۔''

جہاز کچھ اور قریب آیا، محفوظ زاویہ اختیار کیا اور پھر کچھ لائف بوٹس پانی میں ڈالی گئیں۔ تین تین، چار چار کر کے ہم لوگ جنگی جہاز پر پہنچا دیے گئے۔ لیفٹس نے کشتی پر ہی رہنے کا فیصلہ کیا جسے جنگی کشتی سے باندھ کر کھینچا جارہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ حقیقت میں ہم ساحل سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر تھے!



Sanned by Faisal



کالا طوفان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

معاہدہ دو افراد کے درمیان ہو یا دو اقوام کے مابین، اس کی پاس داری نہ کرنے والا مہذب نہیں کہلا سکتا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ معاہدے کے فریقین میں اگر توازن نہ ہو تو ایسے معاہدے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے۔

جوع الارض کے مرض میں مبتلا جنگی جنونیوں کا ماجرا

ہٹلر ۱۹۳۵ء میں برسرِ اقتدار آیا۔

اس کے بعد یورپ کی فضا بڑی تیزی سے تیرہ و تار ہوتی چلی گئی۔ اب تک جرمنی خفیہ جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اب اس کی فیکٹریاں کھلے عام سامانِ جنگ بنانے لگیں۔ جرمن فضائیہ اور بری افواج کو ازسرِنو وسیع بنیادوں پر منظم کیا گیا۔ ہر صحت مند شہری کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دے دی گئی۔ جرمنی کے عزائم کھل کر سامنے آگئے تھے۔ آسٹریلیا پر ہٹلر کی نگاہیں پڑنے لگی تھیں۔ ۲۴ مارچ کو سر جان سائمن، لارڈ یوی سیل، مسٹر وائنڈز کے ہمراہ ہٹلر کی دعوت پر برلن گیا۔ فرانسیسی حکومت کے نزدیک سر جان سائمن نے دورے کا بالکل غلط وقت منتخب کیا تھا۔ فرانس ایک نئی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ وہ جنگی تیاریوں اور فوجوں میں توسیع کا سخت مخالف تھا۔ اس کے سیاست دان رائے عامہ کو اس نہج پر تیار کرتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنی فوجیں بڑھانے اور انہیں جدید ترین اسلحے سے لیس کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

فرانسیسی کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان اقدامات کے سخت مخالف تھے اور رائے عامہ کو بھڑکانے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں ایک نیا شوشہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹلی کا مسولینی، جنوب مشرقی یورپ کے معاملے میں برطانیہ اور فرانس کا ہم نوا تھا لیکن افریقا میں وہ ابی سینیا (حبشہ) کو ہڑپ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

یورپ کی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے اسٹریسا میں کانفرنس منعقد ہوئی اور اتفاقِ رائے سے طے پایا کہ معاہدوں کی خلاف ورزی برداشت نہیں کی جائے گی۔ تاہم خلاف ورزیوں کو روکنے کے لیے برطانیہ مصلحتاً کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح کانفرنس نشستند و گفتند و برخاستند...... سے آگے نہ بڑھی۔

۲ مئی کو فرانس اور روس کے درمیان پنج سالہ معاہدہ طے پایا جس کے تحت دونوں حکومتوں نے عہد کیا کہ جارحانہ حملے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ معاہدے کے بعد فرانسیسی وزیرِاعظم لاول سہ روزہ دورے پر ماسکو گیا۔ فرانسیسی کمیونسٹ اور ان کے ہم سفر دفاعی تیاریوں کے سخت مخالف تھے۔ کمیونسٹ لیڈر تھورز نے تو صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ نام نہاد جمہوریت کو فاشزم سے بچانے کے نام پر محنت کش طبقوں کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کی کوئی کوشش ہم برداشت نہیں کریں گے۔ لاول چاہتا تھا ماسکو انہیں قومی دفاع

کے پروگرام کی حمایت پر آمادہ کرے اور وہ اس مقصد میں کامیاب رہا۔ ۱۵ مئی کو ایک اعلامیہ جاری ہوا۔ جس میں اسٹالن نے فرانسیسی حکومت کے وضع کردہ قومی دفاعی پروگرام کی حمایت کی تھی۔ اعلامیہ شائع ہونا تھا کہ فرانسیسی کمیونسٹ اپنے مؤقف سے الٹے پاؤں پھر گئے اور ''محنت کش طبقوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دینے والے'' پروگرام کی پرجوش حمایت کرنے لگے۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کردیا۔ اٹلی دراصل ایک مدت سے اس دور کی پالیسی پر گامزن تھا جب سفید چمڑی والے، زرد، کالے، بھورے یا سرخ آدمیوں کو فتح کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس سال پہلے بھی اس نے ابی سینیا پر حملہ کیا تھا۔ مگر اڈووائے کے مقام پر شرمناک شکست کھائی تھی۔ اس وقت سے وہ رسوائی کا انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ مسولینی اٹلی میں برسرِاقتدار آیا تو اس نے ماضی کے اس بدنما داغ کو دھونے اور ابی سینیا کو اپنی نوخیز سلطنت میں شامل کرکے اٹلی کا وقار یورپ کی نظر میں بلند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجلس اقوام کے ایک رکن نے دوسرے رکن پر حملہ کردیا تھا اور یہ سوال پیدا ہوگیا تھا کہ جس ادارے سے دنیا کے تمام اچھے لوگوں نے خوش آئند امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، وہ اپنے ایک طاقت ور رکن کی دستبرد سے دوسرے کمزور ملک کو بچاتا ہے کہ نہیں۔ میرے نزدیک کوئی بھی ایسا اقدام مصلحت اور دانشمندی کے خلاف تھا، جس سے اٹلی مخالف کیمپ میں چلا جائے۔ ۱۰ اکتوبر کو مجلس اقوام کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں ایک کے مقابلے میں پچاس ووٹوں سے اٹلی کے خلاف اجتماعی اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور مسئلے کا پرامن حل تلاش کرنے کے لیے اٹھارہ ارکان کی ایک کمیٹی بنادی گئی۔ مسولینی نے جواب میں اعلان کیا کہ اٹلی مجلسِ اقوام کے فیصلے کا مقابلہ نظم وضبط، کفایت شعاری اور قربانی وایثار سے کرے گا۔ تاہم وہ اپنے مقصد (فتح ابی سینیا) کی راہ میں حائل ہونے والی کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائے گا اور اس کے خلاف جنگ کرے گا مگر رکاوٹ پیدا ہی کب ہوئی تھی کہ اٹلی کو مجلسِ اقوام کے خلاف محاذ آرائی کی ضرورت پڑتی۔ مجلسِ اقوام نے اقدامات تجویز کرتے وقت بڑی احتیاط برتی تھی۔ اس نے بہت سی اشیا اٹلی بھیجنے سے روک دی تھیں۔ ان میں بعض جنگ میں کام بھی آتی تھیں لیکن تیل، جس کے بغیر اٹلی ایک دن بھی جنگ نہ لڑ سکتا تھا، برابر بھیجا جاتا رہا۔ مجلسِ اقوام نے المونیم پر بھی پابندی لگادی لیکن یہ دھات خود اٹلی میں ضرورت سے زیادہ نکلتی تھی۔ یہی کیفیت لوہے کی تھی۔ یعنی خود لوہا اٹلی کے لیے بیکار تھا، اس پر پابندی لگادی گئی اور جس لوہے کی اسے ضرورت تھی، وہ بہ دستور ملتا رہا۔ ابی سینیا بڑی بہادری سے لڑا، اٹلی نے زہریلی گیس تک استعمال کی، تب کہیں وہ ''ابی سینیا'' پر قبضہ کرسکا۔

اس جنگ کے دوررس نتائج نکلے۔ اسٹریسا کانفرنس کا معاہدہ ختم ہوگیا۔ اٹلی، جرمنی سے جاملا۔ جرمنی کا ردِعمل یہ تھا کہ برطانیہ کمزور ہوچکا ہے اور اس میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی طاقت نہیں جس سے جنگ کی آگ بھڑک اٹھے۔ اس ردعمل نے ہٹلر کے حوصلے اور بلند کردیے۔ ابی سینیا پر اٹلی کی جارحیت سے پہلے میکڈانلڈ، برطانیہ کے وزارتِ عظمٰی سے مستعفی ہوچکا تھا اور اس کی جگہ بالڈون نے لے لی تھی۔ فرانس کے وزیراعظم لاول نے تجویز پیش کی کہ ابی سینیا کو اٹلی اور شہنشاہِ حبش میں تقسیم کردیا جائے۔ بالڈون وزارت نے یہ تجویز منظور کرلی۔ برطانوی رائے عامہ کو اس سے زبردست صدمہ پہنچا۔ بالڈون نے یہ شرمناک فیصلہ واپس لے لیا مگر اس بحران سے اس کی سیاسی زندگی تقریباً ختم ہوکر رہ گئی۔ وہ ایک رات کے اندر اندر قومی قیادت کی بلندیوں سے گر کر نفرت اور تضحیک کا سامان بن گیا۔

☆☆☆

ہٹلر کی قوت روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے اقدامات کرکے معاہدۂ ورسائی کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ جنگی تیاریوں کے ساتھ ساتھ ہٹلر کی کوشش یہ تھی کہ مغربی طاقتیں روس کے ساتھ تعلقات استوار نہ کریں۔ فرانس نے سوویت روس کے ساتھ ایک معاہدے پر مئی کے مہینے میں دستخط کیے تھے لیکن ابھی تک اس کی توثیق نہ ہوسکی تھی۔ لاول کو برلن نے متنبہ کیا کہ اگر اس نے معاہدے کی توثیق کی تو جرمنی اور فرانس کے درمیان مفاہمت کی آخری کرن بھی دم توڑ دے گی۔ فرانس معاہدے کی توثیق کا فیصلہ کرچکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر جرمنی کی طرف سے اس کا ردِعمل یہ ہو کہ وہ معاہدۂ لوکارنو کی خلاف ورزی پر تل جائے تو فرانس اور برطانیہ کس حد تک جانے کو تیار ہوں گے۔ آخر طے پایا کہ جرمنی نے معاہدۂ لوکارنو کی خلاف ورزی کی تو فرانس اپنی مسلح افواج مجلسِ اقوام کے سپرد کردے گا اور برطانیہ معاہدے کے مطابق فرانس کی مدد کرنے کا پابند ہوگا۔ فرانسیسی پارلیمنٹ نے ۲۷ فروری کو سوویت فرانس معاہدے کی توثیق کردی۔ اگلے ہی دن فرانسیسی سفیر نے جرمن حکومت سے رابطہ قائم کرکے پوچھا ''فرانس اور جرمنی کے درمیان مفاہمت کن بنیادوں پر ہوسکتی ہے؟'' ہٹلر نے جواب میں غوروخوض کرنے کے لیے چند روز کی مہلت مانگی۔ ۷ مارچ کو جرمن وزیرخارجہ ہرفان نیورتھ نے برطانیہ، فرانس، بیلجیم اور اٹلی کے سفیروں کو وزارت

ہمارے کے دفتر میں بلایا اور اعلان کیا کہ جرمنی ۲۵ برس کے لیے معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

اسی روز سہ پہر کے وقت اس اعلان کے صرف دو گھنٹے بعد ہٹلر نے ایشاغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ رائن لینڈ پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جرمن فوجیں رائن لینڈ میں داخل ہو رہی تھیں اور جرمن عوام ہر جگہ جوش و خروش سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ہٹلر نے اعلان کیا کہ محض ایک علامتی قبضہ ہے۔ جرمن سفیر متعینہ لندن نے مسٹر ایڈن کو پچیس سالہ معاہدے کی دوبارہ پیش کش کی جسے اس نے بڑے سخت الفاظ میں ٹھکرا دیا۔ فرانس بری طرح تلملا رہا تھا لیکن برطانیہ کے غیر سرکاری حلقوں کا ردِعمل بالکل مختلف تھا۔ برطانوی پریس کی رائے یہ تھی کہ آخر جرمن اپنے ہی ملک میں تو جا رہے ہیں۔ ہمیں اگر دس پندرہ سال کے لیے یارک شائر سے بے دخل کر دیا جاتا تو ہمارے احساسات کیا ہوتے؟

لائڈ جارج نے کہا "میری رائے میں ہٹلر نے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کوئی جرم نہیں کیا۔ کیونکہ اشتعال انگیزی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہیے۔"

ادھر فرانس میں زبردست اختلافِ رائے تھا۔ بہ حیثیتِ مجموعی سیاست داں جنگی بھرتی اور ہٹلر کو الٹی میٹم دینے کے حق میں تھے لیکن جرنیل، جرمن جرنیلوں کی طرح صبر و سکون اور توقف کی حمایت کر رہے تھے۔ ان دنوں ہٹلر اور جرمن جرنیلوں میں شدید اختلاف رائے موجود تھا۔ اگر حکومتِ فرانس جرأتِ رندانہ سے کام لے کر ایک سو ڈویژن بری فوج اور فضائیہ میدان میں لے آتی تو جرمن ہائی کمان ہٹلر کو رائن لینڈ سے چلے آنے پر مجبور کر دیتی اور خود اتحادیوں کے لیے بھی اس کی مدد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا مگر وہ اتحادیوں خصوصاً برطانیہ پر تکیہ کیے بیٹھا رہا اور برطانیہ مذاکرات اور سوچ بچار سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ برطانیہ اور فرانس کے طرزِ عمل سے صاف عیاں تھا کہ وہ نہ صرف کمزور ہیں بلکہ یک جہتی سے بھی محروم ہیں۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو بالڈون ریٹائر ہو گیا اور اس کی جگہ نیول چیمبرلین وزیراعظم بنا۔

☆☆☆

۱۹۳۷ء کا ایک دن تھا۔

جرمن سفیر ربن ٹراپ نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے جرمن سفارت خانے میں اس سے ملاقات کی۔ دو گھنٹے تک یورپ کی سیاست، تخفیفِ اسلحہ اور برطانیہ کی پالیسی پر باتیں ہوتی رہیں، ربن ٹراپ نے کہا۔

"جرمنی، برطانیہ سے دوستانہ روابط استوار کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر سرد و گرم میں برطانیہ کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ بس ایک شرط ہے، جرمنی کی بڑھتی ہوئی آبادی کو رہنے کی جگہ چاہیے۔ اس کے لیے پولینڈ اور ڈینزگ کوریڈور کا جرمنی کے ساتھ الحاق نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے سات کروڑ عوام کا مستقبل محفوظ رکھنے کے لیے سفید روس اور یوکرین کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ برطانیہ مداخلت نہ کرے۔" میں نے جواب دیا۔

"برطانوی حکومت، جرمنی کو کھیل کھیلنے کی کبھی اجازت نہ دے گی۔ بے شک ہمیں کمیونزم سے نفرت ہے مگر جرمنی کے وسطی اور مشرقی یورپ پر تسلط جمانے سے جو مسائل پیدا ہوں گے ان سے ہم لاتعلق نہیں رہ سکتے۔" ربن ٹراپ نے کہا "پھر جنگ ناگزیر ہے۔ فیوہرر فیصلہ کر چکا ہے۔" میں پارلیمنٹ کا پرائیویٹ رکن تھا تاہم کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے جواب دیا "جنگ کی باتیں کرتے وقت تمہیں انگلستان کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ بہت ہوشیار ہے، جنگ چھڑ گئی تو پوری دنیا کو جرمنی کے خلاف صف آرا کر دے گا۔" ربن ٹراپ جوش میں آ گیا، کہنے لگا "اوہ! انگلستان ہوشیار ہے..... ہوگا لیکن اب کے وہ دنیا بھر کو جرمنی کے مقابلے میں نہ لا سکے گا۔"

☆☆☆

ہٹلر نے ۱۹۳۶ء کے وسط تک جتنے اقدامات کیے وہ سب اس جواری کے سے تھے جو محض ایک موہوم امید میں اپنی ساری متاع داؤ پر لگا دیتا ہے۔ فرانس اور برطانیہ میں اتفاقِ رائے نہ تھا۔ امریکا الگ تھلگ رہنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ ہٹلر کو اچھی طرح خبر تھی کہ اتحادی اس کے چیلنج کا جواب نہیں دے سکتے لیکن ۱۹۳۸ء تک وہ محض جواری نہ رہا، اب وہ کیل کانٹے سے لیس ہو چکا تھا۔ یورپ بھر میں کسی ملک کی بحری، بری اور فضائی طاقت اس کے برابر نہ تھی۔ فروری ۱۹۳۸ء میں اس کی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ آسٹریا کا حصول ہٹلر کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ "مین کیف" (میری جدوجہد) کے پہلے ہی صفحے پر یہ فقرہ لکھا ہوا تھا "جرمن آسٹریا، عظیم جرمنی مادرِ وطن کو واپس ملنا چاہیے....." آسٹروی نازیوں نے زیرِ زمین سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ ہٹلر کا مطالبہ تھا کہ آسٹروی حکومت میں نازی پارٹی کے ارکان بھی شامل کیے جائیں۔ بویریا میں آسٹروی ایجنٹس کو باقاعدہ تربیت دی جا رہی تھی۔ ریل گاڑیوں اور سیر و سیاحت کے مراکز میں بم پھٹنے کے واقعات عام ہو چکے تھے، جرمن طیارے، آسٹریا کے شہروں پر پمفلٹ اور دستی اشتہار پھینک

رہے تھے۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں ہٹلر نے آسٹریا میں بغاوت کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ علانیہ اپنی فوجیں اس لیے داخل نہ کیں کہ بیلجیم اور فرانس کی سرحدوں پر ابھی وہ پوری طرح تیار نہ تھا پھر مسولینی بھی مزاحمت کر رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے آغاز تک اس نے رائن لینڈ میں قلعہ بندیاں مکمل کر لیں۔ تاہم بہ ظاہر اس کی زبان پر امن وصلح کی باتیں تھیں۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو اس نے ریشٹاغ میں اعلان کیا کہ جرمنی نہ تو آسٹریا کے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑانے کا ارادہ رکھتا ہے اور نہ اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء کو اس نے حکومتِ آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس میں اقرار کیا کہ وہ نہ تو آسٹریا کے اندرونی معاملات پر کسی صورت اثر انداز ہوگا اور نہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی (نازی پارٹی) کی کوئی مدد کرے گا۔

معاہدہ ہوئے پانچ دن ہی گزرے تھے کہ آسٹریا کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو خفیہ ہدایات جاری کر دی گئیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں زیادہ تیز اور وسیع کر دے۔ ساتھ ہی جرمن جنرل اسٹاف نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

۱۹۳۷ء کے اواخر تک یورپ کے نقشے میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ فرانس کے مقابلے میں سگفرڈ لائن کھڑی کر دی گئی جسے فرانس ان گنت قربانیوں کے بعد ہی توڑ سکتا تھا۔ مسولینی ابی سینیا کے مسئلے پر خفا ہو کر جرمنی سے جا ملا تھا۔ ہٹلر کے اقدامات پر مغربی طاقتیں خاموش تھیں۔ جرمنی کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک براہ راست ان پر حملہ نہ ہوگا، وہ بڑے سے بڑا اقدام برداشت کرتی چلی جائیں گی۔

ہٹلر نے آسٹریا کے چانسلر ہر فان شوشنگ کو جرمنی آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے وزیرِ خارجہ کے ساتھ آیا۔ ہٹلر نے دھمکی دی کہ آسٹریا صرف آدھ گھنٹے کی مار ہے۔ ''سرحدوں پر تم نے جو ''دفاعی سوانگ'' رچا رکھا ہے، سب دھرا رہ جائے گا۔ جرمن فوجیں طوفان کی طرح چھا جائیں گی اور پھر ان کے ہاتھوں جو کچھ ہوگا تم اس سے بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ انہیں اپنی آتشِ انتقام بجھانے سے کوئی روک نہ سکے گا، خود میں بھی......'' فان شوشنگ کا جواب تھا ''چانسلر! ہم دنیا میں تنہا نہیں۔ ویانا پر حملے کا مطلب ہوگا جنگ۔''

''غلط فہمی دماغ سے نکال دو، آسٹریا کی خاطر کوئی ملک انگلی تک نہیں ہلائے گا۔'' ہٹلر نے کہا۔

پچھلے پہر تین مطالبات پر مشتمل الٹی میٹم شوشنگ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔

۱۔ آسٹریا کے نازی لیڈر زائیں انکارٹ کو کابینہ میں لیا جائے اور وزارتِ تحفظ مملکت اس کے حوالے کی جائے۔

۲۔ آسٹریا کی نازی پارٹی کو حکومت کی سرپرستی میں بننے والے وطن محاذ میں شامل کیا جائے۔

۳۔ سارے نازی قیدیوں کو فی الفور رہا کیا جائے۔

خیریت چاہتے ہو تو یہ مطالبات بلا جھجک قبول کر لو......

اور...... شوشنگ نے تین روز کے اندر اندر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

مگر ابھی ڈراما ختم نہیں ہوا تھا۔

مسولینی نے اندر ہی اندر شوشنگ کے مؤقف کی حمایت کی۔ شوشنگ نے ۱۳ مارچ کو ملک میں استصوابِ رائے کرانے کا اعلان کر دیا۔ ۱۱ مارچ کو دوپہر کے وقت زائیں انکارٹ گورنگ کا پیغام لے کر پہنچا۔ ''استصوابِ رائے کا اعلان ایک گھنٹے کے اندر اندر منسوخ کر دو۔ ورنہ جرمن فوجیں حرکت میں آ جائیں گی۔'' شوشنگ نے یہ مطالبہ مان لیا۔ ہٹلر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

''اب یوں کام نہیں بنے گا۔ شوشنگ فوراً مستع... ہو جائے اور زائیں کو دو گھنٹے کے اندر اندر چانسلر نامزد کر... جائے۔ بہ صورتِ دیگر جرمن فوجیں...... ہلا بول دیں گی۔''

شوشنگ نے صدر مکلاس سے ملاقات کی اور اپنا استع... پیش کر دیا۔ وہیں قصرِ صدارت میں (اطالوی) حکومت کا ایک خف... پیغام پہنچا کہ وہ کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہے۔ بوڑھا صد... اکڑ گیا۔

''گویا فیصلہ کن گھڑی میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔''

اس نے نازی لیڈر کو چانسلر نامزد کرنے سے صاف ا... کر دیا۔ جرمن فوجیں حرکت میں آ گئیں۔ آسٹروی فوج نے کوئی خاص مزاحمت نہ کی۔ ہٹلر ۱۳ مارچ کو فاتح اور ہیرو کی شان سے ویانا میں داخل ہوا۔ جمہوریہ آسٹریا نے دم تو... اور آسٹریا جرمنی میں مدغم کر دیا گیا۔

☆☆☆

آسٹریا پر جرمنی کے قبضے سے پورا یورپ دہل گیا۔ ر... کا ردِ عمل بڑا شدید تھا۔ ۱۸ مارچ کو اس نے کانفرنس بلا... مطالبہ کیا تا کہ خطرے کی صورت میں سوویت فرانس معاہ... کو عملی جامہ پہنانے کے طور طریقوں پر سوچ بچار کی جا... لیکن پیرس اور لندن نے کچھ زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ ن... فرانسیسی حکومت داخلی مسائل سے دوچار تھی۔ چیمبر لین... شکستہ بھی تھا اور متذبذب بھی۔ اس نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۸... دارالعوام میں روس کی پیش کردہ تجویز پر تبصرہ کرتے ہو... ''اس قسم کے مجوزہ اقدام سے صورتِ حال اور بگڑ... گی۔''

آسٹریا کے بعد چیکوسلواکیہ کی باری تھی۔ جرم...

امان، ہٹلر کی ہدایت پر جون ۱۹۳۷ء ہی سے اس ملک پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانے میں مصروف تھی۔ ۲۰ فروری ۱۹۳۸ء کو ہٹلر نے پہلی مرتبہ چیکوسلواکیہ کا ذکر جرمن پارلیمنٹ میں کیا اور کہا۔ "ایک کروڑ سے زیادہ جرمن ہماری سرحدوں سے متصل دو ملکوں میں رہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حفاظت کریں۔ انہیں شخصی، سیاسی اور نظریاتی طور پر آزاد ہونے میں مدد دیں۔" ہٹلر کا مقصد صرف چیکوسلواکیہ کے جرمنوں کا تحفظ ہی نہ تھا بلکہ وہ روسی فضائیہ کو نہایت اہم جنگی اڈے سے محروم اور جرمنی کو عقب سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ ۱۴ مارچ کو فرانسیسی وزیراعظم مسٹر بلوم نے چیک سفیر سے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ فرانس نے چیکوسلواکیہ کے ساتھ جو معاہدہ کر رکھا ہے، وہ اس کا بلا تامل پورا پورا احترام کرے گا لیکن یہ ساری یقین دہانیاں ڈپلومیسی پر مبنی تھیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو اٹلی اور برطانیہ میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ درحقیقت اٹلی کی فتح کے مترادف تھا۔ برطانیہ نے تسلیم کرلیا کہ اٹلی ابی سینیا اور اسپین میں من مانی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں اٹلی نے وسطی یورپ کے معاملے میں خیر جانبداری کا طرزِ عمل اختیار کرنے کا وعدہ کیا۔ اب چیمبرلین سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ ایسا ہی ایک معاہدہ جرمنی سے کرکے اختلاف کی خلیج پاٹ لی جائے۔

۲۴ اپریل کو سوڈٹن لینڈ کی نازی پارٹی کے لیڈر ہنلن نے مطالبہ کردیا کہ جرمن سرحد سے متصل چیکوسلوویکی علاقوں کو خودمختاری دی جائے۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبر پہلے ہی تلقین کر رہے تھے کہ اس کی حکومت یورپ میں امن قائم رکھنے کی خاطر اعتدال سے کام لے۔ اب پراگ میں دونوں ملکوں کے سفیروں نے چیک وزیرِ خارجہ سے ملاقات کی اور امید ظاہر کی کہ اس کی حکومت کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کرے گی۔

مئی ۳۸ء میں چیکوسلواکیہ میں رہنے والے جرمنوں نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کردیں۔ انہی دنوں وہاں بلدیاتی انتخابات ہونے والے تھے۔ ہٹلر نے ان پر اثر انداز ہونے کے لیے اعصابی جنگ چھیڑ دی۔

مسلسل افواہیں پھیلنے لگیں کہ جرمن افواج تیزی سے پیش قدمی کر رہی ہیں۔ چیک حکومت نے بھی اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔

۲۸ مئی کو ہٹلر نے اپنے خصوصی مشیروں کا اجلاس طلب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ کسی وقت بھی حملہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ جرمن جرنیل، ہٹلر کی رائے سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا ہمیں چند سال اور انتظار کرنا چاہیے تاکہ جرمن فوج یورپ کی سب سے طاقتور اور عظیم فوج بن جائے۔ موجودہ حالات میں خطرات مول لینے کا تصور ان کے لیے بے حد دہشت ناک تھا۔ فرانس اور برطانیہ یقیناً خاموش نہیں رہیں گے۔ چیکوسلواکیہ کی اپنی فوج بھی نرم چارہ نہ تھی مزید برآں روس کا خطرہ بھی تھا جس کے چیکوسلواکیہ کی ریاست اور اس کے صدر کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات تھے۔ صدر بینز نے ۱۹۳۷ء میں اسٹالن کو اس سازش کی خبر دی تھی جو روسی فوج کے افسر اور پرانے کمیونسٹ اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پراگ کے سوویت سفارت خانے کی وساطت سے جرمنوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس انکشاف پر اسٹالن نے کیپٹن سے اوپر کے رینک والے پانچ ہزار فوجی افسر موت کے گھاٹ اتار دیے تھے۔ تاہم جرمن جرنیلوں کی ایک نہ چلی۔ جون کے مہینے میں ڈپلومیٹک سرگرمیاں پورے زوروں پر تھیں۔ ۱۸ جون کو ہٹلر نے چیکوسلواکیہ پر حملہ کرنے کے لیے آخری ہدایات جاری کردیں۔ جولائی میں ہٹلر کا ذاتی معاون کیپٹن وائڈمین برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ ہیلی فیکس سے ملا۔ وائڈمین نے کہا۔

"ہٹلر نے مصالحت کی جو پیش کش کی تھی، برطانیہ کی طرف سے جواب نہ ملنے پر اس کی عزتِ نفس کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ اب گورنگ مذاکرات کے لیے لندن آنا چاہتا تھا۔ جرمنی، چیکوسلواکیہ کے خلاف کارروائی سال بھر کے لیے ملتوی کردے گا۔" چیمبرلین تو خود مصالحت چاہتا تھا۔ اس نے مذاکرات کے لیے فضا سازگار بنانے کی تگ و دو شروع کردی۔ لارڈ رنگی مین کو پراگ بھیجا تاکہ چیکوسلوویکی حکومت اور نازی لیڈر ہنلن میں مصالحت کرائے۔ پندرہ روز تک مذاکرات ہوتے رہے مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ واقعات کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ بہنے لگا۔ ڈپلومیٹک سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مختلف ملکوں کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ جرمن وزیرِ خارجہ ربن ٹراپ اٹلی سے بات چیت کر رہا تھا۔ ماسکو میں فرانسیسی سفارت خانے کا ناظم الامور روسی وزیرِ خارجہ سے مصروفِ گفتگو تھا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو وزیرِ خارجہ فرانس نے برطانوی سفیر متعینہ پیرس سے کہا "ہٹلر چیکوسلواکیہ پر حملہ کردیتا ہے، فرانسیسی فوجیں فوراً حرکت میں آجاتی ہیں۔" فرانس کہتا ہے "ہم تو مارچ کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی ہمارا ساتھ دیتے ہو؟ برطانیہ کا جواب کیا ہوگا؟"

۱۲ ستمبر کو لارڈ ہیلی فیکس نے برطانوی کابینہ کا جواب اپنے سفیر کی وساطت سے فرانس کو بھیج دیا "ہز میجسٹی کی حکومت، فرانس کی سلامتی اور اس کے وجود کو کبھی خطرے میں نہ پڑنے

دے گی۔ تاہم وہ کس قسم کے اقدامات کرے گی اور کب کرے گی؟ سردست ٹھیک ٹھیک کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

فرانسیسی حکومت نے پھر دریافت کیا ''فرانس کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا تو برطانیہ کیا مدد کرے گا؟'' جواب آیا۔ ''جنگ کے پہلے چھ مہینوں میں دو ڈویژن غیر مشینی فوج اور ایک سو پچاس طیارے۔''

فرانس چیکوسلواکیہ کو اس کی قسمت کے سپرد کر دینے کے لیے اگر کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا تو برطانیہ نے مہیا کر دیا۔ ۱۲ ستمبر کو ہٹلر نے نورمبرگ کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے چیکوسلواکیہ پر شدید حملے کیے۔ جواب میں چیکوسلووکی حکومت نے اگلے روز ہی ملک کے بعض حصوں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ ۱۵ ستمبر کو نازی لیڈر ہنلن بھاگ کر جرمنی چلا گیا۔ بحران نقطۂ کمال پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

۱۳، ۱۴ ستمبر کی درمیانی رات فرانسیسی وزیراعظم نے چیمبرلین سے رابطہ قائم کیا اور ہٹلر سے شخصی سطح پر مشترکہ ملاقات کرنے کی تجویز پیش کی۔

چیمبرلین پہلے ہی جرمنی کے ساتھ سلسلہ جنبانی شروع کر چکا تھا۔ اسی شام ہٹلر نے اسے میونخ آنے کی دعوت دے دی۔ ۱۵ ستمبر کو سہ پہر کے وقت برطانوی وزیراعظم میونخ پہنچ گیا۔ وقت کا انتخاب بے حد غلط تھا۔ چیکوسلووکی لیڈر تو دم بہ خود ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے فوری اقدامات کر کے سوڈٹن لینڈ کے حالات پر قابو پا لیا تھا۔ نازی لیڈر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے اور سوڈٹن نازی پارٹی میں راست اقدام کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ چیکوسلووکی حکومت سوڈٹن لینڈ کو علاقائی خودمختاری دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ ان حالات میں چیمبرلین کا دورہ ظاہر کرتا تھا کہ برطانیہ تصادم سے بہرصورت گریز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کمزوری سے سوڈٹن لینڈ نے پورا فائدہ اٹھایا اور برلن کے اشارے پر جرمنی کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ یہ پہلی خبر تھی جو میونخ پہنچنے کے بعد چیمبرلین کو ملی۔

ہٹلر سے ملاقات کے بعد ۱۷ ستمبر کو چیمبرلین واپس لندن آ گیا اور کابینہ میں چیکوسلواکیہ کے متعلق نئی پالیسی پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جرمن اکثریت والے چیکوسلووکی علاقے جرمنی کے حوالے کر دیے جائیں۔ وہ صرف اسی صورت میں ہٹلر کی دستبرد سے بچ سکتا ہے۔

۱۸ ستمبر کو فرانسیسی وزیراعظم لندن پہنچا۔ برطانیہ اور فرانس نے مل کر تجاویز مرتب کیں جنہیں دونوں ملکوں کے سفیروں نے ۲۰ اور ۲۱ ستمبر کی رات پراگ میں صدر بینز کے سامنے رکھ دیا۔ برطانیہ تو بری الذمہ تھا۔ اس نے چیکوسلوا سے باضابطہ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن فرانس نے معاہدے رو سے زبان دی تھی کہ وہ چیکوسلواکیہ کو جارح سے محفوظ ر کے لیے بے چون وچرا مدد کرے گا مگر اب اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

صدر بینز فرانس اور برطانیہ کے دباؤ کے آگے جھکنے مجبور ہو گیا۔

انگلستان اور فرانس کے اس شرمناک طرز عمل کا نتیجہ نکلا کہ چیکوسلووکی حکومت مستعفی ہو گئی اور جنرل سائیروِن سربراہی میں غیر جماعتی حکومت نے زمام اقتدار سنبھال لی۔ ۲۲ ستمبر کو صدر بینز نے قوم سے خطاب کیا اور پرسکون رہنے درخواست کی۔ ٹھیک اس وقت چیمبرلین، ہٹلر سے دوسری ملنے کے لیے دوش ہوا پر میونخ جا رہا تھا۔ اب کے گاڈسبرگ میں ملاقات ہوئی۔ برطانوی وزیراعظم وہ اینگلو فرانسیسی تجاو لے کر آیا تھا جو چیکوسلواکیہ نے منظور کر لی تھیں اور جو ملاقات میں ہٹلر کی طرف سے پیش کردہ اصولوں کے عین مطابق تھیں۔ لیکن ہٹلر نے اب انہیں مسترد کر دیا اور نئی تجاو پیش کر دیں۔ چیمبرلین ناقابلِ تصور صورت حال سے دو چ تھا، ہٹلر اپنے مؤقف سے دستبردار ہونے کو آمادہ نہ تھا۔ آخر اجلاس میں اس نے چیمبرلین کو ایک میمورنڈم دیا۔ میمورنڈم تھا، الٹی میٹم تھا۔ ''چیکوسلووکی حکومت ۲۸ ستمبر دن کے دو ب تک ان مطالبات کو تسلیم کر لے بہ صورت دیگر یکم اکتوبر جرمن افواج چیکوسلواکیہ میں داخل ہو جائیں گی۔''

چیمبرلین ۲۴ ستمبر کی سہ پہر بے نیل ومرام واپس لندن پہنچ گیا۔

اگلے روز کابینہ کے تین اجلاس ہوئے۔ ہٹلر کے مطالبات پر لندن اور پیرس دونوں کا رویہ نہایت سخت تھا انہیں مسترد کر کے جرمنی کو اطلاع دے دی گئی۔ تصادم کا لم آ چکا تھا۔ چیکوسلواکیہ، فرانس اور برطانیہ نے اپنی فوجوں تیار رہنے کے احکام جاری کر دیے۔

اب ایک نظر جرمنی پر بھی ڈالتے چلیے۔ جرمن فوج کے اعلیٰ افسر ہٹلر کے منصوبوں سے سخت بیزار تھے۔ آسٹریا پر تسلط کے بعد انہوں نے ایک یادداشت میں اسے صاف صاف کہ دیا تھا کہ فتوحات کے اس پروگرام پر عمل ہوتا رہا تو اس کا نتیجہ عالمی تباہی کی صورت میں نکلے گا، پہلی جنگ کے کھنڈروں سے جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہٹلر نے چیکوسلواکیہ کو الٹی میٹم دیا تو چیف آف جنرل اسٹاف جنرل بیک نے استعفا دے دیا اور کشمکش تیز تر ہو گئی۔ آخر جرمن ہائی کمان نے (جنرل ہیلڈر کے بیان کے مطابق جو اس نے

نورمبرگ کے مقدمے میں دیا) اس پاگل شخص سے ملک وقوم کو نجات دلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سازش میں تمام اہم جرمن افسر شامل تھے۔ منصوبہ بالکل مکمل ہو چکا تھا کہ خبر ملی چیمبرلین جرمنی آرہا ہے۔ اعلیٰ فوجی افسر فوراً جمع ہوئے اور طے پایا کہ اگر ہٹلر چیمبرلین کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو انقلاب لانے کا فیصلہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی بری اور بحری افواج کے کمانڈروں نے الگ الگ یادداشتیں ہٹلر کو ارسال کیں جن میں جرمن عوام، فوجوں کی پوزیشن اور یورپ کے حالات پر تبصرہ کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ جنگ کا خطرہ مول لینے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ بچار کر لینی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

۲۷ ستمبر کی شام کو چیمبرلین نے ریڈیو پر اپنی قوم سے خطاب کیا اور کہا۔

''میں دل و جان سے امن پسند انسان ہوں لیکن اگر مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی قوم اپنی طاقت سے دہشت زدہ کر کے دنیا پر غالب آنا چاہتی ہے تو اس کی مزاحمت کروں گا۔''

تقریر کے بعد اسے ہٹلر کا خط ملا اور امید کی ہلکی سی کرن پھر جگمگا اٹھی۔

ہٹلر نے چیکوسلواکیہ کی نئی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ چیمبرلین فوراً تیسری بار بات چیت کے لیے تیار ہو گیا۔

۲۹ ستمبر کو میونخ کانفرنس شروع ہوئی جس میں ''چار بڑے'' شامل تھے۔ چیمبرلین، فرانسیسی وزیراعظم ہٹلر اور مسولینی۔ سمجھوتا بڑی تیز رفتاری سے طے پا گیا۔ اس کی رو سے چیکوسلواکیہ سے کہا گیا کہ وہ سوڈٹن لینڈ خالی کر دے۔ نئی سرحدیں متعین کرنے کا کام ایک بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ سمجھوتے کی دستاویز چیکوسلوویکی نمائندے کے حوالے کر دی گئی۔

۳۰ ستمبر کو چیمبرلین نے مشترکہ اعلامیہ کا پہلے سے تیار کردہ مسودہ ہٹلر کے آگے رکھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ دونوں ملک متعلقہ مسائل کو اس طرح بات چیت اور صلاح مشورے سے حل کریں گے جس طرح گزشتہ رات کا معاہدہ طے پایا ہے۔ ہم باہمی اختلافات ختم کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے اور یورپ کو امن سے ہمکنار کرنے میں پوری طرح حصہ لیں گے۔ ہٹلر نے پڑھے بغیر دستخط کر دیے۔

چیمبرلین برطانیہ پہنچا تو اس نے کاغذ ہوا میں لہراتے ہوئے میونخ کے اعلان کو تاریخ ساز اعلان اور پورے دور کے لیے مژدۂ جاں فزا قرار دیا۔

ہٹلر کی بصیرت و فراست نے ایک بار پھر مغربی طاقتوں کو پچھاڑ دیا تھا۔ جرمن جرنیلوں کو پھر نادم ہونا پڑا اور انہوں نے اس کا تختہ الٹنے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ تاہم کسی فوجی افسر نے اس سازش کا انکشاف کر کے اپنے ساتھیوں سے دغا نہ کی۔

چیکوسلواکیہ نے فیصلۂ میونخ کے آگے سر جھکا دیا۔ صدر بینز مستعفی ہو گیا۔

چیکوسلواکیہ معاہدے کے مطابق تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن اس کی لاش کے حصے دار اکیلے جرمن گدھ ہی تھے۔ معاہدۂ میونخ کے فوراً بعد پولینڈ نے چیکوسلواکیہ کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا کہ ٹیشن کا سرحدی علاقہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ چیکوسلواکیہ کے پاس وسائل ہی نہ تھے کہ اس ظالمانہ مطالبے کی مزاحمت کر سکتا۔ یہی نہیں ۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو سلاوکوں نے جرمنی کی شہ پر آزادی کا اعلان کر دیا۔ اسی روز ہنگری نے بھی اس لاش میں اپنا حصہ بٹاتے ہوئے مشرقی صوبے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵ مارچ کو رہے سہے علاقے پر جرمن افواج قابض ہو گئیں اور چیکوسلواکیہ کا وجود مٹ گیا۔ پانچ مہینے پہلے معاہدۂ میونخ کے بعد وزیر نوآبادیات نے کہا تھا۔

''ہز میجسٹی کی حکومت چیکوسلواکیہ کی حفاظت اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہے۔ وہ اس کی سالمیت اور وجود برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن اقدام اٹھائے گی۔''

۱۵ مارچ ۳۹ء کو جب چیمبرلین نے ہنگری اور جرمنی کی اس برہنہ جارحیت کی خبر پارلیمنٹ کو سنائی تو پوچھا گیا۔ ''اس ضمانت کا کیا بنا جو برطانیہ نے چیکوسلواکیہ کو دی تھی؟''

''کل تک تو اس ضمانت کا جواز تھا۔ مگر آج صورتِ حال بدل گئی ہے کیونکہ سلاوک پارلیمنٹ نے سلاویکیہ کی آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔'' چیمبرلین کا جواب تھا۔

☆☆☆☆

معاہدۂ میونخ جس سے چیمبرلین نے عظیم خوش آئند توقعات وابستہ کر لی تھیں، انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ چیمبرلین جو اس معاہدے کی شان میں قصیدے پڑھتا رہتا تھا، اب ہٹلر کی مذمت کر رہا تھا۔ ہٹلر کا اگلا شکار پولینڈ تھا۔ ۳۱ مارچ کو چیمبرلین نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ پولینڈ کی آزادی کو خطرہ درپیش ہوا تو برطانیہ پوری قوت سے اس کی مدد کرے گا۔

اس زمانے میں ایک نیا بحران پیدا ہو گیا۔ ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو فجر کے وقت اطالوی فوجوں نے البانیہ پر حملہ کر دیا۔ البانیہ کی بساط ہی کیا تھی۔ مختصر سی جھڑپ کے بعد پورا ملک سرنگوں ہو گیا۔ جس طرح جرمنی، چیکوسلواکیہ کے خلاف ہیں

کیمپ بنانا چاہتا تھا۔ اسی طرح اٹلی، البانیہ کو یونان کے خلاف فوجی کیمپ بنانے کا خواہش مند تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شمال مشرقی یورپ کی طرح جنوب مشرقی یورپ میں بھی متحدہ محاذ قائم کرنے اور یونان اور ترکی کو تحفظ کی ضمانت دینے کی ضرورت ہے۔ میں نے وزیر اعظم چیمبرلین کو ایک مکتوب میں اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی اور لکھا ”پورا جزیرہ نما بلقان خطرے میں ہے۔ اگر برطانیہ اور فرانس نے بروقت اقدام نہ کیا تو بلقانی ریاستیں جرمنی اور اٹلی کے دباؤ میں آکر ان سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔“

برطانیہ نے ہٹلر کے آگے بچھ جانے کی پالیسی اپنا کر امن وامان کی جو امیدیں وابستہ کی تھیں، وہ ایک ایک کر کے دم توڑ چکی تھیں۔ ہٹلر جنگ چاہتا تھا۔ برطانیہ، پولینڈ کے علاوہ یونان اور رومانیہ کو بھی تحفظ کی ضمانت دے چکا تھا۔ ۲۸ اپریل کو ہٹلر نے جرمن پولینڈ معاہدے کی دھجیاں بھی اڑا دیں۔ برطانیہ نے پولینڈ کو ضمانتِ تحفظ تو دے دی مگر روس کے ساتھ کسی سمجھوتے کے بغیر اس ضمانت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ ۱۶ اپریل کو روس نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر سہ طاقتی متحدہ محاذ قائم کرنے کی پیش کش کی۔ روس کی اپنی نظریں پولینڈ، رومانیہ، فن لینڈ اور بالٹک کے تینوں ملکوں پر جمی ہوئی تھیں اور یہ سب ملک بھی اس کی طرف سے شدید خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ چیمبرلین اور دفتر خارجہ اس اسرار بھرے معمے پر بہت حیران تھے، لہٰذا کوئی جواب نہ دیا۔ اب روس نے ہٹلر کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ ۱۷ اپریل کو روسی سفیر نے جرمن وزارتِ خارجہ سے سلسلہ جنبانی شروع کیا اور پھر روس میں ایک عہد ختم ہو گیا۔ اسٹالن نے لٹوینوف (وزیر خارجہ) کو برطرف کر دیا۔ جس کی مغربی ملکوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی پالیسی ناکام رہی تھی۔ اس کی جگہ مولوٹوف نے لی۔ ہٹلر کا رویہ فوراً بدل گیا۔ کمیونسٹوں کے خلاف مہم بند ہو گئی۔ جرمن اخبارات کہہ رہے تھے، جرمنی کا روس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں اور لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مولوٹوف نے وزیر خارجہ بنتے ہی جرمنی سے مل کر پولینڈ کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ ۷ مئی کو فرانسیسی سفیر نے برلن سے اپنی حکومت کو خبر دی کہ جرمنی اور روس کے درمیان عنقریب معاہدہ ہونے والا ہے۔ ۳۰ مئی کو جرمنی نے روس سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

موسم گرما گزر رہا تھا۔ جنگ کی تیاریاں پورے یورپ میں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ جرمن فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی۔ ۷ جولائی کو اٹلی نے برطانیہ کو خبردار کیا۔ ”اگر انگلستان، پولینڈ کے دفاع میں لڑے گا تو ہم بھی اپنے اتحادی جرمنی کی حمایت میں ہتھیار اٹھالیں گے۔ برطانیہ اور فران[س] نے روس سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی مگر اب وقت گزر ر[ہا] تھا۔ روس اور جرمنی کے درمیان مذاکرات شروع ہو[چکے] تھے۔ ۲۳ اگست کو ربن ٹراپ اور اسٹالن میں گفتگو ہوئی ا[ور] اگلے روز دونوں ملکوں کے درمیان عدم جارحیت کا معاہدہ [طے] پا گیا۔ اس روز ایک اور خفیہ معاہدے میں جرمنی نے لٹو[یا،] ایسٹونیا اور فن لینڈ میں دلچسپی نہ لینے کا اقرار کیا۔ البتہ کہا [کہ] وہ لیتھونیا کو اپنے دائرۂ اثر میں رکھنے کا خواہش مند [ہے۔] پولینڈ کو تقسیم کر دیا گیا۔

☆☆☆☆

جرمن سوویت معاہدے کی خبر جونہی برطانوی حکومت [کو] ملی، اس نے فوراً احتیاطی اقدامات کرنے کے احکامات جا[ری] کر دیے۔ مقبوضات اور نوآبادیوں کو تار کے ذریعے خبر[دار] کر دیا کہ وہ تیار رہیں۔ علاقائی تنظیموں کو جنگی بنیادوں پر [منظم] کرنے کی ذمے داری لارڈ پریوی سیل کے سپرد کر دی گ[ئی۔] جنگی اور دفاعی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ فضا[ئی] اور بری افواج کے ریزرو دستے ڈیوٹی پر بلا لیے گئے۔ بح[ریہ] نے تجارتی جہازوں کو ہوشیار رہنے کے احکام جاری کر دیے۔ اخبارات جلی سرخیوں میں خبریں شائع کر رہے [تھے۔] وزیر اعظم چیمبرلین نے ہٹلر کو ایک خط میں لکھا۔

”آپ نے ہمارے اخبارات میں شائع ہونے و[الی] خبریں پڑھ لی ہوں گی۔ جرمنی اور روس کے معاہدے کی شرا[ئط] جو کچھ بھی ہوں، پولینڈ کا وجود اگر خطرے میں پڑا تو [برطانیہ] اپنی ذمے داریاں ادا کرنے میں کبھی کیل تعویق سے کا[م نہیں] لے گا۔ اور پولینڈ پر حملہ کرنا خطرناک غلطی ہوگی۔“

ہٹلر نے پولینڈ پر حملے کی تاریخ ۲۵ اگست مقرر کی تھ[ی] اب یکم ستمبر تک بڑھا دی گئی اور پولینڈ سے مذاکرا[ت] چھیڑ دیے جیسا کہ چیمبرلین نے اپنے خط میں مطالبہ کیا تھا۔ اس کی نیت جنگ لڑنے کی تھی، صلح [اور] معاہدے کی نہیں۔ ا[س] لیے مذاکرات ناکام رہے۔

۳۱ اگست کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کرنے کے احکا[مات] جاری کر دیے۔ یکم ستمبر کی صبح ابھی طلوع نہیں ہوئی تھی کہ جر[من] فوجیں پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ اسی روز ساڑھے نو [بجے] رات وزیر اعظم چیمبرلین نے جرمنی کو الٹی میٹم دے دیا۔ ۳ [ستمبر] کو صبح نو بجے دوسرا اور آخری الٹی میٹم دیا۔ اسی دن سوا دو [گھنٹے] بعد وزیر اعظم نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہو[ئے] اعلان کیا کہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ برطانیہ اپنے وہ فرائض [ادا] کرنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑا ہے جو اس پر ع[ائد] ہوتے ہیں۔

گیارہ جرمن جرنیل

پھانسی کے تختے پر

جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے ستمبر ۱۹۳۹ء میں کرۂ ارض کو جنگ میں جھونک دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھے یورپ کو روندتا، فرانس تک کو تہ تیغ کر کے رودبار انگلستان تک جا پہنچا۔ اس کے بکتر بند ڈویژن بحیرۂ روم پھلانگ کر شمالی افریقہ پر قابض ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی جرمن فوجوں نے روس پر یلغار کر دی اور روسی فوجوں کو ماسکو تک دھکیل لے گئیں۔ اتحادیوں نے مل کر جوابی حملہ کیا۔ اُدھر روسیوں کے پاؤں جم گئے اور اگست ۱۹۴۵ء میں روسی، برطانوی، امریکی اور فرانسیسی فوجوں نے برلن میں داخل ہو کر جرمنوں کو شکست دے دی۔ ہٹلر نے خودکشی کر لی اور اس کے تمام مشیروں اور جرنیلوں کو گرفتار کر کے بین الاقوامی ملٹری ٹربیونل کے سامنے پیش کیا گیا جس نے گیارہ جرمن لیڈروں کو سزائے موت دی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو انہیں نورمبرگ کی جیل میں پھانسی دی گئی۔ "نیوز ٹائمز" کا نامہ نگار ورکر تھیمس پھانسی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔



ورکر تھیمس

محمد صدیق خان

نورمبرگ (جرمنی)

۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کی شام سے میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی شام

بہت مغموم تھی۔ گلیاں سنسان اور ماحول پر موت کا سکوت طاری تھا۔ جرمنی کے جن بڑے بڑے جرنیلوں اور ہٹلر کے مشیروں نے ستمبر ۱۹۳۹ء میں ساری دنیا کو جنگ میں جھونک دیا تھا انہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی شام بین الاقوامی فوجی ٹریبیونل نے سزائے موت کا حکم سنا دیا تھا۔ ان میں سے ایک سو چھیاسی (۱۸۶) کو بری کر دیا گیا تھا، کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ حکام بالا کے حکم سے کیا تھا۔ باقی گیارہ کو اسی رات نورمبرگ کی جیل میں پھانسی دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے آٹھ اخباری نمائندوں کو ان گیارہ جرمنوں کو پھانسی چڑھتا دیکھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں بھی ان آٹھ نمائندوں میں تھا۔

ہم شام کے وقت جیل میں پہنچے تو جیل کے گورنر کرنل اینڈریو نے ہمارا استقبال کیا اور ہمارے پاس دیکھ کر کہا — "آپ کو جہاں کھڑا کیا جائے یا بٹھایا جائے آپ وہیں رہیں۔ ادھر ادھر جانے یا کسی سے بات کرنے کی سخت ممانعت ہے"— ہمیں ان کوٹھڑیوں کے برآمدے میں لے جایا گیا جن میں یہ جرمن بند تھے۔ کوٹھڑیوں کے سلاخوں والے بھی اور لکڑی کے دروازے بھی بند تھے۔ ہر دروازے میں ایک ایک گول سوراخ تھا۔ ہر دروازے کے سامنے ایک ایک امریکی سپاہی کھڑا اس سوراخ میں سے اندر جھانک رہا تھا۔ ہم نے ہر دروازے میں سے جھانک کے دیکھا۔ ہٹلر کا دست راست گورنگ کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ باقی پڑھ رہے تھے یا لکھ رہے تھے یا بند کوٹھڑی میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

ہمیں تمام جیل میں گھمایا گیا اور رات کے ساڑھے نو بج گئے۔ گھڑیال بجا اور جیل کی بیشتر بتیاں بجھ گئیں، صرف کوٹھڑیوں کے اندر کی بتیاں جلتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک وسیع لان میں پہنچے۔ یہ ایک خوبصورت باغیچہ تھا جہاں بتیاں جل رہی تھیں لیکن اس باغیچے کے حسن پر موت کی دہشت طاری تھی۔ اس کے وسط میں پھانسی کا بلند چبوترہ تھا جس پر تین تختے اور ان کے اوپر تین نئے رسے لٹک رہے تھے۔ چبوترے کی تیرہ سیڑھیاں تھیں۔ چبوترے پر ایک کھمبے کے ساتھ سیاہ ٹوپی نما نقاب لٹک رہے تھے۔

رات کے دس بج گئے۔ کرنل اینڈریو ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ کرنل پھانسی چڑھنے والے جرمنوں کو بتانے جا رہا ہے کہ انہیں سزائے موت دی گئی ہے اور دو گھنٹے بعد انہیں پھانسی چڑھا دیا جائے گا۔ سزائے موت کا فیصلہ گزشتہ شام کیا گیا تھا لیکن مجرموں کو اس فیصلے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے جب کرنل اینڈریو بھاگتا آیا اور گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولا — "گورنگ مر گیا ہے"۔ اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ گورنگ نے ٹریبیونل کے سامنے رحم کی درخواست پیش کی تھی جب گورنگ کو بتایا گیا کہ اس کی اپیل مسترد کر دی گئی ہے اور وہ سزائے موت سے بچ نہیں سکتا تو اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور تیزی سے کمرے میں ٹہلنے لگا پھر چارپائی پر بیٹھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ رات ساڑھے دس بجے اس کی کوٹھڑی کے باہر کھڑے سنتری کو اندر سے کراہنے اور سسکنے کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ سنتری نے دیکھا کہ گورنگ تڑپ رہا تھا۔ اس نے ڈیوٹی افسر کو اطلاع دی۔ یہ افسر ڈاکٹر کو لے کر فوراً پہنچ گیا مگر گورنگ مر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا منہ کھول کے دیکھا۔ منہ میں پسے ہوئے شیشے کے ذرے موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے لاش کا مکمل معائنہ کر کے اپنی رپورٹ دی کہ اس نے پوٹاشیم سائنائیڈ کھا کر خودکشی کی ہے۔ اس کی کوٹھڑی میں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے چھوٹا سا ایک ڈبہ پڑا تھا۔ گورنگ نے اسی ڈبے میں زہر چھپا رکھا تھا لیکن یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا کہ اس نے

یہ زہر کہاں سے اور کس طرح حاصل کیا تھا۔

گورنگ جرمن فوج کا فیلڈ مارشل تھا جس نے جنگ کی سکیم تیار کی تھی۔ جیل کی کوٹھڑی میں اُس کے سرہانے تلے چند خطوط اور کاغذوں کے پُرزے رکھے تھے۔ ایک کاغذ پر اُس نے لکھا تھا۔ "تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں فیلڈ مارشل کو کسی نے پھانسی چڑھایا ہو"—— اس سے پہلے ہٹلر اور گوئبلز جرمنی کی شکست سے پہلے ہی خودکشی کر چکے تھے۔

گورنگ کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ میں نے اُسے جنگی مجرم کی حیثیت سے بین الاقوامی فوجی ٹربیونل میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے نہایت شدت سے، چلا چلا کر، مقدمہ لڑا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف زندہ رہنا بلکہ حکومت کرنا چاہتا ہے۔ جہاں تک میں نے اس کے کردار کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے متعلق جو مصدقہ معلومات حاصل کی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر کا یہ مشیرِ خصوصی بے تحاشہ دولت مند تھا۔ وہ اس نظریے کا انسان تھا کہ پیسہ سب سے بڑی قوت ہے۔ جنگ کی ابتدا میں جرمنی نے جتنے ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا ان کی بیشتر دولت گورنگ سمیٹ لے گیا تھا۔ غیر جانبدار ملکوں کے بنکوں میں اس نے بے اندازہ دولت جمع کر رکھی تھی۔ اُسے مکمل امید تھی کہ جرمنی فتح یاب ہوگا تو وہ دنیا کا بادشاہ ہوگا مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے پھانسی کا رسّہ دیکھ سکتا۔

جب باقی قیدیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا تو سب نے یہ حکم نہایت خاموشی سے سنا۔ امریکی سنتریوں نے ان کے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا۔

رات بارہ بج کر پچپن منٹ پر مجھے پھانسی کے چبوترے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ ایک بجے کے قریب ٹربیونل کے ممبر، ڈاکٹر، جرمن زبان بولنے والے امریکی ترجمان، جیل کے افسر اور جلاد آ گئے۔ تمام حاضرین الگ کھڑے ہو گئے۔ ترجمان اور جلاد چبوترے پر چڑھ گئے۔

ایک بج کر گیارہ منٹ پر ہٹلر کے مشیر، ربن ٹراپ، کو لایا گیا۔ چبوترے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے اس کا رنگ زرد ہو گیا، اس کے ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔ اس کی ہتھکڑی اتار دی گئی اور ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ جب اُسے چبوترے پر لے جایا جانے لگا تو ہر سیڑھی پر اس کا قدم لڑکھڑاتا تھا۔ پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے اُس سے انگریزی اور جرمن زبان میں پوچھا گیا: "آپ کا نام؟"—— اس نے جواب دیا—— "جوآکم ربن ٹراپ"۔ جلاد نے اس کے دونو پاؤں جوڑ کر رسّی سے باندھ دیئے۔ ترجمان نے اس سے پوچھا: "کوئی آخری بات کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے کہا—— "میں عالمی امن کا خواہش مند ہوں۔ مشرق اور مغرب میں مفاہمت ہونی چاہیئے۔"

عالمی امن کے اس خواہش مند نے نہ صرف جنگ کا منصوبہ تیار کیا تھا بلکہ غیر جرمن قوموں کو نیست و نابود کرنے کی واضح سکیم بنائی تھی جس کے تحت جرمن فوجوں نے لاکھوں شہریوں کو قتل کر دیا تھا۔

جلاد نے رسّے کا پھندا اس کی گردن میں ڈال کر اس کے سر اور چہرے پر سیاہ نقاب ڈال دیا۔ ایک بج کر پندرہ منٹ پر ربن ٹراپ کے پاؤں تلے سے تختے ایک جھٹکے سے نکل گئے۔ دنیا بھر کو فتح کرنے والا پھانسی کے کنوئیں میں لٹک رہا تھا۔

ایک بج کر سترہ منٹ پر جرمن فوجوں کے جنرل فیلڈ مارشل کیٹل کو چبوترے کے قریب لایا گیا۔ میں نے اس بے رحم فوجی لیڈر کو برلن میں جرمنی کی شکست پر دستخط کرتے دیکھا تھا وہ ہٹلر کا فوجی مشیر تھا۔ اس نے چبوترے کی پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر تمام حاضرین کو دیکھا پھر پھانسی کے لٹکتے رسّے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف جھلکنے لگا لیکن اس نے اپنے جذبات

پر قابو پالیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا ——— "میرا نام ولہیم کیٹل ہے۔ میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ جرمن قوم پر رحم کرے۔ بیس لاکھ سے زیادہ جرمن سپاہی اور افسر اپنے وطن کے لیے مر گئے ہیں۔ میں وطن کے ان جاں نثار بچوں کے پاس جا رہا ہوں۔"

ہٹلر کے اس فوجی مشیر نے جنگ اور شہریوں کے قتل عام کی جو سکیم تیار کی تھی وہ ہیبت ناک تھی۔ اس کا جرم صرف یہ نہیں تھا کہ اس نے ہٹلر سے مل کر یورپ کے لاکھوں بے گناہ شہریوں کو بے دردی سے مروا دیا تھا بلکہ اس نے یورپ اور روس میں بیس لاکھ سے زیادہ جرمن سپاہی دنیا بھر کو فتح کرنے کے لیے مروا دیئے تھے۔ بیس لاکھ سے زائد مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں اور معصوم بچے، اپنے باپوں، خاوندوں اور بھائیوں کی موت پر شکست خوردہ جرمنی کی گلیوں میں رو رہے تھے۔

چند منٹ بعد نسل انسانی کا قاتل پھانسی کے کنوئیں میں لٹک رہا تھا۔

ایک بج کر سینتیس منٹ پر ہٹلر کے دست راست کیلتن برونر کو لایا گیا۔ اس کی شکل و صورت اور جسم جنّ اژدہا کی مانند تھا۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں اب بھی یوں لرز رہی تھیں جیسے انسانوں کا گلا دبوچ لینے کے لیے بے تاب ہوں۔ یہ بے رحم قاتل جرمنی کا قابل ترین ڈاکٹر تھا لیکن اپنے پیشے سے ہٹ کر وہ جرمن پولیس کا جرنیل تھا اس نے جنگ کے دوران سیکورٹی پولیس تیار کی تھی جسے مقبوضہ علاقوں کے شہریوں کے قتل عام کا کام سونپا گیا تھا۔ بیگار کیمپوں میں اسی کے حکم سے لوگوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اس نے بے گناہ اور بے بس انسانوں کو قتل کرنے کے انتہائی وحشیانہ اور سفاکانہ طریقے اختراع کیے تھے۔ اس کے جرائم کی تفصیلات سنتے ہی جرنیل انسان بھی لرز اٹھتا ہے۔ لیکن جب اس کی اپنی موت کا وقت آیا تو وہ اپنی کوٹھڑی میں لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ میں سخت بیمار ہوں۔ بیمار آدمی کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ امریکی اور

برطانوی ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا اور متفقہ فیصلہ دیا کہ وہ پھانسی سے بچنے کے لیے بیماری کا بہانہ پیش کر رہا ہے۔

پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر اس نے جلاد کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا مگر چند سیکنڈ میں اس کے پاؤں باندھ کر اس کے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال دیا گیا اور دوسرے لمحے تختے ہٹ گئے۔

اس کے بعد الفریڈ روزنبرگ کو لایا گیا۔ اس شخص نے نسلی امتیاز کا نظریہ اختراع کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ جرمن قوم دنیا کی تمام قوموں سے اعلیٰ ہے اور کسی دوسری قوم کو جرمن قوم کی موجودگی میں آزاد رہنے کا حق حاصل نہیں۔ اس کے اس فلسفے کو ہٹلر نے قبول کر لیا تھا اور یہی فلسفہ تھا جو دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے قتل عام کا باعث بنا۔ جب روزنبرگ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے اس سے نام پوچھا گیا تو اس کی زبان ہکلا گئی۔ وہ بڑی کوشش سے اپنا نام بتا سکا لیکن اس قدر دھیمی آواز میں بولا کہ جلاد کے سوا اور کوئی نہ سن سکا۔

اسے پھانسی چڑھا کر جب ڈاکٹر نے کنوئیں میں جا کر اس کی نبضیں دیکھیں اور اعلان کیا کہ روزنبرگ مر چکا ہے تو پھانسی کے رسّے تبدیل کر دیئے گئے۔

ہنس فرینک کو لایا گیا۔ وقت ایک بج کر چھپن منٹ تھا۔ فرینک ہٹلر کا مشیر قانون تھا۔ اس نے بیگار کیمپ بنانے کی سکیم تیار کرنے میں مدد دی تھی۔ پولینڈ پر قبضے کے دوران وہ پولینڈ کا گورنر جنرل تھا۔ پولینڈ کی فوج اور شہریوں نے جرمن فوجوں کا خوب مقابلہ کیا تھا لیکن جرمنی کی طاقت کے سامنے یہ ذرا جتنا ملک سترہ روز سے زیادہ جم نہ سکا اور شکست کھا گیا۔ ہنس فرینک کو اس ملک کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے پولینڈ کی قوم کو ختم کرنے کے لیے وہاں بیگار کیمپ کھول دیئے جس میں عورتوں اور بچوں کو غیر انسانی مشقت

اور فاقہ کشی سے مارا جانے لگا۔ اس کے علاوہ اس نے شہریوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔

پھانسی کے تختے پر جب اس کے پاؤں باندھے جا رہے تھے۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ پر اُداسی چھا گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ جلاّد نے ہمیں بعد میں بتایا کہ اس نے کہا تھا ——— "خدا سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔"

اب ہٹلر کا وزیر امورِ داخلہ، ولہیم فرک، چبوترے پر چڑھا۔ وہ موت اور بیگار کیمپوں کا انچارج تھا۔ کیمپوں میں جو قتل عام ہوتا تھا، اس کے حکم نامے پر اسی شخص کے دستخط ہوا کرتے تھے۔ اس نے غیر جرمنوں کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کے ایسے انسانوں کو بھی زہر کے انجکشنوں سے مروا دیا تھا جو اس کی نگاہ میں جرمنی کے لیے بیکار لوگ تھے یعنی ضعیف بوڑھے، دائمی مریض، جسمانی لحاظ سے کمزور آدمی اور تمام غیر ملکی مزدور ——— ان لوگوں کے قتل کے لیے فرک اور ہٹلر نے باقاعدہ قانون بنا رکھا تھا جس کے تحت ہسپتالوں میں اس قسم کے "بیکار" انسانوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا تھا۔ یہ قتل جرمنی کی شکست تک جاری رہا۔

جب فرک نے پھانسی کے چبوترے کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا تو قدم ڈگمگا گیا۔ اس نے پاؤں پیچھے کر لیا مگر دوبارہ کوشش میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے چہرے پر خوف کے نمایاں تاثرات تھے۔ اسے سنتریوں نے تھام لیا اور سہارا دے کر پھانسی کے تختے تک لے گئے۔ اس سے نام پوچھا گیا تو اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر سرگوشی کی ——— "ولہیم فرک" ——— جلاّد حرکت میں آ گیا اور ایک آدھ منٹ بعد فرک کی لاش سیاہ نقاب اوڑھے کنوئیں میں لٹک رہی تھی۔

اس کے بعد، جیولیس سٹریچر کو لایا گیا۔ اس کی چال اور انداز میں نخوت کی بجائے نفرت اور حقارت تھی۔ اس جرمن لیڈر نے اپنی قوم کو ذہن نشین کرایا تھا کہ جرمن قوم اشرف المخلوقات ہے اور دنیا کی تمام قومیں کمزور اور قابلِ نفرت ہیں۔ اس فلسفے کو بچوں کی تعلیم و تربیت اور فوجیوں کی ٹریننگ کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ اس نے جرمن قوم کو یہ بھی ذہن نشین کرایا تھا کہ کسی غیر جرمن کو قتل کرنا جرم نہیں بلکہ قومی فریضہ ہے۔

جب اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا گیا تو اُس نے گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا ——— "ہیل ہٹلر" ——— (ہٹلر زندہ باد) ——— ترجمان نے اُس سے اس کا نام پوچھا ——— ——— تو اس نے نفرت سے لبریز لہجے میں جواب دیا ——— "تمہیں میرا نام معلوم ہے" ——— ترجمان نے پھر اپنا سوال دہرایا ——— "آپ کا نام؟" ——— اس نے اور زیادہ نفرت سے جواب دیا ——— "تمہیں معلوم ہے" ——— تیسری بار اس نے اپنا نام بتایا اور بلند آواز سے کہا ——— "اب میں خدا سے اپیل کرتا ہوں" ——— اُس نے حاضرین کو گہری نفرت سے دیکھا اور روسی افسروں سے مخاطب ہو کر بولا ——— "روسیو! ایک دن تمہیں بالشویک پھانسی پر چڑھائیں گے۔"

وہ چلا چلا کر امریکیوں، انگریزوں، فرانسیسیوں اور روسیوں کو لعن طعن کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں کو رسی سے باندھ کر اس کا سر اور منہ سیاہ نقاب سے ڈھک دیا گیا۔ نقاب کے اندر سے بھی اس کی لعن طعن سنائی دیتی رہی جو پھانسی کے کنوئیں میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

اب ہٹلر کا ایک اور انسان دشمن مشیر چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کا نام ساؤکل تھا۔ اس کی ہدایات پر مقبوضہ ملکوں کے شہریوں کو بیگار میں پکڑ کر جرمنی لایا جاتا تھا

جہاں اُن سے غیر انسانی مشقت کرائی جاتی تھی۔ ہزارہا انسان فاقہ کشی سے مر گئے یا دق اور سِل کے امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔

اس نے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر اپنا نام بتایا اور بلند آواز سے کہا ـــــ "یہ سزا بالکل ناجائز ہے۔ یہ ناانصافی ہے"۔

جلاد نے اس کی گردن کے گرد پھندا کس دیا اور سیاہ نقاب چڑھا کر پھانسی کے تختے ہٹا دیئے۔

اس کے بعد جوڈل کو لایا گیا۔ اس کی چال تُلی تُلی اور قدم خود اعتمادی سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ اس طرح سیڑھیاں پھلانگ کر پھانسی کے تختے پر جا کھڑا ہوا جیسے اُسے سزائے موت کا کوئی علم ہی نہ ہو۔ اس نے بغیر پوچھے اپنا نام پکارا ـــ "ایلفرڈ جوڈل"۔

جو ملک جرمنوں کے قبضے میں آ گئے تھے وہاں کے باشندوں نے جرمنی کے خلاف زمین دوز جماعتیں بنالی تھیں۔ ان جماعتوں نے نہ صرف جاسوسی کی بلکہ جرمنوں کے لیے زمین دوز بارودی سرنگیں بنے رہے۔ ایلفرڈ جوڈل کو یہ ڈیوٹی دی گئی کہ وہ ان جماعتوں کے وجود کو ختم کرے۔ چنانچہ اس نے خصوصی پولیس کو یہ حکم دیا کہ جس شہری پر ذرا سا بھی شک گزرے خواہ وہ ایک ماہ کا بچہ ہی کیوں نہ ہو اُسے جان سے مار دو۔ اس حکم کے تحت مقبوضہ فرانس، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، آسٹریا اور روس کے مقبوضہ علاقوں میں شہریوں کو مکھیوں کی طرح مارا جانے لگا۔

پھانسی کے تختے پر جب اُس کے پاؤں باندھے جا رہے تھے اُس نے بلند آواز سے کہا ـــــ "میرے جرمنی میں تمہیں سلام کرتا ہوں" ـــــ اور دوسرے لمحے وہ رسّے سے لٹک رہا تھا۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر آرتھر سیِس انکارٹ کو لایا گیا۔ اس شخص کے چہرے پر عالموں کا سا وقار تھا لیکن وہ ہٹلر کا جلاد تھا۔ اُس نے پولینڈ میں قتلِ عام کا ایک نیا منصوبہ تیار کر کے اُسے عملی شکل دی تھی۔

رات کے دو بج کر چھیالیس منٹ اور تیس سیکنڈ پر جرمنی کا آخری لیڈر پھانسی پا گیا۔ دو امریکی سپاہی گورنگ کی لاش اٹھا لائے اور اسے اس کے ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ رکھ دیا۔ جنگِ عظیم دوئم کے ہولناک ڈرامے کے آخری منظر پر پردہ گر پڑا۔ میں جیل سے باہر نکل آیا۔ اعصاب پر ناگوار سا بوجھ اور سینے میں رُوح کش تلخی تھی۔ میں نے لمبے لمبے سانس لیے۔ پھانسی کا منظر کسی پہلو خوشگوار نہیں تھا۔ پھر بھی میں، اعصابی بوجھ اور تلخی کے باوجود، طبیعت میں سکون سا محسوس کر رہا تھا۔ ان جرمنوں کو بلاوجہ پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ میں نازیوں کی درندگی کے تحقیقاتی کمیشن کا ممبر تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے نازیوں کے وہ بیگار کیمپ دیکھے تھے جہاں نسلِ انسانی کو غیر انسانی طریقے سے ختم کیا جا رہا تھا۔ میں نے مختلف کیمپوں میں وہ ہولناک بھٹیاں دیکھیں جہاں انسانوں کو زندہ پھینک کر جلا دیا جاتا تھا۔

میں نے گیس چیمبر بھی دیکھے تھے جہاں لوگوں کو داخل کر کے زہریلی گیس چھوڑ دی جاتی تھی۔ میں نے نازیوں کے گوداموں میں چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے جوتوں کے انبار دیکھے۔ یہ اُن ننھے ننھے بچوں کے جوتے تھے جنہیں نازیوں نے ذبح کیا تھا۔ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ جرمنوں نے گناہوں کی سزا پالی۔

ایک صاحب ایمپلائمنٹ ایکسچینج گئے اور بولے۔ مجھے گھر کے لیے ایک ایسی نوکرانی کی ضرورت ہے جو خوبصورت ہو۔ عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان ہو۔ کھانا پکانے، برتن دھونے، کپڑے سینے، استری کرنے اور گھر کی صفائی میں ماہر ہو۔ اچھے اخلاق کی ہو۔ بڑے گھر کی ہو اور پڑھی لکھی ہو۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے افسر نے پوچھا۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ نوکرانی کتنا جہیز لے کر آئے اور آپ اس کو کتنا حق مہر ادا کریں گے۔ ـــــ (اسکندر حیات، کراچی) ـــــ

پیٹر ایلس
ثریا شاہین ملک

دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں نے رُوس پر رُوسیوں کی توقعات اور معاہدوں کے خلاف اس قدر اچانک اور شدید حملہ کر دیا کہ رُوسیوں کو سنبھل کر کسی بھی محاذ پر مورچہ بند ہونے کی مُہلت ہی نہ مل سکی۔ جرمنوں کی قوّت رُوسیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ رُوسی پسپا ہوتے ہوئے ماسکو کے مضافات تک جا پہنچے۔ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ رُوسی اِس تباہ کُن دباؤ کو برداشت کر کے ماسکو کو بچالیں گے لیکن رُوسیوں نے نہ صرف ماسکو کو بچالیا بلکہ جرمنوں کو دھکیلتے ہوئے جرمنی تک لے گئے اور اُن سے ہتھیار رکھوا لیے۔ آج نصف جرمنی رُوس کے قبضے میں ہے۔

اس معجزہ نما فتح کے پس منظر میں صرف رُوسی فوجوں کا ہی نہیں رُوس کے ہر بچّے، ہر عورت اور ہر مرد کا جذبۂ حُبّ الوطنی شامل ہے۔ ساری قوم مسلّح ہو کر حملہ آور دشمن کے خلاف سینہ سپر ہو گئی تھی۔ جرمن فوج کی نفری اس قدر زیادہ تھی کہ وہ رُوسی دستوں کو گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈلوا لیتے تھے۔ رُوسی فوجیوں کی اس مجبوری کو روسی جرنیل اچھی طرح سمجھتے تھے اس کے باوجود رُوسی ہائی کمان نے جرمنوں کی قید میں چلے جانے کو سنگین جُرم قرار دے دیا تھا۔

رُوسیوں نے اِس جنگ میں ذاتی شجاعت کے بے شمار مظاہرے کیے ہیں جن میں جرمنوں کی قید سے بھاگ نکلنے کے جرأت مندانہ واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ دس رُوسی قیدیوں کے فرار کا ہے۔

رُوسی ایئر فورس کا سب لفٹیننٹ یاتا ژوف ایک روز اپنے لڑاکا طیارے میں یوکرین کی فضا میں اُڑ رہا تھا۔ اچانک متعدد جرمن طیارے آنکلے۔ اس وقت تک یاتا ژوف مختلف فضائی معرکوں میں اُنسٹھ (۵۹) جرمن طیارے گرا چکا تھا لیکن آج وہ اکیلا تھا اور جرمنوں کی تعداد بہت زیادہ۔ پیشتر اس کے کہ وہ وار کرتا اس کے طیارے میں مشین گنوں کی بھرپور بوچھاڑ آپڑی اور انجن کو آگ لگ گئی۔ یاتا ژوف طیارے سے کُود گیا اور پیراشوٹ نے اُسے صحیح و سلامت زمین پر اتار دیا مگر جرمن سپاہیوں اور اُن کے کُتّوں نے اُسے گھیر لیا اور وہ بے بس ہو گیا۔

اُسے قیدی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ وہ لڑاکا ہوا باز تھا



جیتے جی دشمن کی قید میں نہ رہ سکتا تھا۔ اُس نے چند رُوسی قیدیوں کو ساتھ ملایا اور فرار کے لیے سُرنگ کھودنی شروع کردی۔ سُرنگ ابھی نصف نہیں کھدی تھی کہ وہ پکڑے گئے۔

یانا ژوف کو جرمنوں نے پولینڈ کے ساحلی علاقے میں ایک قیدی کیمپ میں بھیج دیا۔ جہاں سے بھاگ کر رُوس تک خیریت سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ یانا ژوف وہاں بھی ہر لمحہ فرار کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ رُوسی فوجیں پولینڈ سے ایک سو پچاس میل تک پہنچ گئی ہیں۔ اب وہ فرار کے لیے اور زیادہ بے چین ہونے لگا تھا۔

اس قیدی کیمپ میں رُوسی قیدیوں سے بہت زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ قریب ہی جرمنوں کا ہوائی اڈہ تھا جس پر برطانوی بمبار طیارے اور رُوسی طیارے بھی بمباری کرتے رہتے تھے۔ بموں سے جو گہرے گڑھے پڑ جاتے تھے اُنہیں رُوسی قیدیوں سے بھروایا جاتا تھا۔

یانا ژوف کو اسی کام پر لگا دیا گیا۔ اُس کی پارٹی میں دس رُوسی قیدی تھے جن میں رُوسی فوج کا ایک کپتان بھی شامل تھا۔ اس پارٹی کو ایک جرمن سپاہی، رائفل کے بٹ اور سنگین سے ہانکتا ہوا ہوائی اڈے میں لے جاتا تھا اور اُن سے دن بھر گڑھے بھرواتا رہتا تھا۔ ہوائی اڈہ بہت وسیع تھا اور اردگرد گھنا جنگل۔ جرمنوں نے بمبار اور لڑاکا طیارے بکھیر کر درختوں تلے چھپا کر رکھے ہوتے تھے۔

جرمن پہرہ داروں کو یقین ہو چلا تھا کہ یہاں سے کوئی قیدی بھاگ نہیں سکتا۔ چنانچہ اُنہوں نے اُن قیدیوں پر بھی کڑا پہرا نہ رکھا جو باہر کام کے لیے لے جائے جاتے تھے۔ ایک روز لفٹیننٹ یانا ژوف اور اس کے دس ساتھیوں کو ایک جرمن سپاہی ہوائی اڈے پر لے گیا۔ یخ بستہ جھکڑ چل رہے تھے۔ قیدی بہت بڑا گڑھا بھرنے کے لیے گینتیاں اور بیلچے اُٹھائے اِدھر سے اُدھر مٹی اور پتھر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ تلے جرمنوں کا ایک بمبار طیارہ کھڑا تھا۔ یہ دو انجنوں کا طیارہ تھا جس میں آٹھ دس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اس طیارے کو دیکھ کر یانا ژوف کا دماغ فرار کی ایک ترکیب سوچنے میں مصروف ہوگیا۔

ان کا جرمن پہرہ دار ذرا دُور بیٹھا تھا۔ رائفل اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُسے مارنا آسان نہ تھا۔ اتنے میں اُس سپاہی نے ڈبیا سے سگریٹ نکالا۔ منہ میں لے کر دیا سلائی جلائی تو تیز ہوا سے بجھ گئی۔ اُس نے پیٹھ پھیر کر دیا سلائی پھر جلائی اور سر گھٹنوں میں دے کر اسے ہوا سے بچانے لگا۔ رُوسی کپتان اُس کے قریب تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گینتی تھی۔ اُس نے یانا ژوف کی طرف دیکھا۔ یانا ژوف نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ پیشتر اس کے کہ جرمن سپاہی سگریٹ جلا کر سر اُوپر اُٹھاتا۔ رُوسی کپتان کی گینتی کا وزنی پھل اُس کی کھوپڑی میں اُتر چکا تھا اور کھوپڑی دو حصوں میں کٹ گئی۔ اس بھرپور وار نے جرمن کو تڑپنے بھی نہ دیا اور وہ ٹھنڈا ہوگیا۔

دس کے دس رُوسی قیدی کام چھوڑ کر ایک جگہ اکٹھے ہوگئے اور یانا ژوف اور کپتان کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ لمحہ ایسا تھا جب اُن کی زندگی یا موت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ یانا ژوف کو صرف یہ مسئلہ پریشان کر رہا تھا کہ کیا وہ اس بمبار طیارے کو اُڑا سکے گا؟ وہ ہوا باز تھا لیکن وہ رُوسی طیارے اُڑا سکتا تھا۔ جرمنی کے طیاروں کے متعلق اُسے کچھ علم نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ پریشانی بھی تھی کہ ہوسکتا ہے یہ طیارہ بے کار ہو یا اس میں پٹرول ہی نہ ہو۔ زندگی اور موت دُو بدُو کھڑی تھیں۔

یانا ژوف نے سوچا کہ انجام بہرحال موت ہی ہے پھر کیوں نہ فرار کی کوشش کر کے مریں۔ بمبار طیارہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ ہوائی اڈے کے سٹاف سے روپوش

تھا۔ یاتا ژوف بمبار طیارے میں پائلٹ کی سیٹ پر جا بیٹھا اور تمام قیدیوں سے کہا کہ طیارے میں پانچ یا چھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں لیکن سبھی گھس جاؤ اور اپنے آپ کو طیارے میں ٹھونس لو۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ یاتا ژوف نے سُرعت سے طیارے کے کنٹرول وغیرہ کا جائزہ لیا اور انجن سٹارٹ کیا۔ ایک طرف کا انجن سٹارٹ ہوگیا اسی طرح اُس نے دوسرا انجن بھی سٹارٹ کرلیا۔ پٹرول کا میٹر دیکھا ٹینکیوں میں نصف پٹرول تھا اُس نے سوچا کہ اتنا سا پٹرول رُوسی مورچوں تک پہنچا دے گا۔

اس نے طیارے کی بریکیں کھول دیں۔ طیارہ آگے چل پڑا۔ سامنے کھُلا میدان تھا۔ اس نے دونوں تھراٹل پوری طرح کھول دیے۔ طیارہ گرجتا ہوا بھاگا اور آگے جاکر زمین سے اُٹھنے لگا۔ اس نے اڈّے کے فلائنگ کنٹرول کی طرف دیکھا۔ وہاں اُسے سُرخ روشنی نظر آئی جو خطرے کا الارم تھی طیّارہ ابھی بلندی پر نہیں گیا تھا کہ ڈگمگا گیا۔ یاتا ژوف نے دیکھا کہ زمین سے طیّارہ شکن مشین گن کی بوچھاڑ ایک پَر کو چھلنی کرتی گزر گئی تھی۔ اُس نے طیارے کو یک لخت بلندی کی طرف کھینچا۔ اب آسمان میں اس کے اردگرد طیّارہ شکن گولے پھٹ رہے تھے۔ جرمن بیدار ہوگئے تھے۔ یاتا ژوف طیارے کو انتہائی رفتار پہ لے جارہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہوائی اڈّے کی طیّارہ شکن گنوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ اُس نے میدان مار لیا ہے لیکن اب آسمان کی طرف سے موت اس پر جھپٹا مار رہی تھی۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ دو جرمن لڑاکا طیارے اس پر غوطے میں آرہے تھے۔ اُس نے جائزہ لیا تو خوفزدہ ہوگیا کیونکہ اِن بمبار طیّارے کی مشین گنیں خالی تھیں۔ وہ فضائی معرکہ لڑنے سے معذور تھا۔ لیکن وہ تجربہ کار لڑاکا ہوا باز تھا۔ فضائی جنگ کے داؤ پیچ جانتا تھا۔ جب جرمن لڑاکا طیارے پیچھے سے اُس کے قریب پہنچے تو وہ سمجھ گیا کہ اب وُہ مل کر اس پر گولیاں برسائیں گے۔ اُس نے جرمنوں کا وار بیکار کرنے کے لیے اپنے طیارے کی رفتار یک لخت کم کردی۔ رفتار کم ہونے سے طیارے کی بلندی بھی کم ہوگئی۔ جرمن بمبار جو تیز رفتار پہ آرہے تھے مشین گنیں فائر کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ایک بھی گولی بمبار طیارے کو نہ لگ سکی کیونکہ وہ یاتا ژوف کے پینترے سے پیچھے رہ گیا تھا۔

جرمن طیارے دُور آگے جاکر غوطے سے اُٹھے اور گھُوم کر اپنے شکار کی طرف آنے لگے لیکن انہیں شکار کہیں نظر نہ آیا۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ ان کا سامنا ایک منجھے ہوئے ہوا باز سے ہے۔ یاتا ژوف طیارے کو دُور اُوپر بادلوں میں لے گیا تھا جرمن اُسے بادلوں کے نیچے تلاش کر رہے تھے۔ اُسے معلوم نہیں کہ وہ اُسے کتنی دیر تلاش کرکے لوٹ گئے۔ جب وہ بہت دیر تک سامنے نہ آئے تو یاتا ژوف نے سکون سا محسُوس کیا لیکن اُسے سَر میں گرانی محسُوس ہونے لگی پھر آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھانے لگی۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ وہ طیارے کو اس قدر بلندی پہ لے آیا ہے جہاں آکسیجن کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ وہ جرمن طیاروں کے ڈر سے بادلوں سے نیچے نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اُوپر بھی موت کا خطرہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند لکا گہرا ہونے لگا۔

اس کے ساتھ دُوسری مصیبت یہ آپڑی کہ وہ دُنیا کے ایسے خطے پر اُڑ رہے تھے جہاں زمین پر ہر شے یخ بستہ رہتی ہے۔ اس خطے کی بلندی پر طیارے کے انجنوں کا جام ہوجانا حیران کُن نہ تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جرمنوں نے یہ طیّارہ برفانی علاقوں کے لیے بنایا تھا اس لیے انجن محفوظ رہے لیکن طیارے میں بیٹھے ہوئے یہ روسی قیدی محفوظ نہ رہ سکے۔ سردی سے اُن کے جسم اکڑنے لگے۔ بعض کے دانت بج بج کر اکڑ گئے۔ خود یاتا ژوف کا یہ حال تھا کہ کنٹرول پر اس کی انگلیاں اکڑ گئیں۔

یہ محض فرار کا جذبہ تھا جو اُسے زندہ رکھے ہوئے تھا۔

جب اُس نے دیکھا کہ وہ آکسیجن اور حرارت کے بغیر دو منٹ اور زندہ نہ رہ سکے گا اُس نے طیارے کو غوطے میں ڈال دیا اور بادلوں سے نیچے لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اب ایسی فضا میں جا پہنچا جہاں سورج چمک رہا تھا، بادل کا کوئی ٹکڑا نہ تھا۔ سورج کی تپش نے اُنہیں ذرا سا سنبھالا دیا اور بلندی کم ہونے کی وجہ سے آکسیجن کی ضرورت نہ رہی لیکن یاتا ژوف کی جسمانی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے سمت کا تعین کیا۔ اُس کے کئی ساتھی بے ہوش ہو چکے تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد طیارے کے گرد تین چار گولے پھٹے۔ اُس نے گھبرا کر نیچے دیکھا۔ اُس نے زمینی مورچوں کا رُخ دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ رُوسی مورچے ہیں۔ یعنی اب رُوسی توپچی اُس پر گولے برسا رہے تھے۔ اُس نے طیارے کی کاک پٹ ۔۔ (پائلٹ کی سیٹ کی جگہ) میں ہر طرف دیکھا اُسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کا وائرلیس سسٹم کہاں ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ طیارے پر جرمنی کے نشان تھے۔ رُوسی توپچیوں کو کیسے پتہ چلتا کہ اس کا ہوا باز بھی رُوسی اور مسافر بھی رُوسی ہیں۔ وہ تو اُسے جرمنی کا حملہ آور بمبار سمجھ کر اُسے مار گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یاتا ژوف کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ رُوسی توپچیوں کو صُورتِ حال سے آگاہ کر سکے کہتا۔ "رُوسیو! ہمیں مار نہ گرانا۔ ہم بہت مصیبت جھیل کر آئے ہیں ۔" یہ ایک دردناک پکار تھی جو طیارے کے انجنوں کے شور میں دب گئی ۔

طیارے کے اردگرد گولے پھٹتے رہے اور طیارہ رُوسی مورچوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ یاتا ژوف نے طیارہ اُتارنے کے لیے پہیے نیچے کیے اور بلندی کم کرنے لگا۔ زمینی توپچی اُسے زد میں لینے لگے تو کسی افسر نے چلّا کر اُنہیں حکم دیا۔ " فائر نہ کرنا۔ وہ اُتر رہا ہے۔ اُترنے دو۔ ہوا بازوں کو زندہ پکڑ لیں گے ۔"

نیچے ذرا وسیع میدان تھا۔ یاتا ژوف کو توقع نہیں تھی کہ اس ذرا سے میدان میں جو ہموار بھی نہیں تھا طیارہ صحیح وسلامت اُتر سکے گا۔ لیکن وہ اپنے توپچیوں اور پٹرول ختم ہو جانے کے ڈر سے اور آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے خطرہ مول لیا اور طیارے کو وہیں اتارنے لگا۔ طیارہ زمین پر آگیا، پھر اُچھلا لیکن یاتا ژوف نے اسے سنبھال لیا اور آگے جا کر روک لیا۔ رُوسی فوج کے کئی سپاہی رائفلیں تانے اُسے گھیرے میں لینے کو پہنچ گئے لیکن اُنہوں نے دیکھا کہ طیارے سے رُوسی قیدی نکل رہے تھے۔ باقی سب ٹھیک تھے لیکن یاتا ژوف جونہی باہر نکلا، بے ہوش ہو گیا۔ اس کا اعصابی نظام تباہ ہو چکا تھا۔

جب وہ ہسپتال سے تندرست ہو کر نکلا تو بجائے اس کے کہ اُسے اس بہادری پر اور دشمن کا اچھا بھلا بمبار طیارہ چرا لانے کے عوض کوئی تمغہ دیا جاتا۔ اُس کا کورٹ مارشل کیا گیا اور اس جُرم میں اُسے نو سال قید بامشقت دے دی کہ وہ دشمن کا قیدی بن گیا تھا۔ اُسے اور اُس کے دس ساتھیوں کو نو نو سال کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔

۱۹۵۳ میں جب وہ جیل سے سزائے قید کاٹ کر رہا ہوا تو ایئر فورس کے اعلیٰ حکام نے اپنی حکومت سے کہا کہ وہ سٹالن کا حکم تھا جس کے تحت قیدی ہو جانا جُرم قرار دیا گیا تھا۔ اُنہوں نے سٹالن کے بعد کی حکومت پہ واضح کیا کہ جو رُوسی فوجی قیدی ہو گئے تھے وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں قیدی ہوتے تھے۔ اگر یہ جُرم ہی تھا تو اصل مُجرم خود سٹالن تھا۔

چنانچہ حکومت نے یاتا ژوف کو ۱۹۵۳ میں رُوس کا سب سے بڑا تمغہ "ہیرو آف سوویت یونین" دیا اور اس کے کارنامے کو فوجی تاریخ میں شامل کر لیا۔



میں جاسوس تھی

اچانک جاپانی فوجی پولیس کے چار افسر دندناتے ہوئے کلب میں داخل ہوئے۔ میں گھبرا کر اچھل پڑی۔ ان افسروں نے ریوالور کی نالیاں میری پسلیوں میں گاڑھ دیں۔

کلیر فلپس
عبدالحفیظ قریشی

جب فروری ۱۹۴۲ء میں امریکی فوجیں واپس باتان آنے لگیں تو ہم یعنی میں اور ڈائنی (میری بیٹی) بھی ان فوجوں کے ساتھ ساتھ باتان چل دیے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے شوہر کے قریب رہ سکوں جو امریکی فوج میں تھا۔ جاپانیوں کے ڈر سے ہم پہاڑیوں میں جا چھپے اور جانوروں کی سی زندگی گذارنے لگے ڈائنی پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا۔ میں ڈائنی کو بڑی مشکل سے چھپتے چھپاتے نکال کر منیلا پہنچی۔ جہاں مجھے اور ڈائنی کو ایک جج روکساس نے پناہ دی۔ یہ میرے پہلے شوہر یعنی ڈائنی کے والد کے رشتہ دار تھے۔

مجھے جاپانیوں سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے جب جج روکساس کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا کہ میں جاپانیوں کے خلاف جاسوسی کروں گی اور ملکی ساحلی علاقے میں ایک نائٹ کلب کھول کر جاپانی جہازوں کی آمد و رفت دیکھوں گی اور جاپانی گاہکوں سے معلومات حاصل کر کے امریکی فوجوں کو دوں گی تو جج روکساس نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں ایسی حرکت نہ کروں کیونکہ جاسوسوں کو کبھی نہ کبھی تو پکڑ ہی لیا جاتا ہے اور ان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔

میں کچھ عرصہ پہلے مادام ڈوٹ کے فرضی نام سے "اینافی" کے شبانہ کلب میں جاپانیوں کی ناک کے نیچے دو ماہ تک مغنیہ کا کام کر چکی تھی اور کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے جاپانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے میری جلد کی رنگت زیتونی اور بال کالے تھے اس لیے مجھ پر امریکی ہونے کا شبہ ہی نہ کیا گیا۔ ان دو مہینوں میں میں نے منیلا کے شبانہ کلبوں اور جاپانی کردار کو بڑی غور سے دیکھا تھا۔ میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگر میں شبانہ کلب کھول کر زیادہ قیمت وصول کروں اور کلب میں صرف جاپانی افسران کو آنے دوں تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔

میں نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی اور کلائی کی گھڑی رہن رکھ دی۔ اس سے مجھے



خاصی رقم لی گئی اور میں نے کام شروع کر دیا۔ امریکا کے علاقے میں ایسی جگہ میں نے تلاش کر لی جہاں سے میں بندرگاہ میں جہازوں کی آمد و رفت کو بآسانی دیکھ سکتی تھی۔ یہیں میں نے اپنا کلب کھول لیا۔ کلب کا نام جاپانی طرز پر "زوباکی" کلب رکھا۔ "زوباکی" جاپانی زبان میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو نازک بھی ہو اور ناممکن الحصول بھی۔ میں نے ایک لڑکی فیلی کورکارا کو لڑکیوں پر منتظم کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ اس لڑکی کو میرے ارادوں کا علم تھا اور یہ کئی دفعہ میری جان بچا چکی تھی۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو کلب کا افتتاح تھا۔ میں دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ کوئی جاپانی افسر آتا تو میں تعظیماً جھک کر اسے کومباوا (شام کا سلام) عرض کرتی اور اس کو میز تک لے جاتی جہاں وہ ایک میزبان لڑکی اپنے لیے چن لیتا۔ اس زمانے میں منیلا کے بہت سے نائٹ کلب ہفتے میں صرف ایک شو کرتے تھے۔ میرے ہاں اس قسم کے شو روزانہ ہوتے تھے۔ فیلی کورکارا جاپان کے رومانی گیت گاتی اور دوسرے فلپینی لڑکے اور لڑکیاں مقامی رقص کرتے۔

ہمیں چند مشکلات کا بھی سامنا کرنا۔ شروع میں جاپانی مجھے اور دوسری لڑکیوں کو اپنے مخصوص آوارہ انداز سے دیکھتے تھے ان کو بڑی مشکل سے سمجھانا پڑا کہ یہ جگہ اس قسم کی نہیں ہے۔ اس کے لیے بعض دفعہ ہمیں جاپانی افسروں کے طمانچے بھی کھانے پڑے آہستہ آہستہ یہ مشکل ختم ہو گئی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ گاہک کلب کو بہت مہنگا سمجھتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ اتنی رقم لینا کچھ زیادتی نہیں ہے۔ آخر کار وہ مطمئن ہوتے گئے۔

عام طور سے جونیئر افسر بیئر پینے کے بعد بوتل کو فرش پر پھینک کر چور کر دیتے اور بغیر رقم دیئے ہی کلب سے چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک نائب افسر نے بیئر کی خالی بوتل ایک میزبان لڑکی کے سر پر دے ماری۔ گو جاپانیوں کی طرف سے حکم تھا کہ افسروں کی بد اخلاقی اور ان سے جو نقصان کلب کو ہوتا ہے اس کی فوراً اطلاع دی جایا کرے مگر میں ارادتاً ان کی شکایت کرنے سے چشم پوشی کرتی۔ کیونکہ میں ان کا مکمل اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جاپانیوں نے جنگ کے دوران رقص کی قطعی ممانعت کی ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک رقص فوجی کردار کی تضحیک کے مترادف ہوتا تھا۔ مگر اکثر جاپانی افسر میزبان لڑکیوں کو رقص کے لیے مجبور کرتے تھے۔ ایک رات جاپانی فوجی پولیس کا ایک آدمی کلب میں آیا اور ایک کپتان کے، جو اس وقت رقص کر رہا تھا زور سے تھپڑ مارا۔ کپتان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ مگر کپتان نے بغیر کچھ کہے رقص ختم کر دیا۔ مجھے اس واقعہ پر بہت گھبراہٹ ہوئی کہ اب جاپانی میرا کلب بند کروا دیں گے اور جس مقصد کے لیے میں نے اتنے پاپڑ بیلے ہیں ختم ہو جائے گا۔ فیلی کورکارا نے میری ہمت بندھائی۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ سب کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں خود ٹھیک کر لوں گی"۔

فیلی کورکارا اور ایک میجر نے اس جاپانی فوجی پولیس کے آدمی کو بڑی مشکل سے یہ سمجھایا کہ ہم نے تو کپتان کے رقص کرنے پر احتجاج کیا تھا۔ لیکن ہمیں مجبوراً کپتان کی مرضی پر خاموش رہنا پڑا۔ میجر نے پولیس کے آدمی کو کچھ رشوت بھی دی۔ تب کہیں اس نے وہ شکایت نامہ پھاڑا جو وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے مجھ پر مکمل اعتماد کیا جانے لگا۔ جاپانی افسروں کا راتوں کو تانتا بندھا رہتا۔ میری دولت بڑھ رہی تھی اور کام کا اب یہی موقعہ تھا۔ میں نے کپتان جان بون سے، جو امریکی گوریلا فوج کا باٹان میں کمانڈر تھا، رابطہ پیدا کیا۔ میرا خفیہ نام "ہائی پاکٹس" High Pockets تھا۔ میں کھانے پینے کی چیزوں کے ناموں کو اپنی اطلاع کی ترسیل کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اگر میری فراہم کردہ اطلاعات بہت اہم ہوتیں تو کپتان بون جواباً "مچھلیاں بہت مزیدار تھیں" لکھتا اور اطلاعات کے غیر اہم یا ناقابل عمل ہونے پر وہ لکھتا "گوبھی آتے آتے خراب ہو گئی"۔

ہمارا سب سے پہلا پیغام بر پکڑا گیا اور اسے گولی مار دی گئی۔ دوسرا پیغام بر محفوظ رہا۔ اس کے جوتے دوہرے تلے

گئے تھے۔ ہم اپنے پیغامات اس کے جوتوں کے تلوں میں چھپا کر بھجواتے یا کبھی کبھی ہم کیلوں کے گچھے میں سے ایک کیلے کی چھال اتار کر پرچہ اس کے اندر رکھ دیتے اور کیلے کی چھال کو برابر کر دیتے۔ مہینے میں ایک دفعہ میں اپنی فراہم کردہ اطلاعات دواؤں اور غذاؤں کے پیکٹوں کے ساتھ بھیجتی۔ اگر کوئی بہت اہم بات ہوتی تو میں ایک فلپینی خدمت گار کو اطلاع کے ساتھ فوراً کپتان بون کے پاس روانہ کر دیتی۔ میں جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اور ان کی منزل مقصود کی خبریں امریکیوں تک پہنچاتی۔

ایک رات ایک جاپانی بحری ریڈ کراس کے جہاز کا کپتان کلب میں آیا۔ وہ بہت زیادہ پیئے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بڑی دقت سے فوج کا ایک دستہ یونگن واسے لے کر آیا ہے۔ میں نے پوچھا "کیا سب سپاہی زخمی ہیں؟" کپتان بہت زور سے ہنسا اور بولا "اس جہاز میں صرف چند سپاہی معمولی زخمی ہیں۔ باقی سب کے سب بہترین لڑنے والے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بے وقوف امریکی اس ریڈ کراس کے جہاز کو غور سے نہیں دیکھیں گے۔" کپتان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہم نے بہت سے زخمی سپاہیوں کو خود ہی ختم کر دیا ہے تاکہ وہ امریکیوں کے ظلم و تشدد سے بچ جائیں۔ اسی رات کو میں نے کپتان بون کو یہ اطلاع پہنچائی کہ جاپانی ریڈ کراس کے جہازوں کو فوجیوں کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ایک رات میں کلب میں ایک جاپانی افسر سے باتیں کر رہی تھی کہ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا "میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟" میں نے سوچا کہ اس نے پہلے مجھے اینانی کے کلب میں دیکھا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا "پہلے کب؟" اک زوردار گھونسہ میرے منہ پر پڑا اور میں فرش پر لڑکھڑا گئی۔ وہ غصے سے دھاڑا "تم لوگ ہمیشہ جاپانیوں کے آنے سے پہلے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ یہ بات تمہیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ذلیل امریکن ہمیشہ کے لیے جا چکے ہیں اور اب یہاں جاپانیوں کی حکمرانی ہے۔"

کبھی کبھی مجھے اپنی محنتوں کا علم جلدی ہو جاتا تھا۔ ایک ایئر کرافٹ کیریر (طیارہ بردار بحری جہاز) کا کپتان فیلی کو کارا کے گانے پر بری طرح فریفتہ تھا۔ اس افسر کی الوداعی پارٹی کے موقعہ پر فیلی نے اس سے نہایت مکاری سے کہا "اب آپ جا رہے ہیں۔ میں آپ کو کس پتے پر خط لکھوں؟" کپتان نے بتایا کہ وہ پہلے سنگاپور اور پھر رابول جائے گا۔ میں نے یہ اطلاع فیلی سے حاصل کر کے فوراً کپتان بون کے پاس پہنچا دی۔ اس کے کچھ ماہ بعد ایک جاپانی افسر نے فیلی کو بتایا "تمہارے ایئر کرافٹ کیریر کے کپتان اور اس کے پورے عملہ کو امریکیوں نے تباہ کر دیا تھا۔" میں نے اور فیلی نے نہایت مکاری سے اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

ایک جاپانی آبدوز بیڑے کا کمانڈر ایک رات کلب میں آیا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان نظر آ رہا تھا۔ اس نے سان فرانسسکو میں نیم عریاں رقص دیکھا ہوگا۔ یہ رقص بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا ہے اس نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی ننگا رقص پیش کروں میں نے اسے دوسری رات آنے کی دعوت دی۔ ہم نے بانسوں کی کھپچیوں اور بہترین کاغذ سے دو پنکھے بنائے۔ فیلی نے میرے جسم کی رنگت سے ملتا جلتا اک چست چمٹا ہوا لباس بنایا۔ ہال میں ہم نے سرخ روشنی پھیلا دی۔ وہ کمانڈر اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ آیا ان لوگوں نے نظریں گاڑ گاڑ کر دیکھا کہ میں واقعی برہنہ ہوں؟ وہ دوسری رات بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اس نے کہا "آج رات تم اور نیم عریاں رقص کرو کیونکہ کل ہم لوگ سالومن جا رہے ہیں۔"

میں نے نیم عریاں رقص دوسری رات بڑی کامیابی سے پیش کیا اور اس کے بعد جاپانی آبدوز بیڑے کی روانگی کی اطلاع کپتان بون کے پاس پہاڑیوں میں بھجوا دی۔ چند مہینوں کے بعد ایک جاپانی افسر آیا۔ اس نے بتایا کہ آبدوز کا وہ بیڑا بالکل تباہ کر دیا گیا ہے اور

دو چند بچنے والے خوش قسمتوں میں سے ہے۔

میرا شوہر کیانا ٹان کیمپ میں قید تھا۔ میں اس زمانے میں بہت دولت کما رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کی کچھ مدد کروں۔ میں نے بہت کوششوں کے بعد اس قیدی کیمپ میں اپنا کچھ اثر پیدا کیا۔ مگر مجھے یہ معلوم کر کے از حد افسوس ہوا کہ میرا شوہر دو ہفتے قبل مر چکا تھا۔ گو جاپانی یہ کہتے تھے کہ اس کی موت ملیریا سے ہوئی ہے لیکن وہ دراصل فاقہ کشی سے مرا تھا۔

دو پادری تھے۔ رابرٹ ٹیلر اور ٹی ٹی لا۔ یہ دونوں ایک جاپانی قیدیوں کے جہاز پر دوسرے سوا تین سو آدمیوں کے ساتھ تھے اور جہاز جاپان جا رہا تھا۔ اس جہاز کو تارپیڈو کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا۔ ان پادریوں نے مجھے امریکی قیدیوں کی مشکلات اور ان کی ضروریات کے بارے میں لکھا۔ میں قیدیوں کی مدد کرنے کی خاطر یو گروپ میں شامل ہو گئی تاکہ میں قیدیوں کے لیے پیغامات کچھ رقم، غذا اور دوائیں بھجوا سکوں۔ ہم لوگ قیدیوں کی چادروں کی شکنیں درست کرتے اور ان کے موزوں کی مرمت کرتے۔ ہم قیدیوں کے لیے دوائیں تک خود بناتے۔ قیدیوں میں حیاتین 'ج' کی کمی کی وجہ سے بیری بیری اور سکروی کی بیماریاں عام تھیں۔ ہم مقامی نارنگیوں کا رس پکا کر اس میں شکر ملاتے اور جگوں میں بھر کر قیدیوں کے کیمپ میں بھجوا دیتے۔ قیدیوں تک سامان پہنچانے کی خاطر پہرے داروں کو قلم، گھڑیاں اور کیمروں کے نذرانے دینے پڑے۔

ایک ایک وقت میں سینکڑوں پیغامات اور پیسے کیمپ میں پہنچا دیے جاتے۔ قیدیوں کی مدد کرنا ہی میری تباہی کا پیش خیمہ بنا۔ ۲۱ مئی ۱۹۴۴ء کو میں بہت رنجیدہ اور بے چین، ناشتہ کی میز پر بیٹھی تھی۔ میری رنجیدگی کا سبب یہ تھا کہ رمین جو خفیہ طور پر کیمپ میں بہت چیزیں لے جاتا تھا، پکڑ لیا گیا تھا۔ اچانک جاپانی فوجی پولیس کے چار افسر دندناتے ہوئے کلب میں داخل ہوئے۔ میں گھبرا کر اچھل پڑی۔ دو افسروں نے ریوالور کی نالیاں میری پسلیوں میں گاڑ دیں۔

"تمہارے سب کاغذات کہاں ہیں؟ جلدی بول ذلیل عورت!" ایک افسر چلایا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ جاسوسوں کو یا تو گولی مار دی جاتی ہے یا ان کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے گارڈ روم لے گئے۔ آنکھوں پر پٹی بندھے بندھے مجھے سوالات کے جواب دینے پڑے۔

ایک آواز گونجی: "ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اب کچھ چھپانا بے کار ہے۔ ہائی پاکٹس!"

"ہائی پاکٹس" یعنی اپنا خفیہ نام سن کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کو میرا کوئی خفیہ خط مل گیا ہے۔ مگر میرا کون سا خط انہوں نے پکڑ لیا؟ اگر کپتان بون کے نام میرا کوئی خط پکڑا گیا تو میرا خاتمہ یقینی ہے۔ جب انہوں نے میرا وہ خط پڑھنا شروع کیا، جو میں نے پادری کے نام لکھا تھا، تب مجھے پتہ چلا کہ میرا پیغامبر پکڑا جا چکا ہے۔

انہوں نے پوچھا: "کال کون ہے؟" میں نے بتایا: "یہ کلمے مین سس مقامی نارنگی کے نام کا مخفف ہے۔" اس خط میں پادری کو میں نے یہ لکھا تھا کہ میرے پاس جگوں کی کمی ہے۔ اور جتنے جگ آپ کے پاس ہوں فوراً بھجوا دیں۔"

جاپانیوں کو میری باتوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں سے خوب پیٹا۔ وہ پیٹتے جاتے اور پوچھتے جاتے: "یہ کال کون ہے اور جگ سے کیا مراد ہے؟ ہم بے وقوف نہیں ہیں۔ کال ایک خفیہ لفظ ہے اور جگ ایک امریکی نام ہے۔"

چند ہاتھوں نے مجھ کو پکڑ لیا اور مجھے زبردستی لٹا دیا گیا۔ میرے ہاتھوں، پیروں اور سر کو سختی سے باندھ دیا گیا۔ پانی کا پائپ میرے منہ اور ناک میں پھنسا دیا گیا۔ جب اس پائپ میں پانی چھوڑا گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں پانی میں ڈوب رہی ہوں۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ میں خوف سے چیختی ہوئی ہوش میں آئی۔ جاپانی میرے جسم کے مستور حصوں کو جلتی ہوئی سگریٹوں سے جلا رہے

تھے "بتاؤ مسٹر ڈیپی جون کون ہیں اور کال کیا ہے" ؟ میں سوائے چیخنے چلانے کے کچھ نہ کہہ سکی۔

جب میرے منہ میں وہ دوبارہ پائپ پھنسانے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ ڈیپی جون کے معنی کسی انگریزی جاپانی لغت میں دیکھیں۔ انہوں نے پائپ میرے منہ میں پھنسا دیا اور پھر وہی عمل دہرایا۔ میں پھر بے ہوش ہو گئی۔

میں جب دوبارہ ہوش میں آئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ بند کر دی۔ ہر جاپانی افسر کی جیب میں ایک چھوٹی انگریزی جاپانی لغت ہوتی تھی۔ انہوں نے اس لغت میں ڈیپی جون کے معنی دیکھ لیے تھے۔ وہ لوگ باہر چلے گئے اور میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔

مجھے تین ہفتے تک ایک کمرے میں بالکل تنہا رکھا گیا مجھے روزانہ تین پیالے پانی اور اک پیالہ اُبلے ہوئے چاول غذا کے طور پر ملتے تھے۔ ایک دن میں نے چند جاپانیوں کو، جو میرے کمرے کے پاس کھڑے تھے، اشاروں سے بتلایا کہ مجھے اپنے گندے کپڑے دھونے کے لیے کچھ پانی کی ضرورت ہے ایک جاپانی نے گندے پانی کی بالٹی میرے اوپر انڈیل دی۔ میرے بال چیکٹ ہو رہے تھے۔ میرے جسم پر گرد اور میل کی تہیں جم چکی تھیں۔ جوؤں اور پسوؤں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں بھتنی کی صورت بنی ہر پل فرش پر بیٹھی رہتی۔

میں غذا کی کمی کی وجہ سے کمزور ہونے لگی تھی۔ جسم کا گوشت آہستہ آہستہ گھلنے لگا تھا۔ سگریٹوں سے جلایا ہوا جسم کا حصہ پکنے لگا تھا۔ جسم پر جلنے کے ایسے نشانات پڑ چکے تھے جن کو میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔ اکیلے پن کا احساس شدید تھا اور میں خود ہی خود بڑبڑاتی تاکہ یہ معلوم کر سکوں کہ میں زندہ ہوں۔

تین ہفتوں کے بعد مجھے سانتاگو کے قید خانے میں بھیج دیا گیا جہاں مجھے دوسری گیارہ عورتوں کے ساتھ اسی فٹ لمبے اور بیس فٹ چوڑے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تین مہینے بڑی مشکل سے گذرے۔ آخر کار ایک افسر، جس کو میں پہلے اپنے کلب میں دیکھ چکی تھی، میری کھڑکی کے قریب سے گذرا۔ میں نے اسے بلایا اور اس سے کہا کہ میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے معاملے کو دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرے تاکہ مجھے اس جہنم سے نجات مل سکے۔

دو بجے صبح میں پھر بازپرس کے لیے لے جائی گئی۔ جاپانی ہمیشہ گہری نیند میں سے قیدیوں کو اس لیے اٹھاتے ہیں کہ اس طرح شاید قیدی نرم پڑ جائیں اور حالات بتادیں۔ مجھے یہ بتلایا گیا کہ ایک خاص خط جو میرے معاملے میں بہت اہمیت رکھتا تھا کھو گیا ہے۔ مگر دوسرے خطوط موجود ہیں۔ ایک خط میں واقعی میں نے بڑی بے وقوفی کی تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ "میں اک امریکی عورت ہوں اور جاپانیوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک جاپانی کلب چلا رہی ہوں" یہ خط اب ان لوگوں کے پاس تھا۔ افسر غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ "اے ذلیل عورت۔ تو نے جاپانیوں تک اس لیے رسائی حاصل کی کہ تو ان کی جیب ذلیل امریکیوں کی خاطر خالی کروا سکے"۔

جاپانیوں نے مجھے مختلف طریقوں سے شدید اذیتیں پہنچائیں انہوں نے میرے ناخنوں میں میخیں ٹھونک دیں۔ درد کی شدید لہر میرے جسم کو چیرتی ہوئی پاؤں تک چلی گئی۔ میں بالکل بے حال ہو گئی۔ اس وقت اگر میں ان کے سوالات کے جواب دینا بھی چاہتی تو شدید تکلیف کی وجہ سے نہ دے سکتی۔ ایک ہفتے کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک پرانے سپاہی کیمپ میں لے جایا گیا۔ یہ کیمپ سانتاگو کیمپ کے زیر عمل تھا۔ جب میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو مجھے ایک جاپانی افسر ہاتھ میں ننگی چمکتی تلوار لیے ہوئے نظر آیا۔ اس نے مجھے جھک جانے کا حکم دیا۔ مجھے تلوار کی دھار اپنی گردن پر محسوس ہوئی۔ جاپانی افسر نے کہا "یہ تمہارا آخری وقت ہے، اگر دعا مانگنی ہو تو مانگ لو"۔

میں شاید تڑپ کر نکل بھی جاتی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ

میں حرکت کرنے کے بالکل قابل نہیں ہوں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وقت تیز و تند سیلاب کی طرح گذرتا جارہا تھا اور میں خدا کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔ اس جاپانی افسر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا: اے بہادر عورت ہمیں امید تھی کہ تم اس مرحلہ پر کچھ بھی نہ چھپا سکو گی اور وہ سب کچھ ہمیں بتلا دوگی جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ مگر تم اس مرحلے پر بھی خاموش رہی ہو۔ اس لیے ہم یقین کرتے ہیں کہ تم بے قصور ہو: اس تقریر کا آخری حصہ میں اس لیے نہ سن سکی کہ میں بے ہوش ہو کر آگے کی طرف ڈھلک چکی تھی۔

تین دن کے بعد مجھے میکلی قلعے میں ایک رسمی کورٹ مارشل کے لیے لے جایا گیا۔ میں نے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زور دار گھونسہ میرے منہ پر پڑا جس سے میرا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ ایک آواز نے مجھے ڈانٹا: تم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ تم صرف یہ بتاؤ کہ تم مجرم ہو کہ نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ گو پہلے میں بہت خوفزدہ تھی مگر اس کے بعد پتہ نہیں کیوں مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ مجھ پر ایک اور مقدمہ چلنے والا ہے۔ یہ مقدمہ جاسوسی سے متعلق نہیں تھا بلکہ مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں نے جاپان کی شاہی حکومت کے خلاف کام کیا ہے۔ جب مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ میں اس سلسلے میں کیا کہنا چاہتی ہوں تو میں نے بے ساختہ اس بے بنیاد جرم کا اقرار کرلیا۔ میری گذشتہ حالت ایسی تھی کہ مجھے زندگی سے موت بدرجہا بہتر نظر آتی تھی اس لیے میں نے اس غلط الزام کا اقرار کرلیا۔ مجھے بیس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

دوسرے دن مجھے عورتوں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ گو یہ جگہ بھی اتنی اچھی نہ تھی، مگر دوسرے کیمپ کی صعوبتوں کے مقابلے میں یہ عورتوں کی جیل جنت معلوم ہوتی تھی۔ قیدی عورتیں کبھی فاقہ کشی کرتیں اور کبھی کیلے کے پتے ابال کر کھاتیں۔ ہم پر ایک فلپینی عورت نگران تھی اور ہم باغبانی کا کام کرتی تھیں۔ یہ نگران عورت بہت مہربان تھی اور صرف یہ چاہتی تھی کہ جس دن جاپانی افسر معائنہ کے لیے آئیں اس دن باغ کو اچھی طرح سنوار دیا جائے۔ میرے زخم آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہے تھے۔ دماغ بھی کچھ سکون پاتا جارہا تھا۔ آخر کار ۱۰ فروری ۱۹۴۵ء کا وہ دن آیا جب اتحادی فوجوں نے ہمیں اس قید خانے سے نجات دلائی۔ میں پریشان حال ننگے پیروں ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ آزادی نے مجھے دیوانہ سا کر دیا تھا۔ یہ خیال کہ میں اپنی ڈائنی سے مل سکوں گی، اپنے ملک کی آزاد فضا میں سانس لے سکوں گی۔ مجھے خوشی سے پاگل کیے دے رہا تھا۔

- تعلیم کے ساتھ عمل نہ ہو اور دولت کے ساتھ شرافت نہ ہو تو دونوں بے کار ہیں۔
- دولت کے بھوکے کو کبھی راحت میسر نہیں ہوتی۔ ناجائز دولت تباہی کا باعث ہوتی ہے۔
- مصیبت صبر و ایمان کا امتحان لینے آتی ہے۔ مایوسی، کمزوریٔ ایمان کی دلیل ہے۔
- خدا تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو اپنا کارساز یا حامی سمجھنا شرک اور گناہ عظیم ہے۔
- ہر کام کے نتائج عمل پر موقوف ہیں۔ عقیدہ درست نہ ہو تو عمل بے کار ہے۔
- سب سے بڑی دولت عمل صالح ہیں۔ مفلس وہ ہے جس کے پاس اعمال صالح نہ ہوں۔
- تمہارے اوپر حکومت جب آتے ہیں وہ تمہارے ہی اعمالوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
- اپنا اخلاق و کردار بلند کرو۔ دوسروں کی کوتاہیوں اور برائیوں پر نظر نہ رکھو۔



جب فلپائن میں معرکہ ہوا

دوسری عالمی جنگ میں جاپانیوں کے طوفانی حملے اور اہلِ فلپائن کی بے مثال مزاحمت کی حیرت بدوش کہانی

ترجمہ و تلخیص: قاضی ذوالفقار احمد

تاریخ عالم کی سب سے بڑی جنگ' دوسری عالمی جنگ یا جنگ عظیم دوم (ستمبر ۱۹۳۹ء تا اگست ۱۹۴۵ء) کہلاتی ہے۔ یہ جنگ اتحادی اور محوری طاقتوں کے مابین برپا ہوئی۔ اتحادیوں کے سرخیل برطانیہ' امریکہ' روس اور فرانس تھے اور محوریوں میں جرمنی' اٹلی اور جاپان شامل تھے۔ محوری انہیں اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی قسمت شروع سے لے کر آخر تک گویا ایک محور کے گرد گھومتی رہی۔ جنگ کے ابتدائی دور میں جرمنی اور اس کے ساتھی کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے گئے حتیٰ کہ ۱۹۴۲ء ان کی فتوحات کا نقطہ عروج تھا۔ مغرب میں تقریباً پورا یورپ ہٹلر کے قدموں میں تھا تو اس طرف مشرقی و جنوب مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کے بیشتر جزائر جاپان کی عملداری میں آ گئے تھے۔ جاپانی فوجی ایشیا اور بحرالکاہل پر ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء سے لے کر ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء تک دندناتے رہے۔ اواخر ۱۹۴۲ء میں شمالی افریقہ میں لڑی گئی ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ "العالمین" کے بعد محوری بتدریج شکستیں کھاتے چلے گئے حتیٰ کہ ہٹلر کی خودکشی (اپریل ۱۹۴۵ء) اور ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے امریکی ایٹم بموں (۶ اور ۹ اگست ۱۹۴۵ء) نے محوریوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ زیرِ نظر داستان جاپانی جنگجوئی کے اسی دور سے تعلق رکھتی ہے جب فلپائن پر جاپانیوں کے حملے کے بعد امریکی جنرل میکارتھر نے فلپائنی عوام کی مدد سے جاپانی جارحیت کے خلاف مزاحمت کا آغاز کیا تھا۔

جاوا میں ایک ہوٹل میں چائے کی ٹرے کے ساتھ بیرا پیغام لایا کہ باہر ایک کار میری منتظر ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پیغام انڈونیشی قوم پرستوں کی طرف سے ہے۔ میں بھی چونکہ ایک فلپائنی قوم پرست تھا اور عظیم قوم پرست مینوئیل ایل کیوزون کے اخبار کے ادارتی عملے میں رہ کر اس کے دوش بدوش آزادی کی جنگ لڑ چکا تھا' لہٰذا قوم پرست انڈونیشی طلبہ کے لیڈروں سے ملاقات کرنے ان کے ہاں جا پہنچا۔ وہ انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تمام یورپی اقوام کے خلاف تھے' البتہ امریکہ کے حق میں تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مشرق بعید میں امریکیوں کے سوا ہر یورپی قوم نے مقامی لوگوں کا استحصال کیا ہے۔ انہوں نے انسان کو انسان نہیں سمجھا۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ مشرق بعید میں جہاں کہیں بھی جانا ہوا' میں نے وہاں مقامی لوگوں کی تذلیل ہوتے دیکھی۔ ریل گاڑیوں کے اول درجے میں سفر صرف یورپی لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کتوں اور مقامی لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

وہ مقامی لوگ جن کو یورپی باشندوں نے اپنے مقاصد کی خاطر کچھ سماجی مقام دیا تھا' وہ بھی اپنے ہی بھائی بندوں کی تذلیل پر کمربستہ رہتے تھے۔ جاوا میں کسٹم حکام نے قطار میں میرے پیچھے کھڑے ایک امریکن کا سامان مجھ سے پہلے جانچنا چاہا تو اس نووارد نے اسے میری باری کا احساس دلایا۔ تب کسٹم افسر نے مجھ سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا: "ہم آپ کو چینی سمجھے تھے۔" اسی طرح میں نے برنارڈ کالج کولمبیا کی سابق ہم جماعت انڈونیشی لڑکی کو ہوٹل انڈیز' بتاویا (جکارتہ) میں دعوت دی تو اس نے تلخی سے کہا تھا: "میں دنیا کے کسی بھی ہوٹل میں جاتی تو مجھے خوش آمدید کہا جاتا لیکن اپنے ملک میں ہمیں اس ہوٹل میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔" وہ ولندیزی حکومت سے شاکی اور جاپانیوں کی حامی تھی۔ ہانگ کانگ میں ایک تقریب کے دوران چند چینی' مہمان خصوصی کے لئے بچھائے گئے سرخ کارپٹ پر چڑھ گئے تو پولیس نے ان کے سروں پر ڈنڈے برسائے۔ میں نے اپنا سرکاری کارڈ ان کو دکھایا تو انہوں نے کہا: "پہلے انگریز۔" اور میرا کارڈ مجھے تھما دیا۔۔۔ ایک افسر نے ہانگ کانگ ہی میں بڑے نفرت آمیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا تھا: "تم جمہوریت کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

اور میں نے تلخی سے جواب دیا تھا: "جمہوریت ایک ایسی شے ہے جو برطانوی قانون کے تحت کم از کم ہانگ کانگ میں نہیں پائی جاتی۔"

چین میں جہاں کہیں بھی میں گیا وہاں برما روڈ کے بند کئے جانے کی شکایت تھی۔ چینی اپنی جنگ اس سڑک کے بغیر جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔۔ یہاں بھی ایک رکشا کھینچنے والے نوجوان نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا تھا کہ امریکہ' انگریزوں کی طرح نہیں۔۔ اس نے دونوں کے درمیان فرق یوں ظاہر کیا تھا کہ امریکن دیتے ہیں جبکہ انگریز چھینتے ہیں۔

☆☆☆

میرا نام کارلوس پی رومولو ہے۔۔۔ اور میں "ہیرلڈ" منیلا کے لئے مشرق بعید کا دورہ کر رہا تھا اور میرا مقصد آزادی کی اس لہر کا مطالعہ کرنا تھا جو جنوب مشرقی ایشیا کی یورپی نوآبادیات میں پائی جاتی تھی۔ حکومت جاپان کو میرا یہ دورہ

ناگوار گزر رہا تھا۔ جاپان کی خفیہ ایجنسیوں نے میری نگرانی شروع کر دی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں ایسے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤں جن سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس دورے کے دوران امریکن اخبارات میں پینتالیس مقالے لکھے تھے۔

اس سے پہلے میں جنرلیسمو چیانگ کائی شیک سے ملا تھا اور اس نے میرے ذریعے دنیا کو اس خصوصی خبر سے نوازا تھا کہ چین جاپان سے لڑے گا۔۔۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم فلپائن میں جنگ کی تیاری کرو کیونکہ جاپان کا اگلا نشانہ فلپائن ہو گا۔

میں جاوا ہی میں تھا کہ جاپان میں جنرل ٹوجو نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جنگ عظیم دوم کا دائرہ پھیلنے والا ہے۔ فوری طور پر تمام بحری اور ہوائی راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ میں آخری آدمی تھا جو جاوا سے ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ میری منیلا میں آمد پر یونیورسٹی کے طلبہ نے میرا پرجوش استقبال کیا۔ وہ جاپان کی مخالفت اور جمہوریت کے حق میں لکھے گئے میرے مضامین کی تائید کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ان میں میرے چار بیٹے بھی تھے۔ یہ وہ نوجوان تھے جنہیں تھوڑے ہی عرصہ بعد میں نے بتان کے مورچوں میں دیکھا۔

فلپائن واپسی پر جس روز میں صدر کیوزون سے ملا اسی دن امریکی جنرل میکارتھر سے ملاقات ہوئی۔ انہیں اپنے سفر کی روداد اختصار سے سنائی۔ جنرل میکارتھر نے کہا: "کارلوس! جنگ آرہی ہے۔ اور جب یہ منیلا تک آئی تو میں صدر کیوزون سے تمہیں فلپائنی فوج میں کمیشن دلاؤں گا۔ پھر تمہاری خدمات امریکن فوج میں منتقل کرانے کے بعد تمہیں اپنے فوجی اطلاعات کے محکمے کے سپرد کر دوں گا۔"

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کی صبح مجھے میرے ایڈیٹر ناٹسو نے جگایا اور جاپانیوں کے پرل ہاربر پر حملے کی خبر دی۔ میں نے اسے ایسی خبر چھاپنے سے منع کیا اور جنرل میکارتھر سے فون پر بات کی۔ جنرل میکارتھر نے میری آواز سنتے ہی کہا: "خبر درست ہے۔"

تین گھنٹے بعد صدر کیوزون نے اپنے گرمائی محل کے اوپر سے گزرتے جنگی طیاروں کی آواز سنی۔ وہ ان کا تالیاں بجاکر استقبال کرنے باہر آیا لیکن کچھ شک محسوس کر کے اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ وہ میکارتھر کو ٹیلیفون کر کے معلوم کرے آیا یہ طیارے امریکن ہیں۔ ایک میل دور کیمپ جون پر گرتے بموں کے دھماکوں نے صدر کی بات کا جواب دے دیا۔

☆☆☆

جنگ فلپائن کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وی یعنی فتح کے دو نشان بناتے ہوئے جاپانی فضائیہ کے چمکتے طیارے منیلا کے اوپر محو پرواز تھے اور سائرنوں کی آواز کے درمیان گرجا گھروں کے گھڑیال دوپہر کا اعلان کر رہے تھے۔

پرل ہاربر کے بعد جلد ہی منیلا پر جاپانی حملہ جاپانی عزائم اور جارحیت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ عورتیں پارکوں میں درختوں کے نیچے چھپ گئیں۔ مرد پناہ گاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگے۔ چلتی گاڑیاں رک گئیں۔ گھوڑا گاڑیاں فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہو گئیں۔ افراتفری کا عالم نہ تھا' لوگ جاپانی طیاروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔ ہمارے دفتر کی کولا نامی بلی میرے قدموں میں

آ بیٹھی تھی جبکہ دفتر میں کام کرنے والا ایک لڑکا دیوار پر چڑھا ہوائی جہازوں کو گھونسے دکھارہا تھا۔

پرانی ہسپانوی دور کی دیوار پہ رکھی گئی طیارہ شکن توپوں نے گولے اگلے۔ طیارے ذرا اور بلندی پر چلے گئے۔ ہمارے شعبہ اشتہارات کی ہیلن اوسنگ چلائی: "ہمارے طیارے کہاں ہیں؟ ان کو کوئی روکتا کیوں نہیں؟" ہم بھی حیران تھے۔ ابھی چند روز پیشتر امریکہ کے ایک سو طیارے منیلا کی فضا میں پرواز کرتے دیکھے تھے اور سارے شہر نے ان کو ہیلو ہیلو کہا تھا۔

اچانک جاپانی طیاروں نے وی کی شکلیں توڑیں اور ایک ایک کرکے پورٹ ایریا، کیمپ نکولس، فورٹ میکنلے اور کیوائٹ پر حملہ آور ہوئے۔ ہم نے بموں کے دھماکے سنے اور پہاڑیوں پر شعلے اور دھواں چھاگیا۔ کیمپ کلارک اور کیمپ نکولس میں سو امریکی طیارے قطاروں میں کھڑے کھڑے راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ ان طیاروں کو محو پرواز رہنے کا حکم تھا لیکن جاپانی طیاروں نے انہیں اچانک اس وقت آ لیا تھا جب ہوا باز کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ لوگ پوچھتے تھے کہ جاپانیوں کو کیسے علم ہوا کہ سو امریکی طیاروں کے ہوا باز کس وقت اور کہاں طیارے کھڑے کرکے کھانا کھارہے ہوں گے۔

میں جاپانیوں کے ذرائع معلومات جانتا تھا۔ مشرق بعید میں ان کی کامیابیاں غیر ملکی حکمرانوں سے مقامی لوگوں کی نفرت کے علاوہ جاپان کے پروپیگنڈے کی مرہون منت تھیں۔ برما میں جاپانیوں نے بدھ بھکشو بھیج رکھے تھے جو مذہب کی آڑ میں جاپانی مقاصد کا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ میں نے برطانوی افسروں کو بتایا تھا کہ ان کی کیبنٹ بھی ان سے وفادار نہیں لیکن وہ مجھ پر ہنسے تھے۔

بعد میں خود حکومت برطانیہ برمی وزیراعظم یوسا کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ تھائی لینڈ پانچ گھنٹے میں فتح ہوگیا تھا کیونکہ تھائی وزیراعظم بھی جاپان کا حامی تھا۔ جاپان نے عظیم ایشیا کا نعرہ لگاکر مشرق بعید اور جنوبی ایشیا کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں، سیاسی شخصیتوں، مذہبی رہنماؤں اور وڈیروں سے فتح کے بعد مفتوحہ علاقوں میں حکمرانی کے اختیارات دینے کے وعدے کررکھے تھے۔

امریکی حکومت نے جاپانی تارکین وطن کو امریکہ سے نکالنے کے لئے ایک ایکٹ نافذ کیا تھا۔ اس ایکٹ کے نتیجے میں بہت سے جاپانی، امریکہ سے ناراض ہو گئے تھے۔ تاجروں کے روپ میں جاپانی ہمارے ہرراز سے واقف تھے۔ منیلا میں ہر کاروباری جاپانی، حملہ آور جاپانیوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھا۔ جاپانی چھوٹے چھوٹے شراب خانوں کے مالک تھے جہاں امریکی اور فلپائنی افواج کے سپاہیوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ جاپانیوں کے کاروباری مراکز پلوں، بجلی گھروں اور دیگر پبلک مقامات کے قریب تھے۔ جنگ سے قبل کیمپ مرفی میں جاپانی لوگوں کے جھونپڑوں سے اس قدر گولہ بارود برآمد کیا گیا تھا جو منیلا شہر کو اڑانے کے لئے کافی تھا۔ ناجائز اسلحہ رکھنے کی سزا صرف تین ماہ قید تھی۔ کیمپ نکولس اور کیوائٹ سے خفیہ ریڈیو بھی برآمد ہوئے تھے۔ منیلا میں ہر شخص جانتا تھا کہ جاپانی باتسٹار بیک بیئر بروری، جاپانی اسلحہ خانہ تھی اور اس کا نادر جاپانی طیاروں کے لئے رہنما تھا۔

فلپائن پر حملے سے چند ہفتے پہلے منیلا میں جاپانی سفیر کروسو سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ "امن مذاکرات" کے لئے امریکہ جارہا تھا۔

اس نے میرے مضامین کے حوالے سے پوچھا تھا کہ آخر میں جاپانیوں کے خلاف کیوں ہوں اور ان سے نفرت کیوں کرتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں جاپانیوں کے خلاف ہوں نہ ان سے نفرت کرتا ہوں۔ بہت سے جاپانی میرے اچھے دوست ہیں۔ اس نے مجھ سے مزید پوچھا تھا کیا میں نے مشرق بعید کا دورہ اے بی سی ڈی (امریکی' برٹش' چائنیز اور ڈچ حکومتوں) کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ میں نے جواباً کہا تھا کہ میں نے ABCD کی نمائندگی کی تھی اگر اس سے آپ کی مراد Accurate Beyond Cavil or Doubt (درست' شک وشبہ سے بالا) ہے۔

☆☆☆

خطرہ ٹل جانے کا سائرن بجتے ہی سارا شہر چل پڑا تھا۔

جنگ کی آمد کے ساتھ ہی فلپائنی جذبہ حریت بیدار ہوگیا تھا۔ صدر کیوزون کی زیر نگرانی سرگرم شہری دفاع کی تنظیم نے پارکوں میں خندقیں کھودنے اور مورچے بنانے شروع کردیئے تھے۔ طیارہ شکن توپیں نصب کی جانے لگیں۔ ریکروٹنگ دفتروں کے سامنے جوانوں کی قطاریں لگ گئیں۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ نے دن رات مشقیں شروع کردیں۔ میرے اپنے اخبار کے عملے میں سے کئی افراد نے معذرت کی اور فوج میں بھرتی ہوگئے۔

صدر کیوزون نے اپنی تقریر میں اللہ سے دعا کی کہ وہ اس قوم کی حفاظت کرے۔ ساتھ ہی صدر نے امریکہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اس کے پیغام کو ایک "بہادر آدمی کا پیغام بہادر قوم کے نام" گردانا گیا۔

میں خود تو ان مقامات پر نہیں گیا جہاں تباہی آپہنچی تھی لیکن میرے نامہ نگار مجھے برابر لکھ رہے تھے کہ جاپانی ایسی جگہوں پر بھی پہنچ رہے ہیں جہاں عام حالات میں پہنچنا مشکل تھا۔ دشوار گزار پہاڑ' گھنے جنگل۔۔۔ ان کی منزل تھے۔

پٹرول کا راشن کر دیا گیا۔ حفاظتی تدابیر اختیار کرلی گئیں۔ جو لوگ مضافات میں جاسکتے تھے' وہ شہر چھوڑ کر جارہے تھے۔ ان میں میری بیوی اور چار بچے بھی شامل تھے۔ شہر سنسان ہو رہا تھا۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔

میں ایک ٹیکسی میں جارہا تھا۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے وردی کیوں نہیں پہن رکھی۔ میں نے اسے مذاق میں جواب دیا تو اس نے میری طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے بتایا کہ وہ کل فوج میں بھرتی ہو رہا ہے۔ فلپائن کے ہزاروں نوجوان یہی کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی آزادی پر حملہ ہوا ہے۔ میں ہیرلڈ کے دفتر میں تھا جب جنرل میکارتھر کا فون آیا کہ مجھے فوجی خدمت کے لئے طلب کیا جارہا ہے۔ اور اگلے ہی روز میں فلپائن آرمی ریزرو میں میجر کے عہدے کا حلف اٹھا رہا تھا۔

جاپانیوں نے فلپائن پر طوفانی حملہ (بلٹز کریگ) کیا تھا۔ فضا میں جاپان کے مقابلے میں فلپائنی افراد نے بڑھ چڑھ کر موت کو گلے لگایا تھا۔ میں نے مردانگی' جرات اور عالی حوصلگی کی کہانیاں نشر کیں۔ بہادروں سے انٹرویو کئے۔ ان میں ایک نوجوان ولامور تھا جس نے چھ تربیتی جہازوں سے جاپانی فضائیہ کے چون طیاروں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ جولیانو' اکلان' مینلوئس' مونڈیگو اور باسا تھے۔ انٹرویو کے دوران ولامور نے بار بار کہا: "کاش! ہمارے پاس

چند طیارے اور ہوتے۔" کولن کیلئے وہ ہیرو تھا جس نے موزان نامی انتیس ہزار ٹن کا جاپانی جنگی بحری جہاز غرق کر دیا تھا۔ ان میں وہگنو تھا جس کا پیچھا پانچ جنگی طیاروں نے کیا تھا اور اس نے دو کو فضا میں مار گرایا تھا اور زمین پر کھڑے پانچ جہاز تباہ کر دیئے تھے۔

ان میں سان وناندو نامی ٹیلیفون آپریٹر لڑکی تھی جس نے مرتے دم تک مواصلات کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ بیلو نامی وہ سکول ٹیچر تھا جس نے قومی پرچم اتارنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی پرچم کے سائے میں جاپانیوں نے اسے گولیوں سے اڑا دیا تھا۔ کوبنکا نامی وہ ڈرائیور تھا جو اکتیس جاپانیوں کو اپنے ٹرک میں پہاڑ پر لے گیا تھا اور اپنے سمیت اس نے ٹرک کو پہاڑ سے نیچے گرا دیا۔ ان بہادروں میں میرا برادر نسبتی یوجینو تھا جس کے دونوں ہاتھ جل گئے تھے اور وہ اپنی بیوی کے سہارے ایئرریڈ وارڈن کی حیثیت سے ٹیلیفون پر اطلاعات دے کر اپنے فرائض نبھاتا رہا تھا۔

سب سے بڑھ کر ہمارا ہیرو صدر کیو زون تھا جو امریکہ سے جونز ایکٹ لے کر آیا تھا۔ جونز ایکٹ کے ذریعے امریکن کانگریس نے فلپائن کو قانون سازی کی ضمانت دی تھی۔ یہ ایکٹ فلپائن کی آزادی کا اولین عہد تھا۔ فلپائن کے لوگوں نے امریکہ سے اپنے صدر کی واپسی پر جشن منایا تھا۔ شہر کی دیوار توڑ کر کیو زون گیٹ بنایا گیا تھا اور اسی راستے سے وہ ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا تھا۔ فلپائن کے لئے امریکن کانگریس میں کی گئی صدر کیو زون کی تقاریر ایسی تاریخی دستاویزات ہیں جن کے حرف حرف سے اس کی اپنے وطن اور عوام سے محبت کی بو آتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں میرا باپ تارلک صوبے کا گورنر تھا اور میں امریکہ کے سخت خلاف تھا۔

میرا باپ بھی امریکیوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ ایک گوریلا تھا اور کیمبلنگ میں میری ماں کو سمجھایا کرتا کہ لڑکے کو نیلی آنکھوں والے شیطانوں کے قریب نہ جانے دیا کرو۔ دراصل ایک امریکن سارجنٹ ہم آٹھ دس لڑکوں کے ساتھ گھاس پر کھیلا اور ہمیں انگریزی سکھایا کرتا تھا اور والد کو یہ پسند نہ تھا۔ ایک روز میں نے ایک فلپائنی کی لاش درخت سے لٹکتی دیکھی۔ ایک رات میرا ایک رشتے دار میرے باپ کو بتا رہا تھا کہ کس طرح اس کے دادا سے اس کے باپ کا پتہ پوچھنے کے لئے امریکیوں نے اسے پانی میں غوطے کھانے کی سزا دی تھی --- پھر میرے باپ نے امریکی فوجیوں کی مار پیٹ، تشدد اور دہشت گردی کے متعلق امریکن کانگریس کی تحقیقاتی رپورٹ پر یقین کر لیا۔ کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی نے فلپائنیوں پر امریکی مظالم کو انفرادی فعل قرار دیا تھا اور ایسے تمام فوجیوں کے کورٹ مارشل کا حکم دیا تھا جنہوں نے ایسا کیا تھا۔ امریکن کانگریس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ایسے فوجیوں سے امریکن آرمی، امریکی عوام اور امریکی حکومت کا کوئی تعلق نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد میرے باپ نے امریکہ سے وفاداری کا عہد کر لیا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

ایک روز میرے ہائی اسکول کے پرنسپل نے امریکیوں سے میری نفرت کی وجہ پوچھی۔ میں نے اپنے خیالات اس کے سامنے پیش کئے تو اس نے کہا: "کارلوس! چند افراد کی غلطی کی بنا پر

پوری قوم سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ تم جب چاہو میرے پاس آ سکتے ہو۔ میرے ساتھ کھانا کھا سکتے ہو۔۔ پڑھ سکتے ہو۔۔ میری سوچ میں میرے ساتھی بن سکتے ہو۔ میں امریکی ہوں۔۔ وہ غلیظ امریکی فوجی نہیں جس نے ذاتی وجوہات کی بنا پر کسی فلپائنی پر تشدد کیا۔۔" اور پھر اس نے ان کارناموں کا ذکر کیا جو امریکہ' فلپائن کے لئے سرانجام دے چکا تھا۔ اس نے جونز ایکٹ میں فلپائن کو انصاف اور تحفظ دینے کا پیرا پڑھا۔۔ اور وہ جیت گیا۔ میرا اعتماد امریکہ پر بحال ہوا اور مجھے پڑھنے کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

پرل ہاربر کے بعد میکارتھر جن مشکلات سے دوچار تھا' مجھے ان کا احساس تھا۔ جاپانی ہماری فضائی مدافعت ختم کرنے کے بعد چاروں اطراف سے ہم پر چڑھے آ رہے تھے۔ فضا ان کی تھی۔۔ اور سمندروں میں خلیج لنگاین 'اتیمونان' ہتنگاس اور البے میں ان کے اسی جہازوں نے ہماری ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ ادھر لوزون' ویساپاس اور منڈاناؤ میں ہماری افرادی قوت صرف ایک لاکھ تھی جن میں ہزاروں ایسے تھے جو صرف اڑتالیس گھنٹے قبل فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ منیلا شہر پر جاپانی جنرل ہوما کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

۱۲ دسمبر کو جنرل میکارتھر نے اخباری نمائندوں کو غیر سرکاری طور پر بتایا کہ وہ فلپائن کے سوا حل کی پوری طرح حفاظت کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اس کے پاس وسائل کی کمی ہے۔۔ جاپانی حملے اسے برانگیختہ کرنے کی خاطر کئے جا رہے ہیں جبکہ وہ صرف دفاعی جنگ جاری رکھنے کے لئے اپنی قوت مجتمع رکھنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

بمباری کے دوران میکارتھر کبھی اپنے د
سے اٹھ کر کسی خندق یا مورچے میں نہیں گیا۔
بھی اس کی نقل کرتے۔ کرسمس کے قریب
جاپانیوں نے منیلا پر حملے شروع کر دیئے تھے لیکن
وہ اندرون شہر کے بجائے خلیج کے کنار
عمارات پر حملہ آور ہوتے تھے۔ میں ایک رو
سرکاری کام کے سلسلے میں خلیج کے علاقے میں
کہ مجھ سے ایک سوگز کے فاصلے پر زور کا دھما
ہوا۔ دوسرا دھماکہ مجھ سے پچاس فٹ دور ہوا
بم کی زد میں آنے والے ایک شخص کے خو
سے میرے کپڑے تر ہو گئے اور میرے عقب
میں ایک دیوار گر گئی۔ اسی لمحے ایک مخصوص
سیٹی سنائی دی۔۔ اور میں نے دیکھا کہ صد
کیوزون اپنے اے ڈی سی نیٹو کے ساتھ یہ دیکھ
آیا تھا کہ لوگ پناہ گاہوں میں ایک دوسرے
مدد کس طرح کرتے ہیں۔ صدر کی اس جرات
مجھے احساس ہوا کہ قوم کا مورال اس شخص
موجودگی میں کبھی نہیں گر سکتا۔

صدر کیوزون اور جنرل میکارتھر جاپانیوں
جو جنگ لڑ رہے تھے وہ محاذوں کی جنگ سے زیا
اہم تھی اور اسے چند ہی لوگ جانتے تھے۔
جنگ سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کے محاذ
تھی۔ میکارتھر جاپان کی جنگی چالوں میں نہ آیا تھا
وہ جاپانیوں کے خفیہ طور پر کہیں اکٹھے ہونے
خبر سنتا تو خاموش رہتا' ان کو اکٹھے ہونے دیتا او
پھر اچانک ان پر حملہ آور ہوتا۔ وہ انہیں سانس
لینے کی مہلت بھی نہ دیتا بلکہ باکسنگ کی زبان میں
ان کو ایڑیوں پہ رکھتا۔ پورا مکا لگانے کے لئے
ان کو تیار تک نہ ہونے دیتا۔ چیدہ چیدہ سپاہی
چاقو' گرینیڈ اور ٹامی گنوں سمیت جاپانی فوجوں میں
گھس جاتے اور انہیں پتہ ہی نہ چلتا کہ ان

ساتھ کیا ہو رہا ہے اور انہیں جن امریکی فوجیوں یا فلپائنی سپاہیوں کو ابھی میلوں آگے جا کر گھیرنا تھا وہ ان کی صفوں میں ابھی سے کیسے گھس آئے۔

میکارتھر اور صدر کیوزون نے ایک خفیہ ملاقات میں منیلا کو کھلا شہر قرار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صدر، ملاکانان کا محل چھوڑ کر محاذ پر جا رہا تھا۔ اس نے ایک نشریے میں کہا تھا: "اس قوم کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جو مصائب جھیلنا اور مرنا نہیں جانتی۔" اس کی مثال وہ خود آپ تھا۔ اس وقت دو بجے تھے۔ جاپانی جہاز منیلا پر حملہ کر رہے تھے اور صدر کیوزون، مایون سٹیمر میں کوریجیڈار کی طرف جاتے ہوئے شجاعت و مردانگی کا ایک باب لکھ رہا تھا جبکہ دوسرا باب جھنڈا لگے کمرے میں بیٹھا ایک تھکا ماندہ جنرل تحریر کر رہا تھا۔

جنرل میکارتھر میری میز پر آیا اور اس نے بتایا کہ وہ پٹرول دستوں میں جا رہا ہے اور اسے وہاں ہر قسم کی صورت حال سے باخبر رکھنا میرا فرض ہے۔۔ کیونکہ ہم عقبی دستہ ہیں بلکہ پشت پناہ ہیں۔۔ میں نے اپنے عقبی دستے پر نظر ڈالی۔ ہم چند لوگ تھے جنہیں میکارتھر نے عقبی دستہ کہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا سارا عملہ بھی چلا گیا اور اب میں ڈپٹی چیف آف سٹاف بریگیڈیئر جنرل مارشل کے تحت تھا۔

یہ کرسمس کی شام تھی۔ عقبی دستہ ایسی عمارت میں تھا جس کا محل وقوع جاپانیوں کو اچھی طرح معلوم تھا لیکن دشمن ابھی تک خلیج کے کناروں ہی پر بمباری کر رہا تھا۔ فون پر مسلسل خبریں آ رہی تھیں کہ جاپانی، پہاڑوں سے اتر کر منیلا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دشمن کے جہاز اس کی فوجی نفری میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے۔ جاپانی ٹینکوں کی صفیں اور آگ اگلنے والی بکتر بند گاڑیاں منیلا کے مضافات میں قدم جما رہی تھیں۔ ہم پر کسی لمحے بھی بمباری ہو سکتی تھی۔ جاپانی سپاہی سنگینیں تانے کسی بھی وقت ہمارے کھلے دروازوں سے اندر آ سکتے تھے۔۔ ایک شخص نے "ہیپی کرسمس" کہا لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم کرسمس کے گیتوں کے بجائے بارود کے وہ دھماکے سن رہے تھے جو کرنل ہف، منیلا میں ان تنصیبات کو تباہ کرنے کے لئے کر رہا تھا جن سے آنے والا دشمن فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ان میں تیل کے ذخائر، ریلوے کی تنصیبات، ریڈیو اسٹیشن، گودیاں اور وہ جہاز شامل تھے جو منیلا سے نکل نہیں سکتے تھے۔

عقبی دستے کے پاس کوئی ذریعہ آمدورفت نہ تھا۔ کوئی فوجی ٹرک تک ہمارے پاس نہ تھا، تاہم محب وطن افراد عقبی دستے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ فلپائن کے لئے۔۔ اپنے لئے ۔۔ جمہوریت کے لئے۔۔ آزادی کے لئے۔۔ سب شہری مصروف عمل تھے۔

ہم نے میکارتھر کے محاذ پر روانہ ہونے کی خبر نشر کر دی تھی لیکن منیلا کو کھلا شہر قرار دینے کے فیصلے کے بارے میں کچھ بھی نشر نہیں کیا تھا۔ میکارتھر کے متعلق خبر سن کر شہریوں نے فون پر فون کرنے شروع کر دیئے۔ وہ پوچھ رہے تھے کیا منیلا کو کھلا شہر قرار دیا جا رہا ہے؟ کیا لندن اور ماسکو کو کھلے شہر قرار دیا گیا تھا؟ کیا منیلا شہر لندن اور ماسکو کی طرح مضبوط نہیں؟ کیا کیوزون کو اپنے عوام پر اعتماد نہیں رہا؟ شہریوں کی التجا یہ تھی کہ منیلا کو کھلا شہر قرار نہ دیا جائے۔

ادھر کرنل ولیم ان طیارہ شکن توپوں کو ان مقامات سے ہٹا رہا تھا جہاں اس نے انہیں بڑی

محنت اور کوششوں سے نصب کرایا تھا۔ ہم کسی بھی لمحے میکارتھر کا اشارہ پا کر منیلا کو کھلا شہر قرار دینے کا اعلان کرنے والے تھے۔

بیرونی دنیا سے بری خبریں آ رہی تھیں۔ جاپان' فلپائن کو ایک مہیب جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دشمن کو نقصان پہنچا رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ نقصان برداشت کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ دشمن کی بحریہ کے دستوں اور ساز و سامان پر ہم نے وگین اور اپاری کے علاقوں میں موثر بمباری کی۔ لنگاین کے علاقے میں دشمن کے قدم جمنے نہیں دیئے گئے۔ لوزان کے میدانوں میں سنگینوں سے دست بدست لڑائی ہوئی۔ شمال میں جنرل لم اور کیھنسن نے جاپانیوں کی پیش قدمی کو انچ انچ پہ روکا اور زک پہنچائی۔ جنوب میں جنرل سکھنڈو اور جونز نے جاپان کے جارحانہ عزائم توڑ کے رکھ دیئے لیکن دشمن اپنی اکثریت اور ٹینکوں کی بنیاد پر ہماری منقسم شدہ افواج کو بتان میں محصور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میکارتھر' کوریجڈار میں بند ہو گیا تھا جبکہ عقبی دستہ چوہے دان میں بند تھا۔ منیلا کے گرد خلیجی علاقے دشمن کے طیاروں' جنگی جہازوں' تیز رو جنگی کشتیوں' طیارہ بردار جہازوں' بجروں اور فوج بردار جہازوں سے اٹے پڑے تھے۔ میکارتھر کی نسبت ہمارا عقبی دستے کے زیادہ قریب تھا۔

کرسمس کے اگلے دن منیلا کو کھلا شہر قرار دے دیا گیا۔ پرل ہاربر پر حملے کے دن سے لے کر اب تک منیلا میں بلیک آؤٹ تھا۔ کھلا شہر قرار دینے کے ساتھ ہی سارا شہر روشنیوں سے جگمگا اٹھا' تاہم بازار اور فٹ پاتھ سنسان ہی رہے۔ لوگ اپنے گھروں ہی میں رہے۔ وہ جنگی صورت حال کو کوس رہے تھے۔ انہیں جاپانیوں کے خون سے منیلا کی قیمت چکانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

منیلا کو کھلا شہر قرار دینے سے ہمارا ذہنی تناؤ اور اعصابی دباؤ کم ہو گیا تھا کیونکہ انتہائی وحشی فوج بھی کھلے شہر کا احترام کرتی ہے' تاہم ہمیں جان لینا چاہئے تھا کہ جاپانی افواج اپنی طرز کی افواج تھیں۔۔ انہیں کسی اخلاقی قدر' کسی اصول' کسی قاعدے قانون کی پروا نہ تھی' چنانچہ اگلے ہی دن انہوں نے کھلے شہر منیلا پر بے تحاشا بم برسائے۔

☆☆☆

۲۸ دسمبر کو مجھے جنرل مارشل نے حکم دیا کہ میں کیوائٹ کا چکر لگاؤں اور دیکھوں کہ وہاں ہماری بحریہ کے مرکز کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ میں اپنے چوہے دان سے نکلنے پر خوش تھا لیکن مجھے یہ اندیشہ تھا کہ میں محصور منیلا سے نکل بھی سکوں گا۔ ڈیوی بلیوارڈ میں کوئی کار نہ تھی۔۔ سائیکلوں پر دفتر جاتی لڑکیاں نہ تھیں۔ گھوڑوں پر سیر کرتے شرفا نہ تھے۔ کشتی کلب' نائٹ کلب اور ہوٹل' تجہیز و تکفین کرنے والوں کی دکانیں نظر آتے تھے۔ کھڑکیوں پر سیاہ پردے پڑے تھے۔ مختلف رنگوں کی چھتریاں "کاسامنانا" کے لانوں پر اوندھی پڑی تھیں۔ خلیج میں ڈوبے جہازوں کی چمنیاں قبروں کے سنگی کتبوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ سطح آب پر تیرتی جنگی کشتیاں' جن سے ہمیں تحفظ کا احساس ہوتا تھا' ہمارے ہوائی جہازوں کی طرح کہیں چلی گئی تھیں۔۔ اور پس منظر میں اٹھتا ہوا دھواں پورے ماحول کو افسردہ تر بنا رہا تھا۔ جگہ جگہ بہت سے خاندان شہری دفاع کے ٹرکوں کے منتظر تھے کہ شاید وہ انہیں

کہیں لے جائیں۔ ننگ دھڑنگ شریر لڑکے حالات سے بے پروا مجھے وی کا نشان بنا کر دکھا رہے تھے۔

کیوائٹ کے متعلق میری رپورٹ ایک جملے پر مشتمل تھی: "کیوائٹ میں کچھ بھی نہیں بچا' لہٰذا رپورٹ صفر ہے۔" میں نے جنرل مارشل کے سامنے یہ فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ شہر پر بمباری ہونے لگی۔ اب کے جاپانیوں کا نشانہ اندرون شہر تھا۔ میں پناہ گاہ میں جانا چاہتا تھا لیکن جنرل مارشل کو ایک رپورٹ پڑھتے دیکھ کر میں نے بھی ارادہ بدل لیا۔ حملے کے بعد مجھے ہوائی حملے کی رپورٹ مرتب کرنے کے لئے واٹر فرنٹ پر بھیجا گیا۔ دریائے پاسگ کی ہر کشتی ڈبو دی گئی تھی۔ کھلی مارکیٹ اور فٹ پاتھوں پر اشیا فروخت کرنے والی لڑکوں اور بوڑھوں کی کٹی پھٹی بلکہ دھنکی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ زمین میں خون جذب ہونے سے کیچڑ ہو رہا تھا اور کھنڈروں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ جونز برج کے قریب بم کے ٹکڑے سے ایک بھکاری کی کٹی لاش پڑی تھی لیکن اس کا بھیک کے لئے پھیلا ہوا ہاتھ اب بھی کھلا تھا۔ بین الاقوامی قوانین کے خلاف کئے جانے والے اس غیر اخلاقی حملے میں سینکڑوں افراد جاں بحق ہو گئے تھے۔ سارے شہر میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اپنا دفاع کر سکنے پر قادر ہو۔ اس بہیمیت کی بے شمار تصاویر بنائی گئیں لیکن ہم نے شائع کوئی بھی نہ کی۔ ان میں ایک تصویر سات افراد پر مشتمل اس کنبے کی تھی جو ایک کشتی میں رہتے تھے اور جن کے خون سے کشتی کے ارد گرد کا پانی سرخ ہو گیا تھا۔

اگلے روز پھر حملہ ہوا۔ اب کے سانتا روزا اور سانتا کیتھالینا کو تباہ کیا گیا تھا۔ راہبات اور پادری تباہی کے مناظر دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے' اور گھٹنوں کے بل گرے' آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ محراب میں مقدس مریم کے مجسمے کے سامنے ساری دیواریں ڈھے گئی تھیں اور وہ دور تک بربادی کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ جاپانی فوجی تنصیبات کے علاوہ ہر چیز کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ان میں "ہیرلڈ" کے دفاتر بھی تھے۔ اس نقصان کو میں نے قومی اور ذاتی وجوہات کی بنا پر بہت محسوس کیا تھا۔ میرا خاندان جاپانی حملوں کے باعث مضافات سے واپس شہر آ گیا تھا اور میرے بڑے لڑکے نے تباہی کے مناظر دیکھ کر میرے مشورے کے بغیر فلپائن آرمی میں اپنا نام لکھوا لیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کب اس سے مل پاؤں گا۔

عقبی دستے کے کمانڈر کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے میں نے کہا: "منیلا اپنی زندگی آگ کی نذر کر چکا ہے۔"

☆☆☆

جب میں ورمن اسٹریٹ میں اپنے گھر پہنچا تو میری بیوی جاگ رہی تھی۔ نیند کے غلبے سے میں لڑکھڑا سا گیا۔ میری بیوی نے گندے کپڑے اتارنے میں میری مدد کی اور مجھے پانی کے ٹب میں لے گئی۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر پلنگ کی طرف لائی۔ میں مچھر دانی کے اندر گھس ہی رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میری بیوی نے کہا: "تمہیں شاید ہیڈکوارٹر بلایا جا رہا ہے۔"

واقعی وہ میکارتھر کا فون تھا۔ مجھے ہیڈکوارٹر جانے اور پھر میکارتھر کے پاس کوریجیڈار میں حاضری دینے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ فرمائش بھی تھی کہ راستے میں منیلا ہوٹل والوں سے

پوچھتا آؤں کہ کیا وہ ہمیں کچھ کھانے کو دے سکتے ہیں۔

میں نے سوتے بچوں کو پیار کیا۔ سفید لباس میں ملبوس چمکتے چہرے والی اپنی بیوی کو دیکھا۔ میں اسے حوصلہ دینا اور بتانا چاہتا تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں لیکن فقط اتنا کہا کہ میں دو ہفتوں کے اندر اندر آؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے اس جھوٹ کو سمجھ گئی تھی۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے اپنے خاندان کو دیکھا۔ یہ نئے سال ۱۹۴۲ء کا آغاز تھا۔ آہ ہیپی نیو ایئر۔

جب میں میکارتھر کا پیغام لے کر منیلا ہوٹل گیا تو وہاں چند آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مقدر کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا اور نیا سال شاید ان کی زندگی میں پھر آئے نہ آئے۔ انہوں نے ضروری سامان کے تھیلے ایک طرف رکھے تھے اور وہ نئے سال کو روایتی انداز میں نہیں منا رہے تھے۔ وہ ان راستوں کا ذکر کر رہے تھے جو جاپانی بیگار کیمپوں کی طرف جانے والے تھے۔ ان کے چہروں پر اس المیے کے نقاب چڑھے ہوئے تھے۔

خوراک مہیا کرنے کے متعلق ہوٹل منیلا کے منیجر نے بتایا کہ ان کے پاس تو نئے مہمانوں کو پیش کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں۔ نئے مہمانوں سے اس کی مراد ٹوکیو سے آنے والا ہراول دستہ ہی ہو سکتی تھی۔

عقبی دستے کو میکارتھر نے جو حکم دیا تھا وہ اسے بجالایا۔ اس نے ایسی کوئی چیز منیلا میں نہیں رہنے دی تھی جس سے دشمن فائدہ اٹھا سکتا۔ خوراک کے لئے جو کچھ مل رہا تھا، وہ بٹان اور کوریجیڈار کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ ۸ دسمبر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء تک جب مسلسل بمباری ہو رہی تھی، عقبی دستہ اپنی کوششوں سے خوراک اکٹھی کرنے کے علاوہ شمالی اور جنوبی رجمنٹوں کو بٹان میں اکٹھا کرنے کا کام بھی کر رہا تھا۔ اس دستے کی کوششوں سے بٹان اور کوریجیڈار نے ہتھیار ڈالنے میں وقت لیا۔ آخری رات جب میں عقبی دستے سے نکل کر پرانے سٹیمر "ہائیڈ" پر سوار ہوا تو اپنا تھیلا اپنے سرہانے رکھ کر عرشے ہی پر سو گیا تھا۔

جب میں بیدار ہوا تو دھوپ چمک رہی تھی اور سٹیمر کوریجیڈار کی گودی میں کھڑا تھا۔ تھکن ہنوز باقی تھی، تاہم میں ساحلی مٹی پر کود گیا۔ مشرق میں کیوائٹ اب بھی جل رہا تھا۔ مغرب میں جنگل سے بھرا بٹان کا جزیرہ نما تھا جہاں ہمارے نوجوان آخری جنگ لڑ رہے تھے اور اس وقت بارہ میل کے فاصلے پر جاپانی سپاہی کھلے شہر منیلا میں داخل ہو رہے تھے۔ بعد میں اطلاعات ملیں کہ منیلا ہوٹل میں میکارتھر کے دفتر سے امریکی پرچم سنگین کے زور سے اتروا دیا گیا تھا۔ میرے گھر کو جاپانی ہائی کمانڈ نے اپنی رہائش گاہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔ پہلے انہوں نے میری کار طلب کی تھی اور میرے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ وہ میرے بیوی بچوں کے متلاشی تھے۔ ان کے پاس مجھ سے نفرت کرنے کی وجوہات تھیں لیکن وہ میرے بیوی بچوں کی تلاش میں کیوں تھے؟ میں اس سوال کا جواب جانتا تھا لیکن اس کا تصور میرے لئے سوہان روح تھا۔

☆☆☆

نئے سال کے پہلے دن طلوع آفتاب کے کچھ دیر بعد میں کوریجیڈار میں مالنٹا سرنگ میں داخل ہوا تو ایک ناخوشگوار بو نے میرا استقبال کیا۔ یہ بو پسینے میں ڈوبے گندے کپڑوں، خون اور جراثیم کش ادویات کی تھی جو سرنگ کے ایک

بغلی حصے میں واقع اسپتال سے آ رہی تھی۔ اندر شور بھی بہت زیادہ تھا لیکن یہ ایک پناہ گاہ تھی جو ناقابل تسخیر نظر آتی تھی۔ سرنگ ایک چٹان کے نیچے تھی اور اس کی بغلی سرنگیں بھی اندر تک چلی گئی تھیں۔ چٹان پتھر کی تھی۔ کوریجیڈار میں کل آبادی نو ہزار افراد پر مشتمل تھی جن میں سے پانچ ہزار افراد ہوائی حملوں کے دوران سرنگ میں پناہ لیتے تھے جو اس قدر چوڑی تھی کہ اس کے اندر دو ایمبولینس گاڑیاں متوازی چل سکتی تھیں۔ اس کا دروازہ پتھر کو تراش کر خوبصورت انداز میں بنایا گیا تھا۔ اندر فوجی ابھی تک سو رہے تھے اور ان کے بوٹ ایک دوسرے کے چہرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اگر ان پر تھکن طاری نہ ہوتی تو وہ قبرستان جیسی اس سیلن زدہ سرنگ میں ہرگز نہ سو سکتے۔ میں نے دیکھا کہ دیوار پر انہوں نے ان فوجیوں کی تصاویر اخبارات اور رسائل سے کاٹ کر چسپاں کر رکھی تھیں جو اچھے حالات میں تھے اور کسی دوسرے براعظم میں تھے۔

بغلی سرنگوں میں آرڈیننس 'کوارٹر ماسٹر' اینٹی ایئرکرافٹ' ہاربر ڈیفنس اور سگنل کور کے دفاتر کے علاوہ مشرق بعید کے لئے امریکی فوج کا دفتر بھی تھا۔ نسبتاً" چھوٹی بغلی سرنگوں میں اسپتال کی لیبارٹریاں تھیں۔ ایک طرف دو سرنگیں صدر اور اس کے اہل خانہ اور ہائی کمشنر کے لئے مخصوص تھیں۔

میں نے اپنا سامان (تھیلا) امریکن فوج کے دفتر میں رکھا۔ وہاں ایک ہفتہ پہلے آنے والے دستے کا سامان ہنوز بکھرا پڑا تھا۔ دستے کے تمام کارکن کام میں مشغول تھے۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید تو کہا لیکن ان کا انداز ایسا تھا جیسے سزائے موت کے منتظر کسی بدنصیب کے' مقتل میں آنے پر کہتے ہوں۔ پہلے ان کا دفتر سرنگ سے باہر تھا لیکن جب چوہتر جاپانی بمباروں نے کوریجیڈار پر بمباری کی تھی تو انہیں اندر جگہ دی گئی۔ عملے کی خستہ حالی اور اداس اداس جلنے والے بلب نے دفتری ماحول کو بھوت پریتوں کے ڈیرے کی صورت بخش دی تھی۔

سب سے پہلے مجھے کرنل ڈر ملا اور کچھ کھلانے کے لئے سرنگ کے باہر ایک خیمے میں لے گیا۔ سرنگ سے نکلتے وقت اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے پانی کے متعلق پوچھا تو اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں سمندر کا پانی تھا۔ میٹھے پانی کے حصول کے تمام ذرائع تباہ ہو چکے تھے۔ نمکین پانی بھی مقررہ مقدار میں ملتا تھا' نہانے اور شیو کرنے کے لئے صرف ایک کپ۔ سمندری پانی سے نہانا اپنے اوپر نمک کی تہ چڑھانے کے مترادف تھا۔ میں میز پر بھنا گوشت اور انڈے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ میں بھوکا تھا لیکن نمک نے گوشت کو پتھر بنا دیا تھا' اسے چبا نہ سکا۔ بس ایک بھاری اور موٹا توس کھایا۔ یہ بڑا ڈراؤنا ناشتا تھا۔ مکھیوں کی یلغار' الامان!

سرنگ کا ایک حصہ عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ وہاں پچاس ساٹھ خواتین تھیں جن میں صدر کی اہلیہ اور بیٹیاں بھی تھیں۔ صرف میکارتھر کی اہلیہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ صدر کی خوابگاہ اوسط درجے کے کمرے کے برابر تھی۔ اندھیرے کے باعث میں صدر کو نہیں دیکھ سکا' تاہم کھانسنے کی آواز سن کر جب اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے مجھے ازخود ہیلو کہا۔ وہ لوہے کے پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم ڈھانچا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سفید بال بوڑھے

اور الجھے ہوئے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہی پرانی اپنائیت تھی جو اس کی شخصیت کا طرہ امتیاز تھی۔

"کیا تم نے صدر روزویلٹ کا بیان پڑھا ہے کہ کمک پہنچ رہی ہے؟ صدر امریکہ نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ فلپائن کی آزادی کا تحفظ کیا جائے گا۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں مجھے بتایا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے صدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور امید دونوں جلوہ گر تھے۔ میری آمد سے دو روز قبل عجیب و غریب حالات کی وجہ سے صدر کیوزون نے صدارت کا نئے سرے سے حلف اٹھایا تھا۔ اس نے کہا: "میری خواہش تھی کہ حلف برداری کی تقریب میں تم بھی یہاں موجود ہوتے۔"

۳۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کو حلف برداری کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ میں نے اس کی روداد میں لکھا کہ تقریب میں فلاں فلاں حاضر تھے۔ لوگوں نے نعرے لگائے۔ فوجی بینڈ نے دھنیں بجائیں۔ اعزازات تقسیم ہوئے۔ ترانوں کا مقابلہ ہوا... وغیرہ وغیرہ... نشریے کے لئے میں نے اپنی تحریر صدر کیوزون کو دکھائی تو اس نے کہا کہ ہاں چشم تصور اور زور قلم کے حوالے سے تو یہ ٹھیک ہے مگر یہ تقریب سرنگ کے باہر کھانے کے خیمے میں ہوئی تھی۔

کوریجیڈار میں کوئی ریڈیو اسٹیشن نہ تھا۔ میکارتھر نے ریڈیو ٹرانسیٹر یا اس کے پرزے وغیرہ لانے کے لئے منیلا میں اس وقت پیغام بھیجا تھا جب میجر لنک اور لیفٹیننٹ انسے بہت سے ٹرانسیٹر تباہ کر چکے تھے، تاہم وہ میکارتھر کا حکم بجا لانے کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔

جنرل میکارتھر نے ملاقات کے وقت مجھے تحسین آمیز کلمات سے نوازا جس سے میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھا۔ میکارتھر ایک خوش لباس اور خوش خوراک جرنیل تھا لیکن کوریجیڈار میں اس کے انداز بدلے ہوئے تھے۔ یونیفارم استری سے بے نیاز، بال الجھے ہوئے اور نمکین پانی سے شیو کرنے کے نتیجے میں کھردرا چہرہ۔۔۔ وہ تھکا ہوا عقاب نظر آ رہا تھا۔ چار دن قبل ہی اس کی جان مشکل سے بچی تھی۔ وہ بمباری کے دوران باہر پہاڑی پر کھڑا تھا۔ بموں کے ٹکڑے اڑ رہے تھے۔ سارجنٹ ڈومنگو نے اپنا ہیلمٹ اس کے سر پر رکھا۔ جب وہ ہیلمٹ رکھ رہا تھا تو بم کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ پر آ کر لگا۔ اگر وہ ایسا نہ کر رہا ہوتا تو وہ ٹکڑا لازماً میکارتھر کے سر پر لگتا۔

☆☆☆

جاپانیوں نے جزیرہ لوزان کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ میکارتھر کی افواج نے کوریجیڈار اور بٹان میں مورچوں اور خندقوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ اگرچہ وہ جاپانیوں کے انگوٹھے کی زد میں تھے لیکن انہیں کچلنا جاپانیوں کے لئے آسان نہ تھا۔ میکارتھر نے اس صورت حال کے متعلق کہا کہ بوتل ان کے پاس ہے لیکن کارک اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی ایسی گفتگو عجوبے سے کم نہ تھی۔ اس کی فوج کی تعداد ہزاروں میں تھی... ادویات ختم... خوراک غیرموافق... دوسرا سامان ناکافی... جہاز ندارد۔۔ اسی لئے طویل جنگ لڑنے کی روایت قائم کرنا میکارتھر ہی کا حوصلہ تھا۔

صبح سے شام تک میجر جنرل مور دفاع کو مضبوط کرنے اور سرنگ کو قابل رہائش بنانے کے لئے اپنے آدمیوں کے ساتھ مصروف رہتا۔ زیر زمین تار کے ذریعے بٹان اور کوریجیڈار کا رابطہ قائم تھا۔۔ سرنگ میں کھٹملوں، مکھیوں اور بو کے علاوہ کوئی بھی چیز کافی نہ تھی۔ پہلی رات میں سرنگ اور اس کے بغلی حصوں میں سونے کی کوئی جگہ تلاش کرتا رہا مگر بے سود۔ اندر دم گھٹتا تھا، باہر بموں کا خطرہ تھا، تاہم ایک کا انتخاب ضروری تھا۔ ہماری صحتیں گرتی جا رہی تھیں اور صفائی ندارد۔۔ اور بیت الخلاؤں کا ذکر آتے ہی میری طبیعت متلانے لگتی تھی۔ ہم انہیں عفونت کا دوسرا جہنم کہا کرتے تھے۔

میکارتھر نے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر، ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کا حکم دیا۔ میجر ٹیک اور فرسٹ لیفٹیننٹ انسے نے منیلا سے لائے گئے مختلف النسل پرزے جوڑ کر ایک بغلی سرنگ میں ٹرانسمیٹر نصب کر دیا اور اس کا ٹاور چٹان کے ایک سمت باہر نکالا۔ کرنل ڈلر بڑا خوش تھا۔ اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "ٹرانسمیٹر کام کر رہا ہے۔"

۵ جنوری کو میں نے "صدائے آزادی" نامی ریڈیو اسٹیشن پر فلپائن کے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: "میرے ہم وطنو! آپ بٹان کے محاذ جنگ سے "صدائے آزادی" ریڈیو کی آواز سن رہے ہیں۔" منیلا کی طرح یہاں کوریجیڈار میں بھی میری ذمہ داری لوگوں کو حالات سے باخبر رکھنا تھی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی خبروں کا ایک بلیٹن نشر کرنا بھی میرے فرائض میں شامل تھا لیکن اس بلیٹن کو مرتب میجر سائزر کرتا تھا۔ میں کرنل ڈلر کی رہنمائی میں دن میں تین دفعہ ہمت و جرات کے پیغامات فلپائن کے لوگوں کو سناتا۔ یہ پیغامات جو آزاد لوگوں کے لئے تھے ایک ایسی سرنگ سے نشر ہو رہے تھے جہاں بدبو ہر وقت پھیلی رہتی تھی اور جہاں مصائب کے مارے بھوکے اور مریض لوگ ایک قسم کے "چوہے دان" میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہمارے پیغامات کے جواب میں ریڈیو جاپان انگریزی میں پروگرام نشر کرتا۔ جاپانی اناؤنسر کہتا: "بٹان اور کوریجیڈار کے لوگو! تمہاری مزاحمت بیکار ہے۔ ہم نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا ہے۔ ہم نے ہانگ کانگ، سنگاپور، جاوا، گوام اور جزیرہ ویک (Wake) فتح کر لئے ہیں۔ پرل ہاربر میں ہم نے امریکی بحریہ کو تہس نہس کر دیا ہے۔ جب ہم نے فیصلہ کر لیا تو ہم تمہیں بھی تباہ کر دیں گے۔ لیکن چونکہ کوریجیڈار اور بٹان میں فلپائنی لوگ بستے ہیں اور ہماری جنگ تم سے نہیں، ہماری جنگ امریکہ سے ہے، لہٰذا ہتھیار ڈال دو۔ ہم تمہارے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کریں گے۔"

ابتدا ہی سے جاپانی جہاز اشتہارات اور پمفلٹ گرا کر لوگوں کو ذہنی جھٹکے دینے میں مصروف تھے۔ اب بھی ان کے ایسے اشتہارات ملتے جن کا مخاطب براہ راست میکار تھر ہوتا۔ انہوں نے جعلی کرنسی کے ذریعے بھی فلپائنیوں کو بددل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک روز ان کے پروپیگنڈے کا جواب دیتے ہوئے کہا: "تم نے جنگ کی ابتدا ہی سے ہمارے قصبوں' شہروں اور فوجی کیمپوں میں اشتہارات پھینکے۔ تم یا وہ لوگ جنہوں نے تمہیں ہمارے ملک پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا ہے تاکہ ہم ہتھیار پھینک دیں' اپنے گھروں کو چلے جائیں اور امریکی افواج کو جنگ لڑنے کے لئے اکیلے چھوڑ دیں' سن لو کہ ہمارے تمہارے درمیان زبان کے علاوہ روایات کا بھی فاصلہ ہے۔ تم نے بار بار اپنی اور ہماری شکلوں کی مشابہت کا ذکر کیا ہے لیکن ہماری پرورش مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔ ہم جاپانی عوام کی خوبیاں جانتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک بہادر اور عظیم قوم ہے۔ یہ امریکہ سے پچاس سالہ رفاقت ہی کا نتیجہ ہے کہ جاپانی ان سے استفادہ کر کے ایک قوت کے طور پر ابھرے ہیں۔ یقیناً ہر قوم کو اپنی محنت کا ثمر کھانے کا حق ہے لیکن اسے یہ حق نہیں کہ وہ دوسری قوموں کو کچلنے یا ہڑپ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔ جاپان کے سپاہیو! تم حملہ آور ہو۔ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ تم سے آخری دم تک لڑیں گے۔"

انہی دنوں مجھے اپنے بیٹے کی طرف سے نئے سال کا کارڈ ملا۔ اس نے "ہیپی نیو ایئر" کے بجائے "جھپی نیو ایئر" لکھا تھا۔ میں نے جذباتی ہو کر ایک پیغام نشر کیا جو اہل فلپائن کے دل کی آواز تھا' خصوصاً ان سب کے دل کی آواز جو کوریجیڈار اور بٹان میں بدترین حالات میں دشمن سے معروف جنگ تھے۔ میں نے کہا: "ہیلو! میرے باپ' میری ماں' میرے بھائی' میری بہن' میرے بیٹے' میری بیٹی' میری دمساز' میری عزادار! میں جنگی محاذ سے تم سے دو باتیں کرنے آیا ہوں۔ یہ شخص جو تم سے مخاطب ہے۔۔ تمہارا بیٹا' تمہارا بھائی' تمہارا باپ' تمہارا شوہر۔۔ یہ جو بھی ہے تم سب سے' مقدس رشتوں کے نام پر' بٹان کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں لڑنے والے جنگجو بہادروں کے نام پر' اپیل کرتا ہے کہ ہمت و جرات سے کام لو' اپنے حواس میں رہو۔۔ اگر تم نے جاپانیوں سے تعاون کیا تو کھیتوں میں اگنے والا چاول اور گلیوں سے اکٹھا کیا گیا لوہا غیرانسانی جنگ میں دشمن کی مدد کریں گے اور پھر فیلا میں تیار کی جانے والی گولیوں کا شکار تمہارا بیٹا' تمہارا بھائی' تمہارا باپ' اور تمہارا شوہر بھی ہو سکتا ہے۔ تم خود تصور کر سکتے ہو کہ دشمن کی مدد کرنے میں کیا کیا نقصانات ہیں۔۔ عزیز ہم وطنو! اپنے قومی پرچم کو اپنے دلوں میں بلند رکھو' اسی طرح جس طرح ہم اسے بٹان کی پہاڑیوں پر بلند رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دھوکا نہ دینا۔ اپنی قوم کو دھوکا نہ دینا۔ ہم جو بٹان میں ہیں' فلپائن کا مستقبل ہیں' ہم تمہاری نوجوان نسل ہیں۔ یہ پہاڑیاں' یہ جنگل اور سمندر سے گھری یہ سرزمین جسے بٹان کہتے ہیں' سربکف نوجوانوں کی سرزمین ہے اور یہاں ایک نئی قوم جنم لے رہی ہے۔"

"صدائے آزادی" دراصل میکار تھر کی ہمت و جرات اور صدر کیوزون کے جذبہ حب الوطنی کی آواز تھا۔ ہمارے پاس ہمت و مردانگی اور ایثار و قربانی کی بہت سی کہانیاں فلپائنی عوام کو

سنانے کے لئے موجود تھیں۔ ان میں سارجنٹ کالوگس کی کہانی تھی جو برستے گولوں اور بموں کے درمیان ایک مشین گن کو خاموش پاکر سو گز کا فاصلہ طے کر کے گن تک جا پہنچا تھا اور اس نے بمبار طیاروں کو للکارتے ہوئے کہا تھا کہ جنگ میرا پیشہ ہے اور فتح میرا مقصود۔۔ حالانکہ وہ میس کا انچارج تھا۔ میجر رہینل کی کہانی تھی جس نے اپنا فوجی دستہ دشمن سے بچانے کے لئے اپنے سمیت پل کو اڑا دیا تھا۔ لیفٹیننٹ اینڈرسن کی کہانی تھی جس نے دشمن کے کئی طیارے تباہ کر دیئے تھے اور جب وہ پیراشوٹ سے اتر رہا تھا تو جاپانی مشین گنوں نے اسے زندہ زمین پر نہیں اترنے دیا تھا۔ فرسٹ لیفٹیننٹ بیانچی کی کہانی تھی جس نے دشمن کی ایک مشین گن پر قبضہ کر لیا تھا اور جس کا داہنا ہاتھ زخمی تھا۔ وہ صرف ایک پستول سے لڑ رہا تھا۔ اس کے سینے میں دو گولیاں آ لگی تھیں، پھر بھی وہ ایک امریکن ٹینک پر چڑھ گیا تھا۔ ایک کہانی فلپائنی سکاؤٹ سوریا کی تھی جس نے دشمن کے ٹینک پر چڑھ کر اسے دستی بم سے اڑا دیا اور خود بھی ساتھ ہی اڑ گیا تھا۔ پھر کیپٹن نوورٹے کی کہانی تھی جس نے ایک چھوٹی تارپیڈو کشتی سے پانی میں اترتے ہوئے نو بمبار طیارے تباہ کر دیئے تھے۔ ہم یہ کہانیاں نشر کر رہے تھے اور بٹان میں ہمارے جیالے شجاعت اور مردانگی کی ایسی داستانوں کو برابر جنم دیتے چلے جا رہے تھے۔ جب ہم حب الوطنی اور جاں نثاری کی یہ کہانیاں سناتے تھے تو امریکہ سے آنے والی خبریں بھی سنتے۔ وہ ہمیں عجیب لگتی تھیں کیونکہ ہم بھوکے تھے جبکہ ان میں ہوٹلوں میں دعوتوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ اناؤنسر بتاتا کہ امریکہ اس برس پینسٹھ ہزار طیارے بنائے گا، پچاس بمبار طیارے ابھی انگلستان میں اترے ہیں جبکہ ہم صرف چار طیارہ شکن توپوں سے کوریجیڈار کی فضا کی حفاظت کر رہے تھے۔ بٹان میں صرف چار پی۔۴۰ طیارے خفیہ طور پہ رکھے گئے تھے۔ ایسی خبریں سن کر ہمارے نوجوان کہتے ان پینسٹھ ہزار میں سے ہمیں صرف دس طیارے بھیج دو تو دیکھو ہم کس طرح دشمن کی صفوں میں تباہی مچاتے ہیں۔۔ ہمیں پانچ طیارے ہی دے دو۔۔ ایک ہی دے دو!

جاپانی طیارے اب کوریجیڈار پر منڈلانے لگے تھے۔ ہم ان پر اپنے کے ہی لہرا سکتے تھے۔ انہیں ہماری سرنگ کا علم ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں اس پناہ گاہ سے نکالنا چاہتے تھے۔ (جاری ہے)



ایک دن میں نے کھیتوں میں کھڑے کاٹھ کے پتلے سے کہا: "تم اس کھیت میں کھڑے اکتا گئے ہو گے۔"
اس نے کہا: "جانوروں کو ڈرانے کی لذت اس قدر گہری اور دیرپا ہے کہ میں اس سے کبھی نہیں اکتاتا۔"
میں نے ایک منٹ سوچ کر کہا: "یہ سچ ہے کیوں کہ میں نے بھی اس مسرت کا مزہ چکھا ہے۔"
وہ بولا: "ہاں وہی لوگ جن کے جسم میں گھاس پھونس بھری ہو اس لذت سے آشنا ہو سکتے ہیں۔"
یہ سن کر میں وہاں سے چل دیا لیکن مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نے میری تعریف کی یا میرا مضحکہ اڑایا۔ ایک برس گزر گیا اور اس مدت میں وہ کاٹھ کا پتلا ایک فلاسفر بن چکا تھا۔ اور جب میں دوبارہ اس کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر دو کوؤں نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔
(خلیل جبران)



قاضی ذوالفقار احمد

جب فلپائن سرنگوں ہوا

ان جانگداز برسوں کی تلاطم خیز کہانی جب ایک قوم جاپانی استعمار کے خلاف سینہ سپر ہو گئی

دوسری اور آخری قسط

۲ جنوری ۱۹۴۲ء کو رہجیدار میں میرا دوسرا دن تھا۔ اسی روز سقوط منیلا ہوا۔ یہ سقوط اہل فلپائن کے لئے ایک بڑا صدمہ تھا لیکن میکارتھر کی طرف سے یہ ایک جنگی چال تھی۔

میں سرنگ کے باہر زخمیوں کو سٹریچروں اور پہیہ دار کرسیوں کے علاوہ ادھر ادھر زمین پہ بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زخمیوں کی بدحالی اور بے بسی کا مقابلہ ہو رہا ہو۔ کالی مکھیاں سب پر بھنبھنا رہی تھیں۔ صدر کیوزون اپنے خیمے میں پہیہ دار کرسی پر بیٹھا سمندر کی تازہ ہوا کھا رہا تھا۔ اچانک سائرن بجنے لگے۔ نرسیں دوڑتی آئیں اور مریضوں کو اندر لے جانے لگیں۔ جو خود جا سکتے تھے وہ سرنگ میں چلے گئے۔ سرنگ کے باہر ہر چیز رک گئی۔ ایسے میں تیزی سے جنرل میکارتھر کی گاڑی آئی۔ اس میں جنرل کے علاوہ اس کی بیوی، بیٹا اور بیٹے کی چینی آیا بھی تھے۔ میکارتھر کی بیوی ہنس ہنس کر سپاہیوں سے باتیں کرتی رہی۔ ادھر خلیج منیلا پر دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پانچ گھنٹے کے اس حملے میں ساٹھ جاپانی بمباروں نے حصہ لیا تھا۔ ایمبولینس زخمیوں اور نعشوں کو لا رہی تھیں۔

موسم ہمارے حق میں تھا۔ کوریجیدار میں ہمارے قیام کے دوران بارش نہیں آئی۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو ہم سرنگ کے اندر ڈوب کر مرجاتے۔ دھماکوں سے سرنگ کی پتھریلی دیواروں اور چھتوں میں رخنے پڑ گئے تھے اور میں سوچا کرتا کہ یہ سرنگ ہمیں کب تک سہارا دے گی!

میں نے صدر کیوزون کو بغلی اسپتال میں بہت افسردہ پایا۔ صدر کی بیوی ڈونا ایک زخمی نوجوان کا ہاتھ پکڑے اسے تسلی دے رہی تھی کہ وہ اچھا ہو جائے گا۔ صدر کی بیٹی ماریا مریضوں کے بستر درست کر رہی تھی۔ سرنگ کے اندر میرا دم گھٹنے لگا تو میں باہر نکل آیا۔ باہر مٹی کے ایک تودے میں کسی فوجی کی ٹانگ نظر آ رہی تھی۔ ایک اور فوجی کی مدد سے ہم نے اسے ملبے کے ڈھیر سے نکالا۔ اس نے وی کا نشان بنایا اور ہمارے ہاتھوں ہی میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

میکارتھر سرنگ کے باہر خیمے میں کھانا کھاتا۔ اس کی میز پر جو کچھ رکھ دیا جاتا، اسی پر اکتفا کرتا اور سارے دن میں ایک سگریٹ تین وقفوں میں پیتا۔ سرنگ میں گھٹن کے باعث رات کو نیند ہڑبڑا کر اٹھتا تو میکارتھر اپنی کرسی پر بیٹھا ٹیلی فون کرتا اور ہدایات دیتا نظر آتا۔ وہ محاذ پر جنرل سدرلینڈ سے باتیں کرتا۔ اس نے امریکن وار کونسل سے کہہ رکھا تھا کہ اگر جنگ کے دوران اسے کچھ ہو جائے تو مشرق بعید میں افواج کی کمان جنرل سدرلینڈ سنبھالے گا۔

جب میں کوریجیدار آیا تھا تو میں اپنے تھیلے میں دو فالتو وردیاں لایا تھا لیکن انھیں میں نے بٹان بھیج دیا کیونکہ وہاں نوجوان چیتھڑوں میں گزارا کر رہے تھے۔ اب میری واحد وردی چیتھڑے ہو رہی تھی۔ بلیڈ ختم ہو چکے تھے۔ سرنگ میں ایک فوجی بال کاٹتا تھا۔ میں نے اسے کبھی فارغ نہیں دیکھا، اس لئے ہم خود ہی ایک دوسرے کی الٹی سیدھی حجامت بنا لیتے تھے۔ رات کو سرچ لائٹ میں بستروں کے اوپر کھٹملوں کی قطاریں دکھائی دیتیں۔ سرنگ والوں نے ان موذی کھٹملوں کا نام "ففتھ کالم" رکھا ہوا تھا۔ ہمیں ہر چیز سے شکایت تھی لیکن ہم کس سے کہتے۔ سب مجبور تھے اور جنگ میں اپنا اپنا

کردار نبھا رہے تھے۔
"تم تھوڑی دیر آرام کیوں نہیں کر لیتیں؟"
ایک دن میں نے ایک نرس سے کہا۔
"میں کس طرح آرام کر سکتی ہوں! ان کو میری ضرورت ہے۔" اس نے مریضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔
تین میل دور بٹان سے دھماکوں کی آوازیں دن رات آتیں۔ چٹان کے اوپر پرانی توپوں کے ساتھ ایک طاقتور دوربین نصب کی گئی تھی۔ ایک دن میں نے اس دوربین سے کیوائٹ کا تباہ حال علاقہ دیکھا۔ جاپانی اپنی توپیں کوریجیڈار کے رخ پر نصب کر رہے تھے۔ پھر میں نے دوربین کا رخ منیلا کی طرف کر دیا۔ منیلا ہوٹل پر امریکی پرچم کے بجائے جاپانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔
ایک روز مجھے جنرل والڈیس اور کرنل نیو کے ساتھ بٹان جانے کے لئے کہا گیا۔ ہم تینوں ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار تھے۔ شارک مچھلیاں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ یہ لاشیں نہیں کھاتی تھیں، زخمی اور زندہ انسان انہیں زیادہ مرغوب تھے، تاہم خوش قسمتی ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ صدر کیوزون کے ذہن پر ہر وقت فوج آزادی کے نوجوان چھائے رہتے تھے جو محاذ پر مشکلات کا شکار تھے۔ صدر اپنی بیماری کی وجہ سے خود محاذ پر جانے سے معذور تھے، لہٰذا ان کی خواہش پر ہم نوجوان مجاہدوں کا حال معلوم کرنے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کے پاس ریڈیو تھا نہ ان تک اخبار پہنچتا تھا۔ میں ان کے لئے روز ویلٹ کا پیغام لے کر آیا تھا جو ہم نے ریڈیو پر سنا تھا:
"فلپائن کے لوگو! دنیا تمہیں دیر تک یاد رکھے گی۔ میں اپنے وعدے کا اعادہ کرتا ہوں کہ تمہاری آزادی اور خود مختاری کی حفاظت کی جائے گی۔ اس وعدے کے ایفا کے لئے امریکہ کے تمام وسائل کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ مضبوطی سے ڈٹے رہو۔"
بٹان شدید گرمی کی لپیٹ میں تھا۔ راستے میں جگہ جگہ نیم عریاں امریکی اور فلپائنی فوجی بیلچوں کے ذریعے کچی سڑک ہموار کر رہے تھے۔ مجھے ٹیلیفون کی وہ تاریں نظر آ رہی تھیں جن کے ذریعے بٹان کا کوریجیڈار سے رابطہ قائم تھا۔ گرد کی تہیں جمنے سے ہم ایک دوسرے کو بھوت نظر آ رہے تھے۔ جنگل کے اندر ہم ایک چوکی پر پہنچے تو چوکی والوں نے چھوٹتے ہی پوچھا:
"کمک کب پہنچ رہی ہے؟"
"جلد ہی۔" میں نے کہا اور پھر انہیں روزویلٹ کا پیغام پڑھ کر سنایا۔
اس کے بعد ہم جنرل میگنلو کی چوکی پر گئے۔ اس نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ توپیں دکھائیں جو دشمن نے اپنے فوجیوں کے لئے گرائی تھیں مگر جنرل کے دستوں نے ان پر قبضہ کر کے دشمن کا صفایا کر دیا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ کانٹے دار تار بچھائے گئے تھے کیونکہ ہمیں دھوکا دینے کے لئے دشمن اپنے فوجی ادھر ہی اتارتا تھا۔ مورچے اور پناہ گاہیں جنگل کے باہر دھوپ اور دشمن دونوں کی زد میں تھیں۔ کسی قسم کا تحفظ ان کو حاصل نہ تھا۔ ان مورچوں کو "فاکس ہول" کہا جاتا تھا کیونکہ ان میں ایک ایک نوجوان رائفل تھامے بیٹھا تھا۔ وہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ پاؤں پسار کر کمر سیدھی کر سکتا تھا۔ اس کی خوراک فی یوم ایک مٹھی چاول تھے اور وردی چیتھڑے چیتھڑے --- سب نوجوان آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔

شب خون مارنے والے جاپانی، درختوں کے اوپر اپنے "گھونسلے" بنائے بیٹھے تھے۔ ان کی رائفلوں سے دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی مارا جاتا تو وہ نیچے گر نہیں سکتا تھا کیونکہ گھونسلے کی ساخت ہی ایسی تھی۔ اسی میں اس کی لاش پڑی گلتی سڑتی رہتی۔ ان سے بچنے کے لئے نوجوانوں کو ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک بل کھاتے ہوئے بھاگنا پڑتا۔ ان مورچوں میں سب نوجوان سترہ اٹھارہ برس کے فلپائنی تھے۔ ان میں سے اکثر، میرے لڑکے کے دوست تھے۔

جاپانی، پمفلٹوں کے ذریعے ترغیبات دے کر انہیں راہ آزادی سے ہٹانے میں کوشاں تھے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار ان کے اوپر پمفلٹوں کی بارش کرتے۔ چند روز پہلے پھینکے جانے والے پمفلٹ میں ایک نیم عریاں جاپانی حسینہ، فلپائنی جوانوں سے کہہ رہی تھی: "تم ان مورچوں میں کیوں گل سڑ رہے ہو جبکہ زندگی کی خوبصورتیاں تمہاری تلاش میں ہیں؟" پمفلٹوں میں ان فلپائنی نوجوانوں کو تحفظ اور خوشگوار زندگی کی ضمانت دی گئی تھی جو اپنی رائفل کی نالی کا رخ زمین کی طرف کئے ان کی صفوں میں شامل ہو جائیں۔ میں نے ایک جوان سے اس جاپانی پیشکش کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: "رائفل کی نالی کا صحیح رخ جاپانی فوجی کا سینہ ہے۔"

فلپائنی جوان کی اس سچی بات کے حوالے سے میں نے اپنے نشریے میں جاپانیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "جو چیز تم گولیوں سے حاصل نہیں کر سکے اسے پروپیگنڈے سے کیسے حاصل کر سکتے ہو؟"

ہماری جنگ آزادی کی جنگ تھی۔ جاپانیوں کی جنگ نفرت کی جنگ تھی۔

☆☆☆

ایک دوپہر ہمیں "ابوکے" جانے کا حکم دیا گیا جہاں جاپانیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ "ابوکے" میں جنرل میکارتھر نے کامیابی سے ڈھانپے گئے مورچوں میں بھاری توپ خانہ چھپا رکھا تھا۔ اس نے جنرل ہوما کی، پیش قدمی کرتی ہوئی افواج کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ جاپانی جارحانہ انداز میں آگے بڑھتے چلے آئے۔ وہ ہماری پوشیدہ توپوں کی زد میں آ گئے تو بچ کر نہ جا سکے اور "ابوکے" دس ہزار جاپانی فوجیوں کا، قبرستان بن گیا۔

"لڑو اور مر جاؤ..." یہ جاپانی فوجیوں کا نعرہ تھا۔ وہ بجلی کے ننگے تاروں پر اپنے جسم گرا دیتے، بارودی سرنگوں کے اوپر لیٹ کر دھماکے سے اڑ جاتے اور ان کے ساتھی لہروں کے مانند آگے بڑھتے چلے جاتے۔ میکارتھر جاپانی فوجیوں کی تربیت اور جانبازی کی تعریف کرتا تھا۔ لیکن ان سے لڑنا اور انہیں مارنا اس لئے ناگزیر تھا کہ اگر انہیں چھوڑ دیا جاتا تو وہ ہرگز ہرگز ہمیں نہ چھوڑتے۔۔ جنرل ہوما کی تربیت اور توجو کی تعلیم ہی یہ تھی کہ سورج کا بیٹا وہی ہے جو بڑھ کر موت کو گلے سے لگا لے۔

ایک دن ہمیں باگیک کی دفاعی صفوں میں جانے کا حکم ملا۔ ہم ایک چوکی کی طرف جا رہے تھے کہ ایک فوجی نے گنے کے کھیت سے نکل کر شبخون مارنے والے جاپانی دستوں کے متعلق بتایا جو درختوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہماری کار جونہی آگے بڑھی، ہم پر ایک درخت سے گولی چلائی گئی۔ اسی لمحے ایک مشین گن نے درخت کو اڑا کے رکھ دیا جو ایک مورچے میں ہماری حفاظت

کے لئے رکھی گئی تھی۔ ہمارا کار ڈرائیور ہمیں' ایک زخمی امریکی کو سنبھالنے کی خاطر' کار ہی میں چھوڑ گیا۔ ہمیں بعد میں علم ہوا کہ ہماری حفاظت کرتے ہوئے اس روز بارہ فوجی شبخون مارنے والے دستوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بنے تھے۔

اس رات ہم واپس کوریجیڈار نہ آ سکے اور محاذ پر ایک چھوٹی سی کھاڑی کے نزدیک سوتے جاگتے رات گزاری۔ ایک مرتبہ تو ایسا لگا جیسے ہزاروں توپوں نے بیک وقت فائر کھول دیا ہو۔ میں گھبرا کر اٹھا مگر کرنل لارو نے کہا: "فکر نہ کرو۔ یہ صرف آگ کے گولے ہیں۔" یہ جاپانیوں کی ایک چال تھی۔ وہ ہمیں ہراساں کرنے کے لئے ایسے گولے داغتے تھے جن سے گولہ باری کا گمان ہو تاکہ ان کی آواز سن کر نوجوان لڑکے مورچوں سے نکلیں اور جاپانی شبخون مار دستے ان پر گولیاں برسا سکیں۔

میں نے پستول کی گولیاں چلنے کی آوازیں بھی سنیں۔ پھر قریب ہی سے ایسی آواز سنی جو انسان کی آخری ہچکی جیسی تھی۔ یہ وحشتناک آواز کدھر سے آئی تھی' میں اس کا تعین نہیں کر سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے درخت سسکیاں بھر رہے ہوں۔ خاموشی' سسکیاں اور چیخیں۔۔ یہ اس جنگل کی زندگی تھی جس میں ہم نے "ہیرلڈ" کی بائیسویں سالگرہ منائی ....اور جنگل میں منگل کیا۔

کرنل لارو نے مجھے بتایا کہ یہ آوازیں جاپانی اپنے ٹرکوں پر رکھے لاؤڈ سپیکروں سے ہمیں خوفزدہ کرنے کے لئے نشر کر رہے ہیں۔ پھر ریڈیو پر ایک نسوانی آواز ابھری: "بٹان کا دفاع کرنے والے بہادر محافظو!" ہمارے یہ محافظ روحانی' جسمانی اور ذہنی طور پر سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔

☆☆☆

کوریجیڈار اور بٹان میں خوراک کا مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ' صابن اور سگریٹ کی عیاشیاں پہلے ہی ختم تھیں۔ ناقص خوراک کی وجہ سے اب ہمارے دانت گرنے لگے تھے' تاہم ایک عیاشی باقی تھی اور وہ تھی طبیب دندان کی کرسی پر بیٹھنا۔۔ وہ نرم کرسی ماں کی گود معلوم ہوتی تھی۔

سرنگ والی چٹان کے نیچے فلپائنی خزانہ بھی تھا۔ حالات کے پیش نظر صدر کیوزون نے اس خزانے میں شامل تمام کرنسی نوٹ تباہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ کرنل نیو انہیں جلانے کا کام کئی روز سے انجام دے رہا تھا۔ صدر روزویلٹ نے صدر کیوزون کے اس حکم کا بطور خاص شکریہ ادا کیا تھا۔ ایک روز خزانے کے قریب ہی بم گرا۔ کرنل نیو وہیں لیٹ گیا۔ دھماکے کے بعد وہ بکھر جانے والے نوٹ اکٹھے کر کے بھٹی میں ڈالنے لگا۔ میں نے کرنل کی اس جرات کا ذکر صدر سے کیا تو اس نے کہا: "کوریجیڈار میں دو اشخاص ایسے ہیں جن کے چہروں پر کبھی خوف نہیں دیکھا اور وہ کرنل نیو اور جنرل میکارتھر ہیں۔"

جاپانیوں نے پانی کے راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ صدر کیوزون بیماری کے باوجود ایسی خوراک کھا رہا تھا جو اس کی صحت کو اور گرا رہی تھی۔ ایک روز جنرل میکارتھر اور صدر کیوزون نے ناکہ بندی توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ کیپٹن لینو نے اس مہم کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ صوبوں کے گورنروں سے رابطہ کر کے

ان کو لی گاپی نامی کشتی کا بتایا گیا جو خفیہ مشن پر حصول خوراک کے لئے جا رہی تھی۔ گورنروں نے خوراک کا بندوبست کرنے کا یقین دلایا اور ایک ہفتے بعد لی گاپی' جاپانی آبدوزوں' طیاروں اور خلیج منیلا میں تباہ کن جہازوں کی موجودگی کے باوجود واپس آ گئی لیکن جونہی اس سے سامان اتارا جانے لگا جاپانیوں نے کیوائٹ کی طرف سے گولہ باری شروع کر دی۔ شاید وہ کشتی کے تعاقب میں تھے! کشتی کا واپس آنا سرنگ والوں کے لئے نیا حوصلہ پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ جنرل میکارتھر نے کشتی کے دونوں کپتانوں کو اعزازات دیئے۔ انہی کے ایثار سے سرنگ میں بھوک کا عذاب کم ہوا تھا۔

ایک روز نہ جانے کیسے یہ خبر اڑ گئی کہ امریکی بحری بیڑہ بحرالکاہل عبور کر کے پہنچنے ہی والا ہے۔ اس خبر سے ہر چہرے پر شگفتگی پھیل گئی۔ عورتوں نے اپنے سامان باندھ لئے۔ شاید کسی بڑے اچھے ذہن نے بحری بیڑے کی آمد کا خواب دیکھا تھا۔ ہم خوابوں کے سہارے ہی تو جی رہے تھے!

کوریجیڈار کی ایک ڈھلان کا نام ہم نے "محبت کرنے والوں کی ڈھلان" رکھا تھا۔ یہاں چند نرسیں اور چند فوجی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے (وقت ملنے پر) ٹہلا کرتے تھے۔ تین نرسوں نے دو فوجیوں اور ایک ڈاکٹر سے شادی کی لیکن یہ شاندار جوڑے ماہ عسل بھی نہ منا پائے تھے کہ اجل کا شکار ہو گئے۔

میکارتھر کبھی کبھی اپنی چھڑی میز پہ رکھ کر مجھ سے کہتا: "کارلوس! تلوار تو رک سکتی ہے مگر قلم نہیں۔" پھر وہ نقشوں میں کھو جاتا جن کے ہر چوتھائی انچ میں ان ہزاروں فوجیوں اور نوجوانوں کی موت لہراتی نظر آتی جو زندہ رہنے کی جدوجہد' فاقوں اور تھکن سے کر رہے تھے۔ اس کے نقشوں میں وہ لکیریں بھی تھیں جو یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اکتالیسویں ڈویژن یعنی فلپائنی سکاؤٹوں نے ایک وسیع و عریض علاقے میں جاپانیوں کو گھیر رکھا ہے۔

جاپانی یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ فلپائنی ان سے تعاون کر رہے ہیں جبکہ ہماری خفیہ اطلاعات یہ تھیں کہ فلپائنی شہریوں نے جاپانیوں کے خلاف "تحریک مزاحمت" جاری رکھی ہے۔ منیلا میں یہ پوسٹر دیواروں پر لگے تھے کہ ایک جاپانی کی جگہ دس فلپائنی مارے جائیں گے۔ تحریک مزاحمت والوں نے جوابا" پوسٹر لگائے کہ ایک فلپائنی کے بدلے دس جاپانی فوجی قتل کئے جائیں گے۔ ان اشتہارات پہ ایف۔ ایف۔ ایف (فائٹرز فار فریڈم) لکھا تھا۔ مزاحمت کی خبروں کے انداز بھی نرالے تھے۔

جنرل ہوما کے ایما پر چھپنے والے "منیلا ٹریبیون" میں ایک شہری کے متعلق خبر چھپی کہ اس کی نشان دہی پر جاپانی فوج نے پٹرول کا ایک ذخیرہ برآمد کیا ہے۔ اگلے روز اس مخبر کی لاش ایک گلی میں پڑی تھی اور اس کے کپڑوں پر اسی کے خون سے تین دفعہ "ایف" لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح ایک مشہور فلپائنی کو جاپانیوں نے اپنے حق میں گاؤں گاؤں جا کر تقاریر کرنے پر مامور کیا۔ اسے تقریر کے دوران گولی سے اڑا دیا گیا۔ جاپانی کھڑی فصلوں کو آگ لگا دیتے اور گاؤں کے ذخائر تباہ کر دیتے۔ تحریک مزاحمت والوں نے یہ کام خود شروع کر دیا مبادا جاپانی ان فصلوں اور ذخائر سے کوئی مفاد حاصل کریں۔

جاپانی فوجیوں کی شقاوت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تیس فلپائنی ریزرو افسروں کو گرفتار کرنے کے بعد ان کی قبریں کھدوائی گئیں اور پھر انہیں مشین گن سے اڑا کر ان قبروں میں پھینک دیا گیا۔ اسے چھپانے کے لئے ٹوکیو ریڈیو بار بار فلپائنی مزاحمت کے مظالم کا ذکر کرتا تھا۔ تین الف کا نشان شہروں میں جاپانیوں کے لئے خوف کی علامت بن گیا تھا۔ جو نوجوان یہ گوریلا جنگ لڑ رہے تھے ان کا فوج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان گوریلوں نے جنگ سے دور علاقوں اور دیہات میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ عوام' جاپانی حملہ آوروں سے نفرت کریں۔

وسط فروری میں صدر کیوزون کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے معالج جنرل والدیس نے میکارتھر کو صاف صاف بتا دیا کہ صدر کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اسے فوراً" کورہیجدار سے نکالنا ہو گا۔

صدر کیوزون کا سیکرٹری ورگاس' منیلا ہی میں رہا تھا اور اب جاپانیوں کے قبضے میں تھا۔ جاپانی ریڈیو نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ ورگاس نے جاپانی موقف کو سمجھ لیا ہے اور وہ فلپائنی حکومت اور افواج سے خطاب کرتے ہوئے ان سے جاپان کی حاکمیت تسلیم کرنے کی اپیل کرتا ہے تاکہ جنگ' ایشیا کی عظمت تسلیم کرنے پر منتج ہو۔ ہم ان اطلاعات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ سیکرٹری ورگاس ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا لڑکا جارج اپنی دو ماہ کی دلہن چھوڑ کر بٹان میں مورچہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ہمارے تردیدی نشریوں کے جواب میں وہ ایک روز ورگاس کو اپنی قوم کے نام پیغام نشر کرنے کے لئے ریڈیو پر لے آئے۔ ہم نے بڑے تذبذب کے عالم میں اس کی آواز سنی۔ اس نے کہا: "جنرل توجو وزیراعظم جاپان نے اپنے خصوصی اعلان میں فلپائن کی آزادی اور عزت کی ضمانت دی ہے' چنانچہ ہمیں جاپانی شاہی افواج کو نقصان پہنچانے والے عزائم سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ہماری قوم میں آزادی اور خودمختاری کی جو روح نفوذ کر چکی ہے اسے ہمیں اپنے سے دور نہیں کرنا چاہئے۔ جاپان کی فوجی انتظامیہ کے تحت ہم اسی یک جہتی کا مظاہرہ کریں گے جو فلپائن کے عوام کرتے رہے ہیں۔ ہم امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور جنگ سے تباہ ہونے والے مکانات دوبارہ تعمیر کریں گے اور ملک میں امن و آشتی لائیں گے...."

ہم نے ورگاس کی طویل تقریر کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نے جاپانیوں کو الفاظ کے ہیرپھیر سے خوب بے وقوف بنایا ہے جبکہ اپنی قوم کو اس نے ڈٹے رہنے کا پیغام دیا ہے۔

صدر کیوزون کی خواہش پر اسے چٹان کے اوپر لے جایا گیا جہاں سے اس نے نیم عریاں اور فاقہ کش نوجوانوں کو کام کرتے دیکھا۔ وہ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے' تاہم اس نے کہا: "خدا تمہارا نگہبان ہو میرے بچو!" اس کی آواز بھرا گئی۔ کیوزون ایک فولادی انسان خیال کیا جاتا تھا لیکن دق کا موذی مرض اسے اندر ہی اندر چاٹ چکا تھا' پھر بھی اس کے ارادے مضبوط تھے۔

جنرل میکارتھر نے جنرل والدیس کی رپورٹ پر امریکہ میں روزویلٹ سے رابطہ کرنے کے بعد صدر کیوزون کو خفیہ طور پر کورہیجدار سے منتقل کرنے کے انتظامات کر لئے تھے۔ خلیج منیلا کے کنارے بنی گودی پر جنرل میکارتھر' جنرل

سدرلینڈ اور جنرل روکسا کے علاوہ چوتھا شخص میں تھا جس نے صدر کیوزون کو خدا حافظ کہا۔ صدر کے ساتھ اس کی بیوی بچوں کے علاوہ عملے کے اراکین بھی تھے۔ صدر فقط ایک سایہ نظر آ رہا تھا۔ گہرے پانیوں میں کھڑی آبدوز ان کی منتظر تھی۔

کیوزون جہاں کہیں بھی تھا۔۔۔ خیمے' آبدوز' سرنگ یا غار میں۔۔۔ وہ فلپائن کا صدر تھا۔ صدر کی صحت کے متعلق ایک اعلامیہ ۲۸ فروری ۱۹۴۲ء کو جاری ہوا۔ اس کے ساتھ ہی صدر کی طرف سے اپنے لوگوں کو مخاطب کیا گیا:

"..... تین ماہ قبل فلپائن پر دشمن کا حملہ انسانی جانوں کی قربانی سے روک دیا گیا ہے۔ دشمن نے ہمارے دارالحکومت اور کچھ دوسرے علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن ہمارے حوصلے بلند اور عزم جوان ہیں۔ ہماری مزاحمت شدید ہے اور ہمیں اپنی آخری فتح پر یقین ہے۔ پچھلے ایک ماہ میں دشمن اپنے تمام تر وسائل کے باوجود پیش قدمی نہیں کر سکا۔ لڑائی کا رخ بدل گیا ہے۔ سنگاپور کے سقوط کا بدلہ ہم نے آبنائے مکاسر' جزائر گلبرٹ' جزائر مارشل اور بحیرہ بالی کے جزیروں کی صورت میں لے لیا ہے۔ ہمارے جوانوں کی بہادری کے قصے دنیا بھر میں پھیل چکے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اتحادی فوجیں یہ جنگ جیت لیں گی۔"

میکارتھر نے اپنی پوری توجہ بٹان پر مبذول کر دی۔ وہ سارا دن سرنگ میں اپنے دفتر میں رہتا اور رات کو پہاڑی پر بنائے گئے جھونپڑے میں چلا جاتا۔

سرنگ کی زندگی موت و حیات کی جانگسل کشاکش تھی لیکن کبھی کبھار ہم اسے فقط زندگی سمجھ لیتے۔ ناکہ بندی کے دنوں میں ہم نے ایک عشائیے کا انتظام کیا جس میں بچی کھچی خشک مچھلی پیش کی گئی۔ ایک روز ایک انڈہ ابالا گیا جسے چھ افراد نے کھا کر دعوت کا لطف اٹھایا۔ کرنل کوپر کو اس کی بیوی نے اس کے جنم دن پر آبدوز کے ذریعے ایک گھڑی تحفے میں بھیجی جو کئی روز تک دوستوں کے درمیان مذاق کا باعث بنی رہی کیونکہ سرنگ اور کوریجیڈار میں وقت کا احساس ہی ختم ہو گیا تھا یا اگر تھا بھی تو اس کی رفتار بے حد سست تھی۔

کھانے کی میز پر ایک دن میں نے دوستوں سے کہا کہ آؤ ٹھنڈے دل سے جنگی صورت حال کا جائزہ لیں۔ میں نے واقعات کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا کہ پرل ہاربر پر حملے کے بعد ۷۔ دسمبر سے ۲۴۔ دسمبر ۱۹۴۱ء تک امریکی' صدمے سے نڈھال رہے۔ پھر وہ پرل ہاربر کی تعمیر نو میں مصروف ہو گئے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی توجہ بحرالکاہل کے ساحل اور نہر پانامہ کی ضروریات پر مرکوز کر دی۔ چرچل کے دورہ امریکہ سے انگلستان کی مدد بھی امریکہ کے لئے لازمی ہو گئی۔ ایسی صورت میں اپریل سے پہلے مشرق بعید میں کمک پہنچانا امریکہ کے لئے ناممکن ہے۔

اسی روز میں نے اپنے نشریے میں بٹان کے جنگلوں اور مورچوں میں بیٹھے محصور نوجوانوں کو ہمت و جرات سے ڈٹے رہنے کا پیغام دیتے ہوئے انہیں بتایا کہ کمک جلد آ رہی ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس امید کے سوا اور کچھ تھا بھی نہیں۔

☆☆☆

۱۹۴۲ء کا موسم گرما فلپائن کے جزائر میں بڑا

شدید تھا۔ گرمی یا بارش دونوں ہی، مورچوں میں بیٹھے فوجی لڑکوں کے لئے عذاب تھیں۔ ان تکلیف دہ حالات میں ان کے پژمردہ چہروں پر ایک ہی سوال تھا: "کمک کب آ رہی ہے؟"

میں انہیں بتا رہا تھا کہ ناکہ بندی کے باوجود ہماری چھوٹی کشتیاں آ جا رہی ہیں اور ہمارے چھوٹے جہاز بٹان سے منڈاناؤ تک پروازیں کر رہے ہیں۔ انہی راستوں سے مدد آ سکتی ہے۔ یہ سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔۔ میرے اپنے ہی تجزیئے کے مطابق مدد آنے میں ابھی دیر تھی۔۔ اس لئے یہ جھوٹ تھا۔ لی گاپسی کا سفر اور صدر کیوزون کی روانگی۔ امریکی اخباری نمائندوں کی آمد۔۔۔ یہ سچ بھی تھا۔

ہمارے پاس کچھ جاپانی قیدی بھی تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں۔ وہ ہماری خوراک کو پرتعیش قرار دیتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کیسی خوراک کھاتے ہوں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر رینگ کر آگے بڑھتے تھے لیکن جاپانی، سانپوں کی طرح پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھتے۔ درختوں پر چڑھ کر وہ ٹہنیوں میں چھپ جاتے۔ انہیں استوائی خطہ اور اس جیسی آب و ہوا میں لڑنے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ نسبتاً" کم نقصان اٹھاتے اور زیادہ برداشت سے کام لیتے۔ شبخون مار دستوں کا ہر جاپانی خودکفیل تھا۔ ان کے پاس خوراک اور ادویات وغیرہ فرداً" فرداً" موجود تھیں۔ ہمارے تسخیر شدہ علاقوں سے وہ ہر چیز اٹھا لاتے۔ ہر جاپانی ڈویژن کے ساتھ گیشا لڑکیوں کی صورت میں طوائفوں کا ایک دستہ بھی ہوتا۔ ہمارے نوجوان ان کو طنزاً" "شاک ابزاربر" کہتے۔ غرض جاپانی ہر لحاظ سے مسلح، تیار اور ہم سے بہتر پوزیشن میں تھے۔

وہ ہمارے مرنے والے فوجیوں کی وردیاں پہن کر ہمیں دھوکا دیتے۔ ایسا ہی ایک جاپانی ہمارے فوجیوں کے ایک گروپ کو باتوں باتوں میں اپنی ایک مشین گن کی زد میں لے گیا۔ امریکی کیپٹن کے پیٹ میں گولی داغ دی گئی اور دونوں فلپائنی نوجوانوں نے زمین پر لیٹ کر جان بچائی۔ پھر انہوں نے بہروپئے جاپانی فوجی کو گولی مار دی اور مشین گن کے عملے کو گرفتار کر لیا۔ ایک فوجی کی تجہیز و تکفین ہم رومن کیتھولک طریقے سے کر رہے تھے تو معلوم ہوا کہ یہ تو جاپانی ہے۔ ہمارا ایک سکاؤٹ ہیلڈزو اگلے مورچوں پر تعینات تھا، اس نے تین فوجیوں کو فلپائنی وردی میں دیکھا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تو انہوں نے اسے گولی مار دی۔ وہ جاپانی اور فلپائنی خدوخال کی یکسانیت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ہمیں بھی ایسے مواقع مل جاتے تھے کہ جاپانیوں پر کاری ضرب لگائیں۔ ایک مرتبہ خلیج میں تیرتی ہوئی بہت سی بوتلیں ملیں جن کے ذریعے جاپانیوں نے اپنے پیچھے رہ جانے والے دستے کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ فلاں وقت اور فلاں دن اگلا لوما پہنچ جائیں، وہاں ان کو جاپانی کشتیاں لینے آ جائیں گی۔ ہم نے یہ پیغام پڑھ کر بوتلوں کو بہنے دیا اور مقررہ دن جاپانی کشتیاں اور فوجی ہماری توپوں نے سمیٹ لئے۔

ہمارے مقامی باشندے بھی اکا دکا جاپانیوں کو پکڑ لیتے اور انہیں بانس کے پنجروں میں بند کر کے رکھتے۔ اس قسم کے واقعات کا پتہ ہمیں اس وقت چلا جب ہمارے جنگلی باشندے جاپانی فوجیوں کا سامان اور کپڑے بیچنے ہمارے کیمپوں کے

قریب آئے۔ اگلا لوما سے گرفتار ہونے والے جاپانی کمانڈو بھی ہماری طرح چیتھڑوں میں ملبوس تھے اور ہمارے پاس انہیں دینے کے لئے وردی نہ تھی۔ پھر بھی ہم نے انہیں اپنے سے بہتر حالات میں رکھا۔ ان کو ادویات بھی دے رہے تھے اور طبی امداد بھی۔۔ آپریشن کی میز پر لیٹے ایک زخمی جاپانی قیدی نے میری طرف دیکھ کر اپنے پیٹ پہ ہاتھ پھیرا۔ ہماری طرح وہ بھی بھوکا تھا۔ نرس دوڑ کر اس کے لئے ابلے ہوئے چاول لائی جو ہمارے حصے سے زیادہ تھے۔ انہیں جنگ کے مقاصد کا کوئی علم نہ تھا اور وہ عظیم ایشیا کی جاپانی تحریک سے بھی ناواقف تھے۔ انہیں تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ فلپائن سے امریکی سؤر جاچکے ہیں اور فلپائنی لوگ ان کے لئے چشم براہ ہیں۔

بتان میں جنرل ہنری جارج فضائیہ کے تین ہزار پریشان حال اور افسردہ نوجوانوں کے ساتھ ہوائی مستقر کی تعمیر نئے سرے سے کروا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کل کلاں جب امریکی طیارے کمک کے طور پر آئیں تو ان کے اترنے کے لئے میدان صاف اور ہموار ہو۔ اسی مستقر پر جاپانی بمباروں نے امریکی فضائیہ کو تہس نہس کیا تھا۔ اب ایسے انداز میں تیاریاں کی جارہی تھیں کہ امریکی جہاز آئیں تو ان کو کسی قسم کا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ آئیں گے جبکہ جاپانی پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ امریکیوں کے پاس جہاز ہیں ہی نہیں تو آئیں گے کہاں سے۔ ہم اڑتے ہوئے جاپانی جہازوں کو کے لہرا لہرا کر سبق سکھانے کی دھمکیاں دیتے اور وہ مزید جاپانی چھاتہ بردار پہاڑیوں پر اتار کر واپس چلے جاتے۔

میکارتھر کا خیال تھا کہ ہم اس وقت تک دفاعی انداز میں جنگ کرتے رہیں گے جب تک کمک نہیں آ جاتی۔ وہ جنگ کو ایسی شکل دے رہا تھا کہ اس کا ہر اقدام جاپان کے لئے طمانچہ ثابت ہوتا۔ اس کے الفاظ میں اس قدر اثر تھا کہ بددل ہونے والے فوجی اس کی بات سن کر تازہ دم ہو جاتے۔ بتان کی پہاڑیوں میں میکارتھر نے جنرل ہوما کی فوجوں کو اپنی جنگی چالیں آزما کر ایک کے مقابلے میں آٹھ جاپانیوں کی شرح سے تباہ کیا تھا۔ اس کے بعض اقدامات معجزات سے کم نہ تھے۔ اس کا ایک معجزہ تو وہ چال تھا جو اس نے منیلا چھوڑنے سے پہلے خلیج لنگاین میں بچھایا تھا۔ دوسرا معجزہ یہ تھا کہ اس نے چاروں طرف سے گھری ہوئی فوج کو آہستہ آہستہ جزیرہ نما بتان میں اکٹھا کر لیا تھا۔ تیسرا وہ تھا جس میں ہوما کی فوجیں "ابوکے" میں گھر کر تباہی سے دوچار ہوئی تھیں۔

بتان میں ہمارے دائیں جانب دشمن ہمیں تباہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ ہوما نے ان کو مرتے دم تک لڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور اب لاکھوں کی تعداد میں جاپانی ہمارے بائیں بازو کو تباہ کرنے کے لئے چڑھ آئے تھے۔ اس تباہ کن صورت حال میں ایک ہی راستہ تھا۔ میکارتھر نے اپنی محفوظ فوج کو دائیں بازو کی حفاظت کا حکم دیا۔ ان سے کہا کہ وہ جاپانیوں کو کچلتے ہوئے آگے نکل جائیں اور پھر گھوم کر بائیں بازو پر چڑھ آنے والی جاپانی فوج کے عقب میں چلے آئیں۔ جیسے میکارتھر نے سوچا تھا ویسے ہی ہوا۔ جاپانیوں کو گھر جانے کی صورت حال کا اندازہ تک نہ تھا۔ ہماری محفوظ فوج دائیں بازو پر جاپانی فوج کی صفیں کاٹتے ہوئے نکل گئی۔

جاپانیوں نے بھی ان کو نکل جانے دیا اور خود بھی ان کو نکل جانے دیا اور خود میدان خالی پا کر آگے بڑھے۔ لیکن جب ہماری محفوظ فوج گھوم کر بائیں طرف کی یلغار روکنے کے لئے عقب میں پہنچی تو جاپانی حیران رہ گئے۔ ان کی توجہ اپنے عقب کی طرف مرکوز ہو گئی جبکہ دائیں بازو پر تعینات اتحادی فوج نے اس طرف سے بڑھنے والی جاپانی فوج کا راستہ روک کر اسے تباہی سے دوچار کر دیا۔

یہ میکارتھر کا چوتھا معجزہ تھا۔

ہم بٹان کو سنبھالے ہوئے تھے۔ مقبوضہ علاقوں میں گوریلوں نے جاپانیوں کو ششدر کر دیا تھا اور آزاد علاقوں میں میکارتھر مورچہ بندی کروا رہا تھا۔

امریکی، عورت کو اپنا ساتھی اور دوست سمجھتے ہیں۔ فلپائنی، عورت کو مرد سے برتر خیال کرتے اور ایک قسم کی دیوی کا درجہ دیتے ہیں لیکن جاپانی، عورت کو لونڈی اور عیاشی کی شے سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں ہماری عورتوں کا بھی کوئی مقام نہ تھا۔ کالم پٹ نامی گاؤں میں جاپانیوں نے وہاں کی عورتوں سے جو سلوک کیا اس کی خبریں جنگ کے باوجود تمام جزیرہ نما میں پھیل گئی تھیں۔ اسی طرح آرلینڈا نامی لڑکی سے جاپانی فوجیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا تھا اس کی تفصیل سن کر ہر شخص کانپ گیا تھا۔ وہ بٹان میں پناہ گزین ہونے کے لئے آ رہی تھی کہ جاپانیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے اپنے قصبے میں خوبصورتی کا مقابلہ جیتا تھا اور جنگ سے پہلے وہ اخبارات کا موضوع رہی تھی۔ اور اب جاپانیوں کے ہاتھوں اس کی آبروریزی اور موت کی خبر سینہ بہ سینہ ہر فلپائنی تک پہنچ گئی تھی۔

جنگ کے مارے پناہ گزینوں کی حالت بھی خوفناک تھی۔ دیہاتی عورتوں کے پیٹوں پر سنگینوں کے زخم تھے۔ ناتواں کمزور لڑکیوں کے نازک حصوں پر تشدد کی علامات تھیں۔ بموں کے دھماکوں سے دہشت زدہ، زبان کٹے اور بہرے ہو جانے والے بچے تھے۔ نہ چل سکنے والے نیم مردہ زخمیوں کو بانس کے سٹریچروں پر ڈالے بھوکے، نڈھال اور یاس و حسرت کے مجسمے روٹی اور علاج کی تلاش میں تھے لیکن ان کے زخم بگڑتے جا رہے تھے۔ ایسے مناظر کی تخلیق میں جاپان کے فوجیوں نے اپنی بہیمیت کی خوب خوب تشہیر کی تھی تاکہ دوسرے فلپائنی عبرت پکڑیں اور جاپان کے آگے گھٹنے ٹیک دیں لیکن شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ ان حرکات سے ان کے خلاف نفرت کا لاوا مزید بھڑک اٹھتا تھا۔

۴۔ مارچ کو میکارتھر نے مجھے اور کرنل ڈلر کو ایک خبر نشر کرنے کے لئے کہا۔ یہ خبر میرے نزدیک اس کا پانچواں معجزہ تھی۔۔ خبر یہ تھی:
"ایک اچانک ہوائی حملے میں ہم نے خلیج سوبک میں دشمن کا بحری اڈہ مع جہازوں، کشتیوں اور بحری فوج تباہ کر دیا ہے۔" میں نے اور کرنل ڈلر نے نظریں ملائیں جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ ہوائی حملہ کیسے ہوا۔ میکارتھر کے پاس جہاز کہاں سے آئے۔ بٹان میں تو صرف چار پی۔۴۰ خفیہ طور پر رکھے گئے تھے۔ خبر کا آخری حصہ تھا: "جاپانی جنرل اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گئے ہیں اور اب ان کی کارروائیاں فقط دفاعی اور بہت دھیمی ہو گئی ہیں۔"

اسی روز ٹوکیو ریڈیو نے خبر دی کہ چوبیس امریکی بمباروں نے خلیج سوبک میں ہمارے بحری اڈے پر حملہ کیا۔۔ "چوبیس طیارے!" میں نے

سوچا۔ "اتنے طیاروں سے تو میکارتھر سارے فلپائن کا دفاع کر سکتا تھا۔ یہ اس نے کہاں چھپا رکھے تھے؟" بعد میں علم ہوا کہ میکارتھر کے کہنے پر جنرل ہنری جارج نے تباہ شدہ سو امریکی طیاروں کے بچے کھچے اجزا جوڑ کر چوبیس طیارے تیار کر لئے تھے اور انہوں نے نقائص کے باوجود اپنی پہلی پرواز ہی میں دشمن پر کاری ضرب لگائی تھی۔ ایک تیرتی ہوئی لائف بیلٹ پر "یو ایس ایس میرٹ" لکھا ہوا تھا جس سے پتہ چلا کہ جاپانیوں کے تباہ ہونے والے بحری جہازوں میں وہ جہاز بھی شامل تھا جو امریکیوں نے جاپان میں آنے والے تباہ کن زلزلے کے متاثرین کے لئے ادویات بھر کر خیر سگالی کے طور پر ٹوکیو بھیجا تھا۔

بموں کے ٹکڑے جن سے ہمارے نوجوان زخمی ہوتے تھے وہ یادگار کے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔ ایسے ہی ایک ٹکڑے پر "مشیگن' یو ایس اے" لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ بم اس لوہے سے بنایا گیا تھا جو جاپان نے جنگ سے قبل سکریپ کی صورت میں امریکہ سے خریدا تھا۔۔۔ "از ماست کہ بر ماست" والی مثال تھی۔

فل امریکن ۔۔ ایک ایسا مرکب لفظ فلپائن اور امریکہ کی دوستی کے نتیجے میں وضع ہو گیا تھا جسے جاپانی پروپیگنڈہ باز توڑنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان دو لفظوں کی دوستی دراصل دو نسلوں اور دو قوموں کی دوستی تھی جس کی بنیاد خلوص پر رکھی گئی تھی۔

۶ مارچ کو میکارتھر "فل امریکن" کا لفظ دہرا دہرا کر باتیں کرتا رہا۔ (جاری ہے)

☆☆☆



☆ دنیا نیکوں ہی کے لئے نہیں' اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کی بہت کچھ رونق انہی کے دم سے ہے۔ مدبرین اور سیاست دانوں کو طرح طرح کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور قسم قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی ایسا وقت آ پڑتا ہے کہ بدمعاشوں سے کام لئے بغیر چارہ نہیں ہوتا لیکن کمال تدبر اس میں ہے کہ ان سے کام لیا جائے' انہیں حاوی ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

☆ زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اپنوں میں سے کسی کی نام وری اور کامیابی نہیں دیکھ سکتے' وہ بڑھتے ہوئے کو گراتا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں انہیں خوشی ہوتی ہے۔ کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے ہی سے ان کا کلیجا ٹھنڈا ہوتا ہے۔

☆ کار زار دنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں' زخم بھی کھانے پڑتے ہیں اور سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لئے تیار نہیں' اس کے لئے پسپا ہو جانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہئے۔

☆ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی' نیکی اور حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

☆ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام' کام نہیں بیگار ہے۔

☆ نیکی اسی وقت نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا نیکی' نیکی نہیں رہتی۔

(بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

کریٹ کا ہیرو

وہ فوجی تربیت میں سب سے پھسڈی تھا، مگر اُس نے برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اعزاز دو مرتبہ حاصل کیا۔ اس کی داستان میں قدم قدم پر جنگی چالیں آشکارا ہوتی ہیں۔



"جنرل، میں مسلسل ایک گھنٹے سے ان کاغذات کا مطالعہ کر رہا ہوں، یہ نیوزی لینڈ ڈویژن کے ان جوانوں سے متعلق ہیں جن کے لیے آپ نے مختلف اعزازات کی سفارش کی ہے۔ آپ کو یقیناً یاد ہو گا ان میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کو چند ہفتے پہلے میں خود اپنے ہاتھ سے وکٹوریہ کراس لگا چکا ہوں۔ اب اس کے لیے ایک اور وکٹوریہ کراس کی سفارش کی گئی ہے۔"

ہز میجسٹی جارج ششم نے بکنگھم پیلس میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے میجر جنرل ہاورڈ کیتھ برگر سے کہا۔ یہ ستمبر ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فاتح اتحادی افواج کے کچھ دستے لندن میں مقیم اپنے اپنے ملک جانے کے لیے بحری جہازوں کا انتظار کر رہے تھے۔ انہی میں نیوزی لینڈ کا وہ ڈویژن بھی تھا جس کے کئی جانباز جوانوں نے مشرقِ وسطیٰ اور جزیرہ کریٹ میں غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا۔ میجر جنرل برگر اس ڈویژن کے کمانڈر تھے۔ وہ خود ان معرکوں میں اپنے جوانوں کے ساتھ رہے تھے۔ انہیں جارج ششم نے بطورِ خاص طلب کیا تھا۔

جنرل برگر نے ہز میجسٹی کے استفسار کا جواب سر جھکا کر دیا۔ جارج ششم قدرے توقف کے بعد بولے:

"جنرل، تم جانتے ہو، دوبارہ وکٹوریہ کراس بہت کم جوانوں کو دیا گیا ہے۔ گزشتہ ۹۰ سال کی طویل مدت میں صرف دو جوان اس اعزاز کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔" پھر معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا: "کیا تمہاری رائے میں یہ جوان واقعی دوسرے وکٹوریہ کراس کا مستحق ہے؟"

"جنابِ والا، میری رائے میں تو وہ کئی وکٹوریہ کراسوں کا مستحق ہے۔" جنرل برگر نے دوٹوک جواب دیا۔

"بہت اچھا۔" جارج ششم نے کہا اور جنرل برگر رخصت ہو گئے۔

اگلے روز برطانوی اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ خبر دی: "نیوزی لینڈ کے ایک انفنٹری افسر کو دوسرے وکٹوریہ کراس سے نوازا گیا ہے۔" نیوزی لینڈ کے اس جیالے افسر کا نام کیپٹن چارلس ہزلٹ اوفام تھا۔

"انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا" کے صفحات بتاتے ہیں کہ ۱۸۵۶ء سے ۱۹۵۷ء تک صرف تین فوجیوں کو دوسری بار وکٹوریہ کراس مل سکا ہے۔ ان میں سے پہلے دو جوان فوج کے غیر لڑاکا دستوں سے متعلق تھے جب کہ کیپٹن اوفام ایک انفنٹری بٹالین سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا وکٹوریہ کراس پانے والوں میں کیپٹن اوفام پہلا شخص تھا جس نے میدانِ کارزار میں عملی حصہ لیا، دشمن کا نقصان کیا اور جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کر کے دوسری بار برطانیہ کا اعلیٰ ترین جنگی تمغہ حاصل کیا۔ مزید برآں یہ کہ مشکلات اور خطرات کے سیلِ بے پناہ کے باوجود وہ موت کے نرغے سے بچ نکلا۔

کیپٹن چارلس اوفام نیوزی لینڈ کے معروف قصبے کرائسٹ چرچ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ شہر کا نامور وکیل تھا، وہ اپنے بیٹے کو بھی وکیل بنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اوفام ابھی تحصیلِ علم کے مراحل طے کر رہا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور دوسرے بہت سے نوجوانوں کے ساتھ وہ بھی فوج میں بھرتی ہو گیا۔

ابتدائی تربیت کے بعد اوفام کو ایک انفنٹری بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ پریڈ، ڈسپلن اور چال ڈھال (TURN - OUT) میں وہ تقریباً پھسڈی تھا، البتہ اس کی حاضر جوابی، خود اعتمادی، پھرتی اور متانت سے افسرانِ بالا بھی متاثر تھے۔ چند ماہ بعد اسے ترقی دے کر سارجنٹ بنا دیا گیا۔ اوفام نے اپنے نئے فرائض بڑی ذمہ داری اور فرض شناسی سے انجام دیے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اس کا نام کمیشن کے لیے بھیج دیا۔ آفیسرز ٹریننگ یونٹ میں بھی اوفام نے پھسڈی پن ہی کا مظاہرہ کیا، البتہ دستی بم پھینکنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ان سے گیند کی طرح کھیلتا اور اس کے ساتھی اس کھیل کو دیکھ کر

سُن عش کر اُٹھتے۔ کورس کی تکمیل پر کامیاب کیڈٹوں کی فہرست میں اوخام کا نام سب سے نیچے تھا۔ اس وقت کسے گمان ہو سکتا تھا کہ سکول کی تربیت میں سب سے پھسڈی رہنے والا لیفٹیننٹ عملی جنگ میں اپنے سب ساتھیوں سے سبقت لے جائے گا۔

اوخام اگست ۱۹۴۰ء میں ٹریننگ یونٹ سے لیفٹیننٹ بن کر نکلا۔ اس عرصے میں نازی افواج پولینڈ، بلجیم، ناروے، ہالینڈ، ڈنمارک اور فرانس جیسے عظیم الشان ملکوں کو پامال کر چکی تھیں اور بلغاریہ اور ہنگری کو زیر نگیں کر کے یوگوسلاویہ اور یونان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ۶ر اپریل ۴۱ء کو وہ ان دو ننھی منی ریاستوں پر طوفانِ برق و باراں بن کر ٹوٹ پڑیں۔ جس سیلِ بے پناہ کے آگے فرانس ایسا عظیم ملک نہ ٹھہر سکا تھا، یہ چھوٹے سے ملک کیسے ٹِک سکتے تھے۔ ۱۲ر اپریل کو یوگوسلاویہ کی طاقت نے دم توڑ دیا اور یونانی بھی جو گزشتہ چھ ماہ سے اطالوی فوجوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے، جرمن فیلڈ مارشل لسٹ کی بارھویں آرمی کے پندرھویں ڈویژن کے سامنے پرِ کاہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ نے یونان کی امداد کے لیے چار ڈویژن بھیجے لیکن جرمن طیاروں اور ٹینکوں نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ جرمن فاتحین نے ۲۷ر اپریل ۴۱ء کو یونانی تہذیب کے قدیم مرکز ایتھنز پر سواستیکا لہرا دیا۔ یونان پر جرمنی کے تسلط سے برطانیہ کو مشرقِ قریب، مصر، ہندوستان اور دیگر ممالک ہاتھ سے نکلتے دکھائی دیے۔

فتحِ یونان کے بعد نازی افواج نے مصر کا رُخ کیا۔ اتحادیوں نے نہر سویز اور مصر کو بچانے کے لیے آس پاس کے تمام محاذوں سے دستے جمع کر کے مصر روانہ کیے۔ ۴۰ ہزار کا ایک لشکر جس میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، یونان اور دیگر اتحادی اقوام کے دستے شامل تھے، یونان سے مصر جاتا ہوا جزیرۂ کریٹ میں اُترنے پر مجبور ہو گیا اور پھر جرمن بمباروں نے اس کی نقل و حرکت ناممکن بنا دی۔ جزیرۂ کریٹ کو اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے خاص جنگی اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے اتحادیوں کی سپریم وار کونسل نے اسے ہر قیمت پر نازی تسلط سے بچانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کریٹ کے دفاع کی ذمہ داری اسی بھنبھیری فوج پر ڈال دی گئی۔

یہ لشکر ایک بڑی عددی قوت کا مالک تو ضرور تھا لیکن جنگی نقطۂ نظر سے ثانوی درجے کا لشکر تھا۔ اس فوج میں جو دستے شامل تھے، ان میں سے اکثر کا اسلحہ، کپڑے، سامانِ جنگ اور دیگر اشیائے ضرورت مصر پہنچ چکی تھیں۔ اس میں ایسے یونٹ بھی موجود تھے جو فنونِ جنگ اور آلاتِ حرب سے یکسر ناآشنا تھے۔ انہیں ہنگامی حالات میں بھرتی کر کے چند ہفتے کی ٹریننگ کے بعد جنگ کے شعلوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ متعدد دستے ایسے بھی تھے جن میں توپچیوں کے فرائض انفنٹری کے سپاہی، ڈرائیور اور لانگری انجام دے رہے تھے۔ جنگی وسائل کی قلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ توپچی موجود تھے اور توپیں غائب تھیں۔ چند ایک جو مارٹر اور توپیں تھیں ان کی میں بلیٹس اور ترائی پاٹ ناپید تھے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ توپ خانے کے پاس دُوربینیں تک نہ تھیں۔ سگنل مین تھے لیکن پیغام رسانی کے لیے تار اور وائرلیس سیٹ نہ تھے، ڈرائیور تھے لیکن اکثر یونٹوں کے پاس ٹرانسپورٹ کے لیے ایک گاڑی بھی نہ تھی۔ انتہا یہ کہ جوانوں کے پاس مورچے کھودنے کے لیے کدال اور بیلچے بھی ناکافی تھے، چنانچہ انہیں سنگینوں سے کام لینا پڑا۔ خوراک اور پوشاک کا انتظام بھی تسلی بخش نہ تھا۔ ساحلِ بحر قریب ہونے کی وجہ سے رات کو شدید سردی ہوتی تھی لیکن فوجیوں کے پاس بستر اور کمبل تک پورے نہ تھے۔ اکثر دو دو تین تین جوان ایک کمبل میں رات گزارتے تھے۔

اس بے سروسامان فوج کی کمان نیوزی لینڈ ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل فری برگ (FREYBERG) کو سونپی گئی۔ اس نے حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق یہ ذمہ داری قبول تو کر لی تھی، مگر وہ خوب جانتا تھا کہ یہ بے سروسامان لشکر کریٹ کی طرف بڑھنے والے نازی سیلاب کے آگے بند نہیں باندھ سکتا۔ اس نے حالات کی سنگینی کا جائزہ لے کر یکم مئی ۱۹۴۱ء کو اپنی حکومت کو

تار دیا :

"لندن میں اتحادی ہائی کمان نے کریٹ کو ہر حالت میں بچانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن بھرپور فضائی اور بحری امداد کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا"۔

اس کے بعد اس جنگی ساز و سامان کا تفصیل سے ذکر تھا، جو اس فوج کے پاس تھا۔ آخر میں لکھا تھا "میں محسوس کرتا ہوں ان حالات میں یونان کی طرح یہاں بھی جنگ کا نتیجہ ہمارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ اس لیے لندن والوں پر زور دیں کہ یا تو ہمیں سامانِ رسد مہیا کیا جائے یا اس فیصلے پر نظرِ ثانی کی جائے"۔

نیوزی لینڈ کے وزیرِ اعظم نے فوراً چرچل کو حالات کی نزاکت سے مطلع کیا، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملا —— مڈل ایسٹ کمان کا انچارج جنرل ویول (جو بعد میں متحدہ ہندوستان کا وائسرائے بنا) نے اپنے طور پر کریٹ والوں کے لیے امدادی سامان روانہ کیا، مگر اسے جرمن طیاروں نے راستے ہی میں تباہ کر دیا۔ مجبوراً جنرل فری برگ کو بے سرو سامانی کے عالم ہی میں جرمن یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔

جزیرہ کریٹ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مقامِ اتصال (بحرِ روم) کے قریب واقع ہے۔ جرمنوں سے اس کی غیر معمولی جنگی اہمیت مخفی نہ تھی، چنانچہ یونان فتح کرنے کے بعد جرمن افواج جنرل سٹوڈنٹ کی کمان میں کریٹ کی طرف بڑھیں۔ کریٹ پر حملے کا آغاز یکم مئی ۱۹۴۱ء کو ہوا۔ وسط مئی تک اس حملے میں شدت پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں جاسوسوں نے خبر دی کہ جرمن فوجیں بہت جلد فیصلہ کن حملہ کرنے والی ہیں۔ حملے سے پہلے وہ ارد گرد کی فضا گولوں کے دھوئیں سے تاریک کر دیں گی۔

۲۰ مئی کو متوقع حملہ شروع ہو گیا۔ کریٹ کی یہ جنگ نو دن تک ہوتی رہی، لیکن دراصل اتحادی پہلے ہی دن ہار چکے تھے۔ بلاشبہ جنرل فری برگ کریٹ کو نہ بچا سکا، لیکن اس فوج کے کئی بہادروں نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے۔ انہی بہادروں میں چارلس اوفام بھی تھا۔

نیوزی لینڈ ڈویژن کو اس دس میل لمبے علاقے کا دفاع سونپا گیا جو شمالی ساحل کی بندرگاہ کینیا سے لے کر کریٹ کے اہم ترین ہوائی اڈے مالم (MALEME) تک پھیلا ہوا تھا۔ اوفام کی پلاٹون، بریگیڈ نمبر ۴ کی بیسویں بٹالین کی سی کمپنی کا ایک حصہ تھی۔ ۲۰ مئی کو علی الصبح منہ اندھیرے حسبِ معمول جرمن طیاروں نے بمباری کی اور غائب ہو گئے۔ لوگ ناشتہ کرنے بیٹھے تو ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ خبر رسانوں نے "جس بڑے وقت" کی خبر دی تھی، وہ آن پہنچا ہے۔ اتحادی ناؤ نوش ہی میں مشغول تھے کہ پونے آٹھ بجے جرمن بمبار دوبارہ فضا میں نمودار ہوئے اور زبردست بمباری کی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ پھر نئی قسم کے طیارے قلابازیاں کھاتے ہوئے آئے اور چار پانچ سو فٹ کی بلندی سے چھاتہ برداروں کے غول کے غول اترنے لگے۔ نیوزی لینڈ ڈویژن ان کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس کے جوانوں نے رائفلوں، توپوں اور برین گنوں کے برسٹ مار کر ہزاروں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔

اچانک سی کمپنی کمانڈر کی طرف سے لیفٹیننٹ اوفام کو پیغام ملا: "بریگیڈ نمبر ۴ کی بٹالین نمبر ۲۱ اور ۱۹ کے درمیان کچھ چھاتہ بردار اترے ہیں، ان کا خاتمہ کر دو"۔

اوفام اپنے ساتھ چند جوانوں کو لے کر نشان کردہ مقام پر پہنچا اور وہاں جوکھوں میں ڈال کر جرمنوں پر دستی بم برسانے شروع کر دیے۔ بموں کی بوچھاڑ اتنی شدید تھی کہ جرمنوں کے لیے فرار کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ علاقہ صاف ہو گیا۔

کینیا کے قرب و جوار کے علاوہ جرمن چھاتہ بردار دو اور مقامات پر بھی بھاری تعداد میں اترے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ تعداد پانچویں بریگیڈ کی بٹالین ۲۲ کے زیرِ تحفظ علاقے میں تھی۔ ایک بڑا گروپ مالم ہوائی اڈے کے مغرب میں جمع

ہو چکا تھا جس میں دن بھر اضافہ ہوتا رہا۔ کریٹ میں مالم کو مرکزی اہمیت حاصل تھی، اس پر قبضہ پورے مغربی کریٹ پر قبضے کے مترادف تھا۔ اس علاقے میں متعین دستوں نے ان کا زور توڑنا چاہا، مگر جرمن طیارے بے پناہ بمباری کر رہے تھے، چنانچہ ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ دوپہر تک جرمنوں نے اتحادیوں کے مواصلات کے سلسلے کو درہم برہم کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ڈویژن، بریگیڈ اور بٹالینوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہ رہا۔ اب جو جہاں تھا، صورتِ حال سے بے خبر اندھیرے میں تھا۔

ہوائی اڈے پر نازی افواج کے بڑھتے ہوئے اجتماع کو منتشر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بریگیڈ نمبر ۴ یا نمبر ۵ جوابی حملہ کرے۔ بریگیڈ نمبر ۵ بڑی نازک پوزیشن میں تھا، اس لیے بریگیڈ نمبر ۴ کے کمانڈر بریگیڈیئر انگلس نے اپنے جوانوں کو تیار ہونے کا حکم دیا اور خود ہائی کمان سے جوابی حملے کی فوری اجازت مانگی۔ ذرا سی تاخیر بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

ادھر فورس ہیڈ کوارٹر کو خبر مل چکی تھی کہ دشمن نے کریٹ کے دو اڈوں ریتھیمو اور ہیراک لائن کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے اور دباؤ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان اڈوں کو بچانا نہایت ضروری تھا۔ پھر ہائی کمان کے خیال میں بریگیڈ نمبر ۴ کو اس کی جگہ سے ہٹانا سخت نقصان دہ تھا۔ دشمن اس کی پوزیشن پر بآسانی قابض ہو جاتا، چنانچہ ہائی کمان نے بریگیڈیئر انگلس کو جوابی حملے کی اجازت نہ دی۔

یہ حکم سنتے ہی انگلس کے بریگیڈ میجر نے کہا "پھر ہم کریٹ نہیں بچا سکتے، نہیں بچا سکتے۔"

انگلس نے اس کی تائید کی: "بے شک، بے شک۔"

جنگ ختم ہونے کے بعد بریگیڈیئر انگلس نے جرمن افواج کے کمانڈر جنرل سٹوڈنٹ سے انٹرویو لیا۔ بریگیڈیئر نے پوچھا:
"اگر ۲۰ مئی کو میں جوابی حملہ کر دیتا، تو جنگ کا نتیجہ کیا ہوتا؟"

جنرل سٹوڈنٹ نے برملا جواب دیا:

"اگر اس روز تمہاری طرف سے حملہ ہو جاتا، تو میں ہرگز کریٹ کو فتح نہ کر سکتا۔ تمہارے یونٹوں نے ہمارے چھاتہ برداروں کو زمین پر قدم رکھتے ہی گولیوں کا نشانہ بنا لیا تھا اور ہم نہایت سراسیمہ اور خوف زدہ ہو چکے تھے۔ تمہاری اس کارروائی کے پیشِ نظر ہمیں امید تھی کہ ہم پر جوابی حملہ ضرور ہو گا، چنانچہ ہم سارا دن انتظار کرتے رہے، لیکن جب حملہ نہ ہوا، تو بڑے حیران ہوئے۔"

جنرل سٹوڈنٹ کے اس اعترافِ حقیقت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ۲۰ مئی کو اتحادیوں کی طرف سے حملے کا التوا بہت بڑی جنگی غلطی تھی۔ اس نے جرمنوں کے حوصلے بلند کر دیے، اگلے دن یعنی ۲۱ مئی کو بھاری کمک پہنچ گئی۔ ہر تین منٹ کے بعد ایک جہاز اترنے لگا اور پورے علاقے پر نازی چھا گئے۔

اب فورس ہیڈ کوارٹر کی آنکھیں کھلیں، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ نازی افواج نے کینیا پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا بروقت پتہ چل گیا، چنانچہ اتحادیوں نے مالم حاصل کرنے کے لیے فوری جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

او فام کی بٹالین نمبر ۲۰ اور نیوزی لینڈ ڈویژن کی مشہور اور بہترین تربیت یافتہ بٹالین نمبر ۲۸ کو حکم ملا کہ وہ دونوں سورج غروب ہوتے ہی پلیٹنے نیاس کے قریب نقطۂ آغاز (START LINE) پر پہنچ جائیں۔ علاقے کا جائزہ لیں، دشمن کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کریں اور ایک نئے پیش قدمی شروع کر دیں۔ پیش قدمی کی رفتار ایسی ہو کہ صبحِ صادق سے پہلے پہلے چار میل کا فاصلہ طے کر کے مالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں ورنہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی جرمن طوفان انہیں ہڑپ کر جائے گا۔ نمبر ۲۰ بٹالین کے کرنل جے۔ ٹی۔ بروز کو اس مہم کا انچارج مقرر کیا گیا۔

نمبر ۲۰ بٹالین کے پاس اپنی کوئی گاڑی نہ تھی۔ اسے ہدایت

کی گئی کہ وہ رات کو آٹھ بجے اس وقت روانہ ہو جب ایک آسٹریلوی بٹالین اس کی جگہ لینے کے لیے آجائے اور اس سے گاڑیاں لے کر کام چلائے۔

۵۳ بٹالین رات کا اندھیرا چھاتے ہی چل کھڑی ہوئی۔ اور نقطۂ آغاز پر پہنچ گئی۔ ۵۳ بٹالین والوں نے اپنے کان آسٹریلوی کنوائے کی آواز پر لگا دیے۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ آٹھ، نو، حتیٰ کہ دس بج گئے، مگر آسٹریلوی یونٹ کی آمد کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ کرنل بروز سخت مضطرب ہو گیا۔ اسے صبح ہونے سے پہلے پہلے ایک نہایت اہم اور خطرناک فریضہ انجام دینا تھا اور رات کے قیمتی لمحات ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ گھڑی کی سوئی حرکت کرتی رہی۔ گیارہ سے بارہ اور بارہ سے ایک پر پہنچ گئی۔ پیش قدمی کا مقررہ وقت شروع ہو گیا۔ آخر جوانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، وہ پیدل چلنے اور بہر حال میں آگے بڑھنے پر اصرار کرنے لگے۔ اچانک آسٹریلوی یونٹ کی پہلی گاڑی کی آواز آئی، اس کے پیچھے دوسری، پھر تیسری، یہاں تک کہ چند منٹ کے اندر اندر ساری یونٹ پہنچ گئی، لیکن اس کی حالت سخت خراب اور پراگندہ تھی کیونکہ جونہی یہ لوگ اپنے مقام سے روانہ ہوئے جرمن توپوں نے گولہ باری شروع کر دی اور زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانے کے بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ جو گاڑیاں وہ اپنے ساتھ لائے ان میں بمشکل دو کمپنیاں (نصف بٹالین) سفر کر سکتی تھیں۔

آسٹریلوی دستے کے آتے ہی کرنل بروز کو حکم ملا: "جو دو کمپنیاں لے جا سکتے ہو، انھی کو لے کر ایڈوانس شروع کر دو۔ باقی تمہارے پیچھے پیچھے پہنچ جائیں گی۔"

کرنل بروز بے چون و چرا فوراً سی اور ڈی کمپنی کو لے کر خطِ آغاز پر پہنچ گیا اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے احکام طلب کیے۔ ان کے آتے آتے رات کا ایک اور قیمتی گھنٹہ گزر گیا۔ ایڈوانس کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ چار میل لمبے علاقے میں دشمن کی تعداد کتنی ہے؟ راستے میں کتنی توپیں اور مشین گنیں نصب ہیں؟ اور علاقے میں بچھی ہوئی بارودی سرنگوں سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ مگر اب ان باتوں کا وقت کہاں رہا تھا۔ معرکے کے بعد ایک انٹرویو میں کرنل بروز نے بتایا:

"ہم جانتے تھے کہ صبح صادق سے قبل ہوائی اڈے تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بھی خبر تھی کہ اس علاقے میں ہمارے جوانوں نے جو بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں انھیں نہیں نکال سکتے، تاہم ہمیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ حملہ ناگزیر ہے اور کریٹ کی قسمت کا فیصلہ اس حملے کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں دوبارہ ایسا سنہری موقع کبھی نہیں ملے گا۔"

بہر حال ساڑھے تین بجے ایڈوانس شروع ہوا۔ کرنل بروز نے آدھ گھنٹہ مزید اس انتظار میں گزار دیا کہ شاید باقی دو کمپنیاں بھی آجائیں، مگر وہ نہ آسکیں۔ لاچار بروز نے اپنی یونٹ کو کارروائی کا حکم دے دیا۔ ۵۳ بٹالین پہلے ہی سرگرم عمل ہو چکی تھی۔

رات نہایت تاریک تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ قدم قدم پر ندی، نالے، زیتون کے درختوں اور انگور کی بیلوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ فضا میں موت کا سناٹا طاری تھا، البتہ کبھی کبھی کسی ٹینک کے چلنے کی آواز اور کسی مشین گن کی تڑتڑ اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ دونوں یونٹیں ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ اچانک بندوق کا فائر ہوا۔ بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اور سرگوشیاں ہونے لگیں کہ یہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ ذرا سے وقفے کے بعد دوسری گولی چلی، پھر تیسری اور اس کے بعد بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ مشین گنوں کی تڑتڑ سے فضا گونجنے لگی۔ معاً روشنی کے گولے فضا میں بلند ہوئے، پورا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا اور نیوزی لینڈ کے دستے جرمنوں کو صاف نظر آنے لگے۔ پکی سڑک کے دونوں اطراف میں نصب شدہ مشین گنیں بھی حرکت میں آگئیں۔ لیفٹیننٹ اپھام کی پلاٹون دائیں طرف سب سے آگے تھی۔ پہلا برسٹ اس پر پڑا۔

"لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ" اوفام زور سے چلایا، مگر یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔ چار جوان ڈھیر ہو چکے تھے۔ پلاٹون کے سیکشن اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اب ہر سیکشن کمانڈر کو خود سوچنا تھا کہ اس کا سیکشن موجودہ مقام پر موت کے مُنہ سے بچ سکتا ہے یا کوئی بہتر پناہ گاہ تلاش کرنی چاہیے۔ مشین گن کے برسٹ سے بچنے کے لیے جوان پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ اوفام رینگتا ہوا باری باری ہر سیکشن میں پہنچا اور ضروری ہدایات دیں۔ اب تمام سیکشن ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور پھر اس گن کی طرف بڑھے جو گولیاں اُگل رہی تھی۔ اب مشین گن چالیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ اوفام نے پلاٹون کو کوَرِنگ فائر دینے کا حکم دیا اور خود ہاتھ پاؤں کے بل چلتے ہوئے اس درخت کی آڑ میں پہنچ گیا جس کے نیچے مشین گن نصب تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے یکے بعد دیگرے تین گرینیڈ دے مارے۔ اتنے میں اوفام کے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ دُھواں چھٹا اور گن کے پاس پہنچے، تو پتہ چلا یہاں ایک بڑی اور سات چھوٹی مشین گنیں نصب تھیں۔ ان سب کا اور ان کے چلانے والوں کا صفایا ہو چکا تھا۔

اوفام نے جوانوں سے کہا: "یہاں ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے آؤ ہم ان کا خاتمہ کریں۔"

صبح کا ذب کے دُھندلکے میں سڑک کے کنارے ایک مکان اور اس سے ملحق ایک چھپر نظر آیا۔ یہ لوگ پھُونک پھُونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ آناً فاناً روشنی کے دو گولے بلند ہوئے اور ساتھ ہی دو مشین گنیں حرکت میں آ گئیں۔ ان میں سے ایک مکان کی کھڑکی میں اور دوسری چھپر میں نصب تھی۔ نیوزی لینڈ کے جوان فوراً قریب ترین آڑ میں چلے گئے اور برین گنوں سے جوابی فائر کرنے لگے۔ چند منٹ کے بعد جرمن مشین گنیں خاموش ہو گئیں۔ اوفام حسبِ سابق کوَرِنگ فائر کے سائے میں مکان کی طرف بڑھتا چلا گیا اور پھر دروازے پر گرینیڈ دے مارا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں اوفام کے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ آٹھ نازی موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ باقی چھ نے ہتھیار ڈال دیے۔

اب یہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ قریب ہی ایک بستی ملی جس کے ہر گھر میں جرمن موجود تھے۔ یہاں دست بدست لڑائی ہوئی آخرِ کار جرمن بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اوفام اور اس کے ساتھیوں نے ایک ایک گھر سے دشمن کو نکالا۔ اس مہم میں بھی اوفام نے دستی بموں سے دشمن کو سخت نقصان پہنچایا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹرز کے قریب ایک خندق میں کئی جرمن گریلے چھپے ہوئے تھے۔ کرنل بروز نے ان کا صفایا کرنے کے لیے اوفام کی پلاٹون کو حکم دیا۔ اوفام نے یہاں بھی پُرانی چال سے کام لیا۔ پلاٹون کو کوَرِنگ فائر کا حکم دیا اور خود پیٹ کے بل رینگتا ہوا خندق کے کنارے تک پہنچا۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے گیارہ گرینیڈ خندق میں پھینکے اور تمام جرمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

اب رات کی سیاہی پوری طرح چھٹ چکی تھی اور اُجالا ہو چکا تھا۔ نیوزی لینڈ کے جوانوں نے قابلِ تعریف کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ راستے کے بے پناہ خطرات سے کھیلتے اور دشمن کو بھاری نقصان پہنچاتے ہوئے ہوائی اڈے کے نواح میں پہنچ گئے۔ حملے کا آغاز مقررہ وقت سے تین گھنٹے بعد شروع ہوا تھا اس لیے یہ لوگ اپنے مشن کو سو فیصد تو پورا نہ کر سکے، البتہ اس مختصر سے وقت میں انہوں نے سر فروشی، عزم و استقلال اور بہترین جنگی چالیں چلنے کا حیران کن مظاہرہ کیا۔ یہ جنگ آزمائی ۲۲ مئی کو صبح سات بجے تک جاری رہی۔ روشنی میں جرمنوں نے نقل و حرکت ناممکن بنا دی، تو مجبوراً کرنل بروز نے فائر بند کرا دیا۔

۲۲ مئی کی رات کرنل بروز کی بٹالین نے ایک ایسے علاقے میں گزاری جسے چاروں طرف سے دشمن نے گھیر رکھا تھا۔ صبح

پانچ بجے کرنل بروز کو حکم ملا "کینیا کے پاس اپنی سابقہ پوزیشن پر چلے جاؤ۔"

قدم قدم پر جرمن مزاحمت کو کچلتی ہوئی یہ بٹالین دس بجے پلیٹے نیاس پل کے قریب پہنچی۔ یہاں ایک زبردست جھڑپ ہوئی جس میں مارٹر کا گولہ لگنے سے اوفام کا بازو شدید زخمی ہوا، مگر وہ زخم کی پروا کیے بغیر ایک ہاتھ ہی سے لڑتا رہا۔

۲۵ مئی کو کریٹ کی لڑائی میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس روز مخبروں نے خبر دی کہ دشمن آج کسی وقت بھی زوردار حملہ کر سکتا ہے۔ کمانڈروں نے غیر معمولی تیاری کے بعد ۹ بجے جوابی حملے کا پروگرام بنایا۔ نمبر۲۰ بٹالین کی سی اور ڈی کمپنی کو فرنٹ لائن پر بھیج دیا گیا، لیکن جرمن فضائیہ کے ایک بھاری سکواڈرن نے ان لوگوں کی راہ مسدود کر دی۔ شام کے قریب جرمن حملہ شدت اختیار کر گیا۔ نیوزی لینڈ کی بٹالین نمبر۱۸ کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کی جگہ نمبر۲۰ بٹالین کی مذکورہ دو کمپنیوں نے سنبھالی جن میں لیفٹیننٹ اوفام کی پلاٹون بھی تھی۔ اوفام کا ایک بازو پہلے ہی بے کار ہو چکا تھا، آج کے مقابلے میں اس کی دائیں ٹانگ بھی زخمی ہو گئی، مگر وہ برابر داد شجاعت دیتا رہا۔ رات کے وقت دشمن کا دباؤ اور بڑھ گیا، چنانچہ بٹالین نمبر۲۰ پسپائی پر مجبور ہو گئی۔ واپسی پر اوفام نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔

______ اوفام درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا، تو سامنے تقریباً ایک سو گز طویل کھلا علاقہ تھا جسے پار کرنے کے لیے کوئی قدرتی آڑ نہ تھی۔ ناگہاں اس کی نظر دو جرمن گوریلوں پر پڑی، وہ درختوں کی اوٹ میں اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر اچانک دو گولیاں چلیں اوفام فوراً زمین پر دراز ہو گیا۔ ایک ہاتھ سر پر رکھا اور اس انداز سے ہچکی کھائی کہ جرمن سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ بزعم خویش اس کی لاش کی طرف بڑھے۔ ادھر اوفام گھاس میں لڑھکتا ہوا ایک درخت کی جڑ میں پہنچ گیا۔ رائفل اس کے پاس تھی جسے ایک ہاتھ سے چلانا نہایت مشکل ہوتا ہے، تاہم اس نے تندرست ہاتھ سے بندوق اٹھائی، اسے کاک کیا اور سیفٹی پکیچ آگے کر کے دشمن کا انتظار کرنے لگا۔ ایک گولی سے دونوں کو مارنا ممکن نہ تھا اور ایک ہاتھ سے دوبارہ رائفل کو لوڈ کرنے میں جتنی دیر لگتی ہے، اس میں دوسرا جرمن اسے ہلاک کر سکتا تھا، مگر اوفام بالکل ہراساں نہ ہوا۔ خاموش بیٹھا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ جرمن سپاہی آگے بڑھتے رہے اور ان کا درمیانی فاصلہ سمٹتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ صرف چھ گز دور رہ گئے۔ اب اوفام نے سوتے ہوئے شیر کی طرح انگڑائی لی اور انتہائی چابک دستی سے کام لیا۔ پہلے وار میں ایک کو ڈھیر کر دیا۔ دوسرا جرمن فائر کرنے والا ہی تھا کہ ادھر سے دوسری گولی نکلی اور اس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ ایک ہاتھ سے معذور اوفام نے دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ ان کی ہلکی مشین گنیں اٹھائیں اور اپنی پلاٹون سے آملا۔

جنگ کریٹ کے پورے عرصے میں وہ پیچش میں مبتلا رہا۔ اس کی خوراک بھی بہت گھٹ گئی۔ دو تین بار زخمی ہونے سے صحت بگڑ گئی۔ مسلسل کئی راتوں کی بے آرامی اور خستگی اس پر مستزاد تھی، مگر اس نے بڑی بہادری، تحمل مزاجی، اعلیٰ پائے کی قوت برداشت، ہوشیاری اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ذاتی کردار اور مثالی قیادت نے نہ صرف اس کی اپنی پلاٹون کو بلکہ پوری بٹالین کو نیا جوش اور ولولہ بخشا۔ اس معرکے میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر نیوزی لینڈ ڈویژن کے بہت سے افسروں اور جوانوں کو اعزازات اور اسناد ملیں۔ ان میں اوفام کا نام سرفہرست تھا۔ نمبر۲۰ بٹالین کے حصے میں سب سے زیادہ اعزاز آئے، چنانچہ پورے ڈویژن میں یہ ضرب المثل مشہور ہو گئی کہ "جسے وکٹوریہ کراس حاصل کرنا ہو، وہ نمبر۲۰ بٹالین میں چلا جائے۔"

یہ تھی پہلے کارنامے کی سرگزشت جس پر اوفام کو پہلی بار وکٹوریہ کراس دیا گیا۔ دوسرے کی داستان اس سے بھی زیادہ ولولہ انگیز اور جرأت آموز ہے۔ اس کی تفصیل جارج ششم کے

سامنے پیش کی جانے والی فائل میں یوں درج تھی :

"۲۰ جون سے ۱۵ جولائی ۱۹۴۴ء کے درمیانی عرصے میں کیپٹن چارلس ادفام نے پانچ موقعوں پر عدیم النظیر شجاعانہ کارنامے انجام دیئے۔ اس سارے عرصے میں اس کی کمپنی جہاں جہاں بھی لڑی، وہ ہر جگہ آگے آگے رہا۔ اگرچہ اس عرصے میں وہ تین بار زخمی بھی ہوا۔ اس نے ہر موقع پر عمدہ کارکردگی اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔

۲۷، ۲۸ جون ۱۹۴۴ء کی رات کو پچھلے پہر منقار قائم کے مقام پر جرمنوں نے نیوزی لینڈ ڈویژن کو گھیر لیا۔ ڈویژن نے جرمن افواج کے بیچوں بیچ راستہ بنا کر نکلنے کی کوشش کی۔ ادفام کی کمپنی نے اس کی قیادت میں اس مرحلے میں قابل تعریف کام کیا۔ چاندنی رات ہونے کے باوجود جان پر کھیل کر دشمن کی کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ ایک موقع پر ایک جرمن ٹرک ان کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ کیپٹن ادفام ایک کارپورل کو ساتھ لے کر اس کی طرف لپکا۔ جرمنوں نے ٹامی گن کا فائر کھول دیا، مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اچانک دستی بم کا دھماکا ہوا اور اگلے ہی لمحے ٹرک اپنے سواروں سمیت شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ گرینیڈ کے ٹکڑوں سے ادفام کے دونوں بازو زخمی ہو گئے، مگر اس نے کسی سے ذکر تک نہ کیا۔ اگلے دن جب اس کے ڈویژن نے ایک محفوظ مقام پر پڑاؤ کیا، تو اس نے مرہم پٹی کرائی۔

۱۴، ۱۵ جولائی کی درمیانی شب کو ادفام کی بٹالین نے الرویسات کی پہاڑی پر ہونے والے معرکے میں حصہ لیا۔ اس وقت یہ بٹالین چھ میل کے علاقے میں بکھرے ہوئے لشکر کی فرنٹ لائن سے قریباً دو میل پیچھے ریزرو ایریا میں تھی۔ وائرلیس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ کیپٹن ادفام کو حکم ملا کہ وہ اپنے کسی افسر کو جیپ میں بھیجے جو اگلی یونٹوں سے رابطہ قائم کر کے پچھلی یونٹوں کو ضروری معلومات بہم پہنچائے۔ ادفام نے کسی دوسرے افسر کو اس خطرناک مہم پر بھیجنے کے بجائے خود جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے جیپ ڈرائیور کو ساتھ لیا اور چل پڑا۔ راستے میں زخمی ہونے کے بعد اس نے دشمن کی ایک سپانڈو (SPANDAU) گن چھین لی۔ اسے جیپ میں نصب کر کے فائر کھول دیا۔ ڈرائیور جیپ چلاتا رہا اور وہ مسلسل فائرنگ کرتا ہوا لشکر کے اگلے حصے تک جا پہنچا۔ وہاں سے ضروری معلومات حاصل کیں اور واپس آکر پیچھے والوں کو مطلع کر دیا۔

طلوع صبح سے ذرا پہلے ریزرو بٹالین اور اینٹی ٹینک گن سیکشن کو ایک خاص مشن پر جانے کا حکم ملا۔ ان کے حرکت کرتے ہی دشمن نے ایک کمین گاہ سے مشین گنوں کے دہانے کھول دیئے۔ کیپٹن ادفام کی کمپنی سب سے آگے تھی۔ اس نے اپنے جوانوں کو پوزیشنیں لے کر مشین گنوں پر فائر کرنے کا حکم دے دیا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ایک گن تباہ کر دی گئی۔ اس کے چلانے والوں کو سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ ادفام اس حملے میں بذات خود شریک تھا۔ اس کی کہنی اور بازو پر شدید چوٹیں آئیں، لیکن جب تک باقی مشین گنیں ہمیشہ کے لیے خاموش نہ ہوئیں، وہاں موجود رہا۔ دوپہر کے بعد دشمن نے مارٹروں سے زبردست جوابی حملہ کیا جس میں ادفام کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو گئی اور وہ چلنے سے معذور ہو گیا۔ اسی دن یعنی ۱۵ جولائی کو اسے قید کر لیا گیا۔"

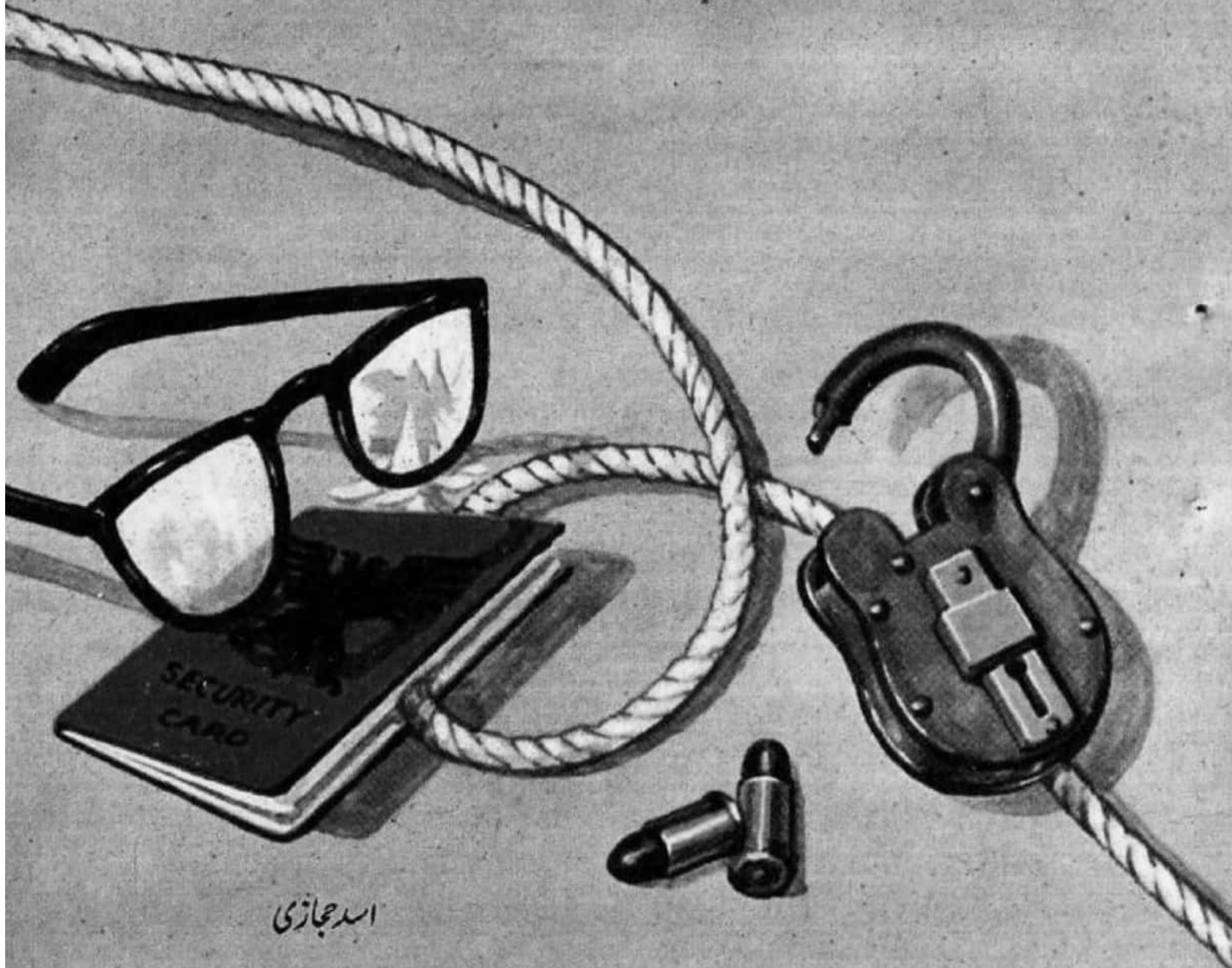
ادفام ۱۵ جولائی ۱۹۴۲ء سے ۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء تک جرمنوں کی قید میں رہا۔ اس عرصے میں اس نے دو تین بار فرار ہونے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۱۵ اپریل کو جب جرمن قیدی کیمپ پر اتحادیوں نے قبضہ کیا، تو اسے رہائی ملی۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۵ء کو ایک خصوصی تقریب میں جارج ششم نے اس کے سینے پر پہلا وکٹوریہ کراس لگایا۔ جون ۱۹۴۶ء میں دوسری بار اس اعزاز سے نوازا گیا، تو اخبارات نے شہ سرخیوں میں دنیا کو یہ خبر دی۔ ایک اخبار نے سرخی جمائی :

"آفیسرز ٹریننگ یونٹ میں سب سے پھسڈی رہنے والے جوان نے دو وکٹوریہ کراس حاصل کر لیے"

○○

سردی، بھوک، تنہائی، تھکن اور خوف، قید خانے سے انہیں یہی کچھ ملا۔ دوسری طرف بلند و بالا فصیلیں، چوکس پہریدار اور روشنیوں کے ہر آن پھٹتے ہوئے گولے ان کے راستے میں حائل تھے ——— اچانک انہیں ایک تجویز سُوجھی۔۔۔

کولڈز کیمپ سے فرار



۱۹۴۰ء میں چرچل کا بھتیجا گائلز رومیلی ڈیلی ایکسپریس کی طرف سے نارو ک پہنچا تاکہ ان برطانوی اور جرمن جہازوں کے متعلق جامع رپورٹ تیار کر سکے جو ایک ہی بندرگاہ میں لنگر انداز تھے۔ اسی روز جرمنی نے ناروے پر حملہ کر دیا۔ رومیلی کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اُس نے رُوپوش ہونے کی کوشش کی مگر دوسرے برطانوی افراد کے ساتھ دھر لیا گیا۔

اُسے پانچ ماہ تک باویریا کے مختلف جنگی کیمپوں میں نظر بند رکھا گیا اور اس پر انسانیت سوز مظالم توڑے گئے۔ گائلز کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے فرار ہونے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ پہلی بار اُس نے ایک عورت کا رُوپ دھارا اور کیمپ سے نکلنے کی کوشش کی جرمن محافظوں کو بروقت پتہ چل گیا، انہوں نے اس کا نقاب اُلٹ دیا۔ پسینے سے شرابور گائلز تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اُسے اٹھارہ دن تک تہہ خانے میں بند رکھا گیا اور پھر کولڈز کاسل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ قلعہ دوسری جنگِ عظیم کے بد نام زمانہ جنگی کیمپ فورٹ نمبر ۹ سے بھی بدتر تھا۔ یہاں پہنچتے ہی گائلز نے پھر بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ اب کے وہ ایک لکڑی کے صندوق میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ صندوق پر پتہ وغیرہ لکھ دیا گیا۔ یہ صندوق ریلوے اسٹیشن پر ہی پہنچایا گیا تھا کہ سانس گھٹنے کی بنا پر گائلز بے چین ہو گیا اور کیلیں اُکھیڑ کر باہر نکل آیا۔ وہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے سوراخ رکھنا بھول گیا تھا۔ اُسے گرفتار کر کے دوبارہ کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ اب اُس نے فرار کی تیسری اور آخری کوشش شروع کر دی۔ اس کے ساتھ چند اور قیدی بھی شامل ہو گئے۔ اس فرار کی داستان گائلز کے اپنے الفاظ میں دلچسپ بھی ہے اور جوش انگیز بھی۔

کیپٹن وینڈی نے ایک کیمرہ تیار کر لیا تھا۔ اُس نے ہماری پاسپورٹ سائز تصویریں اُتاریں جنہیں پولیس کے اجازت ناموں پر چسپاں کرنا تھا۔ یہ اجازت نامے بھی جعلی تھے، مگر بغور دیکھنے پر بھی کوئی شک نہ ہوتا تھا۔ یہ چیزیں قلعے کے باہر کی دنیا میں ہمارے پاس ہونا انتہائی ضروری تھیں، کیونکہ ان کے بغیر ایک قدم تک اٹھانا دُشوار تھا جبکہ جرمن سپاہی کیڑے مکوڑوں کی طرح جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ وینڈی نے ایک کہانی بھی گھڑ دی تاکہ پوچھ گچھ کی صورت میں ہم اس کا سہارا لے سکیں۔ کہانی کچھ اس طرح تھی:

ہم دو ولندیزی اور ایک فرانسیسی کارکن تھے۔ ہمارا کام میونخ سمیت باویریا کے اکثر شہروں میں بکری کی پیچیدہ مشینوں کی دیکھ بھال اور معائنہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ہیڈ آفس کی طرف سے ہمارے نام تعیناتی خطوط بھی تحریر کر لیے گئے۔ یہ کہانی قابلِ عمل اور سادہ تھی۔ اس سے اُکھڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اب صرف ایک مشکل درپیش تھی، وہ یہ کہ میری پتلون بالکل فوجیوں کی سی تھی؛ البتہ قمیص کارآمد تھی۔ باقی دونوں ساتھیوں کا لباس بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے کوئی اور پتلون نہ مل سکی۔

اب ہم ایک رسّا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی مدد سے ہم نوّے گز اونچی قلعے کی فصیل سے نیچے اُتر سکتے تھے۔ رسّا تیار کرتے ہوئے ہر لحظہ میری یہی کوشش تھی کہ اس میں کوئی خامی نہ رہے، کیونکہ ہماری زندگی یا موت اسی پر منحصر تھی۔ اگر یہ مضبوط نہ ہوا، تو بیسیوں گز کی بلندی سے گر کر ہماری ہڈی پسلی ٹوٹ سکتی تھی۔

دوسری طرف خدشہ تھا کہ کسی محافظ نے مجھے رسّا بناتے ہوئے دیکھ لیا، تو خیر نہ ہوگی اور مصائب اور مشقتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ابھی میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ میری بیرک کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اندر سے جواب نہ

پاکر دروازے پر دستک اللہ تیز ہو گئی۔ با دلِ نخواستہ اُٹھا اور دروازہ کھول دیا میرے سامنے مائیکل کھڑا تھا، اُسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔

"باہر نکلو" اُس نے میرے کان میں کہا۔" وقت آن پہنچا ہے۔"

"لیکن مَیں رسّے سے مطمئن نہیں" مَیں نے جواب دیا "اسے مزید بٹنے کی ضرورت ہے۔"

"لعنت بھیجو اس پر کسی طرح قلعے سے باہر تو نکلیں، یہاں کی زندگی سے باہر موت اچھی ہے۔"

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، ہم صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلے۔ قیدی کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تمام جرمن محافظ پہلے ہی باورچی خانے پر قبضہ کر چکے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ اچھا اچھا کھانا چٹ کر جاتے اور بچا کھچا کھانا ہی قیدیوں کو مہیا کیا جاتا۔ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا یہ بہترین وقت تھا۔ صرف ایک محافظ صدر دروازے پر متعین تھا اور وہ بھی باورچی خانے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ہم نے اپنا سامان لیا۔ رسّے کو پہلے سے منتخب جگہ پر لٹکایا اور نیچے اُترنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت ہماری قلبی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ دل کی دھڑکن دو قدم کے فاصلے پر بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف دامنگیر تھا۔

میرے ایک ولندیزی ساتھی نے پہل کی۔ یہ مائیکل تھا۔ باقی لوگوں نے نظروں ہی نظروں میں اسے خدا حافظ کہا اور وہ رسّی سے گھسٹتا ہوا نیچے گہری تاریکی میں روپوش ہو گیا۔ رسّے کی سرسراہٹ ختم ہوئی، تو ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ زمین پر پہنچ چکا ہے۔ اب میری باری تھی۔ مَیں نے رسّے کو مضبوطی سے تھاما اور فصیل سے نیچے لٹک گیا ___ اگلے ہی لمحے مَیں غیر متوازن صورت میں نیچے جا رہا تھا۔ ایک بار تو میرا سر فصیل کے ساتھ بُری طرح ٹکرایا۔ اس سے میری ہیجانی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ دوسری طرف میری ہتھیلیوں پر رسّے کی رگڑ ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ اتنے نازک تو نہ تھے کہ وہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں میرا ساتھ نہ دے سکیں، مگر یہاں تو معاملہ ہی اور تھا، رسّا، آری جیسے تیز دانتوں کی طرح ہتھیلیوں کو کاٹ رہا تھا، ان سے گوشت اُڑ رہا تھا۔ درد کی شدت سے مَیں کلبلا کر رہ گیا۔ اب رسّے کو مزید تھامے رکھنا میرے لیے قریباً ناممکن تھا۔ میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آسمان، تارے، قلعہ، ساری فضا ایک دوسرے میں مدغم ہو کر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اب میری گرفت بالکل چھوٹ چکی تھی، مَیں دھڑام سے نیچے گر پڑا، پھر کراہتا ہوا اٹھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میری کوئی نہ کوئی ہڈی تو ضرور ٹوٹ گئی ہو گی، لیکن اپنے آپ کو صحیح سالم دیکھ کر مَیں قدرت کے معجزے پر حیران رہ گیا۔

اس اثنا میں مائیکل بھی میرے قریب آ گیا جب اُسے

پتہ چلا کہ میں اُترتے ہوئے اپنے ہوش و حواس قابو میں نہیں رکھ سکا، تو مجھے سخت سُست کہنے لگا:

"پہلے ہی مرحلے میں ناکام ہو گئے، کس برتے پر نکلے تھے؟"

میں اس کی بات سُن کر خاموش ہو گیا، کیونکہ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔

اب ہمیں اپنے تیسرے ساتھی کا انتظار تھا۔ پانچ دس منٹ گزر گئے، مگر رسّے کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ ہم نے سوچا شاید اس نے بزدلی دکھائی یا ممکن ہے اُوپر کسی محافظ نے اُسے دیکھ لیا ہو۔ اس طرح سارے کیے کرائے پر پانی پھرنے کا اندیشہ تھا۔ ہم نے تھوڑی دیر تک مزید انتظار کیا، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور ذرا سی بے قاعدگی کسی خطرناک صورتِ حال کو جنم دے سکتی تھی۔

بالآخر رسّے کی سرسراہٹ سنائی دی اور چند لمحوں بعد وہ آہستہ سے زمین پر آ گیا۔ ہم نے تاخیر کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا:

"میں یہاں سے بھاگ نکلنے کے بارے میں متذبذب ہوں۔" ابھی وہ یہی الفاظ کہہ پایا تھا کہ کچھ فاصلے پر گشتی دستے کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اگرچہ اس وقت اندھیرا تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارے تیسرے ساتھی کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ انتہائی اضطراب کے عالم میں تھا۔ اچانک اُس نے کہا:

"پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ میں قلعے میں واپس چلا جاؤں۔"

اُس نے ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے رسّا پکڑا اور اُوپر چڑھنے لگا۔ میں نے مائیکل سے پوچھا:

"تم کہو، کیا ارادہ ہے؟"

"اپنے ارادے پر قائم ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔

گشتی دستہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ ہم دونوں چپکے سے چل کھڑے ہوئے ـــــ مائیکل کچھ زیادہ تیزی کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ بار بار مجھے بھی جلد قدم اُٹھانے پر اُکساتا:

"ہمارے بھاگ نکلنے کی خبر زیادہ دیر چھپی نہیں رہے گی اور جرمن سپاہی شکاری کتّوں کی طرح ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

لیکن اُس کی تشویش بالکل غلط ثابت ہوئی۔ ہم جس انداز سے قلعے سے فرار ہوئے تھے، وہ ہمارے حق میں مددگار ثابت ہوا۔ جرمنوں کو بالکل پتہ نہ چل سکا۔

ابھی خاصی رات باقی تھی۔ ہم چلتے چلتے ہوائی اڈّے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہمارے پاس وینڈی کا کیمرہ موجود تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر ہو سکے، تو ہوائی اڈّے پر جرمنوں کے گولہ بارود کے ذخیروں کی تصویریں لے لی جائیں اور انگلستان پہنچ کر شاہی فضائیہ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ مؤثر بمباری کر کے اڈّے کو اُڑا کر رکھ دیں۔ انگلستان پر جرمن بمباروں کے اکثر حملے اسی اڈّے سے کنٹرول کیے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت واضح تھی۔

ہوائی اڈّہ اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اِکا دُکا ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم خار دار تاروں کی باڑ کو کسی نہ کسی طرح عبور کر کے اڈّے میں داخل ہو گئے۔ اڈّے کا کچھ نقشہ ہمارے ذہن میں تھا، کیونکہ کولڈز کیمپ کی فصیل سے اس کا دھندلا سا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ یہاں حفاظتی اقدامات پر زیادہ زور نہ دیا جاتا تھا، کیونکہ یہاں تک کسی جاسوس کی رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھی۔ کبھی کبھار برطانوی جہاز ضرور حملہ آور ہوتے تھے، لیکن وہ رَن وے کے ارد گرد بم گرا کر فوراً بھاگ جاتے۔

ہم ایک خندق میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ گولہ بارود کے ذخیرے قریب ہی تھے، لیکن تاریکی کی وجہ سے تصویر لینا ممکن نہ تھا۔ ہمارے پاس ایک ٹارچ تو تھی جس کی روشنی خاصی تیز تھی، لیکن اس کا استعمال خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہمیں اپنے قریب سیٹی کی آواز سُنائی دی۔ ظاہر ہے یہ چوکیدار تھا، لیکن ہمیں اس سے مطلق خوف محسوس نہ ہوا، کیونکہ اس کے فرشتوں کو بھی

ہماری موجودگی کی خبر نہ تھی — دوسرے ہم نے اپنے آپ کو کچھ اس طرح کیموفلاج کر لیا تھا کہ دن کے وقت بھی کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم صبح پہلا کام فوٹو لینے کا کریں گے اور پھر مناسب موقع دیکھ کر چلتے بنیں گے۔

فضا میں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا؟" میرے مُنہ سے نکلا۔ "شاید برطانوی جہاز ہوں۔۔۔!" مائیکل نے کہا۔ اُس کا اندازہ درست نکلا۔ اگلے ہی لمحے ہوائی اڈہ روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ ہوائی جہاز ٹارگٹ ڈھونڈنے کے لیے روشنی کے گولے پھینک رہے تھے اور پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُف توبہ! کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ جا بجا آگ اور دھوئیں کا منظر تھا، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کسی کام کی جگہ نشانہ نہیں لگا۔ اچانک ایک جہاز ہمارے اُوپر سے گزرا اور ساتھ ہی ایک قیامت خیز دھماکا ہوا۔ صرف پچاس گز کے فاصلے پر گولے بارود کا ذخیرہ آگ پکڑ چکا تھا۔ گولے پھٹ رہے تھے اور ان کے دہکتے ہوئے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے — قیامت کا سا سماں تھا۔ ہمیں یہ فکر تھی کہ آیا ہم ان کی زد میں آنے سے بچ سکیں گے یا نہیں۔ اچانک ایک طرف سے آگ بجھانے والی گاڑیاں سُرعت سے آتی دکھائی دیں۔ یہ ہمارے اُوپر سے گزر کر ہی آگے بڑھ سکتی تھیں۔ موت کی یہ نئی خوفناک شکل ہماری بے بس آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔ ہماری خندق کچھ زیادہ گہری نہ تھی۔ گاڑیوں کے پہیے ہمیں آسانی سے روند سکتے تھے۔ صرف ایک موت سُجھائی دے رہی تھی، لیکن وہ بھی عدم کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ اگر ہم خندق سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتے، تو روشنی میں ہمیں آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا اور کسی محافظ کی گولی ہمارا بھیجا اُڑا سکتی تھی یا پھٹتے ہوئے گولے ہماری تکا بوٹی کر سکتے تھے۔ چاروں طرف موت کے پنجے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔





ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ یہ جاں گسل لمحات آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کبھی مجھے اپنی چھاتی پر شدید دباؤ کا احساس ہوتا، کبھی سانس رُکتا ہوا محسوس ہوتا اور کبھی تصور ہی تصور میں اپنی لاش کا کچومر نکلا ہوا دیکھتا۔ اچانک ایک بہت بڑے دھماکے کے بعد پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ ہم نے سوچا شاید اب مختلف گولوں نے آگ پکڑ لی ہے اور وہ مسلسل پھٹنا شروع ہو گئے ہیں، لیکن نہیں۔ فضا میں ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ ہم نے آنکھیں کھولیں تو ایک نہایت جوش انگیز منظر سامنے آیا۔ برطانوی طیارے پلٹ پلٹ کر فائر بریگیڈ کی گاڑیوں پر حملے کر رہے تھے تاکہ وہ ایمونیشن کے ذخیرے کی آگ نہ بجھا سکیں اور اس طرح سارا گولہ بارود جل کر خاکستر ہو جائے۔ دوسری طرف طیارہ شکن توپوں کے نیلے پیلے اور سُرخ گولے حملہ آور طیاروں کو نشانے میں لینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جوش اور مسرت سے ہمارے دل زور زور سے دھڑکنے لگے اور ہم نے ماحول سے بے پروا ہو کر زور زور سے تالیاں بجائیں اور جی بھر کر برطانوی ہوابازوں کو داد دی۔

یہ کھیل صرف تین چار منٹ تک جاری رہا۔ ہوائی اڈہ اب مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ کچھ لوگ جان بچانے کی غرض سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہم نے افراتفری کے اس موقع کو غنیمت جانا، خندق سے نکلے اور پھٹتے ہوئے گولوں سے بچتے بچاتے اڈّے سے باہر نکل گئے۔ ہم میلوں دُور نکل گئے، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہوائی اڈّے پر شعلے بدستور رقصاں تھے۔

صبحِ کاذب کا دھندلکا چھٹ رہا تھا، نہ معلوم ہم کہاں پہنچ چکے تھے۔ ہمارا رُخ کدھر تھا اور ہماری منزل کونسی تھی؟ ہم ان سوالات کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ میرا ساتھی ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اچانک کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر یُوں گھورنے لگا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا:

"میرا خیال ہے ہم سالزبرگ کے نواح میں ہیں۔"

"وہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا؟" مَیں نے پوچھا۔

"خطرہ تو قدم قدم پر موجود ہے، لیکن ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے شاید کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔"

مائیکل نے کھانے پینے کا نام لیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مَیں کولڈز کیمپ سے فرار ہو چکا ہوں۔ آہ! کتنی لذت تھی آزاد فضاؤں میں۔ خوشی اور مسرت کی اس دولتِ لازوال سے مَیں اس قدر سرشار تھا کہ نہ مجھے پیاس یاد تھی نہ بھوک، نہ تھکن کا سوال تھا اور نہ کوفت کا مسئلہ۔ ہر دم یہی دعا کر رہا تھا کاش! آزادی کے یہ کیف زا لمحات جاوداں ہو جائیں اور سرور کی یہ گھڑیاں صدا باقی رہیں۔

ہم ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ لوگ ابھی نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔ گاؤں سے آگے نکلے، تو مائیکل کہنے لگا:

"ہم دو آدمی ہیں۔ مَیں کمانڈر بنتا ہوں اور تم میری پیروی کرو گے۔ میرا پہلا حکم یہ ہے کہ ہم قریبی جنگل میں کچھ دیر کے لیے سستا لیں۔"

"خود ساختہ کمانڈر صاحب! مَیں کہیں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتا۔" مَیں نے تُرش روئی سے جواب دیا۔ مائیکل ولنڈیزی فوج میں لیفٹیننٹ تھا اور میرے ذہن میں چرچل سے رشتے کا خمار بھرا ہوا تھا، مَیں کیوں اس کی لیڈری تسلیم کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت پریشان حالی اور غریب الدیاری کے اعتبار سے ہم دونوں برابر تھے۔

مَیں نے جواب کا انتظار کیے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیے۔ ناچار اُسے بھی میرے ساتھ گھسٹنا پڑا۔ مَیں خوش تھا کہ میری رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ مائیکل کی حالت اُس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ تکان کے مارے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر زردی نمایاں تھی اور وہ کچھ خفت سی محسوس کر رہا تھا۔

دس گیارہ بجے کے قریب ہم سالزبرگ میں داخل ہو چکے تھے۔
یہاں ہر ممکن احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہمیں اپنی شکل صورت اور چال ڈھال سے کسی کو شبہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا، لیکن رات بھر صعوبت برداشت کرنے کے بعد بھلا اندرونی کرب کو چہرے پر ظاہر ہونے سے کیسے روکا جا سکتا تھا۔
ایک گشتی دستے کو سامنے دیکھ کر مَیں گھبرا گیا۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے مَیں نے ایک ہجوم میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ایک سپاہی نے دوڑ کر مجھے بازو سے پکڑ لیا:
"شناختی کارڈ دکھاؤ!" اُس نے چلا کر حکم دیا۔
مَیں نے ہاتھ سے مائیکل کی طرف اشارہ کیا۔ "اُس کے پاس ہے!"
مائیکل کو پہلے ہی دستے کے دوسرے سپاہیوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن اُس نے اپنے حواس بحال رکھے، کاغذات دکھائے اور اُن سے ہنسی مذاق کرنے لگا۔ وہ جلد ہی اُن سے گھل مل گیا۔ انہوں نے اسے سگریٹ پیش کیے، مائیکل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول کر لیے۔
دستے کے کمانڈر نے مجھ سے پوچھا: "دوست، تم گھبرائے سے کیوں ہو؟"
اس سے پہلے کہ مَیں جواب دیتا، مائیکل بول پڑا:
"یہ اعصابی مریض ہے۔ مَیں کسی ڈاکٹر کی تلاش میں ہوں تاکہ اس کا کچھ علاج وغیرہ ہو جائے۔ دیکھیے اس نے چاقو سے اپنی ہتھیلیاں کیسے زخمی کر لی ہیں!"
مَیں مائیکل کی طنز پی گیا، کیونکہ اس وقت عافیت اسی میں تھی، لیکن دستے کا لیڈر شاید مطمئن نہ ہوا ـــــ اُس نے پوچھا: "کیا تم لوگ مفرور تو نہیں ہو؟"
مَیں نے تیزی سے جواب دیا: "مفرور ہیں تو کونسا جرم کیا ہے۔ دشمن کی قید سے نجات حاصل کرنا اصل آزادی ہے جو انسان کا پیدائشی حق ہے۔"
لیڈر میرے جواب پر پھڑک اُٹھا: "دوست، خوب کہی!"

یہ کہہ کر اُس نے دستے کو مارچ کا حکم دیا اور ہم نے اپنی راہ لی۔
اب ہم دونوں میں ٹھن گئی۔ مَیں نے تند لہجے میں پوچھا:
"مسٹر مائیکل، تم نے مجھے پاگل کیوں کہا؟ مَیں اتنی ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔"
"تو کیا مَیں کہتا یہ چرچل کا بھتیجا ہے؟" اُس نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "جیل جانے کے اور بھی طریقے ہیں۔"
مجھ سے کوئی جواب نہ بن آیا اور ہم خاموشی سے پھیر کر چپ کر آگے بڑھتے رہے۔ اب ہماری منزل سالزبرگ سے آگے فریلاسنگ کا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے ہم گاڑی پکڑ کر ٹرانسٹن پہنچ سکتے تھے۔ اس کے بعد میونخ جانا زیادہ دشوار نہ تھا۔ ہم سالزبرگ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سہ پہر کو فریلاسنگ جا پہنچے۔
وہاں ہوائی حملے کے سائرن ہو رہے تھے اور لوگ قریبی پناہ گاہوں میں گھس رہے تھے۔ ہم بھی ایک خندق میں چھپ گئے۔ آسمان پر طیاروں کا شور بلند ہوا، پھر دُور کہیں بم پھٹنے کی آوازیں آئیں۔

شہر کے اُوپر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ حملہ ختم ہونے کے سائرن ہوئے، تو ہم خندق سے باہر نکلے۔ فریلانگ کے وسط میں کچھ مکان بمباری سے ڈھیر ہو گئے تھے۔ ملبے میں آگ لگی ہوئی تھی، ہم یہاں رُکے بغیر اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے تاکہ جلد از جلد کوئی گاڑی پکڑ سکیں۔

اسٹیشن پر ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ مائیکل مجھے ایک جگہ بٹھا کر خود قطار میں لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک پولیس افسر کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ یا خدا، پھر کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ مائیکل قریب آیا، تو پتہ چلا کہ ہمارے دوسرے کاغذات تو درست تھے لیکن غیر ملکیوں کے لیے ریلوے کے سفر کا اجازت نامہ ہمارے پاس موجود نہ تھا۔ ہنگامی حالات کی وجہ سے مقامی لوگوں کے لیے ریلوے کے سفر پر بالکل پابندی عائد تھی، صرف غیر ملکی سفر کر سکتے تھے اور وہ بھی خصوصی اجازت کے ساتھ، یا پھر ریل کے ذریعے فوج کی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ ہمیں اس قانون کا علم نہ تھا، ورنہ دوسرے کاغذات کے ہمراہ یہ اجازت نامہ بھی تیار کرنا وینڈی کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ اس کے بارے میں چند کلمات خیر سُن لیجیے۔ وہ ایک مفرور تھا اور اب تک کوئی قلعہ یا جیل اُسے اپنی چار دیواری میں مقید نہ رکھ سکی تھی۔ اس وقت کولڈز کاسل میں بھی وہ دوسرے قیدیوں کو فرار ہونے میں معاونت کے لیے موجود تھا، ورنہ وہ کب کا یہاں سے بھاگ گیا ہوتا۔

اب پولیس افسر کا یہ حکم تھا کہ ہم تھانے چلیں اور اپنے بارے میں اطمینان دلائیں۔ مائیکل کو حسب عادت کوئی پریشانی نہ تھی، لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں وہاں جانے سے خوف کھا رہا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھانہ تھا۔ ہمیں وہاں لے جا کر انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ خدا جانے اس نئی مصیبت سے ہم بچ سکیں گے یا نہیں؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔

آخر گھنٹی بجی اور صرف مائیکل کو پیش ہونے کا حکم ملا۔ افسر بالا ساتھ کے کمرے میں بیٹھا تھا اور میری نظروں کے سامنے ہی تھا۔ میں مائیکل کی حرکات کو دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت پھرتی سے باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کبھی آگے جھکتا، کبھی پہلو بدلتا۔ شاید وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اُسے طلبی کی کوئی پروا نہیں اور یہ عام سا معاملہ درپیش ہے۔

میرے بنچ کے قریب ٹائپسٹ بیٹھا تھا۔ کوئی اُس سے ملنے آیا۔ وہ جتنی دیر بیٹھا رہا مجھ پر نظریں جمائے رہا۔ یہ ایک انگریز تھا جو جرمنوں کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ یہ میرا ہم جماعت تھا۔ میں تصور ہی تصور میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اچانک انگریز کسی بات پر ٹائپسٹ سے اُلجھ پڑا۔ میں اسی لمحے انتظار گاہ کا ریڈیو پروگرام روک کر اعلان کرنے لگا: "دو آدمی کولڈز کاسل سے بھاگ نکلے ہیں، ان کا حلیہ۔۔۔"

اُف میرے خدا، ایک طرف ریڈیو پر اعلان اور دوسری طرف انگریز جاسوس کی موجودگی ـــ اب ہماری نجات کی کوئی صورت باقی نہ تھی، میں سوچ رہا تھا ابھی وہ پولیس کو خبر کر دے گا اور ہمیں ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں گی، مگر اس وقت وہ ٹائپسٹ سے بُری طرح اُلجھ چکا تھا۔ پولیس کے سپاہی انہیں چھڑانے کے لیے بھاگے۔ ان میں وہ افسر بھی شامل تھا جو مائیکل سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ لڑائی نے پورے تھانے میں افراتفری مچا دی تھی۔ مائیکل پولیس سے سفر کا اجازت نامہ حاصل کر چکا تھا۔ اس نے مجھے کھسکنے کا اشارہ کیا اور ہم چلتے بنے۔

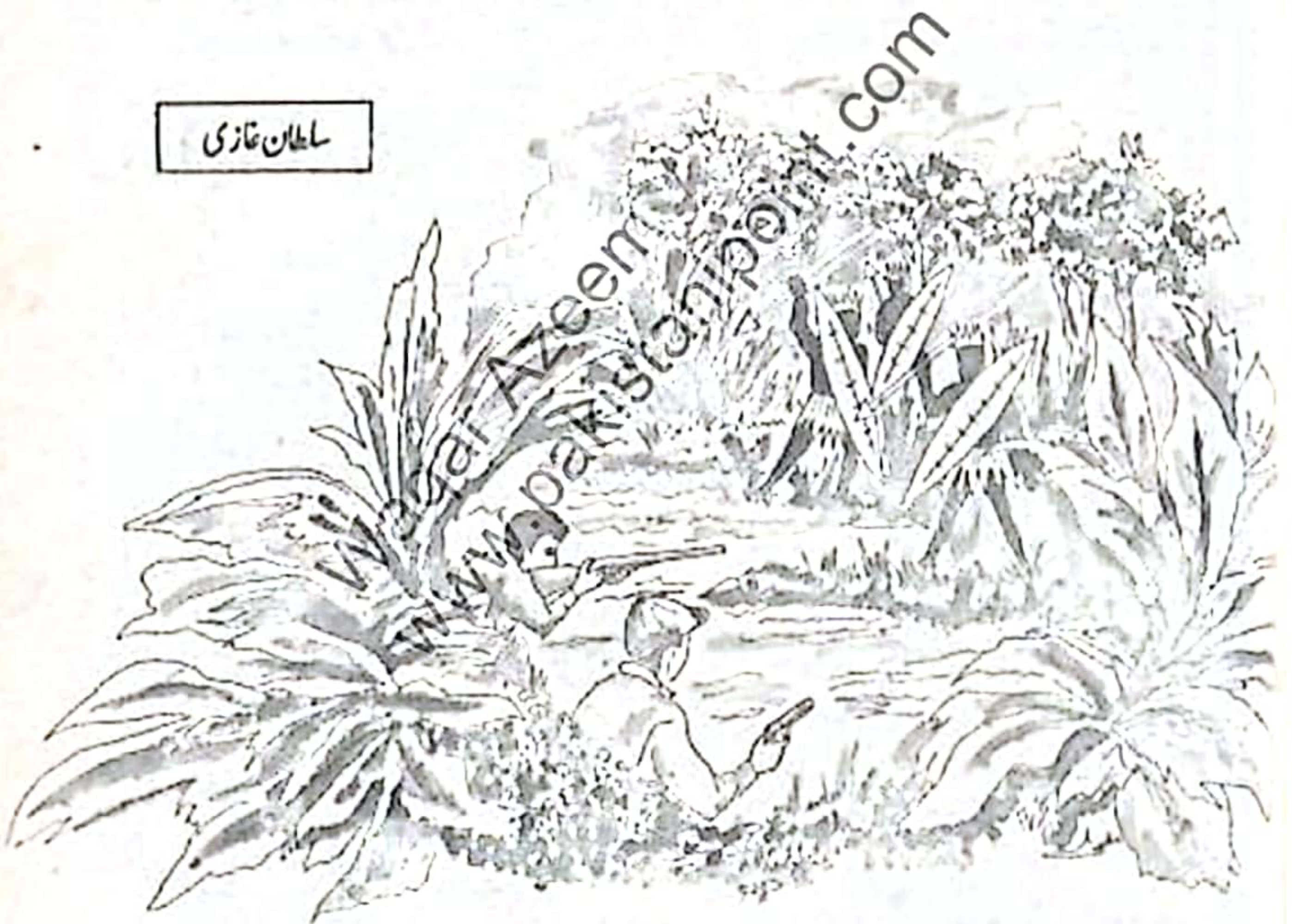
حالات نے قدم قدم پر ہماری موافقت کی تھی، ورنہ جرمنوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنا ناممکن تھا۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچے، تو گارڈ سیٹی دے چکا تھا۔ ہم دوڑ کر آخری ڈبے میں سوار ہو گئے۔ جرمنوں کا خوف پیچھے رہ گیا تھا، بہت پیچھے۔



قیدیوں کے قیدی

وسطی افریقہ میں جنم لینے والی دوسری جنگ عظیم کی یہ پراسرار داستان اس قدر تحیر خیز ہے کہ وہ قاری کو اپنے اندر جذب کیے رکھتی ہے' اس لیے ۲۸ سال بعد بطور قند مکرر پھر پیش کی جا رہی ہے....

سلطان غازی



یہ دو اکتوبر ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ دشمن کا دس ہزار ٹن وزنی جہاز آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار دس ناٹ (ناٹ = ۶۰۸۰ فٹ) سے زیادہ نہ تھی اور وہ غالباً ابھی ابھی بلجیئن کانگو کی بندرگاہ "بنانا" سے روانہ ہوا تھا۔ میں اگرچہ خود جہاز نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ یو بوٹ ۵۰۸ میں میری ڈیوٹی اس مقام پر

تھی جہاں آبدوز کو گہرائی میں لے جانے یا سطح پر لانے کے لیے اندرونی دباؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے' لیکن انٹرکوم پر گربیر کی آواز اور بولنے کے انداز سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ پیری سکوپ سے اس نے کیا منظر دیکھا ہو گا۔

"یہ تو امریکی ٹینکر ہے۔" لیفٹیننٹ کی آواز ایسے سنائی دی جیسے کسی موٹے شکار کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک رہی ہو۔

"گہرائی' ۸۵ فٹ۔" میں نے انٹرکوم پر فوراً لیفٹیننٹ گربیر کو آبدوز کی گہرائی سے مطلع کیا اور اس کے بعد چیف کوارٹر ماسٹر کارل وورز کو دشمن ٹینکر کے بارے میں بتایا۔ وورز پورے ایک سال تک ایک ایسی ہی آبدوز کشتی پر متعین رہ چکا تھا اور دشمن کے جہازوں پر چھاپے مارتا رہا تھا لیکن میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ میری طبیعت کے تجسس اور ہیجان کو بھانپتے ہوئے وورز نے کہا: "تم دیکھتے جاؤ کہ یہ جہاز بھی کیسے سمندر کی تہہ تک پہنچتا ہے۔"

ہماری یو بوٹ نے چند لمحے زیر آب پینترے بدلے اور پھر امریکی ٹینکر کی جانب صرف چھ سو گز کے فاصلے سے تین تارپیڈو چھوڑ دیے گئے۔ چند لمحے بعد مجھے انٹرکوم پر اوپر کی منزل کا شور سنائی دیا جہاں عملے کے چوالیس ارکان مارے خوشی کے دیوانے ہو جارہے تھے' پھر ہیڈ فون پر لیفٹیننٹ گربیر کی آواز سنائی دی: "تینوں تارپیڈو نشانے پر لگے۔" اس کامیابی پر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں خاموش رہا اور منتظر کہ دشمن کی توپیں کب دہانے کھولتی ہیں' لیکن ادھر سے کوئی جوابی کارروائی نہ ہوئی۔ میں نے اپنی دانست میں یہی جانا کہ دشمن کا کام تمام ہو چکا۔ ادھر وورز نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا: "تمہارا یہ پہلا تجربہ خاصا دلچسپ رہا ہو گا۔" میں جواب میں مسکرا دیا' تجربہ ابھی جاری تھا۔ انٹرکوم پر گربیر کے مختلف احکام سنائی دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری آبدوز نے ایک سو اسی درجے کے زاویے پر آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا تاکہ عقب کی تارپیڈو ٹیوب کا رخ دشمن کی طرف ہو جائے۔

"کیا تین تارپیڈو اسے ڈبونے کے لیے کافی نہ تھے۔" وورز زیر لب بڑبڑایا' لیکن میں اپنی جگہ خوش تھا۔ کوٹنگز برگ میں آبدوز کے تربیتی مرکز سے فارغ ہونے کے بعد میرے لیے سچ مچ کی لڑائی کا یہ پہلا تجربہ تھا اور اسی طرح گربیر بھی سرنگیں صاف کرنے والے جہاز پر عرصے تک خدمات انجام دینے کے بعد پہلی بار ایک آبدوز کو کمان کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی یہ خواہش تھی کہ اس لڑائی میں دشمن کا جہاز مکمل طور پر تباہ ہوتے ہوئے دیکھیں۔

امریکی ٹینکر نے ہمارے مقابلے کی ناکام سی کوشش بھی کی' لیکن اوپر سمندر کی سطح پر تین گولے چھینٹے اڑا کر ڈوب گئے۔ اب ہماری باری تھی۔ آبدوز نے پینترا بدل کر نشانہ باندھ لیا تھا۔ فوراً ہی عقب کی ٹیوب سے دو تارپیڈو سنسناتے ہوئے نکلے اور دونوں ہی ٹھیک نشانے پر جا لگے۔ نئے تجربے کا ہیجان ختم ہو چکا تھا اور اب میری طبیعت پرسکون تھی۔ عین اس وقت مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے بڑی دیر سے کچھ نہ کھایا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اب کام ختم ہو چکا ہو گا' میں نے اپنی جگہ سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ وورز نے ڈانٹ بتائی: "گربیب' اپنی ڈیوٹی سے مت ہلو۔ مجھے خطرہ ہے کہ ہمارے اس نئے کمانڈر کی طرف سے ابھی مزید احکام موصول ہوں گے۔

وورز کی آواز میں طنز بھی تھی اور غصہ بھی۔

یو بوٹ آبدوزوں کے لیے عام احکام یہی تھے کہ وہ دشمن کا جہاز ڈبونے کے بعد فوراً اس مقام سے روانہ ہو جائیں اور سطح آب پر ہرگز نہ آئیں' مبادا دشمن کے جہاز سے بچ نکلنے والے' یو بوٹ کو پہچان

لیں، لیکن لیفٹیننٹ گربیر کے بارے میں وورزر کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

"حضرات، اب ہم سطح پر آنے والے ہیں۔"

انٹرکوم پر گربیر کی آواز گونجی۔ اس آواز میں اگرچہ اعتماد تھا لیکن دشمن کے ڈوبتے جہاز کو ایک نظر دیکھ لینے کے شوق اور تجسس کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ وورزر سے اب صبر نہ ہو سکا۔ وہ دانت پیستا ہوا آگے بڑھا اور انٹرکوم کی ٹیوب سے گربیر کو مخاطب کر کے بولا:

"سر، لیفٹیننٹ ہم کسی کو قیدی نہیں بنا سکتے۔ میں رسد کے انچارج کوارٹر ماسٹر کی حیثیت سے آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آبدوز میں قیدی رکھنے کے لیے فالتو خوراک نہیں ہے۔"

"میں قیدیوں کے لیے سطح پر نہیں جا رہا۔" لیفٹیننٹ گربیر نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو صرف دشمن کے جہاز پر اپنے حملے کے اثرات دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا، کیا امریکی جہاز میں بہت بڑے بڑے سوراخ ہوں گے؟" اس کے بعد گربیر نے مجھے گہرائی کا میٹر پڑھنے کا حکم دیا۔

"پچھتر فٹ..... پچاس فٹ..... پچیس فٹ۔"

آبدوز اوپر اٹھ رہی تھی اور میں میٹر پڑھ رہا تھا۔ آبدوز ایک جھٹکے سے سطح پر آن رکی۔ اندر ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا، ہر شخص ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہا تھا اور بھی ڈیک پر پہنچ کر دشمن کی تباہی کا نظارہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ انجینئرنگ آفیسر ٹمی اور تارپیڈو مین ہملٹ روہمر اپنے عملے کے ساتھ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے کنٹرول روم میں گزرے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا... دن کی روشنی میں پہلے تو میری آنکھیں اس طرح چندھیائیں کہ کچھ نظر ہی نہ آیا۔ سمندر کی سطح پر اس قدر دھند تھی کہ چھ سو گز کے فاصلے پر دشمن کا جہاز بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔

"وہ دیکھو ولی....." تارپیڈو مین روہمر نے ہنستے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ امریکی ٹینکر کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ اس کی ایک سمت میں پانچ بڑے بڑے غار منہ کھولے ہوئے تھے۔ ڈیک پر جابجا آگ لگ چکی تھی اور فضا میں دھوئیں کا ایک دبیز بادل بلند ہو رہا تھا۔ ربڑ کی دس کشتیاں جہاز کے قریب سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھیں، لیکن ایک کے سوا سبھی خالی تھیں اور اس رافٹ میں بھی صرف تین افراد بیٹھے دکھائی دیے جو ہماری طرف رخ کیے ہمیں گھونسے دکھا رہے تھے۔

آبدوز کا تمام عملہ اوپر پہنچ چکا تھا اور سب ہی دشمن کے ڈوبتے ہوئے جہاز کو دیکھنے میں محو تھے۔ تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دفعتاً ہمیں اپنے سروں پر ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

لیفٹیننٹ گربیر نے فوراً پلٹ کر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ کچھ لوگ آبدوز کو زیر آب لے جانے کے لیے اندر گئے، کچھ لوگ مشین گنوں کی جانب لپکے۔ لیفٹیننٹ گربیر پرسکون اور خاموش کھڑا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ امریکی ٹینکر نے تباہ ہوتے ہی امداد کے لیے ریڈیو سگنل دے دیا ہوگا اور آبدوز کو سطح پر لانے سے پہلے گربیر کو اس ممکن صورت حال کا احساس کر لینا چاہیے تھا۔

ایک لمحے کے اس تعطل اور ہڑبونگ کے بعد آخر وورزر چلا اٹھا:

"غوطہ لگانے کے لیے نیچے چلو۔" لیکن لیفٹیننٹ گربیر نے اس سے زیادہ شدت سے انکار کرتے ہوئے جواب دیا: "ہرگز نہیں۔ صرف دو طیارے ہیں۔ سب لوگ مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

عملے میں خاصی تعداد مجھ جیسے کم تجربہ رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں آبدوز کی اگلی مشین گن کی طرف بڑھا اور جلدی میں روہمر سے ٹکرا گیا۔ وہ بے چارہ لوہے کے فرش پر زور سے گرا اور وہیں بے ہوش ہو گیا۔

دونوں طیارے امریکہ کے اے ۲۰ قسم کے ہلکے بمبار تھے جو غالباً افریقہ میں متعین فرانسیسی افواج کو امریکہ نے عاریتاً دے رکھے تھے۔ دونوں طیاروں نے پہلے ڈوبتے ہوئے ٹینکر پر پرواز کی، پھر وہ بہت نیچی اڑان پر بچ جانے والے امریکیوں کی رافٹ پر سے گزرے۔ میں نے اس موقع پر طیاروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن مشین گن ایک خاص بلندی سے نہ تو زیادہ نیچے آ سکتی تھی اور نہ قریبی فاصلے پر اس سے نشانہ لیا جا سکتا تھا۔ دونوں طیارے کوئی نقصان اٹھائے بغیر ہمارے سروں پر سے گزر گئے اور اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکے نے آبدوز کو اچھال دیا۔ ڈیک کے پچھلے حصے پر پانچ سو پونڈ وزنی بم نے تباہی مچا دی تھی۔ ہمارے ساتھیوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں اڑے۔ بہت سے افراد محض دھماکے کے جھٹکے سے اچھل کر سمندر میں جا پڑے اور انجینئرنگ آفیسر شمی کا بے جان جسم میری آنکھوں کے سامنے راکٹ کی طرح ڈیک سے اچھلا اور پچاس فٹ دور سمندر میں جا گرا۔ اس کی لائف بیلٹ میں ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ پانی کی سطح پر چت پڑا تھا۔

ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ایک طیارہ چکر کاٹ کر پھر ہماری طرف جھپٹا۔ اس دفعہ ہم طیارے کی مشین گنوں کی زد میں تھے۔ میں فوراً جھک کر اوٹ میں ہو گیا۔ اور ڈیک پر زخمیوں کی چیخیں اور آہیں رہ گئیں۔ البتہ لیفٹیننٹ گربیر کے احکام ابھی تک گونج رہے تھے۔ ادھر دوزر بیں ملی میٹر دہانے کی توپ سے مسلسل فائر کر رہا تھا۔ میں نے اس طیارے کو نشانہ بنانے کی ایک بار اور کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ طیارے نے پلٹ کر غوطہ لگایا اور مشین گنوں کے دہانے ہمارے ان بچے کھچے ساتھیوں پر کھول دیے جو جان بچانے کے لیے سمندر میں کود گئے تھے اور تیر کر آبدوز سے دور دور ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پانچ منٹ سے بھی کم مدت میں دو طیاروں نے یو بوٹ ۵۰۸ اور عملے کے بیشتر افراد ہلاک کر دیے تھے۔ دونوں طیارے جب واپس جا رہے تھے تو لیفٹیننٹ گربیر کی آواز سنائی دی: "کریب' آبدوز کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" ظاہر ہے ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی صورت بھی نہ تھی۔ دوزر اور گربیر بھی میرے ساتھ ڈیک کے جنگلے سے بندھی ہوئی رافٹ کھولنے میں مصروف تھے۔

اس وقت ہمیں ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ آبدوز کے عملے میں ہم صرف تین آدمی زندہ باقی رہ گئے تھے۔ آبدوز ہچکولے کھا رہی تھی اور چاروں طرف خاموشی تھی۔

ہمارے باورچی کی لاش ڈیک پر سے پھسل کر یوں پانی میں جا پڑی جیسے کوئی بھیگی ہوئی مچھلی ہو۔ ڈیک کے عقبی حصے میں ہمارے ساتھیوں میں سے بارہ کی لاشیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ دور فاصلے پر جہاں امریکی جہاز ڈوب رہا تھا ایک اور رافٹ پانی میں ڈول رہی تھی.... ٹینکر سے بچ جانے والے تینوں امریکی چپ چاپ اس میں بیٹھے ہوئے مدد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس رافٹ کے ساتھ غالباً چپو نہیں تھے۔

"ان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" میں نے امریکیوں کی رافٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ گربیر اور دوزر نے گردن گھما کر ادھر دیکھا، دوزر صرف کندھے جھٹک کر خاموش رہا، لیکن گربیر نے

فیصلہ کن انداز میں مجھ سے کہا: "ابھی جنگ جاری ہے گریب' جاؤ نیچے کیبن سے ریوالور نکال لاؤ۔" میں جانے کو مڑا تو ووزر نے یاد دلایا: "اور راشن وغیرہ کے ڈبے بھی ضرور نکال لانا۔"

آبدوز میں پانی بھر رہا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے جلدی جلدی چار ریوالور کمر سے باندھے۔ راشن کے ڈبے جتنے بھی اٹھا سکتا تھا' اٹھا لیے اور فوراً واپس ڈیک پر آگیا۔ اوپر پہنچ جانے کے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ہماری تعداد تین سے چار ہو گئی ہے۔ یہ چوتھا آدمی تارو پیڈمین ہیملٹ روہمر تھا جو مجھ سے دھکا کھانے کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کا کاندھا مشین گن کی گولیوں سے شدید زخمی تھا اور اوسان پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔

کوارٹر ماسٹر ووزر کی نظروں میں اب ہمارے المیے کا ذمے دار کمانڈر تھا۔ اس نے ترچھی نظروں سے زخمی روہمر کو دیکھتے ہوئے گربیر سے کہا: "اب تو ہم تعداد میں امریکیوں سے زیادہ ہیں اور انھیں یقیناً ختم کر سکیں گے۔"

گربیر نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا اور میں حیران تھا کہ آخر اس وقت یہ دونوں کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

ہم نے خاموشی سے اپنا سامان رسد رافٹ میں لادا۔ آبدوز کو خیرباد کہا اور اپنے امریکی دشمنوں کی جانب آہستہ آہستہ رافٹ کو دھکیلنے لگے۔ اچانک مجھے سمندر کے پانی کے رنگ میں کچھ غیر معمولی بات نظر آئی۔ یہ پانی بحراوقیانوس کے شفاف پانی سے مختلف' خاصا گدلا تھا اور سورج کی روشنی میں اس کی لہریں چمکتی بھی نہ تھیں۔ میں نے جھک کر چلو میں تھوڑا سا پانی لیا' اسے چکھا' تو اس کا ذائقہ تازہ پانی کی مانند پایا۔ میں نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ساحل نظروں سے اوجھل تھا' لیکن ہوا میں استوائی خطے کے گھنے جنگلوں کی خوشبو بھی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات اور نتائج کی کڑیاں ایک دم ملتی چلی گئیں۔

مارے حیرت کے مجھے زبان پر بھی قابو نہ رہا اور میرے منہ سے بس اتنا نکلا: "یہ دریا ہے ووزر' گربیر ہم سمندر میں ہیں نا' لیکن یہ تو دریا ہے دریا۔"

ہم یو بوٹ سے بمشکل کچھ پیچھے ہوں گے کہ میری بے تکی باتیں سن کر لیفٹیننٹ گربیر اور ووزر نے چپو چلانے بند کر دیے اور عجیب نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔ میں نے پہلی بار لیفٹیننٹ گربیر کو اس کے عہدے کے بجائے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا اور ان دونوں کو میری دماغی صحت پر شک ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں کا مفہوم بھانپ کر میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا:

"نہیں نہیں' میں بالکل تندرست اور ہوش وحواس میں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ہم بنانا کی بندرگاہ سے دور نہیں ہیں.... یہ بندرگاہ دریائے کانگو کے دہانے پر واقع ہے اور ہماری رافٹ کے نیچے سمندر کا پانی نہیں بلکہ دریائے کانگو کا پانی ہے۔ یہ پانی بالکل میٹھا اور تازہ ہے۔ اب اگر ہم بلجیمن حکام کی نظروں سے بچ کر بنانا کے شمال میں کسی جگہ ساحل پر اتر جائیں' تو آسانی سے دریا کے کنارے پہنچ کر اس کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف نکل سکتے ہیں۔"

میں نے اپنے ساتھیوں کو پورا منصوبہ سمجھاتے ہوئے بتایا کہ اس جانب گھنے جنگلوں میں یقیناً راستہ مل جائے گا۔ یہ پورا علاقہ جنگلی قبائل سے آباد ہے۔ وسطی افریقہ کا فرانسیسی علاقہ جنرل رومیل نے محصور کر رکھا ہے اور اپنی فوج تک پہنچنے کے لیے ہمیں نو سو میل خشکی کا سفر طے کرنا ہو گا۔

میں نے اپنی یہ تقریر ختم کر کے دونوں افسروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا' انھوں نے چند لمحے سوچنے کے بعد مجھ سے پوچھا:

"ٹمشپ مین کریب' ان امریکیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ہم انہیں قلی بنا کر ان سے اپنا سامان رسد اٹھوائیں گے۔"

میں نے فوراً جواب دیا۔ "اور جب سامان ختم ہو جائے گا' تو انہیں گولی مار دیں گے۔"

دوزر کی مسکراہٹ سے میں سمجھ گیا کہ اسے میرا منصوبہ پسند آگیا ہے اس عرصے میں میں زخموں کے باعث مسلسل کراہ رہا تھا۔ دوزر نے تشویش کی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اچانک کسی خیال سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "شمی سمیت تمام لاشوں کو بھی رافٹ میں ڈال لو۔"

اس نے رافٹ کے قریب ہمارے ساتھیوں کی بہتی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اب ہم ان امریکیوں سے تعداد میں واقعی زیادہ ہو جائیں گے۔"

ہم سب نے جلدی جلدی پانی سے لاشیں سمیٹ کر رافٹ میں ڈال لیں اور لاشیں اٹھاتے ہوئے کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ دور فاصلے سے امریکیوں نے یہی جانا ہو گا کہ سمندر میں تیرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی جانیں بچا رہے ہیں۔ روہمر بے چارے کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس پر نیم غنودگی طاری تھی اور اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر پوچھا بھی: "یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" لیکن ہم اتنے مصروف تھے کہ کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

ہم نے تمام لاشوں کو رافٹ کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس طرح بٹھا دیا' گویا وہ زندہ انسان ہوں۔ اس کے بعد ان چار ریوالروں سے تین ریوالور جو میں کیبن سے نکال لایا تھا' مردوں کے ہاتھوں میں تھماکر ان کا رخ امریکی رافٹ کی جانب کر دیا۔ ان لاشوں کے زخموں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا' لیکن فاصلے سے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب دوزر ایک ریوالور تھام کر تیار ہو گیا اور ہم نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رافٹ کو امریکیوں کی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔

ہم جب امریکیوں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر پہنچ گئے' تو گربیر نے مجھے حکم دیا: "ان سے بات کرو۔" میں چپو چھوڑ کر کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کے گرد پیالہ سا بنا کر پوری قوت سے چیخا:

"امریکیو' ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

دوسری طرف سے جب کوئی جواب نہ آیا' تو میں نے پلٹ کر گربیر کی طرف دیکھا' لیکن اس نے ہمیں مزید ہدایت دینے کے بجائے دوزر کو چپو چلانے کا اشارہ کیا تاکہ ہم امریکی رافٹ کے اور قریب ہو جائیں۔

پچاس گز کے فاصلے سے مجھے امریکیوں کے چہرے صاف دکھائی دینے لگے۔ ان میں سے ایک سرخ و سفید اور نہایت صحت مند تھا' دوسرا گربیر کی طرح دبلا اور گہرے رنگ کا اور تیسرا بحریہ کی وردی میں ملبوس تھا۔ تینوں امریکی خاموشی سے ہماری طرف تک رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر بلند آواز سے انہیں خبردار کیا:

"ہم تعداد میں تم سے زیادہ ہیں۔"

میری اس تنبیہ کے جواب میں موٹے امریکی نے فوراً گالی دی اور ریوالور اٹھا کر ہماری طرف فائر کر دیا۔ گولی سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔ میں بچاؤ کے لیے فوراً دبک کر نیچے ہو گیا۔ اس نے دوسرا فائر کیا اور اس بار شمی کی لاش نشانہ بنی۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی اور جھٹکے سے لاش پیچھے کو لڑھک گئی۔ موٹے امریکی نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا اور ادھر گربیر نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی' لیکن اس کی کوئی گولی نشانے پر نہ لگی۔

اس مضحکہ خیز جنگ کا نہ جانے کتنا خوفناک انجام ہوتا' لیکن اسی لمحے پستول چلانے والے امریکی کو اس کے دونوں ساتھیوں نے ٹانگوں سے پکڑ کر زبردستی بٹھادیا۔ ہم تک اب ان کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔ دبلا امریکی اس موٹے امریکی کو سمجھا رہا تھا: "دیکھتے نہیں موران' کم بختوں کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے۔"

اس دوران میں ہماری رافٹ اور قریب پہنچ چکی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ امریکیوں کے پاس صرف ایک ریوالور ہے۔ گربیر نے اس موٹے امریکی سے' جس کا نام موران تھا' کہا کہ وہ اپنا ریوالور سمندر میں پھینک دے' موران نے ریوالور پھینک دیا' تو ہم اپنی رافٹ کو پھر آگے کھینچنے لگے اور جس وقت ہم اپنی "مردہ فوج" کو واپس سمندر میں پھینک رہے تھے تو تینوں امریکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ موران نے اس امریکی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا جس نے ہماری "تعداد" کا خوف دلا کر لڑائی بند کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ موران نے بڑبڑاتے ہوئے جو گالیاں دیں وہ بھی ہم نے سنیں اور ہمیں بڑا لطف آیا۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے اور تینوں امریکی' جو اب ہمارے قیدی تھے' ہاتھ اوپر اٹھائے اپنی رافٹ میں کھڑے تھے۔ بحریہ کی وردی میں ملبوس امریکی مسلسل تمباکو چبا رہا تھا۔ سب سے پہلے وہی ہم سے مخاطب ہوا: "میرا نام کولی کولٹن ہے اور تم سب کون ہو؟"

لیفٹیننٹ گربیر اس قیدی کی بدتمیزی پر ابھی غصے کا اظہار بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک بڑی عجیب سی آواز سنائی دی۔ ہم سب نے پلٹ کر دیکھا۔ تقریباً پچھتر گز کے فاصلے پر بھاری بھرکم امریکی ٹینکر آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا اور ٹینکر کا پچھلا حصہ اب آہستہ آہستہ پانی میں غائب ہو رہا تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پورا ٹینکر اور اس کے شعلے پانی کی آغوش میں گم ہو گئے.... سطح آب پر ایک چھوٹا سا بھنور بنا اور ٹینکر کے چند ٹوٹے پھوٹے حصے اور کچھ خالی کشتیاں وہاں ہچکولے کھانے لگیں۔ امریکی ٹینکر کے ڈوب جانے کے صرف تیس سیکنڈ بعد دوسری جانب ہماری یو بوٹ بھی غرق ہو گئی۔ وہاں پانی کی سطح پر صرف بلبلے تھے۔

"چلو خاتمہ بالخیر ہوا۔" امریکی قیدی کولٹن نے تمباکو کی پیک سمندر میں تھوکتے ہوئے کہا' لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ یہ خاتمہ نہیں' بلکہ اس مقام پر موجود ہم ساتوں افراد کی زندگی میں ایک انتہائی عجیب و غریب تجربے کی ابتدا تھی۔

اسی دن' دو اکتوبر ۱۹۴۲ء شام کو پانچ بجے افریقہ کے جنگلوں میں ہمارے اس عجیب و غریب سفر کا آغاز ہوا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بلجیئن کی بندرگاہ بناتا سے دس میل شمال کی جانب ساحل تک ہم اپنی رافٹ میں گئے۔ قیدیوں کی رافٹ ہم سے بیس فٹ آگے تھی۔ رافٹ کھینے کے لیے ہم نے ان قیدیوں کو اپنے چپوؤں میں سے دو چپو دے دیے تھے۔ وونر اور میں باری باری پستول تھام کر قیدیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ گربیر نے اس دوران میں قیدیوں سے چھینے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کیا۔ ان کاغذات سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ تینوں امریکی ٹینکر پر ملاحوں میں شامل تھے اور امریکہ کی مختلف ریاستوں کے باشندے تھے۔ موران اور کولٹن کا نام ہمیں پہلے معلوم ہو گیا تھا تیسرے قیدی ایڈورڈ کے بارے میں اس کے کاغذات دیکھ کر پتہ چلا کہ وہ یہودی ہے۔

گربیر کا خیال تھا کہ ساحل پر جاتے ہی اس یہودی کو گولی مار دی جائے' لیکن میں نے اس کی رائے سے اختلاف کیا: "یہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے یقیناً

کمزور نہیں اور ہمارے لیے خاصا وزن اٹھا سکے گا۔"
گریبر کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے یہ کہہ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ "بہرحال جب بھی ان تینوں کو ہلاک کرنے کا وقت آیا' یہ یہودی سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔"

ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک اور سنگین مسئلے کا حل سوچنا تھا اور وہ مسئلہ تھا' تارپیڈو مین روہمر کا جو رافٹ میں بے ہوش پڑا تھا.... رافٹ کو لاشوں سے خالی کرتے ہوئے ووزر نے اسے ایک بار دیکھا اور کہا "کیا اسے بھی پھینک دیں؟"

یہ بڑا عجیب و غریب منظر تھا۔ ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ جنگل میں قیدیوں پر پہرہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک زخمی کو سنبھالنا کس قدر مشکل ہو گا' لیکن دوسری طرف یہ بھی احساس تھا کہ روہمر ابھی زندہ ہے اور ہمارا ساتھی ہے۔ وہ میرے ساتھ اکیڈمی میں بھی رہ چکا تھا اور میں کسی صورت پر اسے سمندر کی لہروں کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار ہم سب نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ امریکی ٹینکر کی مدد کے لیے کوئی جہاز فوری طور پر وہاں نہ پہنچا اور جب ہماری رافٹ ساحل پر جا لگی تو اس وقت بھی ہمیں کسی نے وہاں اترتے نہیں دیکھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سفید بھربھری ریت پر کہیں کہیں ہم نے قدموں کے نشان دیکھے تاہم کسی آدمی کا دور دور تک پتا نہ تھا اور ساحل پر پچاس گز دور گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

ہم لوگ ریوالور سنبھالے ابھی تک اپنے قیدیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ موٹے امریکی موران نے گردن گھما کر ہماری جانب دیکھا اور اکتا کر کہنے لگا: "ٹھیک ہے اب ہم تمہارے قیدی ہیں لیکن آخر تم ہمیں لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

چونکہ.... اپنے ساتھیوں میں انگریزی صرف میں ہی بول سکتا تھا' اس لیے گریبر نے مجھے کہا کہ اس کی زبان میں موران کو سمجھا دوں' چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہم ملک کے اندرونی حصے تک پہنچنا چاہتے ہیں اور پھر جنگل کی طرف اشارہ کر کے قیدیوں سے کہا: "تمہیں ہمارا سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ چلنا ہو گا۔"

کولنس اس پر ہنسنے لگا' لیکن تیسرے قیدی ایڈورڈ کی نظریں میرے ریوالور پر تھیں۔ وہ غالباً بھانپ گیا تھا کہ ہم ان سے کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پہلے ہم نے اپنی اور قیدیوں کی رافٹ کو ساحل سے پرے جنگل میں چھپانے کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد قیدیوں سے اپنا سامان اٹھوایا اور جنگل میں گھس گئے۔ خشکی پر پہنچنے کے بعد روہمر کو کچھ ہوش آگیا تھا۔ ہم اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ لے چلے۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ ہماری شکلیں پہچان کر اس نے ہمارے نام بھی لیے اور حیرت سے سامنے دیکھ کر بولا: "یہ کیا' جنگل؟"

☆☆☆

یہ افریقہ کا جنگل تھا جس میں سفر تو کجا ہم اپنے آپ کو سمیٹ رہے تھے۔ دس دن تک ہم نے کوئی کھلی جگہ نہ دیکھی۔ ہر طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ جھاڑ جھنکاڑ' عجیب و غریب کیڑے مکوڑے اور شور مچانے والے پرندے.... اس دس دن کے سفر میں ہم تشہ ۱۱' لوزی' لیوپولڈویل اور برازویل کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور مسلسل دریائے کانگو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ جب تمام بندرگاہیں اور آبادیاں پیچھے رہ جائیں تو پھر دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا جائے' تاکہ ہم پکڑے نہ جائیں۔ کبھی کبھی ہمیں جنگل میں پگڈنڈیاں بھی مل جاتی تھیں' ہم نے انہیں استعمال نہیں کیا' بلکہ گھنی جھاڑیوں میں خود راستہ بنا کر آگے بڑھے۔ جب جھاڑیوں کی خاردار

شاخیں کپڑوں میں الجھتیں اور زخمی کرتیں، تو قیدی ہمیں کوسنے لگتے۔ قیدیوں کا غصہ ہمارے لیے خطرے کا الارم ہوتا اور ہم مزید چوکنے ہو جاتے۔ درختوں پر جھولتے اور شور مچاتے ہوئے طوطوں، ہمارے جسموں پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں اور مچھروں کے باعث نہ دن میں آرام ملتا اور نہ ہم رات کو پوری نیند سو سکتے تھے۔

ایسی ہی ایک رات کو جب میں روہمر کو ٹین کے ایک ڈبے سے پانی پلا رہا تھا اور گربیر اور ووزر امریکی قیدیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں باندھنے پر مجبور کر رہے تھے، تو موران نے جھلا کر کہا:

"اس علاقے میں کہیں غیر جانب دار بلجیم کی حکومت کی عمل داری بھی ہے؟ تم لوگ ہمیں اس حکومت کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟"

لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمیں ان قیدیوں کی ضرورت نہ ہوتی، تب بھی ہم انہیں اس ڈر سے نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ مبادا دشمن ہمارا پیچھا شروع کر دے۔ جرمنی میں ہمیں یہ اطلاعات بھی مل چکی تھیں کہ بلجین کانگو کی سیاسی صورت حال بڑی پیچیدہ ہے، چنانچہ ہم امریکی قیدیوں کے غصے اور جھنجلاہٹ کے جواب میں خاموش ہی رہے۔

۱۲ اکتوبر کو بولیو بو کی بندرگاہ سے تقریباً ۷۵ میل آگے نکل کر ہم نے راستہ تبدیل کیا ہے۔ بے خوابی، تھکن اور زخموں سے ہماری حالت خراب تھی۔ تازہ اور ٹھوس غذا کے لیے ہم ترس گئے تھے۔ آخر کار اگلے روز ہم درختوں اور جھاڑیوں سے رستہ بناتے ہوئے ذرا کھلی جگہ پر نکل آئے۔ گہرے سبز رنگ کی خود رو گھاس اور پیچ در پیچ پودوں کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے جب ہم اور آگے بڑھے، تو دریائے کانگو ہمارے سامنے تھا۔ یہ دریا اس دریا کی مانند نہیں تھا جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں اس کی چوڑائی پچاس فٹ کے لگ بھگ ہوگی، پانی بھی چند فٹ سے زیادہ گہرا نہ تھا۔ آہستہ خرام گدلے پانی، سیاہ کیچڑ اور سطح آب پر بے شمار کنول کے پتے اور جھاڑ جھنکاڑ سے یہ دریا یوں لگتا تھا جیسے کسی برساتی جوہڑ کا پانی گزشتہ چھ مہینے سے سڑ رہا ہو۔

"اسے اچھی طرح دیکھ لو، کیا یہی وہ جگہ ہے جس کی تمہیں اتنے دن سے تلاش تھی؟" کولنن نے اس سارے منظر کا جائزہ لیتے ہوئے حقارت سے کہا اور اپنے کندھے پر لدا ہوا سامان نیچے پٹخ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ گربیر نے اپنا ریوالور اس جانب گھما کر اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا، لیکن کولنن گھاس کا ایک تنکا منہ میں دبائے اسے یوں تکتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اس مقام پر دریا سے مچھلی وغیرہ پکڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن اپنے سفر کے منصوبے کے مطابق، جیسا میں نے سوچا تھا، دریا اس کے لیے عین مناسب تھا۔ ہم اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف باآسانی ۳۰۰ میل سفر کر سکتے تھے۔

شام کے چار بج چکے تھے۔ ڈھلتے سورج کی پیلی پیلی دھوپ میں سائے طویل ہوتے جا رہے تھے اور جنگل کی نمی سے بوجھل ہوا بالکل ساکن تھی۔ مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی، لیکن یو بوٹ سے لائی ہوئی باسی غذا کے تصور ہی سے جی گھبراتا تھا۔ آخر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔

اچانک میری نظر عین کنارے پر پانی کی سطح سے صرف چند انچ نیچے ایک مچھلی پر پڑی اور مچھلی بھی کوئی چھوٹی سی نہیں، پورے پانچ فٹ لمبی تھی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا اور فوراً پکارا: "ووزر، گربیر، آج مچھلی کا ڈنر ہوگا۔ بہت بڑی مچھلی ہے، کہو تو اسے گولی مار دوں؟"

ووزر اور گربیر دونوں اپنے ریوالور سنبھالے گھاس پر لیٹے ہوئے امریکیوں پر نظریں جمائے بیٹھے

تھے۔ دونوں نے بیک آواز جواب دیا: "ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ مچھلی ہے تو مار لو۔"

میں نے چپکے سے ریوالور نکال کر پانی کی سطح پر مچھلی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ جب تک مچھلی تڑپتی پھڑکتی رہی، گولی کی آواز جنگل میں گونجتی رہی۔

دوزر اور گریبر تینوں امریکیوں کو دریا کے کنارے تک لائے اور ہم نے ان سے دو سو پونڈ وزنی مچھلی پانی سے نکلوائی۔ یو بوٹ سے لائے ہوئے سامان میں ایک چاقو بھی تھا۔ میں نے وہ چاقو کولٹن کے حوالے کیا اور مچھلی صاف کرنے کا حکم دیا۔

سب کو بھوک نے ستایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی مچھلی صاف کی گئی اور ساڑھے پانچ بجے ہم نے اسے خشک پتوں اور ٹہنیوں کے الاؤ پر بھون کر کھانا بھی شروع کر دیا۔ مچھلی کے پکے ہوئے گوشت کو ہاتھوں سے نوچتے ہوئے گریبر نے کہا: "میرا خیال ہے کہ یہ مچھلی بہت عمدہ ہے اور ہمیں اس دریا سے آئندہ بھی ایسی ہی مچھلیاں ملتی رہیں گی۔ اس صورت میں ہمیں سفر کے دوران میں اس قدر سامان خوراک ساتھ لے جا کر اٹھا کر چلنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی' لہٰذا اب اس یہودی کو گولی مار دینی چاہیے۔"

امریکی قیدی ہم سے کوئی تیس فٹ پر بیٹھے تھے ایڈورڈ کے کان میں لفظ "یہودی" پڑا تو اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

میں نے اس بار گریبر کی مخالفت نہیں کی۔ ایک مچھلی کو میں گولی مار چکا تھا۔ میں نے سوچا ایک یہودی کو بھی اسی طرح گولی ماری جا سکتی ہے۔ میں نے ریوالور اٹھایا اور قیدیوں کی طرف بڑھا' لیکن کولٹن کی مسکراہٹ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ وہ مجھ پر نہیں' بلکہ میرے عقب میں کسی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اسی طرح مجھ سے آنکھ ملائے بغیر اس نے بڑے سکون سے مجھے مخاطب کیا:

"مسٹر کریبسی' میرا خیال ہے اب تم یہ ریوالور استعمال نہیں کر سکو گے۔ ذرا پلٹ کر دیکھو"۔ کولٹن نے یہ کہتے ہوئے چاقو سے میرے پیچھے اشارہ کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ گریبر اور دوزر میرے پیچھے کھڑے ہیں اور اگر کولٹن مجھے دھوکا دے کر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ دونوں صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں' چنانچہ میں نے کولٹن کے کہنے پر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ کولٹن نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ دوزر اور گریبر کے عقب میں جنگل کے کنارے پر ایک چار فٹ کا افریقی بونا کھڑا تھا۔ اس نے اپنی کمان کے چلے پر تیر چڑھا رکھا تھا اور تیر کا رخ ہماری جانب تھا میں نے فوراً گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم پوری طرح گھیرے میں آ چکے ہیں۔ تقریباً دو سو افریقی تیر کمانوں پر چڑھائے' ہماری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ گریبر نے بھی بونوں کو دیکھ لیا تھا۔

انہوں نے فوراً پلٹ کر آگے بڑھ کر بونوں کی طرف ریوالور تان لیے۔ بجھے ہوئے الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے موران نے یہ صورت حال دیکھی تو چلا اٹھا: "خدا کے لیے اب تو مجھے ایک ریوالور دے دو۔"

اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور عاجزی بھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر لپک کر چوتھا ریوالور اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔

موران نے سب سے پہلے اس بونے کو گولی کا نشانہ بنایا جو ہم سے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا تو ایک اور بونا اسے پھلانگ کر آگے آ گیا۔

دوزر' گریبر اور میں نے تڑاتڑ گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہ گولیاں کھا کھا کر گرتے تھے' تو ان کی جگہ اور بونے پہنچ جاتے' لیکن ان میں سے کسی نے ہم پر تیر نہیں چلایا۔ غالباً وہ سب ہمیں چاروں طرف سے

گھیر کر زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کولٹن سے کئی بونے لپٹے ہوئے تھے اور وہ انہیں اپنے بھاری بھرکم جسم پر سے جھٹک جھٹک کر دور پھینک رہا تھا۔ پھر ایک بونے نے اچک کر اس کا گلا دبانے کی کوشش کی اور کولٹن نے اسی چاقو سے اس کا پیٹ چیر ڈالا جس سے تھوڑی دیر پہلے اس نے دو سو پونڈ وزنی مچھلی کے ٹکڑے کیے تھے۔

ہمارے چاروں طرف بونوں کا حلقہ تنگ ہوتا جارہا تھا۔ تین بونے لپک کر آگے بڑھے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے تینوں کو باری باری پکڑ کر دور پھینک دیا' لیکن چوتھے بونے نے آگے بڑھ کر میری کنپٹی پر اتنے زور سے پتھر مارا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ میں اس وقت جنگل میں چل رہا ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور پیٹھ پر کبھی کبھی بھالے کی انی محسوس ہوتی تھی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں جانے کب سے یونہی چل رہا تھا۔ اب میں پوری طرح ہوش میں آچکا تھا۔ میرے چاروں طرف تقریباً دو درجن بونے تھے جن کی مسلسل باتوں اور بار بار ہنسنے سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد خوش ہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح جنگل میں چلنے کے بعد ہم پھر دریا کے قریب نکل آئے اور کنارے کنارے چلنے لگے۔ ایک موڑ پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا' تو معلوم ہوا کہ میرے سب ساتھی زندہ ہیں اور قیدی بنالیے گئے تھے' حتیٰ کہ رو ہمر کو بھی چار بونے گھسیٹتے اور سہارا دیتے ہوئے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ ایک مقام پر دریا کچھ چوڑا تھا اور پانی بھی وہاں کچھ زیادہ تھا۔ دریا کے کنارے درخت کے کھوکھلے تنوں سے بنائی ہوئی چند کشتیاں پڑی تھیں ہمیں ان کشتیوں میں لاد کر دریا پار کرایا گیا اور اس کے بعد پھر گھنے جنگلوں میں سفر شروع ہو گیا۔ سورج ڈوب گیا تھا اور اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔

کئی میل پیدل چلنے کے بعد ہم افریقیوں کے ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں تقریباً تیس جھونپڑیوں پر مشتمل تھا' لیکن یہاں کی خاص چیز جس نے ہمیں متوجہ کیا' وہ گاؤں سے باہر احاطہ تھا۔ اس احاطے کے چاروں طرف درختوں کی لمبی لمبی شاخیں گاڑ کر انہیں جنگلی پودوں اور رسی کی مانند بیلوں کے ذریعے آپس میں مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا۔ احاطے میں ایک جانب سات چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں اور ان کے سامنے ایک بھاری سی میز اور درخت کے تنوں سے بنائی ہوئی کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ بونوں نے ہمیں جانوروں کی طرح اس احاطے میں دھکیل دیا۔ وہ بار بار گردن گھما کر ہماری جانب دیکھ رہے تھے اور سب نے اچانک دھیمی آواز میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً وہ اپنی بلند آوازوں سے سوئے ہوئے گاؤں کو جگانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے سوچا کہ شاید ہمارے شور مچانے پر گاؤں سے ہماری مدد کو کوئی پہنچ جائے۔ دماغ میں یہ خیال آتے ہی پہلے میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو رسی کی گرہ سے آزاد کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس کے بعد چلانا شروع کیا' لیکن میری آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ عین اسی وقت ایک بونے نے آگے بڑھ کر میرے سر پر کوئی چیز ماری اور میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

صبح افریقی طوطوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو جھونپڑی میں ایک موٹی سی چٹائی پر پڑے پایا۔ میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور پیاس کی وجہ سے منہ خشک تھا۔ چند لمحے بعد تین بونے میری جھونپڑی میں داخل ہوئے اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا.... میں خوف سے لڑکھڑاتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔ ڈوزر' گریبر' موران' کولٹن اور ایڈورڈ پہلے ہی میز کے چاروں طرف

کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ گاؤں کی جھونپڑیوں سے عام قد و قامت کے نیگرو نکل نکل کر احاطے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

"آخر یہ کیا مصیبت ہے؟" موران زیر لب بڑبڑایا' عین اسی لمحے ہم سب کی نظریں اس نیگرو کی طرف اٹھ گئیں جو گاؤں کی سب سے بڑی جھونپڑی سے نکل کر احاطے کی طرف آرہا تھا۔ اس زبردست قامت کا نیگرو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس سیاہ فام دیو کا قد چھ فٹ چار انچ کے قریب تھا اور وزن ڈھائی سو پونڈ سے کم نہ ہوگا۔ اس کے پیٹ پر چاقو کے زخموں کے نشانوں سے ڈھال کی تصویر بنی ہوئی تھی اور جسم پر ایک لنگوٹی اور گلے میں کسی جانور کے دانتوں کی لڑی کے سوا کوئی لباس نہ تھا' لیکن جس چیز پر ہمیں حیرت ہوئی وہ اس کی رو پہلی فریم کی عینک اور دانتوں میں دبا ہوا ایک لمبا سنہری رنگ کا منقش سگریٹ ہولڈر تھا۔

وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر سیدھا احاطے کی طرف آیا اور باہر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے خاموشی سے ایک ہاتھ بلند کیا۔

یہ ایک اشارہ تھا جسے دیکھتے ہی احاطے کے اردگرد جمع ہونے والے لوگ فوراً وہاں سے کھسک گئے۔ اس کے بعد وہ نیگرو احاطے میں داخل ہوا اور ہماری میز کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"گڈ مارننگ سر' کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

نیگرو نے انگریزی میں ہمیں مخاطب کیا' لیکن ہم میں سے کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا' چنانچہ نیگرو کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی اور اس نے بلیجن سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا: "بیٹھوں گا تو میں ضرور۔" اور یہ کہہ کر وہ دھم سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد پہلے اس نے ایک لمبا سانس لیا'

ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرایا: "سار' میرے خیال میں یہ کوئی اچھی جگہ نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ووزر انگریزی بالکل نہیں سمجھتا تھا' وہ چڑ کر جرمن میں کچھ کہنے لگا تو میں نے میز کے نیچے سے پاؤں پر ٹھوکر مار کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

نیگرو جو ووزر سے کچھ سننے کے لیے بڑی مشتاق نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا' اس کی خاموشی پر جھنجلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد جب اس کا غصہ کم ہوا' تو وہ پھر مسکرا کر بولا: "میرا نام انٹیوئن ایم رنا ہے۔ میں انگریزی زبان بڑی اچھی طرح بول سکتا ہوں اور عوام کی زبان لنگالہ بھی بول لیتا ہوں' لیکن افسوس کہ آپ لوگ وہ زبان نہیں سمجھتے۔"

امریکیوں نے مجھے میز کے نیچے سے ووزر کو ٹھوکر مارتے دیکھ لیا تھا اور وہ میرے اشارے کا مطلب سمجھنے کے بعد بالکل خاموش تھے۔ ایم رنا اس صورت حال سے کچھ پریشان سا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا:

"رات جب میرے بونے آپ لوگوں کو پکڑ کر لا رہے تھے تو میں نے آپ سب کو دیکھ لیا تھا' لیکن میں اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

ہم نے اس بار بھی جب اس کی بات کا جواب نہ دیا' تو اس نے جھلا کر زور سے میز پر ہاتھ مارا اور پھر اپنا غصہ بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے بولا: "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ مجھے پاگل کر کے چھوڑیں گے۔ اچھا تو یونہی سہی' میں ہی بولتا ہوں۔" اس کے بعد وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا: "میری عمر اٹھائیس سال ہے۔" ہم اب بھی چپ رہے۔

"تو کیا تم نہیں بولو گے؟" ایم رنا گرج کر بولا' اور ایک دم کھڑے ہو کر اتنی خوفناک چیخ ماری کہ سارا جنگل گونج اٹھا۔ اسی لمحے احاطے کے چاروں طرف

بونوں کے سر ابھرنے لگے۔ سب کے ہاتھوں میں بھالے تھے اور تیز تیز بڑی خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی اور سب کے سب ہم سے صرف بیس فٹ کے فاصلے پر احاطے کے چاروں طرف آکر خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

میں نے یہ منظر دیکھ کر کچھ دیر سوچا اور کھنکار کر بولا:

"میری عمر اکیس سال ہے اس کے بعد باری باری ہم سب نے اپنی عمر بتائی۔ دوزر ہم سب میں بڑا تھا۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ گربیر، موران اور کولٹن انتیس سال کے تھے اور ایڈورڈ کی عمر چھبیس سال تھی۔

ہمیں بولتا دیکھ کر ایم رنا کی باچھیں کھل گئیں:

"خوب، خوب۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم سب تقریباً ایک ہی عمر اور ایک ہی نسل کے لوگ ہیں اور ہم سب کے سوچنے کا انداز بھی یقیناً ایک جیسا ہو گا۔"

اس کے بعد وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک ایک لفظ پر رکا اور میز پر مکا مارتے ہوئے بولا: "اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ افریقی نوجوانوں میں بلجیم، فرانس اور دوسری سامراجی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک ابھر رہی ہے تو آپ میری اس بات کا مفہوم بخوبی سمجھ لیں گے۔ ہم ان تمام لوگوں کے خلاف ہیں جو ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ میرا اشارہ بولیوبا کے مشنری فادر، انیٹوئن کی جانب ہے جس کی تعلیمات ایک بوڑھے کی تعلیمات ہیں۔ فادر انیٹوئن اور اس کے شیطانی اسکول کی ہمیں مذمت کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ...."

یہاں گربیر نے اس کی بات کاٹ دی۔ گربیر انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتا تھا، لیکن وہ چاروں طرف جمع ہونے والے بونوں کے تیور دیکھ کر پریشان تھا اور اپنی جرمن زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔ "ہمیں یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔" ادھر موران اور دوزر بھی یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ ان دونوں نے لپک کر میز کے نیچے ہونے کی کوشش کی تاکہ میز کو ایم رنا پر الٹ دیں، لیکن اسی وقت بونوں نے تیر اور نیزے اپنے اوپر بلند کر لیے، حصار بڑا سخت تھا اور ہم سب کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، چنانچہ دوزر اور موران نے ارادہ بدل دیا اور پھر سیدھے ہو کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

ایم رنا ہماری ان حرکتوں کو نظرانداز کر کے مسلسل تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ اس کے قبیلے کا نام بوجا تھا اور بونے اس کے غلام تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ بوجا قبیلے کے لوگ بلجین حکام کے خلاف بغاوت کر دیں، لیکن ذہین اور تعلیم یافتہ لیڈروں کی رہنمائی کے بغیر بغاوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایم رنا نے خود بولیوبا میں فادر انیٹوئن کے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن فادر انیٹوئن تو بلجین تھا، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ بوجا قبائل کو خود بلجیم کی حکومت کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتا۔

ایم رنا نے یہ بھی بتایا کہ جس دن ہم جنگل میں داخل ہوئے تھے اسی دن اسے ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اگرچہ اس نے یہ بات یقین کے لہجے میں نہیں کہی، لیکن یہ بتاتے ہوئے اس کا سینہ فخر سے پھول گیا کہ مچھلی کو مارنے کے لیے جب ریوالور استعمال کیا گیا تو اس کی آواز پر بونوں نے ہمیں عین اسی مقام پر جا پکڑا۔ فادر انیٹوئن ہمیں یہ فن کبھی نہیں سکھا سکتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ایم رنا آخر ہم سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ کیا ہم ہی وہ "ذہین اور تعلیم یافتہ لیڈر" ہوں گے جنہیں حکومت کے خلاف بغاوت میں بوجا

قبائل کی رہنمائی کرنا پڑے گی۔

"تم جرمن ہو اور وہ تینوں امریکی ہیں۔" ایم رنا نے غور سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پھر بولنا شروع کیا۔ "لیکن یہ جنگ جو تم لڑ رہے ہو' آئندہ چار سال میں ختم ہو جائے گی اور پھر بس میری جنگ باقی رہ جائے گی۔ میری جنگ یعنی بوجا کی جنگ۔"

ایم رنا کی آنکھیں ایک آزاد اور شان دار مستقبل کے تصور سے چمک رہی تھیں۔ اچانک وہ پلٹا اور احاطے کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف منہ کر کے لنگالا زبان میں بلند آواز سے کچھ کہا۔ چند لمحے انتظار کے بعد پچھلی صفوں سے بوجا قبیلے کی سات جوان لڑکیاں شرماتی اور ہنستی ہوئی آگے بڑھیں اور احاطے میں داخل ہو کر ہمارے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

ایم رنا نے ہم سے نظریں ملائے بغیر مسکرا کر کہا: "مجھے مجرد لوگ پسند نہیں' میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ جوڑے بن کر رہیں۔"

یہ بات ایڈورڈ کی برداشت سے باہر تھی۔ اس نے با آواز بلند فریاد شروع کر دی: "اوہ خدا' اوہ میرے خدا۔"

ایم رنا کو ایڈورڈ کا یہ احتجاج ناگوار گزرا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور میز پر گھونسا مار کر گرجا: "سار' اب تو آپ لوگ میرا مقصد سمجھ گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کی اولاد اس قسم کی ہو کہ اسے بولیوبا میں فادر انٹوئن کے اسکول کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم ان بچوں کو لندن' پیرس اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لیے بھیجیں گے۔ وہ بچے بڑے ہو کر آزادی پسند' ذہین اور پڑھے لکھے ہوں گے اور ہمارے قبیلے کے لوگوں کی رہنمائی کر سکیں گے۔"

ہم سب ایم رنا کے اس اچھوتے اور دور از کار منصوبے پر ششدر رہ گئے' لیکن اس شخص سے بحث کر کے اسے قائل کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی مسلسل دو ہفتے تک ہم اسے مختلف دلائل سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ اس کا منصوبہ قبیلے کے لیے مفید نہ ہوگا۔

روزانہ شام کو چھ بجے ایم رنا ہم سے ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا۔ ایک دن ہم نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر افریقی بچے ہی پڑھ لکھ کر قیادت کے قابل ہو جائیں تو وہ سفید یا دوغلی نسل کے بچوں سے یقیناً بہتر ثابت ہوں گے۔ ہو سکتا ہے قبیلے کے قدامت پسند لوگ ایسے لیڈروں کو قبول نہ کریں جس کے خون میں سفید نسل کے خون کی آمیزش ہو' لیکن ایم رنا نے یہ دلیل بھی یہ کہہ کر رد کر دی کہ فادر انٹوئن بھی یہی کہتا تھا' لیکن وہ اکثر جھوٹ بولتا ہے' اس لیے اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔"

اس دوران میں وہ ساتوں لڑکیاں شام کو ٹوکریوں میں ہمارے کھانے کے لیے ہاتھ کا بھنا ہوا گوشت' کیلے اور افریقی سبزیاں لے کر پہنچ جاتیں۔ ہمارے ہاتھ ہروقت بندھے رہتے تھے' اس لیے وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں۔ اگرچہ ساٹھ مربع فٹ کے احاطے میں ہمیں چہل قدمی کی اجازت مل گئی تھی' تاہم جان کے خوف سے ذہن کو اتنا سکون ہی نہ ملتا تھا کہ کچھ سوچ سکیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ ایم رنا اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد ہم سب کو ہلاک کر دے گا اور ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہ جا سکے گا۔

روہمر کی بیماری سے ہم الگ پریشان تھے۔ امریکی قیدیوں سے دشمنی کا احساس ختم ہو گیا تھا اور اب ہم سب روہمر کے بارے میں فکر مند تھے۔ وہ اپنی جھونپڑی میں صبح و شام نیم بے ہوشی کی حالت میں رہتا۔ اس کے زخم اگرچہ اتنی بری حالت میں نہ تھے' تاہم جنگل میں سفر کرتے ہوئے وہ نیند کی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس پر ہروقت غنودگی طاری رہنے لگی۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو اس حالت میں چھوڑ کر

فرار کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے' لیکن ایک دن جب ایم رنا نے دوسرے چوکیداروں کے علاوہ دن رات کے پہرے کے لیے چھ مزید چوکیدار احاطے کے چاروں طرف متعین کر دیے تو فرار کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ یہ چھ چوکیدار دراصل چھ مخبوط الحواس بونے تھے جن کے پیروں میں لمبی رسیاں باندھ کر احاطے کے باہر اس طرح پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر جا نہ سکیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ جنگل کی کوئی نشہ آور گھاس کھلا کھلا کر ان کی ذہنی صلاحیتیں ختم کر دی گئیں تھیں اور وہ ہم پر پہرہ دینے کے لیے اتنے سدھے ہوئے تھے جتنا کہ اچھی قسم کے پالتو کتے کو سدھایا جا سکتا ہے۔

اس صعوبت خانے میں وقت اور دن گزارنے کا احساس تقریباً ختم ہو چکا تھا' لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اکتوبر کی تیس تاریخ تھی جب ایم رنا نے اپنے گھناؤنے منصوبے کا ذکر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دن شام کو بونی لڑکیاں ہمیں کھانا کھلا کر واپس نہ گئیں اور ہمارے ساتھی بھی رسیوں سے آزاد کر دیے گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ایم رنا سے اس کے منصوبے میں تعاون کا مطلب کچھ عرصے بعد ہماری اپنی موت ہو گا' لیکن مکمل انکار اور فرار کے راستے بھی مسدود تھے۔ ادھر ایم رنا کو اپنے مقصد کی سچائی پر اس قدر یقین تھا کہ ہمارے ساتھ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ کئی بار رو بھی پڑا۔ اس نے ایک مرتبہ ہمیں اپنے سینے سے لگا کر کہا:

"میری عمر اٹھائیس سال ہے۔ تمہاری سوچ' میری سوچ سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ ہم سب ایک ہی نسل کے لوگ ہیں۔"

کچھ عرصے کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا جس سے ہمیں پتا چلا کہ بونے ایم رنا کے غلام نہیں' بلکہ ایم رنا سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے' جتنی ہمیں اس سے نفرت ہو سکتی تھی' البتہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو ہم سے کیا دشمنی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن بونے قبیلے کی ایک عورت ہمارے احاطے کے سامنے پہنچی اور اس نے وہاں ایک ڈرم میں کچھ جڑی بوٹیوں کو کوٹنا پیسنا شروع کر دیا۔ وہ عورت دن بھر اس کام میں مصروف رہی اور اس دوران میں ہمیں متوجہ کر کے اشاروں میں بار بار سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ یہ جڑی بوٹیاں کھانے کے لیے ہیں اور بے حد لذیذ ہیں۔

شام کو جب ایم رنا ہم سے ملنے کے لیے آیا تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے اچٹتی نظر سے احاطے کے آس پاس کا جائزہ لیا اور ہم سے کہنے لگا:

"سار' یہ بونے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر آئیں تو آپ لوگ ہرگز نہ کھائیں۔ ایسی چیزوں سے معدہ خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم لوگ ایم رنا کی اس بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔ پھر ہم نے جب اس سے پوچھا کہ بونے اس کے دشمن کیوں ہو گئے تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس طرح ایم رنا کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ تھا کہ جب بونے اس کے غلام ہیں تو وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام کرنے کی کیسے جرات کر سکتے ہیں۔

تاہم اس رات' جیسا کہ ایم رنا نے کہا تھا' کچھ بونے واقعی چند پیالے ہاتھوں میں اٹھائے احاطے تک آئے اور بڑے ادب سے جھک کر اور مسکراتے ہوئے ہمیں وہ پیالے پیش کر کے چلے گئے۔ ان پیالوں میں لئی کی طرح کوئی چیز گھوٹ پیس کر بھری گئی تھی۔ خوشبو اگرچہ اچھی تھی' لیکن ہم نے احتیاطاً اسے چکھے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اتفاق سے گاؤں کا ایک آوارہ کتا احاطے کے قریب آ نکلا۔ میں نے جنگلے سے ہاتھ نکال کر اس کتے کو پکڑ کر اندر کھینچ

لیا۔ ہمارے تھپکنے اور چمکارنے سے کتے کا خوف دور ہوا تو ہم نے بونوں کے لائے ہوئے پیالوں میں سے ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے وہ غذا بڑی رغبت سے کھائی' لیکن چند منٹ بعد کتا لڑکھڑاتا ہوا گاؤں کی طرف چلا' تو چاند کی روشنی میں دیکھتے دیکھتے اس نے دو قلابازیاں کھائیں اور ٹھنڈا ہو گیا.... ہمارا یہ تجربہ وہ بوجا عورتیں نہ دیکھ سکیں جو اس وقت ہماری جھونپڑیوں میں چٹائیاں درست کرنے میں مصروف تھیں' چنانچہ ہم نے جلدی جلدی ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر تمام پیالوں کی زہریلی غذا اس میں ڈال کر دفن کر دی۔

ہمیں حیرت اس بات پر تھی کہ اس ایک واقعے کے بعد بھی بونے روزانہ شام کو ہمارے لیے پیالوں میں وہی زہریلی غذا لاتے رہے اور ہمارے روز کے فرائض میں یہ کام بھی شامل ہو گیا کہ ہم وہ پیالے لے لیا کریں اور چپکے سے گڑھا کھود کر زہریلی غذا دفن کر دیا کریں۔ اس صورت حال سے ہمیں کم از کم یہ یقین ہو گیا کہ بونوں پر ایم رنا کا اتنا زبردست کنٹرول نہیں جس کا وہ دعوٰی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ قریب ہی کوئی اور قبیلہ ہو جو ایم رنا کے قبیلے سے زیادہ طاقتور ہو اور ایم رنا کو یہ خطرہ ہو کہ اگر بونوں کو ناراض کر دیا تو وہ اس قبیلے سے جا کر شکایت کر دیں گے۔

اکتوبر ختم ہو چکا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے' ہماری تکلیفوں اور خوف میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بوجا لڑکیوں سے جو' ہم پر مسلط کر دی گئی تھیں' بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ ادھر ایم رنا ہماری سرگرمیوں سے پوری طرح واقف رہتا اور روزانہ شام کو آکر ہم سے بحث کیا کرتا۔ ایک دن اس نے ہمیں مقامی شراب پیش کی۔ ہم لوگ اپنی تکلیفیں بھول جانا چاہتے تھے' چنانچہ سب نے جی بھر کر پیاس بجھائی۔ نشے میں بدمست ہونے کے بعد ہم لوگ آپس ہی میں لڑ پڑے۔ میں اور یہودی ایڈورڈ جانے کس بات پر الجھے تھے' لیکن ہماری لڑائی کے دوران میں موران مجھے شاباش دے رہا تھا جب کہ گربیر جو کبھی یہودی سے سخت نفرت کرتا تھا' میرے مقابلے میں ایڈورڈ کی مدد کرتا رہا۔ ادھر احاطے میں ایم رنا یہ منظر دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ آخر ہمیں اپنی اس تذلیل کا احساس ہوا اور ہم نے فوراً لڑائی بند کر دی۔

بیمار اور مرتے ہوئے رو ہمر سے قطع نظر ہم تینوں میں سب سے خراب حالت دوزر کی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ خوف نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا اور ایک دن جب اس نے بڑی لجاجت اور درد کے ساتھ مجھ سے اپنے ان سخت الفاظ کی معافی چاہی جو اس نے کبھی یو بوٹ پر میرے لیے استعمال کیے تھے تو مجھے اس کی اس بات پر حیرت کے علاوہ شرمندگی بھی ہوئی۔ اس رات دوزر نے بونوں کے لائے ہوئے پیالوں میں سے ایک پیالہ سنبھال کر جھونپڑی میں رکھ لیا اور رات کو جب اس کی جھونپڑی میں متعین بوجا لڑکی نے چیخ ماری تو ہم سمجھ گئے کہ دوزر مر چکا ہے۔

دوزر کی خودکشی کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ صبح جب اس کی لاش احاطے میں لائی گئی تو بونوں نے اسے اپنی کامیابی جان کر خوشی سے ناچنا شروع کر دیا جب کہ ایم رنا نے اس حادثے پر صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ہم محسوس کر رہے تھے کہ آخر کار یہی وقت ہم پر بھی ایک دن ضرور آئے گا۔ کولنن کو اگرچہ دوزر کی موت پر افسوس ہوا' لیکن اس کی حالت ہم سے مختلف تھی۔ ہم نے اسے کبھی زیادہ فکر مند نہیں دیکھا۔ وہ دن بھر احاطے کے بنگلے کے قریب بازوؤں پر ٹھوڑی رکھے الٹا پڑا رہتا۔ اس کی نظریں سامنے جنگل میں ایک بوجا لڑکے پر جمی رہتیں۔ جو دن بھر زمین

کے ڈبے اور تاروں سے بنا ہوا ایک عجیب و غریب ساز ہاتھی دانت مار مار کر بجایا کرتا تھا۔ یہ ساز کیا تھا' شور پیدا کرنے کا ایک ذریعہ جس سے سارا جنگل گونجتا رہتا تھا اور ہم اس شور سے سخت عاجز آئے ہوئے تھے' لیکن کولٹن نہ صرف اسے دلچسپی سے سنا کرتا' بلکہ اس بوجا لڑکے کی اشاروں اشاروں میں تعریف کرتا اور اسے داد دیا کرتا۔ کولٹن کی اس حرکت پر یوں تو ہمیں غصہ آتا ہی تھا لیکن موران نے تو ایک دن اسی بات پر کولٹن کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ کولٹن نے جوابی حملہ کرنے کے بجائے جھنجلا کر صرف اتنا کہا:

"دیکھو مسٹر موران' ذرا ہوش میں آجاؤ۔ تم سمجھتے ہو مجھے اپنی مصیبت اور انجام کی خبر نہیں' حالانکہ ممکن ہے میں فرار کا کوئی منصوبہ ہی تیار کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد کولٹن نے ہمیں بتایا کہ اس عجیب و غریب ساز کا نام "لی لمبے" ہے اور اوبا کے بیان کے مطابق یہ افریقی اس ساز کے لیے ٹین اور تار سوڈان سے منگواتے ہیں۔

یہاں یہ بھی بتا دینا مناسب ہوگا کہ اوبا اس بوجا لڑکی کا نام تھا جو کولٹن کی جھونپڑی میں متعین تھی اور کولٹن کی باتوں سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ اوبا اور کولٹن کے تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ وہ لڑکی اپنے قبیلے کی خواہشات کے خلاف کولٹن کی مدد کرنے پر تیار ہو گئی تھی' لیکن نومبر کا مہینہ بھی اسی طرح گزر گیا اور ہم فرار کا کوئی کامیاب منصوبہ نہ بنا سکے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ایک دن ایم رنا اپنے تیر انداز بونوں اور چند بوجا جوانوں کو ساتھ لیے علی الصباح احاطے میں آیا تاکہ مرتے ہوئے روہمر کا کام تمام کر دے۔

ہملٹ روہمر کی حالت بدستور وہی تھی۔ بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے سوا اس پر کبھی کوئی دوسری حالت طاری نہ ہوتی۔ ایم رنا ابھی تک اس کی صحت کا منتظر رہا تھا' لیکن اب وہ نا امید ہو کر اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔

بے ہوش روہمر کو اٹھا کر احاطے میں لایا گیا۔ بوجا نوجوان بھالے سنبھالے ہم پر پہرہ دینے لگے اور تیر انداز بونوں نے روہمر کو گھیر کر کمانیں سنبھال لیں۔ میں نے روہمر کی جان بچانے کی آخری کوشش کی اور ایم رنا سے چلا کر کہا:

"ٹھہرو' ابھی اسے نہ مارو' ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں۔" میں نے یہ بات بڑے یقین کے ساتھ کہی تھی' لیکن ایم رنا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا:

"کیا کہا' اس کا علاج کر سکتے ہو؟ فادر اینٹوئن کی دوا کے بغیر اس کا علاج کر سکتے ہو؟ نہیں مسٹر کریب' آپ جھوٹ بول کر اپنے ساتھی کی جان بچانا چاہتے ہیں میں نے اس قسم کے بہت مریض دیکھے ہیں اور یہ بات افسوسناک ہے کہ فادر اینٹوئن کے سوا ابھی ان کا کوئی علاج نہ کر سکا اور پھر آپ کے ساتھی نے بوجا قبیلے کی لڑکی کی مدد نہیں کی اور نہ یہ اس کے قابل ہے۔"

ایم رنا نے اس تقریر کے بعد بڑے دکھ اور تاسف کے ساتھ ہاتھ بلند کیا۔ عین اسی وقت بے چارے روہمر نے اسی غنودگی کے عالم میں منہ کھول کر کچھ کہنا چاہا لیکن چھ تیروں نے اسی لمحے اس کے کھلے منہ سے گزر کر اس کے حلق اور کھوپڑی کو چیر ڈالا۔ اور پانچ مزید تیروں نے اس کے بازوؤں' ٹانگوں اور سینے کو زمین سے پیوست کر دیا۔

ہمارے ایک ساتھی نے خودکشی کر لی تھی اور دوسرے کو یوں بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اس دن موران غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے ہمیں بھاگ نکلنے کا مشورہ دیا' لیکن جب وہ بھاگنے کا کوئی منصوبہ نہ سمجھا سکا تو اس نے ہمیں بزدلی کے طعنے بھی دیے:

"دیکھ لو' آج تمہارے اپنے ساتھی کا کیا حشر ہوا

اور اگر تم اسی طرح بھاگ نکلنے سے ڈرتے رہے تو تمہارا بھی یہی انجام ہو گا۔"

موران کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ رات کو احاطے سے نکل کر پہلے ان مخبوط الحواس بونوں کا گلا گھونٹ دیا جائے جو کتوں کی طرح ہم پر پہرہ دیتے تھے اور پھر جنگل میں پناہ ڈھونڈی جائے' لیکن جنگل میں بونوں اور بوجا قبیلے کے لوگوں سے کیسے بچا جائے' یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔

موران اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ وہ رات بڑی اندھیری تھی اور چاند نکلا نہیں تھا۔ ہم نے موران کو احاطے کا جنگلا پھلانگتے تو دیکھا' لیکن اس کے بعد صرف آوازیں سنائی دیں۔ پہلی آواز ایک بونے کی چیخ تھی' لیکن چیخ نامکمل رہ گئی۔ موران کے مضبوط ہاتھوں نے بونے کا گلا اچھی طرح دبوچ لیا تھا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد ہمیں موران کے بھاگنے کی آواز آئی' وہ جنگل میں بھاگا جا رہا تھا' لیکن اسی وقت جیسے سارا گاؤں ایک دم جاگ اٹھا۔ افریقیوں کے دوڑنے بھاگنے اور چلانے سے سارا جنگل گونج رہا تھا' پھر ایک خوفناک چیخ سنائی دی اور ساری بلند آوازیں دب گئیں۔ تھوڑی دیر بعد احاطے کی جانب افریقیوں کا ایک جلوس بڑھ رہا تھا۔ درمیان میں دو بوجا جوانوں نے بھالوں کی نوک پر موران کی لاش بلند کی ہوئی تھی۔

اگلی صبح موران کی لاش دفنانے کے بعد جب ایم رنا ہمارے پاس آیا' تو اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا' لیکن ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے وہ اس مخبوط الحواس بونے کی لاش پر پہنچا جسے رات موران نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا۔ ایم رنا کو اس کی موت کا اس قدر افسوس تھا کہ وہ وہاں کھڑے ہو کر باقاعدہ آنسو بہا کر رویا۔ اس کے بعد جب وہ ہماری طرف پلٹا' تو اس کا رویہ مختلف تھا۔ اس نے جیب سے ڈائری نکال کر اس میں سے موران کا نام کاٹتے ہوئے کہا:

"یہ انتہائی طفلانہ حرکت تھی' کیا آپ لوگ کبھی یہ نہ سمجھیں گے کہ میں آپ کو اپنا ساتھی سمجھتا ہوں۔ ہم سب ایک عمر اور ایک نسل کے لوگ ہیں اور میرا دشمن صرف فادر اینٹوئن ہے۔"

ہمارے ایک ساتھی نے خودکشی کر لی تھی۔ دوسرا بیمار تھا جسے قتل کر دیا گیا اور اب تیسرا فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ اس دن ہم نے آپس میں فادر اینٹوئن کے بارے میں بہت غور کیا یہ بلجین مشنری اس جگہ سے تقریباً پچاسی میل دور بولیو با میں رہتا تھا اور ایم رنا کی باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ایم رنا اگر کسی سے خوف زدہ ہے تو اسی پادری سے' لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ آخر فادر اینٹوئن تک اپنی حالت کی اطلاع کیونکر پہنچائی جائے۔ میں گربیر اور ایڈورڈ اس مقصد کو سامنے رکھ کر مختلف منصوبے بناتے رہتے تھے جب کہ کولٹن سب سے الگ تھلگ کی "موسیقی" سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔

دسمبر کے وسط میں ہم نے ایم رنا کے لڑکے اور بہو کو بطور یرغمال اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ایم رنا کے لڑکے کی عمر بمشکل تیرہ سال اور اس کی بیوی کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ یہ دونوں بچے اکثر کھیلتے ہوئے احاطے کے قریب آ جایا کرتے تھے۔

ایک دن صبح جب ہم نے ان دونوں ننھے منے "میاں بیوی" کو احاطے کے قریب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے دیکھا تو فوراً ان کو متوجہ کرنے کے لیے احاطے میں کبڈی کی قسم کا کھیل شروع کر دیا۔ یہ کھیل اتنا دلچسپ تھا کہ نہ صرف دونوں بچے' بلکہ قریب قریب کے اور لوگ بھی احاطے کی باڑھ کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ دونوں بچے گردنیں آگے بڑھا بڑھا کر ہمیں دوڑتے بھاگتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے' چنانچہ موقع پا کر گربیر اور ایڈورڈ ایک دوسرے کا پیچھا

کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچے اور لپک کر دونوں کو احاطے کے اندر گھسیٹ لیا۔ اسی وقت کچھ نیگرو اس صورت حال سے ایم رنا کو مطلع کرنے کے لیے گاؤں کی طرف دوڑے اور ہم نے ان چیختے چلاتے میاں بیوی کو ایک جھونپڑی کے کونے میں لا بٹھایا۔

جیسا کہ ہمیں توقع تھی' ایم رنا فوراً ہی پہنچ گیا۔ اس کی حالت بڑی عجیب تھی۔ چہرے پر کبھی خوف کی لہر آتی' تو کبھی غصے سے کپکپانے لگتا: "میرے بچوں کو چھوڑ دو۔" ایم رنا احاطے کے باہر ہی سے چلایا۔

"پہلے ہمیں آزاد کر دو۔" میں نے اسی سختی سے جواب دیا۔ اس دوران میں گربیر اور ایڈورڈ دونوں بچوں کو جھونپڑی کے دروازے میں لے آئے اور ان کی گردنیں ہاتھوں میں تھام کر ایم رنا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"نہیں تمہیں ابھی آزاد نہیں کیا جا سکتا۔" ایم رنا نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

میں نے فوراً کمان سے اصل تیر نکالا: "تو پھر ہم تمہارے بچوں کو ابھی مار ڈالیں گے۔"

ایم رنا کے چہرے پر کرب اور غصے کے آثار نمودار ہوئے' وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا اور ہم اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ آخر کار وہ بڑی کوشش سے مانا۔

"اچھا' تو پھر انہیں مار دو اور میں تمہیں اسی وقت ختم کر دوں گا۔"

ہمیں ایم رنا سے اس جواب کی قطعاً توقع نہ تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچا کہ ایم رنا ہمارے دو ساتھیوں کو پہلے ہی قتل کر چکا ہے اور آخر کار ہمیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس وقت اگر ہم اس کے بچوں کو ہلاک کر دیتے' تو وہاں سے نکل بھاگنے کی ساری امیدیں نہ صرف ختم ہو جاتیں' بلکہ اسی لمحے ہم قتل کر دیے جاتے۔ گربیر اور ایڈورڈ کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور دونوں بچے اپنی گردنیں سہلاتے ہوئے دوڑ کر ایم رنا کے پاس پہنچ گئے۔ ایم رنا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا:

"شکریہ سار' ہم آخر ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں کیونکہ ہم ایک عمر اور نسل کے ساتھی ہیں۔"

ہمارا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا' لیکن بچوں کی جان بخشی پر ایم رنا ہم سے بہت خوش تھا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ اگلے دن ہمیں کیلے اور ہاتھی کے بھنے گوشت کے بجائے بہت نفیس غذا ملے گی جس میں شکر قند' سانپ کے کباب اور چیتے کا سینہ بھی شامل ہو گا۔

آدھی رات کے قریب اچانک لی لبے کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ لی لبے کا آہنگ پہلے سے ذرا مختلف تھا جس پر میں نے توجہ نہ دی' لیکن اندھیری رات کی خاموشی میں اس کا شور خوفناک تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اگلے دن شام کو بوجا قبیلے کے چھ نوجوان بڑے بڑے پیالوں میں ہمارے لیے جو کھانا لے کر آئے' وہ واقعی پہلے سے مختلف تھا۔

رات کو لی لبے کا بدلا ہوا آہنگ اور اگلے دن ہماری غذا میں تبدیلی کے اس واقعے پر میں نے چنداں غور نہ کیا' لیکن کولنن نے اس بات کو اہمیت دی اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا' وہ اس نے ہمیں چھ ہفتے گزرنے کے بعد بتایا۔ اس دوران میں کولنن انتہائی خاموشی سے اوبا کی مدد سے فرار کا منصوبہ بناتا رہا اور جب اس نے ہمیں اپنا منصوبہ بتایا تو حیرت سے ہمارے منہ کھلے رہ گئے۔ کولنن نے پہلی بات یہ بتائی کہ ہماری غذا میں سے کوئی چیز اس علاقے میں پیدا نہیں ہوتی۔ دوسری یہ کہ ایم رنا کا قبیلہ جنگجو قبیلہ ہے اور خوراک کی فراہمی کا کام کوئی دوسرا قبیلہ کرتا ہے۔ دوسرے قبیلے کے یہ پرامن لوگ جنگل میں کہیں قریب آباد ہوں گے اور لی لبے کی آواز دراصل

اس دوسرے قبیلے کے ساتھ ایک قسم کا مواصلاتی نظام ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق خوراک کے لیے لی لبے ہی سے سگنل دیا جاتا ہے۔

"لیکن ہم نے آج تک اس دوسرے قبیلے کے کسی آدمی کو یہاں کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ایم رنا یہ نہیں چاہتا کہ باہر کے لوگوں کو اس صورت حال کا علم ہو اور اسی لیے وہ ان بونوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا جو روزانہ ہمارے لیے زہریلی خوراک لے کر آتے ہیں.... میرا خیال ہے کہ یہ دوسرا پر امن قبیلہ حکومت کا وفادار اور فادر اینٹوئن کے زیر اثر ہے۔ اس قبیلے کے لوگ جب کھانا لے کر آتے ہیں، تو ایم رنا اپنے قبیلے کے لوگوں کو جنگل میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ ان سے کھانے کے برتن لے کر خود ہی یہاں پہنچیں۔" کولٹن نے جواب دیا۔

"تب تو ہمیں اس قبیلے کو کسی نہ کسی طرح ضرور اپنی حالت سے مطلع کرنا چاہیے۔" میں نے احمقانہ انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میں لی لبے سے سگنل دے سکتا ہوں۔" کولٹن نے سر کھجاتے ہوئے کہا: "اگر اوبا مجھے ایک چاقو لادے تو میں اس بوجا لڑکے کا کام تمام کر کے لی لبے پر قبضہ کر لوں۔"

"لیکن تم جو سگنل دو گے، اس کے مطابق وہ کھانا بھجوا دیں گے۔ انہیں ہماری حالت کا علم کیسے ہو گا؟" ایڈورڈ نے اس منصوبے پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

کولٹن جھلا گیا: "تم مجھے بھی بے وقوف سمجھتے ہو؟ تمہارا خیال ہے ہمیں ڈیڑھ مہینے سے اس لیے شکر قند مل رہے ہیں کہ ہم "معزز مہمان" ہیں اور ایم رنا ہم سے بہت خوش ہے، حالانکہ اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں کیلے کی فصل ختم ہو چکی ہے اور پہلے ہمارے لیے جو غذا آتی تھی، وہ اب پیدا ہی نہیں ہو رہی۔" پھر اس نے ہمیں سمجھایا: "اگر اب لی لبے پر پرانا سگنل دیا جائے، تو اس کا مطلب ہو گا کہ ایم رنا کو کیلے، ہاتھی کا گوشت اور ساگ قسم کی وہ سبزی چاہیے جو ہمیں پہلے ملتی رہی ہے، لیکن اب چونکہ ان چیزوں کی فصل ختم ہو چکی ہے تو اس بے وقت سگنل پر اس قبیلے کے لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے اس صورت حال سے فادر اینٹوئن کو مطلع کر دیں کہ ایم رنا ناممکن چیزوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

منصوبہ ہم سب کی سمجھ میں آگیا... دو دن ہم نے شدید ذہنی ہیجان میں گزارے۔ اس دوران میں کولٹن نے اوبا کی مدد سے ایک چاقو حاصل کر لیا اور اس سے یہ بھی معلوم کیا کہ ہمارے ریوالور کس جھونپڑی میں رکھے ہوئے ہیں۔

وہ رات ہم نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ نصف شب کے قریب کولٹن اور اوبا نے مجھے جھونپڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اوبا احاطے سے نکل کر سیدھی جنگل میں اس بوجا لڑکے کے پاس پہنچی جو لی لبے کے قریب بیٹھا سگنل کے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے لڑکے کو باتوں میں لگا لیا اور ہم دونوں موقع پا کر احاطے سے باہر نکل آئے۔ میں اور کولٹن دبے پاؤں اس لڑکے کے عین پیچھے پہنچ گئے اور جس وقت وہ اوبا کے اشارے پر کسی درخت پر بیٹھا ہوا الو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، کولٹن نے لپک کر چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ میں نے فوراً زخمی لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف گھسیٹ لیا اور کولٹن اطمینان سے بیٹھ کر لی لبے بجانے لگا۔

اوبا سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پورے گاؤں میں اس لڑکے کے سوا اور کوئی لی لبے کے سگنل سے واقف نہ تھا، چنانچہ اگلی صبح کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا۔ دوپہر کو جب ایم رنا ہم سے ملنے کے لیے آیا

تو اس نے لی لبے کی جگہ سے اس لڑکے کی گمشدگی ضرور محسوس کی ہوگی' لیکن اسے یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ اس کی لاش اس وقت کولٹن کی جھونپڑی میں چٹائی کے نیچے دفن ہے۔

اگلی صبح چھ جنوری ۱۹۴۳ء کی وہ یادگار صبح تھی جب ہم نے دس میل دور دریائے کانگو میں کسی جہاز کے وسل کی آواز سنی۔ احاطے کے گرد متعین بوجا پہریداروں نے حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایم رنا بھی وسل کی آواز سن کر اپنی جھونپڑی سے باہر آیا اور بے چین نظروں سے جنگل کا جائزہ لے کر واپس چلا گیا۔ اس دن وہ دوپہر کو معمول کے مطابق ہم سے ملاقات کے لئے بھی نہ آیا۔ تقریباً تین بجے جب جنگل میں کسی موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی تو پورے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کولٹن' گربیر اور ایڈورڈ' سب احاطے کی باڑھ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم پر پہرہ دینے والے بوجا اور بونے اگرچہ اپنے بھالوں اور کمانوں کا رخ ہماری جانب کیے اپنی جگہ بدستور کھڑے رہے' لیکن ان کے چہروں پر خوف اور وحشت کے آثار نمایاں تھے۔

چند لمحے بعد جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس کو روندتی ہوئی ایک چھوٹی رینالٹ کار جنگل سے نمودار ہوئی اور جھونپڑیوں کے عین قریب آکر رک گئی۔ کار میں صرف ایک شخص سوار تھا جو لباس اور شکل صورت سے پادری نظر آتا تھا۔ اس شخص نے کار سے اترتے ہی نہایت درشت لہجے میں ایم رنا کو آواز دی اور ہم نے دیکھا کہ اس کی آواز سنتے ہی تمام بوجا عورتیں اور مرد چیختے چلاتے گاؤں کی دوسری جانب جنگل کو بھاگ کھڑے ہوئے' اور تو اور ہمارے چوکیدار بھی دہشت زدہ ہو کر اپنی جگہ سے کھسک گئے۔ یہ وہ موقع تھا جب ہم چاروں نے باڑھ پھلانگ کر گاؤں کی اس جھونپڑی کی طرف بگٹٹ دوڑنا شروع کیا جہاں ہمارے ریوالور رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے گاؤں کے لوگ اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے ہماری جانب قطعاً توجہ نہ دی' چنانچہ ہم کسی مزاحمت کے بغیر جھونپڑی میں داخل ہو گئے جہاں ایک بچہ ہمیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ہمارے ریوالور ٹنگے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ریوالور بھرے ہوئے ہیں اور کارتوس بھی وہیں موجود ہیں۔ باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ ایم رنا چھ فٹ کا ایک بھالا سنبھالے پادری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بیس فٹ کے فاصلے پر ایم رنا نے بھالا پادری کی جانب بلند کیا۔ پادری نے اگرچہ اس وقت ہمیں دیکھ لیا تھا' لیکن اس نے ہماری جانب توجہ دیے بغیر ایم رنا کو مخاطب کیا:

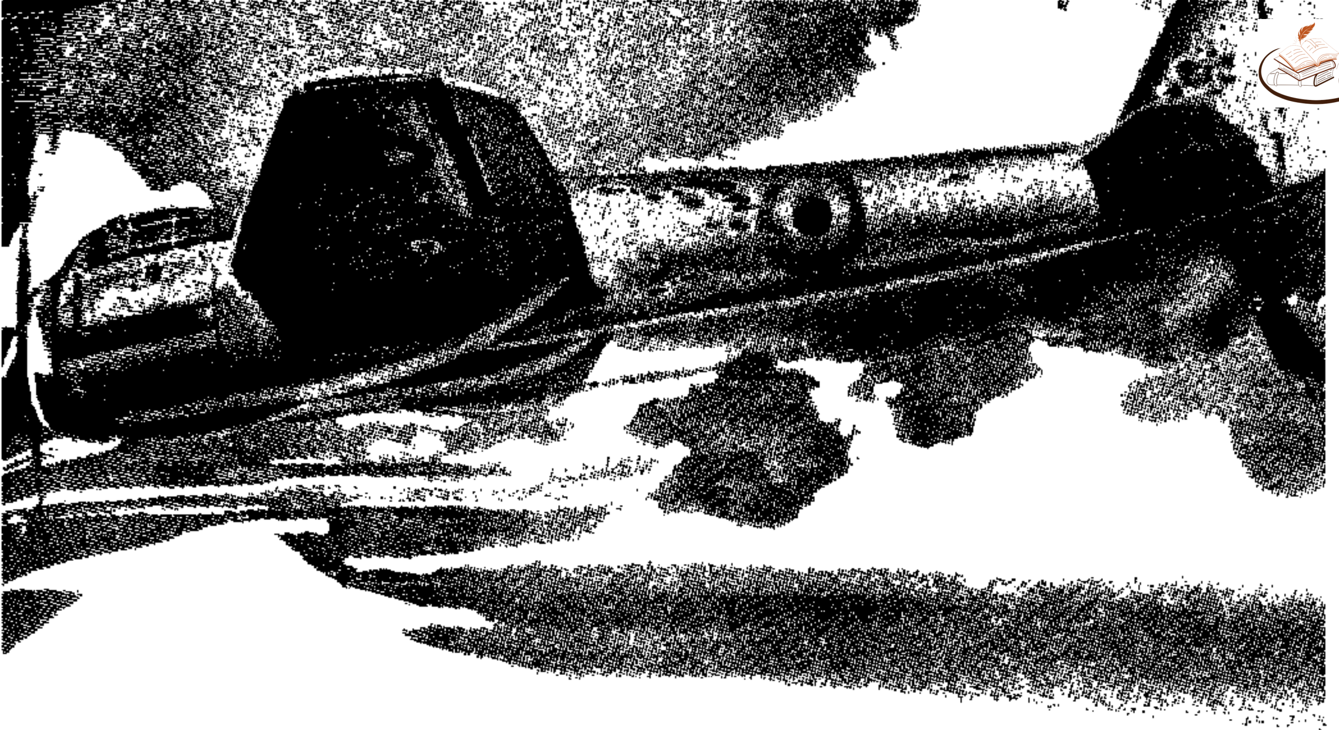
"ایم رنا' بھالا پھینک دو' میں فادر اینٹوئن ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے۔" ایم رنا نے جذبات سے بند ھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کے بعد وہ جھک کر دو قدم اس طرح آگے بڑھا جیسے ابھی فادر اینٹوئن کے پیروں پر گرنا چاہتا ہے' لیکن اچانک چیخ مار کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور فادر اینٹوئن پر حملہ کرنے کے لیے بھالا پھر بلند کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتا' میں نے اس کی کمر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ایم رنا چکرا کر گرا تو اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے ایک لمحے مجھے دیکھا اور پھر بڑے سکون سے بولا:

"مسٹر کریب' میری عمر اٹھائیس سال ہے۔"

میں نے قریب جا کر دوسری گولی اس کے پیٹ میں ماری اور تیسری اس کا بایاں کندھا چیر گئی.... ایم رنا پیٹ پکڑ کر اوندھا ہو گیا اور پھر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا' چنانچہ چوتھی بار میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا اور وہ وہیں سرد ہو گیا۔

☆☆☆





گلین انفیلڈ

دوسری جنگِ عظیم کا حیرت انگیز فضائی معرکہ

"ریڈ ڈاگ، میں پاتھ فائنڈر، (راستہ تلاش کرنے والا) لیڈر ہوں۔" لیفٹیننٹ رالف جیکسن کے ائرفون میں اس کے ساتھی کی آواز سنائی دی اور وہ اپنے طیارے کے کاک پٹ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور پوری توجہ سے پیغام سننے لگا۔ "ہماری سکاٹ والی ریڈیائی لہر پر ایک اجنبی ریڈیو سگنل سنائی دے رہا ہے۔"

"روجر، تم کس پوزیشن میں ہو؟" جیکسن نے پوچھا۔

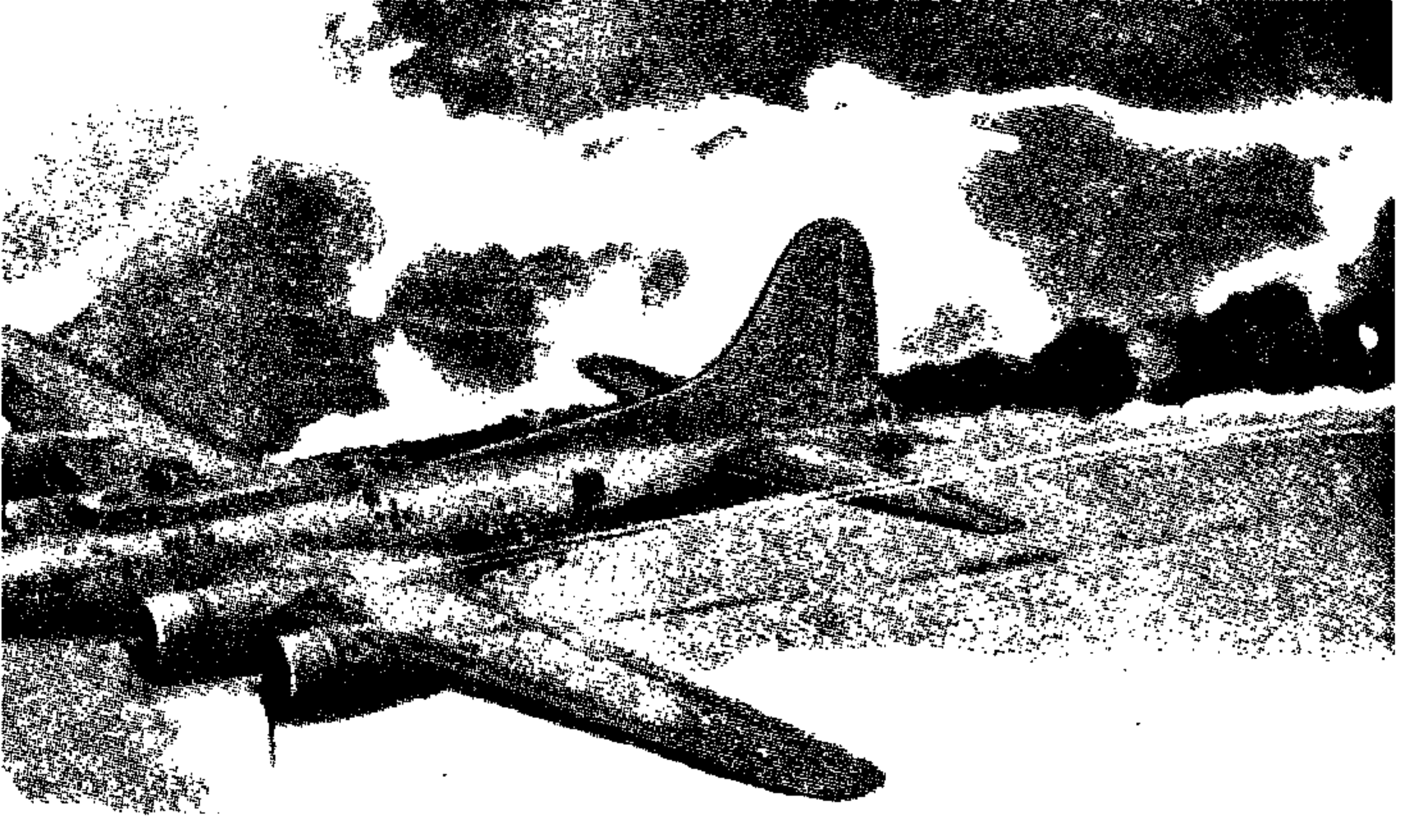
"پانچ، پانچ درجے عرض البلد اور ایک، پانچ درجے طول البلد۔"

جیکسن نے نقشہ دیکھ کر اپنے ساتھی کے مقام پر دائرے کا نشان لگایا اور مائیکروفون کے ذریعے اسے ہدایت کی:

"تم یہیں جمے رہو۔ میں اس جعلی ریڈیائی لہر کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

جیکسن نے اپنے طیارے کا رُخ ۴۰ درجے کے زاویے پر تبدیل کرنے کے بعد اپنے کاک پٹ پر نظر دوڑائی جہاں مختلف آلات اور بٹنوں پر جرمن نشانات بنے ہوئے تھے۔

"یہ جنگ کا دھندا بھی خوب ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ "کیا طرفہ تماشا ہے کہ میں جے یو ۸۸ جرمن طیارے میں ایک ایسے جرمن ہوا باز کا تعاقب کر رہا ہوں جو بی ۱۷ امریکی بمبار میں سوار ہے۔" دشمن کے ہاتھ آئے ہوئے امریکی بمبار طیارے سے نشر ہونے والے ریڈیو سگنل جیکسن کے ائرفون میں سنائی دے رہے تھے اور وہ



اُن کے تعاقب میں اُس وقت ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ فضا میں اگرچہ اِدھر اُدھر ہلکے پُھلکے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے، لیکن ۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کی صبح کے وقت جیکسن کی نظر پوری صفائی سے کام کر رہی تھی۔ اُس وقت وہ برطانوی ساحل سے چار سو میل دُور پہنچ چکا تھا۔ فضا میں دُور دُور تک کوئی دوسرا طیّارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اِس جعلی ریڈیائی لہر کا تعاقب کرتے ایک گھنٹہ ہو گیا۔ اِس لہر پر نشر ہونے والے سگنل لمحہ بہ لمحہ زیادہ واضح اور بلند ہوتے جا رہے تھے۔ جیکسن نے محسوس کیا کہ دشمن کا طیّارہ امریکہ سے آنے والے طیّاروں کی رہنمائی کے لیے سکاٹ لینڈ سے نشر ہونے والے صحیح ریڈیائی سگنل کا سلسلہ منقطع کرنا چاہتا ہے اور بار بار جگہ بدل رہا ہے۔

"یہ کم بخت جرمن بھی نہایت چلتے پُرزے ہیں۔" جیکسن بڑبڑایا۔ "اب اِسی پائلٹ کو دیکھو، امریکہ سے آنے والے بمبار طیّاروں کا دستہ اگر اس کے جال میں پھنس گیا، تو سب کے سب تباہ ہو جائیں گے۔"

اُس نے ہاتھ فائٹر لیڈر کو متنبّہ کرنے کے لیے میگافون کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن یک دم رُک گیا، کیونکہ وہ اب دشمن کے طیّارے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ اپنے ساتھی کو کوئی پیغام بھجواتا، تو اِس مرحلے پر یہ پیغام دشمن کے کانوں تک بھی بہرحال پہنچ جاتا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ جیکسن خاموش رہے اور دشمن کو بے خبری میں جا گھیرے۔

سب سے پہلے اُسے دُور اُفق پر باریک نقطہ سا نظر آیا جو رفتہ رفتہ بڑھ کر سیاہ رنگ کے ایک بمبار طیّارے کی صورت اختیار کر گیا۔ یہی وہ بلا تھی جو اَب تک متعدد امریکی طیّاروں کو جعلی ریڈیائی پیغاموں کے ذریعے صحیح راستے سے بھٹکا کر انہیں شمالی بحرِ اوقیانوس کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل چکی تھی۔ جیکسن نے اِس بلا کو ٹھکانے لگانے کے لیے اپنے طیّارے کی گنوں کا رُخ دشمن طیّارے کی طرف موڑ دیا اور اُسے اِن گنوں کی زد میں لانے کے لیے تیزی سے اُس کی طرف جھپٹا۔

جیکسن مطمئن تھا کہ دشمن اُس کے جے یو ۸۸ جرمن ساخت کے طیّارے کو اپنا طیّارہ سمجھتے ہوئے اُس سے کوئی تعرض نہ کرے گا؛ چنانچہ وہ اِس دھوکے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دشمن کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ کر وار کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے جے یو ۸۸ کا رُخ بی ۱۷ کی سیدھ میں موڑ دیا اور برق رفتاری

سے دشمن کی جانب لپکا۔ اَب وہ اِس قدر قریب پہنچ چکا تھا کہ اسے بی، ایر بنے ہوئے نشانات واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ طیارے پر لگی ہوئی گنوں کو بھی صاف دیکھ رہا تھا جو ہاتھ کے ایک اشارے سے اِس پر گولیوں کی تباہ کُن باڑھ مارنے کے لیے تیار تھیں۔ اِن دونوں کا درمیانی فاصلہ ہر لحظہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۵۰۰ گز ۔۔۔

۴۰۰ ۔۔۔ ۳۰۰ ۔۔۔ ۲۰۰ ۔

"تھوڑا سا اور قریب۔" اُس نے اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا سا اور۔" اُس کے دونوں انگوٹھے فائر کرنے والے بٹنوں پر نہایت مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ یک دم اُس کے کانوں میں دھماکے کی آواز آئی۔ جے یُو ۸۸ میں زلزلہ سا آ گیا اور طیارے کو کنٹرول کرنے والا لیور جیکسن کے ہاتھ سے نکل گیا اور طیارہ کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ڈولنے لگا۔ طیارے کی چھت میں خاصا بڑا سُوراخ ہو گیا تھا۔ پریشان حال جیکسن نے کمال سُرعت سے کنٹرول کو دوبارہ گرفت میں لیا اور غیر ارادی طور پر طیارے کا رُخ نیچے کی طرف کر دیا۔ اُس کی یہی حرکت بچاؤ کا ذریعہ بن گئی، کیونکہ عین اُسی وقت اُس پر گولیوں کی ایک اور باڑھ ماری جا چکی تھی۔ اِن گولیوں سے جیکسن کو تو کوئی ضرر نہ پہنچا، البتہ اِن میں سے دو گولیاں چھت کے سُوراخ میں سے داخل ہو کر آلات کے بورڈ اور سامنے دیکھنے والے شیشے سے ٹکرائیں۔ بورڈ پر نصب کئی سوئچ اور بٹن ٹوٹ گئے اور شیشہ چُور چُور ہو گیا۔ اِس نقصان کے علاوہ کاک پٹ میں خدا جانے کہاں سے دُھواں گھس آیا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف جیکسن کا دَم گھٹنے لگا، بلکہ اُس کی آنکھیں بھی کام نہیں کر رہی تھیں۔ گہرا غوطہ مارنے کے بعد جیکسن نے طیارہ اُوپر اُٹھانے کی کوشش کی، لیکن یہ دیکھ کر اُس کا کلیجہ دہل گیا کہ کنٹرول کام نہیں کر رہا۔ اگرچہ یہ حالت صرف چند لمحے رہی اور جونہی کنٹرول نے دوبارہ کام شروع کیا، اُس کے حسبِ منشا طیارہ اُوپر اُٹھنے لگا، جیکسن کی جان میں جان آئی۔ اُس کی پریشان کُن حالت میں بھی اس کا دِل خدائے بزرگ و برتر کے لیے تشکر کے جذبات سے بھر گیا جس نے عین آخری لمحے دستِ غیب سے جیکسن کو موت کے مُنہ سے کھینچ لیا تھا ورنہ اُس کا طیارہ سمندر میں گر کر گہرے پانی میں غرق ہو جاتا۔

دوبارہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے جیکسن نے دیکھا کہ اُس کا حریف بی، ایہ نہایت اطمینان سے اپنی جگہ پرواز کر رہا ہے اور چار اصلی جے یُو ۸۸ جرمن بمبار طیارے اپنی گنیں جیکسن پر تانے لے اپنی زد پر لانے کے لیے جھپٹ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ اُس کے بارے میں جیکسن کے دل میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ دراصل اُس نے امریکی ساخت کے بی، ا جرمن طیارے کو تنہا سمجھ کر غلطی کی تھی۔ یہ چاروں جرمن بمبار درحقیقت جرمن بی، ا کا حفاظتی دستہ بنے ہوئے تھے جسے طے شدہ پروگرام کے مطابق جائے وقوع سے دُور رکھا گیا تھا۔ جرمن بی، ا نے جونہی اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کیا، اُس نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے طلب کر لیا؛ چنانچہ جیکسن جو جرمن طیارے کو شکار کرنے آیا تھا، اب شکاری کُتّوں میں گھرے ہوئے گھائل ہرن کی مانند اپنی جان بچانے کے لیے سرگرداں تھا۔ اگرچہ جان ہر شخص کو پیاری ہوتی ہے؛ تاہم جیکسن کو اپنی جان سے زیادہ امریکہ سے برطانیہ آنے والے بمباروں کی فکر تھی جنہیں راستے سے بھٹکانے کے لیے جرمن بی، ا بدستور جعلی ریڈیائی پیغام نشر کر رہا تھا۔

جونہی گولیوں کی ایک اور باڑھ اُوپر اُٹھتے ہوئے جے یُو ۸۸ سے ٹکرائی، جیکسن اپنے بچاؤ کے لیے طیارے کی چھت پر لگی ہوئی حفاظتی زرہ کے نیچے سمٹ گیا۔ اِس وقت اُس کے دِل میں اپنی سلامتی کے علاوہ اگر کوئی آرزو تھی، تو یہ کہ طیارہ کنٹرول کرنے والے آلات گولیوں کی زد سے محفوظ رہیں۔ اُس کے سامنے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ وہ اپنے طیارے کو ناک کے بل سمندر کی لہروں کے حوالے کر دے، لیکن یہ اقدام بھی اُس کی جان بچانے کی ضمانت تو نہیں دے سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۹۴۲ء میں امریکی فضائیہ کے ذمے دار افسروں نے محسوس کیا کہ برطانیہ میں متعین امریکی فضائیہ کے پاس لڑاکا طیاروں کی قلت تشویشناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ امریکہ سے مطلوبہ طیارے ہر ممکن سُرعت سے برطانیہ لائے جائیں، مگر اِس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسے تجربہ کار ہوا باز کہاں سے آتے جو جنگی فرائض چھوڑ کر ہمہ وقت لڑاکا طیاروں کو امریکہ سے لانے کا فرض انجام دے سکتے ؛ جُوں جُوں جنگ شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی، تجربے کار ہوا باز ضرورت کے مطابق میسّر نہیں آ رہے تھے۔ اُن دنوں تربیت سے فارغ ہونے والے ناتجربہ کار ہوا بازوں کے دستے بحری جہازوں کے ذریعے یورپ پہنچائے جاتے تھے۔ اُن میں زیادہ تعداد ایسے ہوا بازوں کی تھی جو زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ گھنٹے اڑان کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ یہ اڑان بھی انہوں نے ہلکے پھلکے تربیتی طیاروں میں مکمّل کی تھی۔ بریں حالات اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ وطن سے میدانِ جنگ کی طرف جاتے ہوئے ۵۰ فٹ لمبے، ۴۰ فٹ چوڑے اور ۳۲ ٹن وزنی دیو قامت لڑاکا طیاروں کو بحرِ اوقیانوس پر سے صحیح سلامت اُڑا کر لے جائیں گے، ایک ایسی حماقت تھی جو کسی ذمّے دار اور باشعور افسر سے سرزد نہیں ہو سکتی تھی، مگر امریکی فضائیہ کو حالات کے دباؤ نے اِس حد تک زِچ کر دیا تھا کہ وہ یہ جُوا کھیلنے پر مجبور ہو گئی۔

برطانیہ میں امریکی فضائیہ کے انچارج جنرل ایچ۔ ایچ۔ آرنلڈ نے افسروں کے ایک اجلاس میں جب پہلی مرتبہ یہ تجویز پیش کی، تو اُسے حاضرینِ جلسہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سخت تگ و دو کرنی پڑی؛ چنانچہ سب سے پہلے چند تجرباتی اُڑانوں کا فیصلہ کیا گیا۔ نوآموز اور ناتجربہ کار ہوا بازوں کی موزوں رہنمائی کے لیے یہ طے کیا گیا کہ ایک طرف امریکی ساحل سے اور دوسری جانب سکاٹ لینڈ کے ساحل سے ریڈیائی پیغام نشر کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اُس وقت تک جو ریڈیائی آلے ایجاد ہو چکے تھے، اُن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ۵۰۰ میل دُور ایسے پیغامات پہنچائے جا سکتے تھے جب کہ امریکہ اور سکاٹ لینڈ کا درمیانی فاصلہ ۱۰۰۰ میل سے بھی زیادہ تھا۔ حد درجہ احتیاط، محنت اور کوشش کے باوجود درمیان میں سینکڑوں میل کا ایسا خلا رہ جاتا تھا جہاں امریکہ سے آنے والے ہوا بازوں کو بغیر کسی رہنمائی کے صرف اپنی عقل اور تجربے کے سہارے پرواز کرنی پڑتی تھی؛ چنانچہ انہیں ہدایت کی گئی کہ ۵۰۰ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ناک کی سیدھ میں پرواز کریں، حتیٰ کہ ایک مقرّرہ فاصلہ طے ہو جائے، تو سکاٹ لینڈ کے ساحل سے نشر کیے جانے والے پیغامات سنائی دینے لگیں گے اور وہ اُن کی رہنمائی میں سفر کرتے ہوئے بحفاظت تمام منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ بحث کی حد تک یہ سارا پروگرام ہر طرح قابلِ عمل اور ہر قسم کے خطروں سے پاک نظر آتا تھا، لیکن جب عملی جامہ پہنانے کا مرحلہ آیا، تو جرمن اسے ناکام بنانے کے لیے حیرت انگیز ہتھکنڈوں سے کام لینے لگے؛ چنانچہ امریکی افسروں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

جرمنوں نے اپنے مقصد کے لیے سب سے پہلے بحری جہاز استعمال کیے اور پھر آبدوز کشتیوں سے اسی ریڈیائی لہر پر جس کے ذریعے سکاٹ لینڈ سے ریڈیو سگنل نشر کیے جا رہے تھے، جعلی ریڈیائی پیغامات نہایت خوبی اور ہوشیاری سے نشر کرنے شروع کر دیے۔ امریکہ سے آنے والے ہوا باز جب فضا کے "خاموش منطقے" میں پہنچتے، تو جرمنوں کے نشر کردہ جعلی پیغامات سے دھوکا کھا جاتے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس اُس وقت ہوتا جب صحیح راستے سے بھٹک کر شمالی اوقیانوس کے ایسے علاقے میں پہنچ چکے ہوتے جہاں خشکی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ ہوتا۔ اِس دوران میں طیاروں کا ایندھن بھی ختم ہو جاتا اور اِن بدنصیبوں کے سامنے اِس کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہوتا کہ اپنے آپ کو بحرِ اوقیانوس کی اتھاہ گہرائیوں کے حوالے کر دیں۔ اِس قسم کے دو تین واقعات کو تو امریکی فضائیہ کے افسر کسی حادثے کا نتیجہ سمجھتے رہے، لیکن جب

اُوپر تلے ایسے حادثے ہونے لگے، تو انہیں سخت تشویش ہوئی اور انہوں نے دریافتِ حال کے لیے جنگی جہازوں کا ایک مضبوط بیڑہ شمالی اوقیانوس کے علاقے میں بھجوا دیا۔ بحریہ کو جونہی اصل حقیقت کا پتہ چلا، اُس نے جعلی پیغامات نشر کرنے والی جرمن آبدوز کشتیوں میں سے دو کشتیاں موقعے پر تباہ کر دیں۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ جرمنوں نے مزید کشتیاں بھجوانی بند کر دیں اور یوں کچھ عرصے کے لیے حادثوں کا سلسلہ مکمل طور پر رُک گیا۔

چند ہفتے بڑے آرام و سکون سے گزرے۔ کچھ عرصے بعد پھر امریکہ سے بمبار طیاروں کی روانگی شروع ہوئی اور تباہی و بربادی کا سابقہ چکر دوبارہ چل پڑا۔ کچھ عرصہ تو امریکیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان حادثات کا اصل سبب کیا ہے۔ حتّیٰ کہ ایک روز بی۔ ۱۷ طیارے کا ایک بدقسمت ہوا باز عین اس وقت جب کہ اُس کا طیارہ راستے سے بھٹک کر اور تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے بحرِ اوقیانوس کی نذر ہو رہا تھا، اپنے ریڈیو کے ذریعے سکاٹ لینڈ میں واقع امریکی ہوائی اڈے کو یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گیا کہ اُس کی تباہی کا سبب کیا ہے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ جرمن جعلی پیغامات نشر کرنے کے لیے ایک بی۔ ۱۷ قسم کا امریکی طیارہ استعمال کر رہے ہیں، میجر ہوگن نے امریکی فضائیہ اور ملٹری انٹیلی جینس کے افسروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ لندن کے اِس جلسے میں لیفٹیننٹ رالف جیکسن بھی موجود تھا۔ اُس کا شمار امریکی فضائیہ کے بہترین ہوا بازوں میں ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف بحرِ اوقیانوس کے آر پار متعدد بار پرواز کر چکا تھا، بلکہ ریڈیائی لہروں کی مدد سے چلائے جانے والے بم اور ٹیلی ویژن کی مدد سے کنٹرول کیے جانے والے جدید طیاروں کو ٹسٹ کرنے کے لیے کئی مرتبہ خفیہ طور پر دشمن کے علاقے میں پرواز کرنے کے لیے بھی بھجوایا جا چکا تھا۔ اُس نے یہ سب اُڑانیں نہایت کامیابی سے مکمل کی تھیں۔

جرمنوں کے ہاتھ آئے ہوئے بی۔ ۱۷ قسم کے امریکی طیارے کو جسے دشمن جعلی پیغامات نشر کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا، ٹھکانے لگانے کے لیے جب جیکسن سے مشورہ طلب کیا گیا، تو اُس نے ایک ایسی تجویز پیش کی جسے سنتے ہی تمام حاضرینِ جلسہ چونک پڑے۔ جیکسن کا کہنا تھا "اِس کام کے لیے ہمیں دو یا چار انجنوں والے کسی ایسے طیارے کی ضرورت ہے جو طویل پرواز کر سکتا ہو۔ بی۔ ۱۷ کے مقابلے میں اگر ہم جرمنوں کے پکڑے ہوئے جے یُو ۸۸ طیارے سے کام لیں، تو زیادہ بہتر ہو گا۔" چند لمحے توقف کرنے کے بعد جیکسن دوبارہ بولا: "جرمن طیارہ استعمال کرنے سے ہمیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جرمنوں کو اصل حقیقت کا بر وقت پتہ نہ چل سکے گا اور ہم جعلی پیغامات نشر کرنے والے طیارے کو تہس نہس کر چکے ہوں گے۔"

"ایک امریکی ہوا باز جرمن طیارے میں بیٹھ کر امریکی طیارے کو تباہ کرنے جائے جسے جرمن ہوا باز اڑا رہا ہو"۔ میجر ہوگن نے قہقہہ لگایا۔ "تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ہمارے پاس جتنے بھی جرمن طیارے ہیں، ان سب پر رائل ائر فورس کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ ان نشانوں کو دیکھ کر وہ لوگ دُور ہی سے پہچان لیں گے۔"

"اِس کی آپ فکر نہ کریں۔" جیکسن نے جواب دیا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔ باقی کام مَیں خود سنبھال لوں گا۔"

اجازت ملنے کے چند روز بعد رالف جیکسن نے جے یُو ۸۸ قسم کے جرمن طیارے پر پروازیں شروع کر دیں۔ امریکہ سے قریباً ہر روز لڑاکا طیاروں کے دستے سکاٹ لینڈ پہنچ رہے تھے، مگر حیرت کی بات تھی کہ جرمنوں نے جعلی پیغامات نشر کرنے والا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ جیکسن دو ہفتے تک بحرِ اوقیانوس پر دُور دُور تک چکر لگاتا رہا۔ حتّیٰ کہ ۲۱ ستمبر کا دن آ پہنچا اور وہ بالآخر جعلی پیغامات نشر کرنے والے بی۔ ۱۷ طیارے کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا، لیکن افسوس! اُس نے جرمنوں کی سُوجھ بُوجھ اور عقل و ذہانت کا غلط اندازہ لگایا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اب چار جرمن بمباروں کے نرغے میں گھرا اپنی جان بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اگرچہ زمین سے طیارے کی بلندی ظاہر کرنے والا آلہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، تاہم جیکسن اس آلے کے بغیر ہی دیکھ رہا تھا کہ

طیارہ خطرناک حد تک سمندر کی سطح کے قریب پہنچ چکا ہے۔ طیارے کو کنٹرول کرنے والا آلہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے بار بار جھٹکے دیتا، مگر طیارے پر ان جھٹکوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ عین اُس وقت جبکہ جیکسن مایوسی کی حالت میں اپنے آپ کو بدترین نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا، قدرت کا دستِ غیب حرکت میں آیا۔ اِدھر اُدھر ڈولتے ہوئے طیارے کو اِس زور کا جھٹکا لگا کہ جیکسن کے لیے اپنی جگہ پر جمے رہنا محال ہو گیا۔ وہ اپنی نشست سے اُچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹتی نظر آئیں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر جب وہ دوبارہ سیٹ پر بیٹھا، تو چند لمحوں کے لیے اُسے سوائے تاریکی کے کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ تاریکی پہلے دھندلکے اور پھر اُجالے میں تبدیل ہوئی، تو جیکسن نے سامنے کے رُخ نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا کہ طیارہ نیچے کی طرف جانے کے بجائے فضا میں سمندر کی سطح کے متوازی تیر رہا تھا۔ جیکسن نے جونہی کنٹرول کرنے والے آلے کو حرکت دی، طیارہ آہستہ آہستہ اُوپر کی جانب اُٹھنے لگا۔ اُوپر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا، دو جرمن طیارے جعلی پیغامات نشر کرنے والے بی۔ اے کے آس پاس منڈلا رہے ہیں اور بقیہ دونوں بمبار اپنے شکار کو اُوپر اُٹھتے دیکھ کر اُس پر جھپٹنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

جیکسن کے طیارے کا بایاں انجن رُکنے لگا اور پھر اس میں سے تیل خارج ہوا۔ جیکسن پہلے ہی کچھ ایسی قابلِ رشک حالت میں نہ تھا۔ اِس نئی مصیبت نے اسے بالکل مایوس کر دیا۔ اب اس کے سامنے یہی راستہ تھا کہ اپنے مجروح اور شکستہ طیارے کو ہر ممکن احتیاط سے سمندر میں اُتار دے۔ اس نے آخری مرتبہ دشمن طیاروں کی طرف دیکھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے اس پر حملہ کرنے کے لیے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ جیکسن جیسے گھاگ ہوا باز کے دل میں آخری داؤ کھیلنے کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ اُس نے ایک ماہر ہوا باز کی طرح آخری لمحے میں فیصلہ کیا اور اپنے طیارے کو ایسی پوزیشن میں لے گیا جو حملہ آور ہوا بازوں کے لیے نہایت للچا دینے والی تھی۔ جیکسن مضبوطی سے اپنی نشست پر بیٹھا دشمن طیاروں پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ عین اُس وقت جب دشمن طیارے اسے اپنی زد میں پا کر اس پر فائر کھولنا چاہتے تھے، جیکسن نے عمر بھر کے تجربے اور مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اِس ہوشیاری سے غوطہ لگایا کہ خود تو صاف بچ کر نکل گیا، مگر اپنے زور میں جھپٹتے ہوئے جرمن بمبار آپس ہی میں ٹکرا گئے۔ فضا میں خوفناک دھماکا ہوا اور پلک جھپکنے میں دونوں جرمن طیارے دھوئیں اور آگ کے شعلوں میں لپٹے سمندر میں گرتے دکھائی دیے۔

جیکسن کے لیے یہ ایک ہی دن میں تیسرا معجزہ تھا۔

اِس جوش انگیز واقعے کا اثر زائل ہونے کے بعد جیکسن کے حواس قدرے بحال ہوئے۔ اُس نے دیکھا کہ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھا رہے ہیں۔ فضا میں یہ اچانک تبدیلی جیکسن کے لیے بڑی سود مند تھی۔ وہ اگرچہ دشمن طیاروں کا مقابلہ کرنے سے بے بس تھا، تاہم بادلوں کی اوٹ میں دشمن کو جھانسا دے کر بچ نکلنے میں کامیاب ضرور ہو سکتا تھا۔ اب اُسے اپنی سلامتی سے زیادہ امریکہ سے آنے والے طیاروں کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی۔ یہ طیارے جرمنوں کے نشر کردہ جعلی پیغامات کے دھوکے میں آ کر تباہی و بربادی سے دوچار ہونے والے تھے، بلکہ شاید ہو ہی چکے ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کا دل نہ مانا کہ اپنی جان بچا کر نکل جائے۔ اُس وقت تک وہ اپنے طیارے کو بادلوں کے اُوپر لے آیا تھا۔ اب وہ اِدھر اُدھر بلا مقصد چکر کاٹتے ہوئے اپنے آخری اقدام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی کشمکش و پیچ کی حالت میں یکایک اُس نے نیچے دیکھا۔ اُس وقت اُس کا طیارہ ایسے مقام سے گزر رہا تھا جہاں بادلوں کا نام و نشان نہ تھا اور اس کی نظریں سمندر کی سطح تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔ دشمن کا بی۔ اے طیارہ جیکسن کے عین نیچے کم بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور اس کی حفاظت کرنے والے دونوں بمبار طیارے دُور دُور تک کہیں نظر نہ آتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا کہ جیکسن نے اپنی سلامتی کو نظر انداز کرتے ہوئے

سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

وہ اپنے طیارے کو بڑی سرعت سے ایک مرتبہ پھر بادلوں کی اوٹ میں لے گیا۔ اُسے اس کی خستہ و ابتر حالت کا پُورا پُورا احساس تھا، چنانچہ جلد بازی سے دُشمن پر ہلکا وار کرنے کے بجائے اس پر ایک ہی کاری ضرب لگانا چاہتا تھا جس سے دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ اپنے سابقہ تجربے، مہارت اور چھٹی حس کی مدد سے طیارہ دشمن کے اُوپر بالکل متوازی لیے جا رہا تھا اور ان دونوں کے درمیان گہرے بادلوں کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی۔ کئی منٹ کی بے حاصل پرواز کے بعد بالآخر جیکسن کو وہ موقع مل گیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ ایک مقام پر جونہی اُسے بادلوں میں ایک شگاف نظر آیا، وہ اپنے نیچے اُڑنے والے طیارے پر عقاب کی مانند جھپٹا۔ اگر کوئی اُس وقت یہ منظر دیکھتا، تو اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے طیارے کو دُشمن کے طیارے سے ٹکرا دینے کا عزم کیے ہوئے ہے، مگر جیکسن کا ارادہ کچھ اور ہی تھا۔ دشمن طیارے کے قریب پہنچ کر جیکسن کے طیارے نے کنکوے کی مانند جھوک کھائی اور دوسرے ہی لمحے وہ دُشمن طیارے کے پیٹ کو گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی کرتا ہوا اُس کے نیچے سے نکل کر دُور پہنچ گیا۔ محفوظ مقام پر پہنچ کر اُس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور پھر اُس کا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ اس کا وار توقع سے کہیں بڑھ کر کاری ثابت ہوا۔ دشمن طیارے کی پٹرول کی ٹینکی میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ آسمان سے ٹوٹتے ہوئے تارے کی مانند اپنے پیچھے آگ اور دھوئیں کی لکیر سی چھوڑتا ہوا سیدھا سمندر کی طرف جا رہا تھا۔

اس کے بعد رالف جیکسن اپنے شکستہ اور تباہ حال طیارے کو لے کر اپنے اڈے پر کیسے پہنچا؟ اس میں اُس کی مہارت، ذہانت اور تجربے سے زیادہ خوش قسمتی کا ہاتھ تھا، بہرحال اُس کا زندہ پہنچ جانا معجزے سے کم نہ تھا، کیونکہ اُس کے طیارے کا ایک انجن ہی بند نہ ہوا، بلکہ سوئچ اور بٹن دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ رپورٹ دینے کے لیے میجر ہوگن کے پاس گیا اور بولا:

"میجر، مجھے افسوس ہے کہ مَیں پروگرام کے مطابق کام ختم نہ کر سکا اور یُوں ان بدنصیب ہوابازوں کی تباہی کا باعث بنا جو . . ."

"کیا کہہ رہے ہو جیکسن؟" میجر اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا: "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے وہ زندہ سلامت اپنے اڈوں پر آن پہنچے ہیں۔ قریب تھا کہ جرمنوں کے جعلی پیغامات سے وہ دھوکا کھا جائیں کہ جلد ہی جعلی سگنل سُنائی دینے بند ہو گئے اور تھوڑی سی کوشش سے وہ صحیح سگنل سُننے میں کامیاب رہے، ورنہ اُن کی بربادی میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔"

جیکسن نے جو کارنامہ سر انجام دیا تھا، اُس کے عوض اُسے کوئی نمایاں اعزاز ملنا چاہیے تھا، مگر اس سے وہ راز فاش ہو جانے کا خطرہ تھا جس سے کام لے کر جیکسن نے اتنی بڑی مہم سر کی تھی، چنانچہ چند روز بعد اُسے سرکاری طور پر شاباش کا پروانہ موصول ہوا اور ساتھ ہی ہدایت کی گئی کہ اس واقعے کی تشہیر سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ جرمنوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اُن کے پکڑے ہوئے جے یُو ۸۸ طیارے کیسے کیسے کاموں کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ جیکسن کے قریبی دوستوں کو یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد اُسے کوئی نہ کوئی فوجی اعزاز ضرور دیا جائے گا، مگر افسوس! اُن کی یہ توقع پُوری نہ ہو سکی۔ پیشتر اس کے کہ جنگ ختم ہوتی، ۱۹۴۵ء کے موسم گرما میں جیکسن کو ایک نئے لڑاکا طیارے پر تجرباتی پرواز کا حکم دیا گیا اور وہ ایل پاسو (ٹیکساس) کے فضائی اڈے سے پرواز کرتے وقت حادثے کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور یہ وہی دن تھا جب امریکہ نے جاپان پر پہلا ایٹم بم گرایا تھا۔ ■■

اعتذار

نومبر ۱۹۶۷ء کے اُردو ڈائجسٹ میں صفحہ ۸ پر مولوی عبدالسلام صاحب سیالکوٹی کے بارے میں ایک غلط روایت شائع ہو گئی ہے۔ ادارے کو اس سہو پر افسوس اور ندامت ہے۔ مولوی صاحب صحتمند اور بخیر و عافیت ہیں اور پی۔ اے ایف کالج لوئر ٹوپہ میں لائبریرین کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔



مہربان

رضوانہ منظر

جنگ عظیم کو ختم ہوئے برسوں بیت گئے ہیں مگر ان کے واقعات میں دلچسپی ابھی تک باقی ہے۔ نازیوں کے مظالم ... جاپانیوں کی سفاکی اور جنرلوں کے فیصلوں سمیت ان گنت واقعات شاید ابھی پردۂ راز میں ہیں جو وقتاً فوقتاً برآمد ہوتے رہتے ہیں، ایسے ہی ایک سچے واقعے کی روداد۔

جرمنوں کے یہودیوں پر روا رکھے گئے مظالم کی سچی کہانی

وہ 13 جولائی 1944ء کا ایک گرم دن تھا۔ ہماری ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ایک ویران پلیٹ فارم پر رک گئی اور اس میں سے ہم، سیاسی قیدیوں کا ایک پژمردہ سا گروہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ اس پلیٹ فارم کے سامنے ہی ایک بڑا سا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں اس دروازے سے گزار کر اندر لے جایا گیا۔ وہ ایک وسیع کیمپ تھا جس میں ہزاروں بیرکس بنی ہوئی تھیں۔ ان کے اطراف خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی جن میں یقینی طور پر کرنٹ بھی دوڑ رہا ہوگا۔ اس کیمپ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واچ ٹاور بھی بنے ہوئے تھے جن پر فلڈ لائٹس نصب تھیں۔ ان واچ ٹاورز پر مسلح محافظ موجود تھے اور مشین گنیں بھی لگی ہوئی تھیں۔

خوف ناک، کریہہ صورتوں والے شکاری کتے بھی اپنی لمبی لمبی زبانیں لٹکائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اس دہشت زدہ کیمپ میں آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہاں، موت ہی یہاں سے آزادی دلا سکتی تھی۔ یہ پولینڈ میں نازی جرمنوں کا خطرناک ترین کیمپ تھا اور اس کا نام آشوٹز تھا۔ اس کیمپ میں رونما ہونے والے لرزہ خیز واقعات پوری دنیا میں مشہور تھے۔ جو قیدی اس کیمپ میں لایا جاتا، وہ یہاں سے زندہ واپس

نہیں جاتا تھا۔ ہم قیدیوں کو اسی موت کے کیمپ میں لایا گیا تھا۔

چند لمحوں بعد ہم نے ہٹلر کی ''ایس ایس آرمی'' کا ایک دستہ دیکھا جو مارچ کرتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ پھر ہم اس دستے کے انچارج کی ہدایت پر لڑکھڑاتے ہوئے اندر کی طرف چل پڑے۔ ایک بڑے سے کیمپ میں ہمیں حکم ملا کہ اپنے کپڑے اتار دیں' ہمارے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی بھی باقی نہ رہے۔ ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ وہیں قریب میں بڑے بڑے بکس رکھے تھے۔ ہم نے اپنے اپنے لباس اتار کر ان بکسوں میں ڈال دیے۔ جس کسی نے بھی اس کام میں کسی قسم کا پس وپیش کیا اس پر وحشیانہ تشدد کیا گیا۔ جرمن حکم عدولی برداشت کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ سر کے اشارے سے حکم کی تعمیل چاہتے تھے۔

پھر ہم سب کو اسی برہنہ حالت میں ایک شخص کی طرف چلنے کا حکم ملا۔ ہم قطار بنائے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس آدمی کے پیچھے اس کے عملے کے لوگ بھی کھڑے تھے۔ اس آدمی کے جسم پر آرمی میڈیکل آفیسر کی وردی تھی۔ وہ اس کیمپ کا ہیڈ ڈاکٹر' جوزف مین گیل تھا۔ وہ دبلا پتلا' دراز قد اور خوبرو انسان تھا۔ خاصا چست اور پھرتیلا تھا۔ بہ ظاہر وہ ہمیں اچھا لگا مگر ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شایستہ اور خوبصورت چہرے کے پیچھے ایک عفریت چھپا ہوا ہے۔

ہم سب کو ایک ایک کر کے اس کے سامنے جا کر کھڑے ہونے کا حکم ملا۔ ہر مرد' عورت اور بچہ آگے بڑھتا اور وہ چپ چاپ نظریں جھکا کر ڈاکٹر جوزف مین گیل کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ وہ ہر فرد کے برہنہ جسم کو گھور کر دیکھتا۔ بالکل اس انداز سے جیسے قسائی جانور کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد یا تو وہ ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کر دیتا یا بائیں طرف۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ایس ایس گارڈز مذکورہ قیدی کو حسبِ حکم دائیں طرف یا بائیں طرف دھکیل دیتے تھے۔ وہ قیدی جو قابلِ رحم حالت میں بائیں طرف جا کر کھڑے ہوتے تھے' وہ بوڑھے' ناتواں' بیمار یا بہت کم عمر تھے۔ گویا ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی بھی قسم کے کام کے لیے ناموزوں ہیں۔ ایسے تمام قیدیوں کو فی الفور گیس چیمبر کی طرف بھیج دیا جاتا تھا کہ ان سے جان چھڑائی جا سکے۔

پھر میری باری آئی اور میں بھی ڈاکٹر مین گیل کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑے غور اور شوق سے میرے برہنہ جسم کو گھورنے لگا۔ اس کی نظریں مجھے اپنے جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے کسی عورت کا اس طرح کسی مرد کے سامنے کھڑا ہونا ہی قابلِ شرم تھا۔ میں اس وقت 44 برس کی تھی مگر چونکہ میں تندرست اور توانا تھی' اس لیے ڈاکٹر کے اشارے پر مجھے دائیں طرف بھیج دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی میں ان لوگوں کے کام کی تھی۔ میری زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ میں کب تک تندرست رہتی ہوں۔ جیسے ہی وہ یہ محسوس کرتے کہ اب مجھ میں پہلے والی توانائی باقی نہیں رہی ہے تو وہ مجھے بھی گیس چیمبر کی طرف بھیج دیتے۔

آشوٹز کیمپ میں آنے والے تندرست اور توانا قیدیوں سے محنت اور مشقت کرائی جاتی تھی اور سخت کام لیے جاتے تھے اور جو لوگ کام کرنے میں ذرا بھی کوتاہی کا مظاہرہ کرتے تھے تو ہٹلر کے یہ درندے ان کی کھال ادھیڑ ڈالتے تھے۔

ہم قیدیوں میں سے جنہیں جینے کا حق دیا گیا تھا' انہیں حکم ملا کہ آگے بڑھیں۔ ہم حسبِ ہدایت ایک میز کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ اس میز پر گودنے والی سوئیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں لرز کر رہ گئی۔ مگر وہاں احتجاج کرنے کی اجازت تھی اور نہ زبان ہلانے کی۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر میرے بازو پر ایک نمبر 82585 گود دیا گیا۔ میرے بازو میں تکلیف تو ہوئی مگر میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ذرا سی آواز بھی اپنے حلق سے باہر نہیں آنے دی۔

وہ لوگ کیمپ میں آنے والے تمام قیدیوں کو اس طرح کے نمبر دے کر انہیں ذہنی اذیت سے دوچار کرتے تھے اور انہیں بتاتے تھے کہ اب ان کا کوئی نام' کوئی شناخت نہیں ہے' اب وہ صرف ایک نمبر ہیں...... مگر میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے دل ہی دل میں یہ اعلان کیا ''میں کوئی نمبر نہیں' بلکہ ایک انسان ہوں...... ایک عورت ہوں اور میرا ایک نام' ایک شناخت ہے۔ انسانی تاریخ مجھے اس حوالے سے ہمیشہ یاد رکھے گی کہ میں زیرِ زمین نازی مخالف تنظیم کی رکن تھی اور میں نے نازیوں کے خلاف خوب کام کیا تھا اور انہیں زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ میں کوئی نمبر نہیں ہوں بلکہ ایک انسان ہوں...... ایک ایسی عورت جسے امن پسند دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔''

ہمارے بازو پر جس جگہ نمبر گودا گیا تھا' اس کے نیچے دل کی شکل کا ایک اور نشان بھی گودا گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ اس نشان کا مطلب یہ ہے کہ ہم سیاسی قیدی ہیں۔

نمبر گودنے کے بعد ہمیں ستر پوشی کی اجازت مل گئی۔ ہمارے قریب ہی ان لوگوں کے گندے اور بدبودار کپڑوں کا



اختر شیرانی کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آتا ہے' وہ لفظ ہے "سلمیٰ" اس نام نے اختر کی ذات اور ان کے کلام کے ساتھ بہت سی حکایتیں' روایتیں اور داستانیں وابستہ کردی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس نام کی آڑ میں اپنا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا ہے اور بعض ستم ظریف تو یہ دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اختر جب رات کو سلمیٰ سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان سے باہر پہرا دیا کرتے تھے۔

اختر سے میری دوستی کم وبیش سال چلتی رہی۔ میں نے اس دوران میں ان سے ایک مرتبہ بھی سلمیٰ کے متعلق استفسار نہیں کیا۔ ایک روز اختر نے خود ہی قصہ چھیڑ دیا اور کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دوستانہ بے تکلفی کے باوجود سلمیٰ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا۔"

میں نے عرض کیا "یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے' مجھے دخل در معقولات کا کوئی حق نہیں۔ یوں بھی آپ کی نجی زندگی کے بارے میں جستجو کرنے کی جرأت مجھے کیونکر ہوسکتی ہے؟"

اختر اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز میرے یہاں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاپی تھی' کہنے لگے "یہ کاپی میری حیاتِ معاشقہ کی مکمل داستان ہے۔ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیے گا۔ اس میں میرے اور سلمیٰ کے تمام خطوط موجود ہیں۔ اخفائے راز کے لیے میں نے اپنا نام کوکب رکھا ہے۔"

وہ کاپی بہت دن میری میز کی دراز میں پڑی رہی۔ ایک روز میں نے اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے صفحے پر عنوان درج تھا "ایک شاعر کا خواب" اس کے بعد کوکب اور سلمیٰ کے خطوط درج تھے۔ میں نے بہ مشکل چند صفحے پڑھے تھے کہ محسوس ہوا کہ کوکب اور سلمیٰ کے خطوط لکھنے والی ہستی ایک ہی ہے۔ دونوں طرف بالکل ایک ہی قسم کی مجلّا ومطلا عبارت درج تھی۔ وہی حسین وجمیل ترکیبیں' وہی پُرشکوہ استعارے' وہی دل آویز محاورے اور وہی مرصّع الفاظ بار بار دہرائے جا رہے تھے۔ میں اختر کے انداز تحریر سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ جو خطوط سلمیٰ سے منسوب کیے گئے تھے' تمام تر اختر کے اپنے لکھے ہوئے تھے۔ اختر کو ایک زمانے میں فیضی کے کلام سے بہت ربط رہ چکا تھا۔ چنانچہ سلمیٰ کے خطوط میں جگہ جگہ فیضی کے اشعار درج تھے۔

میں سمجھ گیا یہ "شاعر کا خواب" سراسر اختر کے اپنے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ گھنٹا بھر کی ورق گردانی کے بعد میں نے وہ کاپی جوں کی توں دراز میں بند کردی۔ چند روز بعد اختر ملے اور کاپی کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا "حضرت! مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔" اختر ہنس پڑے اور معاملہ دہیں ختم ہوگیا۔

اقتباس: چند یادیں چند تاثرات از عاشق حسین بٹالوی

انتخاب: محمد خان شنواری' میٹروول' سائٹ کراچی

ایک ڈھیر لگا ہوا تھا جو ابھی گیس چیمبر میں لے جائے گئے تھے۔ ہمیں ایک ایک پتلون قمیص اور جوتوں کی جوڑی اٹھانے کی اجازت ملی تھی مگر اس طرح کہ ہمیں گارڈز کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے یہ کام کرنا تھا۔ نہ رکنا تھا اور نہ دیر کرنی تھی۔ اگر دیر ہوتی یا ہم لباس میں سے کسی اچھی چیز کا انتخاب کرنے کے لیے رکتے تو جرمن محافظ ہمیں ٹھوکریں مارنا شروع کردیتے۔

میں نے بھاگتے بھاگتے جو پتلون اور بلاؤز اٹھایا وہ میرے بالکل ٹھیک آیا تھا اور اس سے میری ستر پوشی ہوگئی تھی مگر جوتوں کے معاملے میں' میں بدقسمت رہی۔ میرے ایک جوتے کی ایڑی اونچی تھی اور دوسرے میں ایڑی تھی ہی نہیں اور دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ میں نے جو جوتے اٹھائے تھے وہ دونوں بائیں پیر کے تھے۔ تاہم نہ میں احتجاج کرسکتی تھی اور نہ انہیں بدلنے کی کوشش کرسکتی تھی اس لیے خاموش رہی۔

اس کے بعد آشوٹز کیمپ میں ہماری زندگی کے شب وروز شروع ہوئے۔ دن کی روشنی میں ہم بھاری قسم کا محنت طلب تعمیراتی کام کرتے تھے۔ میری ذمے داری یہ تھی کہ میں ایک ہاتھ گاڑی میں ریت بھر کر مطلوبہ مقام تک پہنچاتی تھی۔ رات کو ہم سرد اور تاریک بیرکس میں لکڑی کے سرد تختوں پر سوتے تھے۔ یہ بیرکس کم اور جھونپڑیاں زیادہ تھیں۔ ہمیں جو

کھانا ملتا تھا وہ پتلے اور بے ذائقہ سوپ پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی کبھار ہمیں ڈبل روٹی کا کوئی سوکھا ٹکڑا بھی مل جاتا تھا ورنہ ہماری خوراک صرف وہ سوپ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی قیدی دبلے اور کمزور ہونے لگے۔ جو لوگ اتنے کمزور ہو جاتے کہ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے' انہیں گیس چیمبر میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ہر روز بھٹی کی چمنیاں سرخ اور سفید دھواں باہر پھینکتی تھیں۔

مجھے آشوٹز کے اس عقوبت خانے میں آتے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ ہمارے معمولات جاری تھے۔ ایک روز جب میں مارچ کرتی ہوئی دوسرے قیدیوں کے ساتھ اپنی بیرک کی طرف واپس آ رہی تھی کہ ایک قیدی عورت نے مجھ سے سرگوشی کی ''ڈاکٹر ونکلر تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

میں نے وہ بات سنی' اس قیدی عورت کی دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ چند روز بعد اس قسم کی سرگوشی مجھے پھر سنائی دی مگر اس بار جس عورت نے مجھ سے یہ بات کہی تھی وہ پہلے والی سے مختلف تھی ''ڈاکٹر ونکلر تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

میں نے اس عورت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو قیدی عورت نے سرگوشی میں کہا ''ڈاکٹر ونکلر اس کیمپ میں ایک ریڈیولوجسٹ ہے۔ اس سے پہلے وہ بڈاپسٹ کے سٹی اسپتال میں کام کرتی تھی۔ اس کے پاس تمہارے لیے کوئی خاص پیغام ہے۔ اس کیمپ میں ڈاکٹر ونکلر' ڈاکٹر مین گیل کی اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہی ہے' تم اس سے مل لو۔''

اس وقت تک پورے کیمپ کو ڈاکٹر جوزف مین گیل کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ لوگ اس کے ان تجربات سے واقف ہو چکے تھے جو وہ کیمپ کے قیدیوں پر کر رہا تھا۔ وہ قیدیوں کے دل' جگر اور گردوں پر سرجری کے نئے نئے طریقے آزما رہا تھا اور اس طرح اپنے تجربات کو وسعت دے رہا تھا۔ وہ جراثیم کے خاتمے کے لیے ریسرچ کر رہا تھا اور اس ضمن میں عورت اور مرد دونوں پر سرجری اور ریڈیولوجی دونوں کو ایک ساتھ استعمال کر رہا تھا۔

''ڈاکٹر ونکلر! تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' یہ آواز میرے کانوں میں پھر گونجی جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی' ممکن ہے اس کا تعلق کسی خفیہ زیر زمین تحریک سے ہو جو یہاں تباہی پھیلانے آئی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا تعلق کسی خفیہ حریت پسند گروپ سے ہو۔ جس طرح وہ مسلسل مجھے پیغام بھیج رہی تھی اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ کچھ کرنے کے لیے ہی اس کیمپ میں آئی ہے مگر مجھے ہر صورت میں محتاط رہنا تھا۔

اس کیمپ میں مجھ سے جو سخت کام لیا جا رہا تھا اور جس طرح محنت کروائی جا رہی تھی' اس کے نتیجے میں میری صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ پھر کچھ میں نے بہانے بازیاں کیں اور کچھ لوگوں نے مشورے دیے جس کے نتیجے میں مجھے سلائی کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ یہ سلائی کیمپ مردوں کو جلانے والی بھٹیوں کے قریب واقع تھا۔ ایک بھٹی تو اس کے بالکل ساتھ تھی جس کی چمنی میں سے ہر وقت سفید اور سرخ دھواں ابلتا رہتا تھا اور شعلوں کی سرخی باہر آتی رہتی تھی۔ سلائی کیمپ کی ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے میری نظریں اس چمنی پر ہی رہتی تھیں۔ اس ورکشاپ میں ان لوگوں کے لباس وغیرہ کی مرمت اور ازسرنو سلائی کی جاتی تھی جو گیس چیمبر میں جا چکے تھے۔ ان ملبوسات کو مستقبل کے قیدیوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

اس سلائی کیمپ کی انچارج ایک سخت گیر نازی آفیسر تھی۔ وہ ورکشاپ میں کام کرنے والی قیدی عورتوں پر گہری نظر رکھتی تھی۔ اگر کسی کو بھی کام میں سستی یا بے پروائی کرتے دیکھتی تو اس پر جھپٹ پڑتی تھی۔ وہ پہلے دن سے مجھے ناپسند کرتی تھی۔

ایک سہ پہر کی بات ہے' میں ایک کپڑے کی سلائی میں مصروف تھی کہ اچانک وہ مجھ پر جھپٹی اور اس نے مجھ سے وہ کپڑا چھین لیا۔ پھر وہ زور سے چیخی ''یہ کیا کر رہی ہو تم؟ ٹھیک طرح کام کرنا نہیں آتا؟''

میں اسے بتانے لگی کہ چونکہ مجھ سے میری عینک پہلے دن ہی لے لی گئی تھی' اس لیے میں ٹھیک طرح سے کام نہیں کر پا رہی۔ ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے چیختے ہوئے کہا ''ایک جرمن آفیسر کے سامنے زبان کھولتی ہے۔''

اس کے بعد اس نے گھوم کر اپنی ماتحت آفیسر سے کہا ''لے جاؤ اسے۔ یہ جتنا کام کر سکتی تھی' کر چکی۔ اب یہ کچھ نہیں کر سکتی۔''

چنانچہ وہ ماتحت آفیسر مجھے گھسیٹتی ہوئی واپس اسی بیرک میں لے گئی جہاں میں رہتی تھی اور مجھے لکڑی کے سخت اور سرد تختوں پر دھکیل دیا۔ گرنے سے مجھے شدید چوٹ لگی مگر میں نے زبان سے اف تک نہیں کی۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنی دیر تک میں وہاں اسی حالت میں پڑی رہی۔ جب رات ہو گئی تو ایک جرمن محافظ آیا اور اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''تمہیں واپس سلائی کیمپ جانا ہے اور وہیں کام کرنا ہے۔''

میں بڑی مشکل سے اٹھی اور جرمن سپاہی کے ساتھ سلائی کیمپ کی طرف چل دی۔ راستے میں' میں سوچ رہی تھی

کہ شاید مجھے دوسرا موقع دیا گیا ہے۔ مجھے سلائی کیمپ میں دھکا دے کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ وہاں جا کر مجھے حقیقت معلوم ہوئی۔ ان لوگوں نے مجھے دھوکے سے بلایا تھا۔ وہاں میرے علاوہ پچاس قیدی اور بھی تھے اور ان سب کو گیس چیمبر میں بھیجے جانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں دو نازی آفیسر آئے اور ہمیں گیس چیمبر کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ دونوں ہی آفیسر کچھ پریشان اور سراسیمہ تھے۔ شاید کوئی بڑا مسئلہ تھا۔ کچھ دیر بعد ہی ہمیں ان کی پریشانی کی وجہ معلوم ہوگئی۔ روسی افواج فاتحانہ انداز میں اس طرف پیش قدمی کر رہی تھیں اور آشوٹز کا یہ عقوبت خانہ ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ مشرق کی طرف سے آنے والی روسی فوج جب اس مقام تک آتی تو اس کیمپ کے تمام قیدی خود بہ خود آزاد ہو جاتے۔ ان نازی فوجیوں کی پریشانی کا سبب یہی تھا۔ انہیں ہماری جانیں لینے سے زیادہ اپنی جانیں بچانے کی فکر تھی۔

میں نے بڑی تیزی سے کچھ سوچا پھر آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسکنے لگی۔ میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ ہمارے پیچھے آنے والا نازی جرمن غائب تھا۔ وہ ہمارے قافلے کے آگے چلنے والے نازی آفیسر سے روسی فوج کی پیش قدمی کی خبر پر بات کرنے آگے چلا گیا تھا۔ پھر جیسے ہی ہمارے قافلے نے بائیں طرف گھومنا شروع کیا تو اس عمارت کے کونے پر پہنچتے ہی میں رک گئی جبکہ باقی لوگ آگے بڑھ گئے۔ میں اس عمارت کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں آگے جانے والوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ پھر میں نے پلٹ کے پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس کیمپ سے زندہ بچ نکلنا آسان نہیں ہے مگر پھر بھی میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں کوئی پلان کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں اور میرے راستے میں کیا کیا آئے گا مگر میں اندھادھند دوڑے چلی جا رہی تھی۔

میرے لیے سب سے ضروری کام یہ تھا کہ فوری طور پر کوئی پناہ تلاش کروں مگر میں کسی ایسی بیرک میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی جس پہلے سے جرمن سپاہی موجود ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کس بیرک میں فوجی ہیں اور کس میں نہیں ہیں۔ بھاگتے بھاگتے مجھے ایک چھوٹا سا شیڈ نظر آیا جس کے دروازے پر خطرے کی علامت بنی نظر آ رہی تھی اور ''خطرہ''

لکھا ہوا بھی تھا مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی اس لیے کہ جہاں سے میں بھاگی تھی وہاں کون سے کم خطرات تھے؟ وہاں کہیں زیادہ خطرات تھے۔

میں نے مایوسی کے عالم میں اس شیڈ کا دروازہ کھولا مگر وہاں تک آتے آتے میں اس قدر تھک چکی تھی کہ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا گیا۔ پھر خلافِ توقع اندر کا دروازہ کھلا اور سفید میڈیکل گاؤن میں ایک عورت باہر آئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا ''خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں آ گئیں۔'' اس عورت کی آواز میں بڑی نرمی اور ہمدردی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک حسین عورت تھی۔ میں سمجھ گئی کہ یہ وہی ڈاکٹر ڈنکلر ہے جس کے پیغام مجھے قیدی عورتوں کے ذریعے مل رہے تھے۔

''مجھے پہچانا؟'' اس نے سوال کیا ''میں ڈاکٹر ڈنکلر ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں مگر تم سے کسی طرح رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔'' ڈاکٹر ڈنکلر نے مسکراتے ہوئے کہا ''ویسے یہ سمجھ لو کہ میں بھی تمہاری طرح یہاں ایک قیدی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا پھر اس نے ایکسرے مشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اگر میں ڈاکٹر مین گیل کے احکامات کی تعمیل نہ کروں تو وہ مجھے فوراً شوٹ کرا دے گا۔''

پھر وہ چونکی۔ اس نے کان باہر کی طرف لگاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ باہر بوٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً کوئی فوجی آ رہا تھا۔ آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ میرے فرار کا راز کھل گیا ہے اور میری تلاش شروع ہو چکی ہے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ڈنکلر نے مجھے دروازے کی آڑ میں چھپنے کا اشارہ دیا اور خود آگے بڑھ گئی۔

''آفیسر! کسی کو تلاش کر رہے ہو؟'' میں نے ڈاکٹر ڈنکلر کی آواز سنی۔

''ہاں۔'' ایک کرخت آواز آئی ''قیدی نمبر 82585 فرار ہوگئی ہے۔''

''اچھا......؟ مگر یہاں تو کوئی نہیں آیا۔'' ڈاکٹر ڈنکلر نے کہا ''ویسے تم چاہو تو اندر آ کر دیکھ لو اور اپنا اطمینان کر لو۔''

یہ سنتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر ڈنکلر نے بڑا زبردست خطرہ مول لیا تھا۔ اگر وہ جرمن محافظ مجھے وہاں دیکھ لیتا تو میرے ساتھ ڈاکٹر ڈنکلر کو بھی گیس چیمبر میں پہنچا دیتا مگر جرمن محافظ غالباً یہ ایکسٹرا ڈیوٹی کرنے کے

موڈ میں نہیں تھا۔ ویسے بھی روسی فوج کی پیش قدمی کی خبر نے جرمنوں کے حوصلے پست کر دیے تھے اس لیے وہ اندر نہ آیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے واپس جاتے قدموں کی آواز سنی اور سکون کا سانس لیا۔

''تمہیں اس جگہ سے صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے نکلنا ہوگا۔'' دروازہ بند کرنے کے بعد ڈاکٹر ڈنکلر نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش اور پریشانی تھی۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی اور دونوں ہاتھ بھی۔

''یہاں میری ایک اطالوی دوست ہے۔'' ڈاکٹر ڈنکلر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ''وہ یہاں متعدی اور وبائی امراض کے وارڈ کی انچارج ہے۔ اس کا وارڈ چونکہ خطرناک امراض کا گڑھ ہے اس لیے وہاں کوئی بھی جرمن گارڈ داخل نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں وارڈ میں آسانی سے چھپا لے گی...... اور جب روسی فاتحین یہاں پہنچیں گے تو تم آزاد ہو جاؤ گی۔''

''ڈاکٹر ڈنکلر!'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''تم یہ سب میری خاطر کیوں کر رہی ہو؟''

''ایک پرانا قرض چکانے کے لیے۔'' اس نے جواب دیا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا ''مجھے ایک رحم دل اور نیک انسان کا ایک پرانا قرض چکانا ہے...... میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شفیق اور بے مثال انسان نہیں دیکھا۔ اس کا نام تم جانتی ہو...... الیگزینڈر رراڈو تمہارے ڈیڈی!''

ڈیڈی کے تذکرے پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے اچانک ہی وہ شدت سے یاد آ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بچپن کی وہ تمام خوشگوار یادیں میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں جو میرے ڈیڈی سے وابستہ تھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے پیروں سے چلنے کے قابل ہوئی تھی' اس وقت سے ہر اتوار کی صبح کو میں ڈیڈی کے ساتھ چہل قدمی کرنے بڑے ذوق شوق سے جاتی تھی۔ چونکہ میں ایک چھوٹی بچی تھی اس لیے ڈیڈی نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا اور نہ اپنے مسائل سے مجھے آگاہ کیا البتہ میں ان کے مسائل خاموشی سے محسوس کر لیا کرتی تھی اور ان کا ذہنی بوجھ کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھ سے اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے ڈیڈی کی ایسی بیٹی ہوں جسے انہوں نے باپ ہی نہیں' ماں بھی بن کر پالا ہے۔

میرے ڈیڈی بھوری اور سرمئی آنکھوں والے صحت مند انسان تھے۔ وہ بڈاپسٹ کی مشہور شخصیت تھے۔ ان کی ایک نیوز ایجنسی تھی۔ اس نیوز ایجنسی کو ملک کی سب سے معتبر اور مستند ایجنسی سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور سے جنگ بلقان کے حوالے سے ڈیڈی کی نیوز ایجنسی کی فراہم کردہ خبروں کو سچ اور صحیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ ہنگری کے دانش وروں اور تعلیمی ماہرین کے ترجمان بھی تھے۔ اس گروپ کا خیال تھا کہ معاشرے پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم کرے اور ان کے لیے یکساں سلوک کو یقینی بنائے۔

پہلی جنگ عظیم نے آسٹریا اور ہنگری کی سلطنت کو ختم کر کے ہنگری کے عوام پر کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ مسلط کر دی جس کا روح رواں وحشی اور جابر بیلا کن تھا۔ یہ آمریت مارچ 1919ء میں مسلط ہوئی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ایک رات کو ہمارے فلیٹ پر چھاپا مارا گیا۔ ان لوگوں کو تخریبی مواد کی تلاش تھی۔ جب ڈیڈی نے دیکھا کہ آمر کے وحشی کارندے ہمارے فلیٹ میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ مشتعل ہو گئے اور انہیں وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اسی لمحے ڈیڈی چکرا گئے اور فرش پر گر گئے۔ انہیں زبردست ہارٹ اٹیک ہوا تھا جس نے آخر کار ان کی جان لے لی۔ ڈیڈی دل کے مریض تھے اور ڈاکٹر نے انہیں غصہ کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

''میں ان لوگوں میں شامل ہوں جن کی تمہاری ڈیڈی نے بے لوث مدد کی تھی۔'' ڈاکٹر ڈنکلر نے مجھ سے کہا ''میں ایک بیوہ ماں کی بیٹی تھی۔ میری ماں کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ مجھے میڈیکل کی تعلیم دلوائیں مگر میری خواہش تھی کہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کروں اور ایک ڈاکٹر بنوں۔ پھر خدا نے معجزاتی طور پر میرا راستہ آسان کر دیا۔ میری اسکول اور کالج کی فیس کا بھی انتظام ہو گیا اور دوسرے تعلیمی اخراجات کا بھی۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس کا مجھے اس وقت علم ہوا جب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے سند حاصل کر چکی تھی۔ اس وقت میری ماں نے مجھے بتایا کہ میری تمام فیس اور تعلیمی اخراجات تمہارے ڈیڈی نے دیے تھے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر ڈنکلر نے ایک سرد آہ بھری اور کہا ''جب مجھے یہ حقیقت معلوم ہو گئی تو میں تمہارے ڈیڈی کی مرضی کے خلاف ان کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس گئی۔ شروع میں تو وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوئے کہ انہوں نے تعلیم کے حصول میں میری مالی مدد کی ہے مگر جب میں نے ان سے بحث اور تکرار کی تو آخر کار انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور مجھ سے کہا ''اگر تم میرا شکریہ ادا کرنا ہی چاہتی ہو تو اس طرح کسی اور کی مدد کر دینا جس طرح میں نے تمہاری کی تھی۔ زندگی میں ایسے انسان کو تلاش کرنا جو اپنوں سے بچھڑ گیا ہو اور سخت مصیبت و پریشانی میں ہو۔ بس تم اس کی مدد

کرنا اور یہ سمجھ لینا کہ تم نے میرا قرض ادا کر دیا۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر ونکلر خاموش ہوگئی۔

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کے مزید بولنے کی منتظر تھی۔ اس نے میری سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "پھر میں ڈاکٹر بن گئی اور بڈاپسٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ کچھ ہی عرصے میں' میں اپنے کام میں اس قدر منہمک ہوگئی کہ مجھے اس کے علاوہ کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر ایک روز نازی فوجی میرے آفس پہنچے۔ آشوٹز کیمپ کے میڈیکل سربراہ ڈاکٹر جوزف مین گیل کو ایک ریڈیو لوجسٹ کی ضرورت تھی لہٰذا وہ لوگ مجھے زبردستی یہاں لے آئے۔ یہاں آنے کے بعد جب مجھے تمہارے بارے میں پتا چلا کہ تم بھی اسی کیمپ میں قید ہو تو میں نے یہ عہد کر لیا کہ تمہاری زندگی بچا کر رہوں گی۔"

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے صبح کی پہلی کرن نظر آئی۔ یہ دیکھتے ہی ڈاکٹر ونکلر نے جلدی سے کہا "تمہیں یہاں سے فوراً چلا جانا چاہیے۔ اگر روشنی مزید بڑھ گئی تو تم نہیں نکل سکو گی۔ متعدی امراض کا وارڈ بلاک نمبر 8 میں ہے اور اس کی انچارج اطالوی ڈاکٹر ایلویرا ہے۔ وہ وارڈ کے شمالی حصے میں دوسری کھڑکی کے پاس سوتی ہے۔ اس کھڑکی پر دستک دینا اور خفیہ کوڈ "پیرو گینا" کے الفاظ ادا کرنا۔ جاؤ...... خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

صبح نمودار ہونے کو تھی۔ واچ ٹاورز کے جرمن پہرے دار اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ کافی دیر تک میں بیرک کی دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی رہی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے گھنٹوں گزر چکے ہیں...... پھر میں نے اپنے گھٹنوں اور دونوں ہاتھوں کے بل کھڑکیوں کے نیچے سے رینگ رینگ کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ آخرکار میں متعدی امراض کے وارڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی...... پھر میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور ڈاکٹر ونکلر کی ہدایت کے مطابق دوسری کھڑکی پر دستک دی۔ مجھے ایک سفید کوٹ کی جھلک شیشے میں سے نظر آئی' پھر فوراً ہی کھڑکی کا پٹ کھل گیا۔ میں نے سرگوشی میں خفیہ کوڈ "پیرو گینا" کے الفاظ ادا کیے۔ اس کے ساتھ ہی دو مضبوط اور توانا ہاتھوں نے مجھے اس کھڑکی کے راستے اوپر کھینچ لیا۔ وہاں سے مجھے ایک نرم گدے پر پہنچا دیا گیا۔ گدے پر لیٹتے ہی میں گہری نیند سو گئی۔

آنے والے دنوں میں' میں اور ڈاکٹر ایلویرا جو بھی باتیں کرتے رہے ان کا محور و مرکز روسی فوج کی پیش قدمی ہی ہوتا تھا۔ ہمیں ان کی توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ آوازیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ آوازیں نہیں تھیں' ہماری آزادی کا اعلان تھا...... یہ آوازیں ہمارے لیے نئی زندگی کی نوید لا رہی تھیں۔

ایک صبح ڈاکٹر ونکلر مجھ سے ملنے آئی۔ اس کی رنگت زرد تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ بے حد تھکی تھکی اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

"میں تمہیں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔" ڈاکٹر ونکلر نے کہا "آج سہ پہر کو ڈاکٹر مین گیل اپنے عملے کو واپس برلن بھجوا رہا ہے۔"

یہ خبر سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی "اگر خدا نے مجھے زندگی دی اور میں مرنے سے بچ گئی تو میں نے یہ عہد کیا ہے کہ اپنی زندگی ڈاکٹر مین گیل کے طبی جرائم کو منظر عام پر لانے کے لیے وقف کر دوں گی اور ساری دنیا کو اس کا مکروہ چہرہ دکھا دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولی "ویسے یہ بات ڈاکٹر مین گیل بھی جانتا ہے شاید اسی لیے اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے مروا دے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ تمہاری ذمے داری ہوگی کہ تم اس شیطان کے کرتوت سے ساری دنیا کو آگاہ کرو اور ساری دنیا کو یہ بتاؤ کہ یہ شخص سائنس کے نام پر کس قسم کے گھناؤنے کھیل اس کیمپ میں کھیلتا رہا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میں لرزنے لگی اور میں نے بڑی مشکل سے کہا "تم نے جس طرح میری مدد کی ہے اور میری جان بچانے کے لیے جو خطرہ مول لیا ہے' اس کا شکریہ میں ساری زندگی بھی ادا نہیں کر سکوں گی۔"

"نہیں مائی ڈیئر!" ڈاکٹر ونکلر نے کہا "تمہاری جان میں نے نہیں' تمہارے ڈیڈی نے بچائی ہے۔ وہ نہ جانے کب اور کیسے ماضی کے دریچوں سے نکل کر یکایک آ گئے اور بلاشبہ یہ میرے اور تمہارے دونوں کے لیے ایک معجزہ ہے۔"

جلد ہی روسی فوج آشوٹز آن پہنچی۔ اس کے ساتھ پولش ریڈ کراس کمیشن کا عملہ بھی تھا۔ جب ان لوگوں نے اس کیمپ کی تلاشی لی تو کیمپ کے میڈیکل اسٹاف کی لاشیں ایک خندق سے ملیں جو اس کیمپ کے مغرب میں 14 میل کے فاصلے پر واقع تھی تاہم ڈاکٹر جوزف مین گیل کو کبھی پکڑا نہیں جا سکا۔ اس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ زندہ ہے اور کسی ملک میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے مگر میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر وہ تھی جس کے مطابق ڈاکٹر ونکلر کی لاش بھی اسی خندق سے ملی تھی۔ اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔

فرار

سید احتشام

گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ہر جانب گولہ و بارود کی بارش تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دونوں جانب کی فوجیں خندقوں سے نکل آئی تھیں اور ہر طرف کشتے کے پشتے لگ رہے تھے۔ لاشوں سے میدان اٹ گیا تھا۔ اتحادی فوج کی فتح قریب تھی کہ دشمنوں کو نئی کمک مل گئی اور نقشہ بدل گیا۔ تمام فوج گرفتار ہو گئی جس میں ایک جنرل بھی تھا مگر جنرل نے جب چال چلی تو دنیا حیران رہ گئی۔

ایامِ جنگ کی حیران کن یادیں



1940 کا سال یورپ میں نازی فتوحات کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ 1939ء میں شروع ہونے والی جنگ عظیم کے شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مغربی یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جرمنوں نے پہلے اپنے پڑوسی ممالک پر حملہ کیا اور یکے بعد دیگرے انہیں فتح کرتا چلا گیا۔ جرمنوں کی یورش اتنی تیز اور بھرپور تھی کہ یورپی طاقتیں ششدر رہ گئیں اور اسی حیرت کے عالم میں ایک ایک کر کے جرمنی کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ ان میں

فرانس جیسی بڑی طاقت بھی شامل تھی۔

دیکھا جائے تو نوآبادیات کی دوڑ میں برطانیہ کے بعد فرانس ہی کا نمبر آتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے نمبر پر ڈچ اور پرتگالی ہیں۔ فرانس نے خاص طور سے افریقا اور مشرق وسطیٰ میں بڑے ممالک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مشرق بعید میں بھی فرانسیسی استعمار کے پنجے گڑ گئے تھے۔ اس کی فوج بے حد تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس تھی۔ جنگ عظیم اوّل میں فرانس، برطانیہ اور امریکا کا اتحادی تھا۔ جرمنوں کی شکست کے بعد اس پر سخت اور ذلت آمیز شرائط عائد کرنے میں فرانس پیش پیش تھا۔ بعد میں جب ان شرائط کے ردِّعمل میں جرمنی نازی ازم کی طرف مائل ہوا تو سب بڑی طاقتوں نے جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ان میں فرانس بھی تھا۔ اس نے جدید اسلحے سے لیس گیارہ لاکھ تربیتی فوج کی مدد سے ایسی دفاعی لائنیں تیار کی تھیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ ناقابل شکست ہیں۔

مگر جب جرمنوں کے مشینی دستوں نے یلغار کی تو بے حد مضبوط مورچے دیکھتے ہی دیکھتے سرنگوں ہو گئے تھے۔ جرمنوں نے اتنی تیزی سے فتوحات حاصل کیں کہ فرانسیسیوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ان کے ناقابل شکست ہونے کا بھرم ان کے مورچوں کی طرح ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ جرمنوں نے انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔

10 مئی 1940ء کے گرم دن جرمن بیچل افواج نے لاکٹیلیٹ کے علاقے دوڈز میں فرانسیسی فارورڈ مشین گن پوسٹ پر حملہ کر دیا۔ مارٹر کے بھرپور حملوں کے بعد جرمن کمانڈر نے بچ جانے والے فرانسیسیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔

مارٹرز کے تیز، شدید اور تابڑ توڑ حملوں نے مشین گن مورچے کو تباہ کر دیا تھا اور اب وہاں ہر طرف فرانسیسی سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے اور زندہ بچ جانے والے آنے والے لمحات سے خوف زدہ تھے۔ جب جرمنوں نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو فرانسیسی دستے نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اسے مان لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ بصورت دیگر مارٹر باری ان کا خاتمہ کر دے گی۔

فرانسیسی سپاہیوں کو اپنی نہیں بلکہ سرمئی مونچھوں والے چھ فٹ قامت کے جنرل ہنری جیراڈ کی فکر تھی۔ وہ ان کے مورچوں کا معائنہ کرنے آیا تھا اور جب جرمنوں نے حملہ کیا تو اسے بچنے کا اور مورچے سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ بھی جرمنوں کے ہاتھوں فرار ہو گیا۔ قیدیوں کے معائنے کے لیے آنے والے جرمن آفیسر نے جب ایک فائیو اسٹار جنرل کو قیدیوں میں پایا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"جنرل سر....! مجھے آپ سے ملاقات کر کے بے حد خوشی ہوئی۔" اس نے فرانسیسی جنرل کو سیلوٹ کیا۔

جیراڈ نے سیلوٹ کا جواب دیا مگر کوئی جملہ کہنے سے گریز کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے جرمن کمانڈر کو علم نہیں تھا کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے جب کہ وہ جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ موقع آیا تھا۔ جنگ عظیم اوّل میں جب وہ کیپٹن تھا، اس وقت بھی وہ گرفتار ہوا تھا اور اس نے قید کاٹی تھی۔ آج تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں فرانس کی مشہور زمانہ "میشرینو" دفاعی لائن پر ایک حملے کے دوران کیپٹن جیراڈ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی کمپنی کے بیشتر افراد مارے جا چکے تھے اور بچے کھچے جرمنوں کے قیدی بن گئے تھے۔ ان میں کیپٹن جیراڈ بھی شامل تھا۔ اسے بیلجیم کے علاقے بنٹے ورپ کے نزدیک قائم کیے جانے والے جنگی کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ اس وقت جنگی قیدیوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ جرمن قیدیوں پر بہیمانہ تشدد کرتے تھے۔ انہیں فوجی عدالتوں کے ذریعے سزائیں دی جاتی تھیں اور انہیں وکیل کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیپٹن جیراڈ کو معلوم تھا کہ اس کے زخم بھرتے ہی اسے کسی نام نہاد عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اور اسے سزائے موت سنا دی جائے گی۔ گرفتاری کے وقت اس نے مزاحمت کرتے ہوئے دو جرمن سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جرمنوں کے نزدیک اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے اس پر خاصا تشدد کیا تھا اور جرمن پہریدار اسے آئے دن دھمکاتے رہتے تھے کہ ذرا اس کے زخم اچھے ہو جائیں پھر وہ اسے دیکھ لیں گے۔

اس کی عافیت اسی میں تھی کہ برا وقت آنے سے پہلے ہی وہ فرار ہو جائے۔

☆☆☆

جنرل ہنری جیراڈ کے خیال میں فرانس کو دفاع کے بجائے جارحانہ قدم اٹھانا چاہیے تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ ملک کے حکمراں اور فوجی افسران، ہٹلر سے بے حد خوف زدہ

تھے۔ انہوں نے صرف دفاع پر زور دیا اور جرمنوں نے ان کے دفاع کو روند کر رکھ دیا۔ اس موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے عقل مندی کی اور فرانس میں سے اپنی فوج کا بڑا حصہ نکال لیا۔ یہ تین لاکھ اسی ہزار سپاہی بچا کر اس نے آنے والے دنوں میں اتحادیوں کی فتح کی بنیاد رکھی۔ جرمنوں سے جنگ میں آزمودہ ان سپاہیوں نے ڈنکرک کے محاذ پر حیران کن پیش قدمی کر کے اپنی ذلت اور مزید پسپائی کا ازالہ کر دیا تھا۔

فرانس پر جرمنوں کی فاتحانہ یلغار نے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ جب جرمنوں نے آرڈی نینس کے جنگلات سے نکل کر پیش قدمی کی تو جنرل جیراڈ کو خود محاذ پر جانا پڑا۔ وہ حیران تھا کہ جرمن اتنے سخت مورچے کس طرح آسانی سے فتح کر رہے تھے۔ اس موقع پر اس نے خود جرمنوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ جرمنوں نے پہلے توپ خانے سے حملہ کیا، پھر مارٹروں اور ہلکے ہتھیاروں سے فائرنگ کی۔ انہوں نے فرانسیسیوں کو مورچوں سے سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اسی دوران ان کے مشینی دستے اور ان کی آڑ میں پیدل دستے پیش قدمی کرتے رہے تھے۔ محض دو گھنٹے میں انہوں نے دس میل تک پیش قدمی کی تھی اور یہ کوئی آسان محاذ نہیں تھا۔ یہاں فرانسیسیوں نے قدم قدم پر مورچے بنا رکھے تھے، بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور خاردار تاروں کی باڑیں لگا رکھی تھیں۔

☆......☆

جنرل جیراڈ اس وقت فارورڈ مشین گن پوسٹ کے دورے پر تھا جب جرمن اس جگہ آن پہنچے اور انہوں نے حسب معمول برق رفتار کارروائی کر کے مورچے پر قبضہ کر لیا۔ جرمن ہائی کمان کے لیے جنرل جیراڈ کی گرفتاری بہت بڑی خبر تھی۔ برلن سے فوری حکم آیا کہ جنرل کو جرمنی روانہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ فرانسیسی فوج یا حریت پسند اسے آزاد کرانے کے لیے کوئی کارروائی کرتے، جنرل کو ایک طیارے میں جرمنی کے سرحدی علاقے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے اسے بذریعہ سڑک جرمنی کے مشہور قلعے کونگسٹن کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اس تاریخی مقام کو اس کے لیے جنگی قید خانہ قرار دے دیا گیا۔ وہ اس جگہ واحد جنگی قیدی کی حیثیت سے آیا تھا۔ جرمنوں کے اتحادی کمانڈرز کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ حملہ کر کے جنرل کو رہا کرانے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے قلعے کی حفاظت کے لیے سخت ترین انتظامات کر رکھے تھے۔ جرمنوں کی خاص فوج ایس ایس کا ایک دستہ قلعے کی نگرانی کر رہا تھا۔ ڈھائی سو اعلیٰ ترین تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ اندر باہر کے راستے پر دو گنے گارڈز تھے۔ قلعہ کی چھت پر دور مار طیارہ شکن توپیں نصب تھیں تاکہ حملہ کرنے والے اتحادی طیاروں کو مار بھگایا جائے۔ قلعہ بلند چٹانوں پر قائم تھا۔ جنرل کو جس حصے میں رکھا گیا تھا اس کی بالکونی سطح زمین سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ بلند تھی۔ اس جگہ بلند اور سیدھی چٹانیں تھیں جن سے اترنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

خلاف توقع جرمنوں نے جنرل سے عمدہ سلوک کیا تھا۔ اس سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس سے معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ البتہ کئی دن تک گستاپو کے افسران اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ جنرل نے ان کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا جس سے اس کی شخصیت پر حرف آتا۔ جرمنوں نے اسے قلعے کے جنوبی حصے میں چٹانوں کے بالائی ٹیرس میں رکھا تھا۔ اس کے کمرے کے ساتھ ہی وسیع و عریض بالکونی تھی۔ یہاں سے نیچے کا منظر صاف نظر آتا تھا بلکہ قلعے کے نچلے حصے میں گشت کرنے والے محافظوں کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سخت ترین پہرہ تھا۔ جرمنوں نے اسے ایسی کوئی شے نہیں دی تھی جس کی مدد سے وہ بالکونی سے اتر کر فرار ہو جاتا۔ جنرل کے خیال میں اس کا قلعے سے فرار مشکل تھا۔ کم از کم شروع میں اس کا یہی خیال تھا۔

مگر جلد ہی جنرل کو اپنا خیال بدلنا پڑا تھا۔ جرمنوں کے رویے میں تبدیلی آ رہی تھی۔ جیسے جیسے ان کی افواج فرانس پر قابض ہوتی جا رہی تھیں ویسے ویسے جنرل کے ساتھ ان کا رویہ درشت ہو رہا تھا۔ اب وہ اس پر دباؤ ڈالنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر تشدد کرتے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اسے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ سب سے پہلے اس نے جرمن رواں کرنے کی طرف توجہ دی۔ خوش قسمتی سے اس کی جرمن پہلے ہی بہت اچھی تھی۔ بس لب و لہجے کا فرق تھا۔ وہ اپنے پہریداروں کے ساتھ جرمن میں گفتگو کرتا تھا اور بعد میں تنہائی میں ان کے کہے جملوں اور الفاظ کو جرمن لہجے میں دہرایا کرتا تھا۔ البتہ سنتریوں سے بات کرتے ہوئے وہ اپنا لہجہ فرانسیسی ہی رکھتا تھا۔

☆......☆

وہ ایک بار پہلے بھی جرمنوں کی قید سے فرار ہو چکا تھا مگر

اس وقت وہ جوان تھا اور اس میں اتنی ہمت اور توانائی تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود فرار کی صعوبتیں برداشت کر سکے۔ اب وہ اکسٹھ برس کا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں خفیف سی لنگڑاہٹ آ گئی تھی۔ اس کی توانائیوں میں بھی خاصی کمی واقع ہوئی تھی مگر اس کا حوصلہ بدستور جوان تھا۔ اس نے فرار کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

جنرل جیراڈ کو جرمنوں نے جو سہولتیں دے رکھی تھیں، ان میں ڈاک کی سہولت بھی تھی۔ وہ فرانس اور دنیا بھر میں اپنے پیاروں اور عزیزوں کو خط لکھ سکتا تھا اور ان کے آنے والے جواب سنسر کے بعد اس تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ ڈاک کے ذریعے ہی فرانس اور دنیا کے دیگر حصوں سے اس کے رشتے دار، دوست، احباب اسے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ ان میں خاص طور سے کھانے پینے کی اشیاء اور عام استعمال کی دوسری اشیاء ہوا کرتی تھیں جیسے ریزر یا شیمپو۔

جنرل کی حیثیت سے اسے کرپٹوگرافی کی تربیت دی گئی تھی۔ اس نے اپنے جاننے والوں کو اور بیوی کو جو خطوط لکھنا شروع کیے ان میں اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے خفیہ الفاظ میں اپنے فرار کا منصوبہ اپنے دوستوں تک پہنچانا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ اس کی مدد کر سکیں۔ اسے ایک رین کوٹ اور ایک ٹرانگون ہیٹ کی ضرورت تھی۔ قید میں اسے جو لباس دیا گیا تھا وہ اس کے فوجی یونیفارم سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی نیلے رنگ کا کوٹ اور سفید پتلون۔ اس لباس میں فرار ہونے کے چند گھنٹے کے اندر اندر وہ پکڑا جاتا۔ اس کے علاوہ اسے شناختی کاغذات اور جرمن کرنسی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ جرمنی کی حدود میں نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

جنگ سے پہلے ہی ہٹلر کی خفیہ پولیس گسٹاپو نے جرمنی میں نگرانی کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ کوئی جرمن باشندہ چاہے وہ کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو، اس جال سے گزرے بغیر چند کلومیٹر کا سفر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر شخص کے پاس شناختی کارڈ کا ہونا ضروری تھا اور اگر کوئی شخص بغیر کاغذات کے پایا جاتا تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اسے کڑی پوچھ گچھ سے گزارا جاتا تھا۔ بغیر مکمل تسلی کے اسے رہا نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی جاسوسی کے لیے پورے ملک میں گسٹاپو کے کئی لاکھ ایجنٹ پھیلے ہوئے تھے جو ہر مشکوک فرد پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ جنگ کے دوران جاسوسی کے اس نظام میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ عام افراد بھی جاسوسی کے فرائض انجام دینے پر مجبور تھے۔ انتہا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے جاسوسی کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی نگرانی کرتے تھے اور اس کی رپورٹ اسکول میں اساتذہ کو دیا کرتے تھے۔

تقریباً چھ مہینے کے عرصے میں جنرل جیراڈ کے فرار کا منصوبہ طے پا گیا۔ فرانس کی تحریک آزادی اور اتحادیوں نے اس سلسلے میں ایک مکمل منصوبہ جنرل تک پہنچا دیا کہ اسے کس طرح اپنے فرار کو کامیاب بنانا ہے۔ منصوبے کے ساتھ ہی اس کے دوستوں نے اسے سامان بھی پہنچانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اسے رین کوٹ اور اس میں ٹرانگون ہیٹ بھیجا گیا۔ اس قسم کا لباس جرمنی میں عام استعمال ہوتا تھا۔ اسے پہن کر وہ کسی جرمن سے مختلف نہ لگتا۔ اس کی شکل و صورت بھی کسی حد تک جرمنوں سے ملتی تھی۔ پھر اسے ایک کیک میں چھپا کر سب سے ممنوعہ شے بھیجی گئی، یعنی ریزر بلیڈ۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے جرمن نگرانوں نے نہ صرف اس کے خط و کتابت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے لیے جو سامان آ رہا تھا اسے بھی بغیر چیک کیے اسے دے دیا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ قلعے کا کمانڈر ایک نااہل شخص تھا۔ اسے جنرل کی جتنی سخت نگرانی کرنی چاہیے تھی اس نے نہیں کی۔

جنرل نے فرار کے لیے رات کے بجائے دن کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ صبح اسے ناشتا پہنچانے کے بعد مزید چار گھنٹے تک کوئی اس کی طرف نہیں آتا تھا اور اسے پوری آزادی حاصل ہوتی تھی جبکہ رات کو ہر نصف گھنٹے کے وقفے سے کوئی نہ کوئی شخص اس کے کمرے میں جھانکنے ضرور آتا تھا۔ اس کے فرار کا راز فوراً فاش ہو جاتا اور وہ اس جگہ سے زیادہ دور جانے سے پہلے ہی گرفتار ہو جاتا۔ اس لیے فرار کے لیے دن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ دن میں عام نقل و حرکت ہونے کی وجہ سے جاسوس یا پولیس والے خاص طور سے اس پر توجہ نہ دیتے لیکن رات میں وہ خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتا اور اس سے لازماً پوچھ گچھ بھی ہوتی۔

☆......☆

17 اپریل 1942ء کی صبح جنرل جیراڈ بالکونی میں کھڑا ایک سو پچاس فٹ نیچے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر قلعے کے بیرونی راستوں پر گشت کرنے والے سنتریوں کو دیکھا۔ وہ ہر چار منٹ میں ایک چکر لگاتے تھے۔ اس طرح کہ ایک

منٹ تک وہ جنرل کی نظروں میں رہتے تھے۔ لازمی بات تھی کہ اس دوران جنرل بھی ان کی نظروں میں رہتا تھا۔ گویا اس کے پاس تین منٹ تھے۔ اس نے اپنی پشت پر ایک پیک باندھ رکھا تھا۔ اس میں اس کا رین کوٹ اور ٹرائیکون ہیٹ تھا۔ لنچ کے لیے بسکٹ اور چاکلیٹ تھے، اس کا ریزر تھا۔

جیسے ہی وہ سنتری نگاہوں سے اوجھل ہوئے، اس نے پھرتی سے تانبے کی تار نیچے گرائی، اسے مضبوطی سے بالکونی کی ریلنگ سے باندھا اور سنتریوں کے آنے سے پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ رگڑ سے بچنے کے لیے اس نے دستانے پہن لیے تھے۔ اس کے باوجود تار کی رگڑ نے اس کی ہتھیلیوں کو زخمی کر دیا مگر جان کے مقابلے میں یہ معمولی زخم کچھ بھی نہیں تھے۔ زمین پر اترتے ہی اس نے نزدیکی درختوں میں جا کر سب سے پہلے اپنی مونچھیں صاف کیں جو ایک طرح سے اس کا شناختی نشان تھیں۔ جلد کی سفیدی ختم کرنے کے لیے اس نے اپنے پاس موجود زیتون کا تیل مل لیا۔ پھر کپڑے بدلے۔ نیلا کوٹ اتار کر اس کی جگہ رین کوٹ پہن لیا اور سر پر ٹرائکون ہیٹ رکھ کر وہ قطعی طور پر ایک جرمن باشندہ نظر آنے لگا تھا۔ لیکن جرمن نظر آنا کافی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی کامیاب فرار کے لیے اسے بہت کچھ درکار تھا۔ حلیہ بدل کر اس نے مخصوص سمت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ اس پورے علاقے کا نقشہ وہ پہلے ہی ازبر کر چکا تھا۔

پیر میں لنگ کے باوجود اس نے اگلے دو گھنٹے میں پانچ میل کا فاصلہ طے کیا اور ''بینڈ شونڈر'' کے پاس موجود پل تک جا پہنچا۔ قلعے میں قید کے دوران اس نے ورزشیں کر کے اپنی صحت کو برقرار رکھا تھا لہٰذا پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے میں اسے قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ پل کے نیچے کی دیوار کے تلے پُرسکون انداز میں ستاتے ہوئے اس نے اپنا لنچ مکمل کر لیا۔ اب اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس کے دوستوں نے جو منصوبہ اس تک پہنچایا تھا اس کے مطابق ایک شخص کو اس کے پاس آنا تھا اور اسے ایک سوٹ کیس دینا تھا جس میں اس کے شناختی کاغذات، ایک عدد سوٹ اور کچھ کرنسی کے علاوہ صنعتی مصنوعات کے چند نمونے بھی ہوتے۔ دراصل اب اسے ایک جرمن صنعت کار کے روپ میں آگے سفر کرنا تھا۔

ایک بجے ٹھیک وقت پر اسے نیچے پگڈنڈی سے ایک نوجوان جرمن ہاتھ میں سرمئی رنگ کا لیدر سوٹ کیس لیے نظر آیا۔ نشانیاں مکمل تھیں لیکن جنرل کے دل میں خدشہ تھا کہ کہیں یہ اس کی دوبارہ گرفتاری کے لیے کوئی چال نہ ہو۔ نوجوان نزدیک آیا تو اس نے اپنا ریزر مضبوطی سے انگلیوں میں تھام رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ جرمنوں کے ہاتھ آنے کے بجائے وہ خودکشی کو ترجیح دے گا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق نوجوان کو اس سے کوئی بات کیے بغیر سوٹ کیس اس کے پاس رکھ کر چلے جانا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا جب نوجوان نے ایسا ہی کیا۔

اس نے سوٹ کیس اٹھایا اور پل پر آ کر اس نے آنے والی پہلی بس میں جگہ حاصل کی اور ریلوے اسٹیشن سے ذرا پہلے اتر گیا۔ اس نے بکنگ سے جا کر فرانس تک کا ٹکٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے ٹرین کے آنے تک کا وقت ایک نسبتاً تاریک گوشے میں اخبار پڑھتے ہوئے گزارا۔ ٹرین کے آتے ہی وہ اس میں سوار ہو گیا۔ سب سے پہلے وہ سوٹ کیس سمیت لیوٹری میں گیا۔ وہاں اس نے اپنے کاغذات نکال کر غور سے دیکھے۔ ان پر اس کی صورت سے ملتی جلتی بغیر مونچھوں کی ایک تصویر تھی۔ کاغذات ہر لحاظ سے مکمل تھے سوائے تصویر کے۔ اگر کوئی ایجنٹ بغور اس کی صورت اور تصویر کا موازنہ نہ کر لیتا تو اس کی چالاکی پکڑ لیتا۔ اس نے کاغذات کے مطابق اپنا حلیہ درست کیا اور جب لیوٹری سے برآمد ہوا تو وہ ایک معزز عمر رسیدہ جرمن بزنس مین نظر آ رہا تھا۔

☆......☆

جنرل جیراڈ کے فرار کا راز کھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ جرمن کے حکومتی ایوان میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ ہٹلر نے خود قلعے کے کمانڈر کو معطل اور گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ پورے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ ناکہ بندی ہونے لگی تھی اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات جرمنی کی جگ ہنسائی کا باعث بن جاتی کہ ایک نامور جنرل ان کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔

ہنری جیراڈ جانتا تھا کہ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ مستقل سفر کرتا رہے حتیٰ کہ فرانس کی سرحد میں داخل ہو جائے۔ ٹرین نے فرانس کی سرحد کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔ جب جیراڈ ٹرین میں سوار ہوا تو اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان جرمن لیفٹیننٹ بیٹھا ہوا تھا جو افریقا کے محاذ سے چھٹی گزارنے وطن واپس آیا تھا۔ وہ جیراڈ کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ہیل ہٹلر۔" اس نے کہا۔

"ہیل ہٹلر۔" جیراڈ نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ حالانکہ اسے اس نعرے سے سخت نفرت تھی۔

"میں افریقا سے آیا ہوں۔" نوجوان لیفٹیننٹ نے بتایا۔ "وہاں میں ایس ایس کے دستوں میں شامل تھا۔"

جنرل جانتا تھا کہ جرمنی میں بلیک شرٹ کی عرفیت سے مشہور یہ خاص فوجی دستے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں چن چن کر صرف ہٹلر کے وفاداروں کو لیا جاتا تھا۔ پھر ان کو کڑی جانچ سے گزار کر فورس میں شامل کیا جاتا تھا۔ ان کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ ان کی سیاہ وردی ہی ان کی شناخت تھی۔ اس کے بعد ان کے حکم سے سرتابی کی کسی میں مجال نہ ہوتی تھی۔ انہیں اختیار حاصل تھا کہ بغیر وجہ بتائے کسی بھی شخص کو گرفتار یا قتل کر سکتے تھے۔ ایس ایس کے اس نوجوان کی صورت میں جنرل کو ایک پناہ گاہ مل گئی تھی۔ بہ شرط یہ کہ وہ اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس نے فوراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔

"واہ، کیا بات ہے افریقا کی۔" وہ بولا۔ "میں نے وہاں کئی سال گزارے ہیں۔"

"اچھا۔" نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

دونوں فوراً ہی بے تکلف ہو کر افریقا اور صحرا کے قصے چھیڑ بیٹھے۔ دونوں ہی کو صحرا سے محبت تھی۔ جنرل نے اپنی عمر کے کئی سال شمالی افریقا کے صحراؤں میں گزارے تھے۔ وہ ان کے چپے چپے سے واقف تھا۔ بعد میں یہی صحرا جنرل رومیل کی رزمگاہ بنتے تھے۔ اس نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ جنرل کو یہ سارے واقعات بھی معلوم تھے۔ اس نے نوجوان کو بتانا شروع کر دیا کہ کس طرح افریقا کے صحرا میں رومیل نے برطانوی افواج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا بیان اتنا موثر تھا کہ نوجوان اس میں کھو کر رہ گیا۔ جب گسٹاپو والے مسافروں کے شناختی کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے اس ڈبے میں آئے تو نوجوان لیفٹیننٹ پوری طرح جنرل کے سحر انگیز اور ولولہ خیز بیان میں کھویا ہوا تھا۔ گسٹاپو والے باری باری ہر مسافر کے پاس اس کے شناختی کاغذات چیک کرتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے۔

جنرل دیکھ رہا تھا کہ گسٹاپو کے ایجنٹ رفتہ رفتہ اس کے نزدیک آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ بظاہر ان کی آمد سے بے خبر اپنی داستان سنانے میں مصروف تھا۔ اس کی کہانی کے سحر میں کھوئے ہوئے نوجوان لیفٹیننٹ کا چہرہ مارے جوش کے تمتما رہا تھا اور اس کے ہاتھ سختی سے سیٹ پر جمے ہوئے تھے۔

گسٹاپو کے ایک ایجنٹ نے جنرل کا شانہ ہلایا۔ "جناب اپنے شناختی کاغذات دکھائیں۔"

جنرل جیراڈ نے یوں چونک کر اس کی جانب دیکھا جیسے اس کی مداخلت پسند نہ آئی ہو۔ "کیا بات ہے؟"

"اپنے کاغذات دکھائیں۔"

اسی اثنا میں نوجوان لیفٹیننٹ کہانی کے سحر سے چونکا تھا۔ اس نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گسٹاپو کے اس ایجنٹ کی طرف دیکھا اور دہاڑا۔

"دفع ہو جاؤ۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمارے درمیان میں آنے کی۔"

گسٹاپو کا ایجنٹ بوکھلا گیا۔ ایس ایس کے کسی آدمی سے الجھنا اپنی شامت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس نے جھک کر جلدی سے معذرت کی۔ "معافی چاہتا ہوں جناب۔"

نوجوان لیفٹیننٹ نے اسے جاتے ہوئے روکا۔ "اب کوئی بھی مجھے اور ان معزز صاحب کو پریشان نہ کرے۔ ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔" اس نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں جناب۔ اب کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔"

اس کے جانے کے بعد جنرل نے سکون کا سانس لیتے ہوئے نوجوان کو اپنی کہانی سنانا جاری رکھا مگر یہ ساتھ زیادہ دیر کا نہ تھا۔ اس سے اگلے اسٹاپ پر جنرل کو دوسری گاڑی پکڑنی تھی۔ نوجوان لیفٹیننٹ نے بادل نخواستہ اسے رخصت کیا۔ اس نے اسے اپنا پتا دیا اور وعدہ کیا کہ وہ اسے خط لکھے گا۔ شکر ہے اس نے جنرل کا پتا نہیں مانگا تھا ورنہ اس کے لیے مشکل ہو جاتی۔ جب دوسری ٹرین آئی جسے فرانس کی طرف سفر کرنا تھا تو جنرل نے دیکھا کہ اس میں سوار ہونے والے مسافروں کی کڑی جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور ان کے کاغذات بہت باریک بینی سے چیک کیے جا رہے تھے۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔

جنرل جانتا تھا کہ گسٹاپو دنیا کی سفاک ترین اور مستعد ترین خفیہ پولیس تھی۔ اس کے ایجنٹ اتنی آسانی سے دھوکا نہیں کھاتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آخری لمحے میں

ٹرین پر سوار ہوگا۔ لہٰذا جب انجن نے وسل دی اور ٹرین نے حرکت شروع کی تو جنرل آخری ڈبے کی طرف بھاگا۔ بڑھاپے اور ٹانگ میں کمزوری کے باوجود اس کی رفتار حیران کُن تھی۔ وہ ایک ایسا بزنس مین نظر آنے کی پوری کوشش کررہا تھا جسے اس ٹرین کے ذریعے کہیں پہنچنا لازمی تھا ورنہ اس کا بہت نقصان ہوجاتا۔ اس کی اداکاری اتنی شاندار اور بھرپور تھی کہ کسی نے اس کا راستہ روکنے یا اس کے کاغذات طلب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ گستاپو کے ایک ایجنٹ نے اس عمر رسیدہ بوڑھے اور معزز نظر آنے والے بزنس مین کو ٹرین میں سوار ہونے میں مدد کی تھی۔

ٹرین میں سوار ہوکر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن ابھی آگے مشکل مراحل باقی تھے۔ برلن ایکسپریس فرانس کی سرحد پر پہنچی تو جنرل نے دیکھا کہ گستاپو کے حکام تمام ایسے افراد کو ایک طرف کررہے تھے جن کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جنرل کو بھی روکا جاتا اور کڑی جانچ پڑتال کے بعد اس کا راز فاش ہونے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ چنانچہ اس نے وہیں سے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ خوش قسمتی سے صرف فرانس میں داخل ہونے کے خواہش مند افراد کو تفتیش سے گزرنا پڑرہا تھا۔ اس نے واپسی کی ٹرین پکڑی اور پھر سے جرمنی کی طرف سفر شروع کردیا۔ واپسی پر گستاپو کے ایجنٹس نے بھی اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اب جنرل نے فیصلہ کیا کہ اسے سوئٹزرلینڈ کی طرف جانا چاہیے۔ اسے اُمید تھی کہ جنگ میں غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے جرمن سوئس سرحد کی اتنی سختی سے نگرانی نہیں ہورہی ہوگی۔ اس کی واحد اُمید اب یہی سرحد رہ گئی تھی۔ وہ مسلسل چوبیس گھنٹے سے سفر میں تھا اور اسی وجہ سے اب تک محفوظ تھا۔ اگر وہ راستے میں کسی اسٹیشن پر اترنے کی کوشش کرتا تو اسے لازماً کاغذات دکھانے پڑتے۔ سوئس سرحد کے پاس وہ ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ اس نے ایک دن ہوٹل میں گزارا۔ اس علاقے میں جنگی سرگرمیاں نہ ہونے کے باعث گستاپو کے ایجنٹ بھی اتنے مستعد نہیں تھے۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا۔ اگلے روز جب اس نے سرحد کا معائنہ کیا تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں بھی جرمنوں کی سرحدی پولیس کا اتنا ہی سخت پہرا تھا جتنا دوسری سرحدوں پر تھا۔

☆......☆

سوئس سرحد پر بے شمار پہاڑی راستے تھے۔ جرمن ہر جگہ پہرا نہیں لگا سکتے تھے۔ جنرل نے اس علاقے کا نقشہ حاصل کیا اور خاصے غور و فکر کے بعد اس نے ایک راستے کا انتخاب کیا۔ یہ بے پناہ دشوار گزار تھا جو دس ہزار فٹ تک بلند راستوں سے گزرتا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے پہاڑی علاقے میں سفر کرنے کے لیے جوتے اور سامان حاصل کیا۔ ان کے بغیر اس علاقے میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ اس نے گرم کپڑے اور خشک گوشت بھی ساتھ لیا۔

اس مرتبہ بھی اس نے دن کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے خود کو ہائکنگ کا شوقین ظاہر کیا تھا۔ اس نے پرائیویٹ کار میں سرحد تک سفر کیا اور وہاں سے آگے پیدل روانہ ہوگیا۔ اکسٹھ برس کی عمر اور پاؤں میں کمزوری کے باعث یہ سفر اس کے لیے آسان نہ تھا۔ بعض مقامات پر تو اسے باقاعدہ کوہ پیمائی کرنی پڑی۔ متعدد مقامات ایسے تھے کہ ذرا سا پاؤں پھسلتا اور وہ کئی ہزار فٹ نیچے جاگرتا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر برف شروع ہوگئی۔ یہ موسم گرما کی پگھلتی ہوئی برف تھی جس پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک جگہ اسے صرف سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے میں پورے دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ لیکن رات ہونے سے پہلے ہی وہ درّے کی بلندی تک جا پہنچا تھا۔ یہاں اس نے جھاڑیاں جلا کر رات گزاری۔ مارے تھکن کے اس کا برا حال تھا مگر سفر کا خطرناک حصہ ابھی باقی تھا۔

اگلے روز سورج نکلنے کے ساتھ ہی اس نے ناشتا کرکے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ اب وہ نیچے کی طرف آرہا تھا۔ یہ سفر چڑھنے سے زیادہ دشوار تھا۔ اس کی توانائی کم ہورہی تھی۔ اگر اس میں ہمت نہ ہوتی تو وہ اب تک کسی کھائی میں گرچکا ہوتا۔ چٹانوں پر سے اترتے ہوئے اس کے پیر کانپنے لگے تھے۔ ہر چند سو گز کے بعد اسے رک کر اپنا سانس بحال کرنا پڑتا تھا۔ اس کے پاس خوراک ختم ہوگئی تھی۔ پینے کا پانی ختم ہوا تو اس نے برف چوسنا شروع کردی۔ چٹانوں پر چڑھتے ہوئے اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ جوتے کے تلے نکل گئے تھے۔

اتنی مشکلات کے بعد نقشے کے مطابق وہ اب بھی جرمنی ہی میں تھا۔ سوئس سرحد اب بھی خاصے فاصلے پر تھی۔ ایک جگہ وہ کئی گز نیچے اتر کر ایسے مقام پر پہنچا جہاں مزید نیچے جانے کا راستہ ہی نہیں تھا۔ اسے واپس پلٹنا پڑا۔ اوپر جاکر اس نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ دوپہر تک اسے لگ رہا

تھا جیسے اس کے جسم میں طاقت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہو۔ وہ جیسے خود بہ خود سفر کررہا تھا۔ اس عالم میں وہ ایسی کئی جگہوں سے گزرا کہ اسے خود بھی بعد میں تعجب ہوا تھا۔

ایک بجے اس نے لنچ میں سوکھے گوشت کا آخری ٹکڑا کھایا اور چٹانوں سے نیچے اترنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے خود کو مسلح فوجیوں کے سامنے پایا۔ ان کی رائفلیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ''ہالٹ۔'' ایک کرخت آواز نے کہا۔ ''کون ہو تم؟''

سوئس زبان سن کر اس نے سکون کا طویل سانس لیا۔ وہ جرمن نہیں تھے بلکہ سوئس سرحدی فوج کے ارکان تھے جو گشت پر تھے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں فرانسیسی جنرل ہنری جیراڈ ہوں اور جرمنوں کی قید سے فرار ہو کر آیا ہوں۔''

''اب آپ محفوظ ہیں۔'' سپاہیوں نے اسے تسلی دی۔

اس کے چار گھنٹے کے بعد وہ سوئس شہر میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ اس نے وہاں اپنی شناخت کرائی جس کی سوئس حکام نے جرمنی سے تصدیق کی۔ جب جرمنوں کو علم ہوا کہ ان کا مطلوبہ شخص سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا ہے تو انہوں نے فوراً سوئس حکام سے جنرل کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر سوئس حکام نے یہ مطالبہ مسترد کردیا۔ قیدیوں کے قوانین کے لحاظ سے ہر جنگی قیدی کو فرار کا حق تھا اور جنرل نے فرار ہو کر اپنے اس حق کو استعمال کیا تھا۔ ویسے بھی سوئٹزرلینڈ اس جنگ میں غیر جانبدار تھا مگر جنرل جیراڈ کا فرار ابھی نامکمل تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے چاروں طرف کے ممالک پر جرمنی کا قبضہ ہو چکا تھا اور گویا جنرل اب ایک بڑے سے قید خانے میں تھا جس سے نکلنا ضروری تھا اور اسے معلوم تھا کہ اب جرمن سوئٹزرلینڈ کی سرحد کی کڑی نگرانی کریں گے اور اسے آسانی سے جانے کا موقع نہیں دیں گے۔ خوش قسمتی سے سوئٹزرلینڈ میں اس کے ہمدردوں کی کمی نہیں تھی۔ فرانس کے بے شمار حریت پسند جرمنوں سے بچنے کے لیے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ آگئے تھے۔ انہوں نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنرل جیراڈ کو فرانس کے آزاد علاقے تک پہنچانے کے لیے پلاننگ شروع کردی۔

سوئٹزرلینڈ سے فرانس تک کئی سڑکیں جاتی تھیں۔ انہی میں سے کسی ایک سڑک سے جنرل کو روانہ کرنا تھا۔ اس کے سوائے کوئی اور تدبیر نہیں تھی۔ غیر جانب دار ملک ہونے کی وجہ سے اتحادی فضائی کارروائی نہیں کرسکتے تھے ورنہ جرمنوں کو بھی مداخلت کا موقع مل جاتا۔ البتہ زیرزمین جوڑ توڑ دونوں طرف سے جاری تھی۔ جرمن اس فکر میں تھے کہ اوّل تو جنرل کو سوئٹزرلینڈ ہی میں اغوا کرلیا جائے ورنہ اسے فرانس جاتے ہوئے راستے میں گرفتار کیا جائے۔

جرمن ایجنٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنرل جیراڈ کو سوئٹزرلینڈ کے امریکی سفارت خانے میں رکھا گیا تھا۔ وہاں پر حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ جرمن ایجنٹ وہاں گھسنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ جب کہ فرانسیسی سفارت خانہ جرمنوں سے بالکل غیر محفوظ تھا۔ جنرل کے فرار کی خبر نے فرانس کی زیرزمین تحریک میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی اور فرانسیسی فوج کے حوصلے بلند ہوگئے تھے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی سرزمین پر آکر فوج کی قیادت سنبھال لے۔ خود جنرل اپنے وطن جانے کے لیے بے چین تھا۔

☆......☆

اس وقت ہٹلر نے اپنی زندگی کی فاش غلطی کرتے ہوئے سوویت یونین پر حملہ کردیا تھا۔ جرمن افواج اپنے مخصوص برق رفتار انداز میں روس کی عظیم وسعتوں میں گھستی چلی گئی لیکن ان فتوحات کی قیمت جرمنوں کو مغربی یورپ کے محاذ پر ادا کرنی پڑی تھی۔ اس طرف سے محاذوں سے جرمن افواج میں کمی ہوتے ہی اتحادی افواج اور ان مقبوضہ ممالک کی زیرزمین تحریکوں نے جرمن کے خلاف حملے شروع کردیے تھے۔ جرمنی کی شکست کی بنیاد 1942ء کے موسم گرما میں رکھ دی گئی تھی۔ افریقا میں جنرل رومیل کی قیادت میں جرمنوں نے بڑی فتوحات حاصل کی تھیں لیکن مصر میں برطانوی افواج نے خود کو از سرِنو منظم کرکے جوابی حملے میں جرمنوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کردیا تھا۔ اس محاذ پر جنرل رومیل کی واپسی نے بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ہٹلر کی روس پر حملے کی حماقت نے اتحادی ممالک میں اُمید کی ایک نئی کرن پیدا کردی تھی۔

بالآخر فرانس کی زیرزمین مزاحمت کی تحریک نے جنرل جیراڈ کو سڑک کے راستے فرانس واپس لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سوئس سرحد سے دس اہم سڑکیں فرانس کے مختلف علاقوں تک جاتی تھیں اور ان سب پر جرمنوں نے کڑی نگرانی کے لیے چیک پوسٹیں قائم کررکھی تھیں۔ اور اب انہیں معلوم ہوا کہ جنرل کو واپس فرانس پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے تو انہوں نے سرحد کی نگرانی اور بھی سخت کردی تھی۔ جرمنوں نے کھوج لگالیا تھا کہ جنرل جیراڈ امریکی

سفارت خانے میں روپوش تھا لہٰذا انہوں نے سفارت خانے کی نگرانی شروع کردی۔

دوسری طرف اتحادی جاسوس اور فرانسیسی حریت پسند بھی جرمنوں کی نقل وحرکت سے بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے جنرل کو امریکی سفارت خانے سے اس خوبی سے نکالا کہ جرمنوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جنرل کو فرانس کی سرحد کے پاس ایک سوئس گاؤں میں منتقل کردیا گیا۔

جب جرمنوں کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اپنے ایجنٹ سرحد کے آس پاس پھیلا دیئے تاکہ جنرل کسی بھی صورت فرانس میں داخل نہ ہوسکے اور اگر ہونے کی کوشش کرے تو ان سے بچ نہ سکے۔ دوسری طرف حریت پسند جانتے تھے کہ جرمن ان کے جنرل کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لہٰذا انہوں نے اپنے منصوبے کو زیادہ سے زیادہ فول پروف بنانا شروع کردیا۔ انہوں نے طے کیا کہ ایک کے بجائے کم سے کم دس گاڑیاں روانہ کی جائیں گی اور ان میں سے کسی ایک میں جنرل ہوگا۔ انہوں نے اس کام کے لیے جرمن گاڑیاں حاصل کرنی شروع کردیں۔ ان کے جعلی نمبر پلیٹس اور کاغذات تیار کروائے گئے ساتھ ہی جنرل کے حلیے میں تبدیلی کردی گئی۔ انہوں نے اسے ایک عام سے جرمن سیاح کی حیثیت دے دی جو فرانس کی سیاحت کے لیے جارہا تھا۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں جنرل کو سفر پر روانہ ہونا تھا لیکن عین آخری موقع پر دوبار اس کا سفر ملتوی کردیا گیا۔ آخر 10 جولائی کی صبح جب ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا، جنرل ایک کار میں سوار ہوا۔ یہ مرسڈیز کار تھی۔ جنرل خود ہی ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے پاس سوائے کاغذات، کرنسی اور چند کپڑوں کے کچھ نہیں تھا۔ ہتھیار میں اس کے پاس صرف ایک پستول تھا جیسا کہ عام طور پر سیاح رکھتے تھے۔

گاؤں سرحد سے کچھ ہی فاصلے پر تھا اس لیے جنرل ایک گھنٹے کے اندر پہلی جرمن چوکی پر جاپہنچا تھا۔ اس نے اپنے کاغذات ملاحظے کے لیے پیش کیے اور سوالوں کے جواب ٹھیٹ جرمن لہجے میں دیئے۔ اس وقت دس اور کاریں جن میں جنرل کے حلیے اور عمر سے ملتے جلتے افراد ڈرائیو کررہے تھے مختلف جگہوں سے سوئس فرانس سرحد عبور کررہی تھیں۔

جرمن بیک وقت اتنی ساری کاروں کے آنے سے پریشان ہوگئے۔ انہوں نے تین کار والوں کو روک کر باقی کو جانے دیا۔ مگر ایک گھنٹے کے اندر انہیں علم ہوگیا کہ ان کا شکار نکل چکا تھا۔

اب ایک نئی دوڑ شروع ہوگئی۔ گسٹاپو کے ایجنٹ روانہ ہونے والی کاروں کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ مزید پانچ کاریں پکڑی گئیں مگر جنرل ان میں سے کسی میں نہیں تھا۔ جرمن حیران تھے کہ جنرل کہاں غائب ہوگیا تھا۔ انہیں جرمن سیاح پر شبہ ہوا تھا مگر اس کی کار بھی آگے کہیں نہیں ملی۔

جنرل اس وقت ایک سنی پورشے میں محوِ سفر تھا۔ اس کا حلیہ اس وقت ایک فارغ البال کسان کا تھا جس کے پاس خاصی دولت آگئی تھی۔ تیسری چوکی سے گزرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر کار اور اپنا حلیہ بدلا۔ اس وقت جرمنوں نے سنی پورشے کی تلاش شروع کردی تھی۔ جنرل کامیابی سے جرمنوں کو جل دیتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے جس دیہاتی طرز کے ریستوران میں کھایا وہ جرمن فوجیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بیٹھ کر لنچ کرنا واقعی دل گردے کا کام تھا مگر جنرل اس صورت حال سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے ایک بے پرواہ فرانسیسی کا کردار ادا کرتے ہوئے جرمن افسروں کے گروپ میں بے تکلفی سے بات کی اور انہیں ٹوٹی پھوٹی جرمنی میں مقامی بے ہودہ فرانسیسی لطائف کا ترجمہ سنایا۔ جرمن دل کھول کر ہنسے تھے اور انہوں نے اسے شراب کی پیشکش بھی کی۔

”نہیں، سینورز۔ ڈاکٹروں نے مجھے شراب نوشی سے منع کیا ہے۔“ اس نے انکار کردیا۔

جرمنوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس شخص کو شراب پیش کررہے تھے وہ ان کا انتہائی مطلوب شخص تھا جو بے تکلفی سے ان کے ساتھ بیٹھ کر گپیں ماررہا تھا۔ تین بجے جنرل نے ان سے اجازت مانگی۔ ”اچھا معزز دوستو، اب مجھے اجازت دو۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ اُمید ہے تم بھی مجھے یاد رکھو گے۔“

جرمن افسران نے اسے گرمجوشی سے رخصت کیا بلکہ میجر کے عہدے کے ایک افسر نے اسے اپنا نام بھی بتایا کہ اگر اسے راستے میں کوئی دشواری پیش آئے تو وہ اس کا نام لے سکتا ہے۔ ریستوران سے نکل کر جنرل سفر کے اگلے مرحلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے گاڑی اور حلیے کے ساتھ روٹ بھی بدل لیا۔ اب وہ ہائی ویز کے بجائے ذیلی سڑکوں

سفر کر رہا تھا جو اہم شہروں سے ہٹ کر گزرتی تھیں۔ یوں ان کا سفر طویل ضرور ہو گیا تھا لیکن کسی قدر محفوظ بھی ہو گیا تھا۔ یہاں جرمن چوکیاں اور چیک پوسٹیں کم تھیں اور اس کا خطرہ بھی کم ہی تھا کہ اسے روک لیا جائے گا۔

ابھی اسے فرانس کے آزاد علاقے تک پہنچنے کے لیے دو سو میل کا سفر کرنا تھا۔ شام کو اس نے فیصلہ کیا کہ رات کو سفر کرنے میں خطرہ تھا۔ جرمن اسے روک سکتے تھے اور ایک بار وہ مشکوک ہو گیا تو اس کے لیے دشواری ہو سکتی تھی لہٰذا اس نے سورج غروب ہونے کے بعد کار ایک فارم ہاؤس میں روک دی اور وہاں کے مکینوں سے درخواست کی کہ اسے وہاں رات گزارنے کی اجازت دی جائے۔ خوش قسمتی سے فارم کا مالک اڑتیس سالہ جان لی، جنرل کا ایک پرانا ماتحت نکلا جس نے جنگ سے قبل فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اب یہ فارم ہاؤس چلا رہا تھا۔ اس نے جنرل کو پہچان لیا۔ اسے معلوم تھا کہ جرمن پاگلوں کی طرح جنرل ہنری جیراڈ کو تلاش کر رہے تھے اور اگر جنرل اس کے فارم سے پکڑا گیا تو اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی خیر نہیں ہوگی۔ اس کی بیوی ماریا بڑی دلکش اور نازک سی عورت تھی جو اس کے تین بچوں کی ماں تھی۔ جان لی نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو اس باہمت اور محبِ وطن عورت نے شوہر سے کہا۔

''ہمیں فرانس کے اس نامور بیٹے کو ضرور پناہ دینی چاہیے۔''

''تم جرمنوں کو جانتی ہو؟'' جان لی نے کہا۔

''ہاں، مگر جرمن ہمیں نہیں جانتے۔'' ماریا نے جواب دیا۔

یوں اس عورت کی وجہ سے جنرل کو فارم ہاؤس میں پناہ مل گئی۔ رات کے کھانے میں ماریا نے جنرل کی دعوت کی اور اس کے لیے اپنا واحد مرغ ذبح کر دیا۔ کاشت کار ہونے کے باوجود ان کے پاس خوراک کی کمی ہو گئی تھی۔ جرمن ان سے جانور اور غلہ چھین کر لے جاتے تھے یا برائے نام قیمت پر خرید لیتے تھے اور ادائیگی بھی جرمن کرنسی میں کرتے تھے جو ان کے لیے بے کار تھی۔ اس لیے وہ بہ مشکل گزر بسر کر رہے تھے۔ دو دن پہلے ہی ایک جرمن فوجی دستہ ان کے فارم پر زبردستی کا مہمان بن گیا اور ان کی سب سے صحت مند گائے ذبح کر کے کھا گیا۔ جاتے جاتے وہ ان سے دو بوری مکئی بھی لے گئے۔ جرمنوں کی یہ چیرہ دستیاں اس علاقے میں عام تھیں۔

جان لی اور ماریا نے رات کو جنرل کو احتیاطاً اپنا سامان رکھنے والی دو چھتی پر سلایا اور اس کی کار پر بھوسے کے گٹھے رکھ

دُکھی پریم نگری (1991-1917)

وہاج محمد خان کو شعروفن کی دنیا میں اہم مقام حاصل رہا۔ کراچی میں بننے والی متعدد فلموں کے نغمہ نگار، کہانی کار، صحافی، کالم نگار اور شاعر کا قلمی نام دکھی پریم نگری ہے۔ آپ معروف سیاست دان معراج محمد خان کے بڑے بھائی تھے۔ فیروز آباد (برصغیر) میں یکم مارچ 1917 کو پیدا ہونے والے وہاج محمد خان نے بھرپور علمی وفنی زندگی بسر کی۔ فلم جرنلسٹ سوسائٹی کراچی کے قیام اور اس کی ترویج وترقی کے حوالے سے بھی انہیں ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ 2 ستمبر 1991 کو کراچی میں وفات ہوئی۔ دکھی پریم نگری ڈیفنس سوسائٹی قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مجموعہ نہیں چھپا۔

☆☆☆

دلاور فگار (1998-1928)

کراچی میں عبداللہ ہارون کالج میں انگریزی کے استاد، مقامی روزنامے میں قطعات لکھنے والے دلاور حسین شہاب بدایونی کو قیامِ پاکستان سے قبل بھی شاعر ہونے کے ناتے اہمیت دی جاتی تھی۔ شکیل بدایونی آل انڈیا ریڈیو کی نظامت کرتے تو دلاور حسین فگار کو شباب تخلص ترک کرنے کے بعد ضرور بلاتے۔ دہلی پاکٹ بک سیریز نے ان کا قطعات کا مجموعہ ''آداب عرض'' (1927) میں شائع کیا۔ شاکر حسین کے گھرانے میں 8 جولائی 1928 کو بدایوں میں جنم لینے والے دلاور حسین نہایت ہی شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ بھارت میں ان کو جیسی عزت ملی اس سے کئی گنا زیادہ 1969 میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد تادمِ مرگ ملتی رہی۔ ''انگلیاں فگار اپنی'' (1971) میں ان کا پہلا شعری مجموعہ چھپا۔ ''آداب عرض'' کی اشاعت کراچی سے دوبارہ ہوئی۔ شامت اعمال، مطلع عرض ہے، سنچری (1986)، خدا جھوٹ نہ بلوائے (1989)، چراغ خنداں (1995) اور کہا سنا معاف کرنا (1997) میں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے دلاور فگاری کی کلیات بھی کراچی سے شائع کی گئی۔ ان کا ایک تراجم کا مجموعہ ''خوشبو کا سفر'' امریکی وغیر ملکی نظم نگاروں کی سنجیدہ شاعری پر مبنی ہے۔ امریکا کے صدر جمی کارٹر کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بعنوان ''خوب تر کہاں'' کرنے والے دلاور فگار غمزدوں اور دکھی دلوں کو ہنساتے ہنساتے رلا گئے۔ 21 جنوری 1998 کو بورڈ آفس ناظم آباد پر سڑک پار کرتے ہوئے ایک حادثے کے سبب جانبر نہ ہو سکے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

دیے تاکہ اگر کوئی جرمن دستہ اچانک اس طرف آنکلے تو جنرل کے بارے میں جان نہ سکے۔ صبح سویرے جنرل نے ناشتا کرتے ہی اپنے سفر کا آغاز کردیا۔ ماریا اور جان لی کی مہربانی اور میزبانی کا شکریہ ادا کر کے وہ آگے روانہ ہوگیا تھا۔ اب بھی تقریباً نوّے میل کا سفر باقی تھا اور یہ اس کے سفر کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ یہاں جابجا محاذ سرگرم تھے جن پر جرمن اور اتحادی فوجیں برسرپیکار تھیں۔ اس نے علاقے کا نقشہ بغور دیکھا اور جنوب کی سمت جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں اتحادی قبضہ مستحکم ہونے کی وجہ سے جرمن اس طرف کم حملے کرتے تھے اس کے بجائے ان کی توجہ دفاع پر تھی۔

دن کے گیارہ بجے جرمنوں کے ایک گشتی دستے نے ایک جگہ اسے روکا۔ اس نے اپنے کاغذات ان کے سامنے پیش کردیے جس کی رو سے وہ غلے کا تاجر تھا اور اس علاقے میں انگور کی فصل کا سودا کرنے نکلا تھا۔ خوش قسمتی سے جرمنوں نے اس کے چہرے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ آخری رکاوٹ تھی جو اس کے فرار کی راہ میں پیش آئی تھی۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد وہ آزاد فرانس کی سرزمین پر حریت پسندوں کے ایک ٹھکانے پر تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بیوی جویدنا کو اپنی خیریت کا تار بھیج دیا۔

☆......☆

1914ء میں جب وہ پہلی بار جرمنوں کی قید سے فرار ہوکر واپس فرانس پہنچا تھا تو اس نے اپنی بیوی کو ان الفاظ کا تار بھیجا تھا......کاروباری دورہ کامیاب رہا۔ میں بہ خیریت واپس آگیا ہوں۔

اس کے کامیاب فرار سے تلملا کر جرمن اب بھی سکون سے نہیں بیٹھے تھے۔ جب وہ اسے فرار سے روکنے اور گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو انہوں نے اسے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ قتل کرانے کا فیصلہ کیا۔ جنرل کھلے عام اپنی فوج کی قیادت کررہا تھا مگر دو قاتلانہ حملوں کے بعد اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اب جنرل کو زیرزمین رہ کر فوج کی قیادت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ فرانس کی سرزمین سے نکل جائے۔ اتحادی کمانڈوز نے جنرل کو برطانیہ بھیجنے کی پیشکش کی مگر جنرل نے انکار کردیا۔ وہ فرانس کی سرزمین پر رہ کر اس کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اس طرح چھپ کر رہنا کسی نئی قسم کی قید سے کم نہیں تھا مگر اس کے ساتھیوں کا دباؤ بڑھا تو اسے اس کی بات ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس دوران اکتوبر 1942ء میں افریقا میں فرانسیسی مقبوضات میں فرانسیسی دستے جرا... کے لیے جمع ہورہے تھے۔ الجزائر کے ایک چھوٹے فارم ہاؤس میں فرانسیسی فوج کے کمانڈر انچیف مارک کلارک نے اعلیٰ فوجی افسران کی ایک میٹنگ میں افریقا میں متحدہ فرانسیسی مقبوضات کی فوج کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا اور جب اس فوج کی سربراہی کا سوال سامنے آیا تو سب جنرلوں نے متفق ہوکر ایک ہی نام لیا ”جنرل جیراڈ“ جنرل کلارک نے اعتراض کیا۔ ”یہ ناممکن ہے کیونکہ وہ تو فرانس میں قید ہے۔“

ایک جنرل نے تجویز پیش کی ”اسے وہاں سے نکالا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی سب میرین یہ کام کرسکتی ہے لیکن جنرل جیراڈ کا کام کوئی اور نہیں کرسکتا۔“

غور و فکر کے بعد جنرل کلارک نے منصوبے کی منظوری دے دی جس کے بعد جنرل جیراڈ کے فرار کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے تحت چند دن بعد ایک اتحادی آبدوز رات کی تاریکی میں جنوبی فرانس کے ساحل پر طے شدہ مقام پر پہنچی۔ برطانوی سیکرٹ سروس اس منصوبے پر عمل درآمد کررہی تھی۔ اس کے ایجنٹس نے پہلے ہی جنرل جیراڈ کو خبردار کردیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ حریت پسندوں نے اسے مطلوبہ مقام پر پہنچایا۔ رات کے دو بجے آبدوز نے خاموشی سے سمندر سے سر نکالا۔ ایک کشتی اتر کر ساحل کی طرف آئی۔ طے شدہ اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے کی شناخت کی گئی اور پھر جنرل جیراڈ کشتی میں سوار ہوکر بالآخر جرمنوں کی پہنچ سے مکمل طور پر باہر نکل گیا۔

اس وقت امریکی اور برطانوی، فرانس کو جرمنی کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے جوابی حملے کو آخری شکل دے رہے تھے جس میں جنرل نے اہم کردار ادا کیا۔ فرانس کی آزادی کے بعد وہ فرانس کے ہیرو کے طور پر ابھرا۔ اس نے جنگ کے خاتمے کے بعد فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور 1949ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی شاندار خدمات کے صلے میں حکومت فرانس نے اسے لیجن آف آنر کے اعزاز سے نوازا جو فرانس کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور اسے لیس لارنز لیڈیز کے قبرستان میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ اس قبرستان میں نپولین اور دوسرے فرانسیسی جنگی ہیروز کی قبریں ہیں۔

ہم نے صرف اردو کے …سی ناول پڑھ کر ہی جانا ہے کہ جاسوسی کیا ہوتی ہے جب کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اصلی وہ لوگ، جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے لیے کام کیا تھا۔ درحقیقت انہی کو جاسوس کہا جا سکتا ہے۔ یہ کھیل کو عجیب انداز سے کھیلتے تھے۔ سرحد پار کا کوئی شخص ملک میں آجائے اور اس کے بارے میں شبہ بھی ہو جائے کہ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے تو اسے فوری طور پر نہ تو گرفتار کرتے تھے اور نہ کوئی سزا دیتے تھے۔ اس کے بجائے اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ یہ کیا معلوم کرنے آیا ہے۔ اسے دوست بنا کر اصلیت اگلواؤ اور غلط سلط معلومات اس کے دماغ میں بھر کر اسے واپس بھیج دو۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔

اگر آپ تاریخ کے طالب علم ہیں اور آپ نے بغور اس کا مطالعہ کیا ہے تو آپ ماتا ہری اور کرسٹائین کیلر سے ضرور واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنی عیارانہ حرکتوں سے سیکڑوں فوجی راز اِدھر سے اُدھر کیے۔ ان میں صوفیہ کیرولین بھی شامل ہے۔ اس نے کافی کارنامے انجام دیے، لیکن اس کا نام اخبارات میں نہ آسکا۔ اس لیے کہ سختی سے کوشش کی گئی تھی کہ اس کا نام نہ ابھرے۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی دس برس کے بعد یہ قصہ عام ہوا اور عام افراد اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

یہ 6 جون 1944ء کا واقعہ ہے جب اتحادی افواج نارمنڈی میں اتریں اور انہوں نے جرمنی کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ یہ جنگ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں جاسوسی کا ایک بڑا گورکھ دھندا (نیٹ ورک) تھا جو بہت ہوشیار جاسوسوں نے انجام دیا تھا۔

اس واقعہ کے تانے بانے 1943ء میں شمالی افریقا (الجزائر) میں اتحادی افواج نے بُنے تھے۔ جنرل آئزن ہاور کے ماتحتوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اتحادی افواج اچانک سسلی میں اتار دی جائیں۔ اس منصوبے کے بارے میں انتہائی خاص افسران کے علاوہ کسی کو علم نہ ہو۔ جن افسران کو اس راز کا علم تھا ان میں ایک امریکی بھی شامل تھا جو بلا کا عیاش اور داد عیش دینے میں طاق تھا۔ ان دنوں ایک ولندیزی حسینہ سے اس کی محبت کی دل فریب کہانیاں سر عام پھیلی ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ حسینہ ولندیزی نہیں تھی، بلکہ جرمن تھی۔ وہ سب کو اپنا نام صوفیہ کیرولین بتاتی تھی۔ بے حد حسین، آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والی، گفتگو میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ۔ اپنے اطوار سے وہ اوچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گفتگو کرتی تو دل موہ لیتی تھی۔

جنرل آئزن ہاور کے انتہائی خفیہ آفس میں یہ منصوبہ

قیامت برپا کردینے والی دوشیزہ کا تذکرہ

عیار حسینہ

شکیل صدیقی

خدا نے اسے حسنِ جہاں سوز کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ اسے دیکھتے ہی جذبات میں مد و جزر کا اٹھنا ضروری تھا۔ اپنی اسی خوبی و خوش شکلی کو اس نے ہتھیار بنایا اور اتحادیوں کو زک پہنچاتی چلی گئی۔



آیا گیا کہ اتحادی فوجیں سسلی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں۔ یہ منصوبہ صبح گیارہ بجے بنا اور شام پانچ بجے حملہ کیا گیا، لیکن جرمنی کو اس کی اطلاع مل چکی تھی، لہٰذا اتحادیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ انہیں ایسی شکست ہوئی کہ وہ پژمردہ اور افسردہ ہو کر بیٹھ گئے۔ انہیں مایوسی ہوئی کہ اب شاید وہ جرمنی کو کبھی شکست نہ دے پائیں۔ اس لیے کہ اس کی جاسوسی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ صبح انہوں نے منصوبہ تیار کیا اور شام سے پہلے جرمنی کو خبر ہو گئی۔

افسران کو یہ کھوج لگ گئی کہ جرمنی کو اس حملے کی خبر کیسے ہوگئی؟ اس لیے کہ ان کی تعداد سسلی میں بہت کم تھی، مگر اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے بھاری فوج طلب کر لی۔ گویا کوئی گھر کا بھیدی تھا جس نے راز افشا کر دیا تھا اور اتحادیوں کو ہزیمت اور شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

اس شخص کی تلاش میں سب کوشاں تھے اور اپنے اپنے اندازے سے اس جاسوس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک وہ امریکی ایک میز پر بیٹھا نظر آیا جس کا نام رچرڈ تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اتنے اداس کیوں ہو؟ اس نے بتایا کہ اس کی محبوبہ صوفیہ کئی دن سے نظر نہیں آ رہی ہے، اس لیے دل اداس ہے۔

استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ صوفیہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ جب یہ خبر محکمۂ سراغ رسانی تک پہنچی تو انہوں نے میجر رچرڈ کو طلب کر لیا۔ اس سے ٹیڑھے ترچھے اور نوکیلے سوالات کیے گئے تو اس نے قبول کر لیا کہ اس نے صوفیہ کو بتا دیا تھا کہ اتحادی سسلی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں خفیہ محکمے کا انچارج جنرل انوون تھا۔ بے حد مستعد اور پھرتیلا۔ سراغ رسانی کا ماہر۔ اس کی ماتحتی میں دو افسران کام کرتے تھے۔ ان تینوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اگر صوفیہ اس ریستوران میں دوبارہ نظر آئے تو ہم اس سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے اور ایسا رویہ اختیار کریں گے جیسے ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ جب اسے یقین ہو جائے گا کہ اس پر کسی کو شبہ نہیں ہوا ہے تو وہ پھر ہماری ٹوہ میں رہے گی اور کوشش کرے گی کہ کوئی راز لے اڑے۔

ایک ہفتے بعد چند افسران نے ریستوران میں لوگوں کو یہ خبر پہنچائی کہ صوفیہ ہالینڈ سے لندن آ چکی ہے۔ ممکن ہے کسی روز اس ریستوران میں بھی وارد ہو جائے۔ یہ خبر دے کر وہ چاہتے تھے کہ سب چوکنا ہو جائیں۔ صوفیہ لندن آ کر آزادی سے گھومنے پھرنے لگی۔ وہ ریستورانوں اور ہوٹلوں میں فوجیوں سے ملاقاتیں کر رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی اصلیت سے اتحادی سراغ رساں واقف ہو چکے ہیں کہ وہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے۔

محکمۂ سراغ رسانی کے افسران سر جوڑے اس عقدے میں الجھے ہوئے تھے کہ اس سیکرٹ ایجنٹ کو اس بار کون سی ایسی اطلاع دی جائے جو قطعاً غلط ہو، لیکن جرمن اس پر اعتبار کر لیں۔ انہیں شبہ نہ ہو کہ ان تک پہنچنے والی اطلاع جھوٹی ہے۔ وہ اسے سچ سمجھ کر اس پر عمل کر ڈالیں اور منہ کی کھائیں۔

ان دنوں اتحادی نارمنڈی میں اپنی فوجیں اتار رہے تھے اور نئی صف بندی کر رہے تھے۔ جرمنی کو اس بارے میں علم تھا اور وہ جوابی حملے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ اتحادیوں کی طرح سے ان کا محکمۂ سراغ رسانی بھی مصروف عمل تھا اور پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

اتحادی سیکرٹ سروس نے یہ خبر پھیلانی شروع کر دی کہ وہ نارمنڈی پر حملہ نہیں کریں گے، بلکہ اس بار ان کا ہدف ہالینڈ ہوگا۔ اس لیے کہ جرمنی کو اتحادیوں کا یہ منصوبہ معلوم ہو چکا ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر دی ہے۔ اب یہ راز کسی معتبر افسر کے ذریعے صوفیہ تک پہنچ جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ اس لیے کہ ایک طرح سے تصدیق ہو جاتی کہ اتحادی یہ سب کرنے جا رہے ہیں۔

اب ایک ایسا خوبرو اور حسین افسر تلاش کرنا تھا جو صوفیہ کے ذہن میں یہ سب بٹھا سکے۔ اس کے انداز میں گرم جوشی ہونا چاہیے تھی، تاکہ صوفیہ کو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔ صوفیہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھی اور اسی کے لیول کے لحاظ سے کام کرنا تھا۔ اس لیے کہ سیکرٹ ایجنٹ پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔

اب جعلی طور پر ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جو ہالینڈ کا نقشہ تیار کرے اور جنگ کی علامات کو اس نقشہ پر ظاہر کرے تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ اتحادی خفیہ طور پر جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔

اس کے لیے ایک فلم کمپنی بنائی گئی۔ وارڈو اسٹریٹ لندن میں اس کا باقاعدہ آفس اور اسٹوڈیو بنایا گیا۔ اس کمپنی میں سارے افراد ہالینڈ کے بھرتی کیے گئے، جن پر ہٹلر نے مظالم کیے تھے اور اب وہ لندن میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس فلم کمپنی کا کام یہ تھا کہ وہ ہالینڈ کے لوگوں کے بارے میں فلمیں تیار کرے، پمفلٹ چھپوائے اور ان کو ہالینڈ تک پہنچائے تاکہ وہاں کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو اور وہ یقین کر لیں کہ ایک نہ ایک دن اتحادی انہیں ہٹلر کے چنگل سے چھڑا لیں گے۔

اس کمپنی میں اتحادیوں نے مظلوم ولندیزیوں کی آڑ لے کر اپنے چند افسر بھی متعین کر دیے۔ ان افسران میں ایک گریگ بھی تھا۔ سنہری بالوں والا ایک حسین امریکی۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ اتحادی ہالینڈ میں اپنی فوجیں اتارنے والا ہے۔ یہ کمپنی چند ہفتوں میں خوب کام کرنے لگی۔ یعنی فلمیں بننے لگیں، پمفلٹ چھپنے لگے اور ہالینڈ تک جانے لگے۔ وہاں بھی ایک جوش و خروش پھیل گیا کہ اتحادی انہیں آزاد کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ کمپنی میں کام کرنے والے بھی ولولے سے کام کر رہے تھے کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے کام کر رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ آزادی حاصل کرنے کا باقاعدہ ایک مشن ہے۔

اب اگلا مرحلہ تھا کہ کسی طرح سے صوفیہ اور گریگ کی ملاقات کرائی جائے۔ وہ ایک سنجیدہ افسر تھا اور ہر اعتبار سے معتبر۔ ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اس میں گریگ اور صوفیہ کو بھی بلایا گیا۔ ایک طرف اسٹیج تھا جس پر چند حسینائیں محو رقص تھیں۔ آرکسٹرا جاز کی ایک خوبصورت دھن بجا رہا تھا۔ کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

صوفیہ اس محفل میں کسی نگینے کی طرح دمک رہی تھی۔ اس کی آمد پر ایک افسر ماریو نے اسے خوش آمدید کہا اور ایک وسطی میز کی طرف لے گیا۔ جو خاص طور پر اس کے لیے وہاں رکھی گئی تھی، تاکہ وہ مرکز نگاہ رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ افسر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ گریگ اپنی میز پر تنہا تھا۔ اس لیے اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ کسی لڑکی نے اب تک اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔

محکمۂ سراغرسانی کا افسر ماریو جو صوفیہ کے ساتھ رقص کر رہا تھا اس نے نہایت عیاری سے کہا کہ اس شخص سے کبھی کوئی سروکار نہ رکھنا۔ وہ سنہری بالوں والا۔ خفیہ کا بڑا افسر ہے۔ لیکن اسے بہت غرور ہے۔ لڑکیاں بھی اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ یہ جرمنی کے خفیہ ٹھکانوں پر بھی جا کر وہاں سے راز لا چکا ہے۔ اس لیے اس کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

رقص تھوڑی دیر کے لیے ختم ہو گیا۔ سب ادھر ادھر ہو گئے۔ جب رقص دوبارہ شروع ہوا تو خفیہ کا افسر ماریو واپس آیا تو اس نے صوفیہ کو گریگ کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک اس کے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔

رقص و سرود کی محفل ڈھائی بجے رات کو ختم ہوئی۔ جن کے پاس اپنی کاریں تھیں وہ ان میں بیٹھ کر واپس چلے گئے، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ٹیکسی کر لی تھی۔ صوفیہ نے اپنے اور گریگ کے لیے ایک ٹیکسی رکوائی تھی۔ صوفیہ کی قیام گاہ کی نگرانی پہلے ہی محکمۂ سراغرسانی کے لوگ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہیڈ آفس کو اطلاع دی کہ دونوں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

صبح نو بجے کے قریب گریگ وہاں سے نکلا اور محکمۂ سراغرسانی کے آفس کے لیے اس نے ایک ٹیکسی کی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دل کش لگ رہا تھا۔ اس کے سنہری بال سلیقہ مندی سے کھوپڑی پر جمے ہوئے تھے۔ اس نے وہاں پہنچ کر رپورٹ دی۔ سب اس کی رپورٹ سے مطمئن تھے۔ گریگ کو ہدایت دی گئی کہ وہ دوستی کی پینگیں بڑھائے اور صوفیہ کا ہاتھ نہ چھوڑے۔ اسے ہلکے پھلکے خفیہ رازوں سے بھی آگاہ کرتا رہے۔ یہ راز اسے محکمۂ سراغرسانی جاری کرے گا۔

جب محکمے نے دیکھ لیا کہ گریگ اور صوفیہ ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ گئے ہیں تو انہوں نے گریگ کو خفیہ کانفرنسوں میں بلانا شروع کر دیا۔ ان کانفرنسوں میں سخت پہرہ ہوتا تھا اور باہر خاردار تاریں پڑی ہوتی تھیں۔ وہاں ہالینڈ پر حملے کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حملہ کب ہوگا اور کتنی فوج وہاں اتاری جائے گی۔ اس کے بارے میں جعلی اور مصنوعی باتیں کی جاتیں تاکہ... گریگ ان سے متاثر ہو اور انہیں صوفیہ تک پہنچا دے۔

اس قسم کی باتیں جاسوس صرف بند کمروں میں بیٹھ کر ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ وہ کسی طرح سے ہٹلر کی سماعت تک بھی پہنچ جائیں۔

لندن میں ہونے والی کانفرنسوں کی روداد گریگ، اپنی محبوبہ دل نواز صوفیہ کو گوش گزار کر دیتا تو وہ انہیں جرمنی پہنچا دیتی۔ اس کے پاس خفیہ افراد کا ایک گروپ تھا جو یہ کام کرتا تھا۔

لندن سیکرٹ سروس نے صوفیہ کو مزید اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے گریگ کو بلا کر حکم دیا کہ چند خفیہ کاغذات لے کر اسے فرانس جانا ہے۔ ایک خفیہ طیارہ اسے وہاں تک لے جائے گا۔ یہ طیارہ اسے رودبار انگلستان کے پار لے جائے گا اور جرمن افواج کے عقب میں اتارے گا۔ وہاں اس سے ایک جاسوس آ کر ملے گا۔ یہ کاغذات اسے دینا ہیں۔ تمہیں کل رات بارہ بجے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ فلاں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤ۔

وہ سراغرساں جو صوفیہ کے گھر پر متعین تھے، انہوں نے

اطلاع دی کہ گریگ جاتے وقت صوفیہ سے بھی ملا تھا۔

اتحادیوں کے جاسوسوں نے جرمنی سے اطلاع دی کہ لندن کے خفیہ محکمے سے ہٹلر کو اطلاع ملی ہے کہ ایک جاسوس انگلستان سے فرانس کے ساحل پر فلاں وقت اترے گا۔ وہ چند کاغذات کسی اور جاسوس کو دے گا۔ جو جاسوس لندن سے آرہا ہے، اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے، اسے گرفتار بھی نہ کیا جائے۔ البتہ اس جاسوس پر کڑی نگاہ رکھی جائے جسے خفیہ کاغذات ملیں گے۔

گریگ حفاظت سے فرانس پہنچ گیا اور اس نے وہ کاغذات جاسوس کے حوالے کردیے۔ اس جاسوس نے ایسی نشانیاں بتائی تھیں کہ اس نے یقین کرلیا۔ اس کے بعد وہ پھر طیارے میں بیٹھا اور وہاں سے لندن واپس پہنچ گیا۔ البتہ اس جاسوس کو جرمن نے ہلاک کردیا۔

جرمن سیکرٹ سروس میں صوفیہ کے اس کارنامے کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ معتبر سمجھی جانے لگی۔ مگر خفیہ کے چند جنرلوں کو اب بھی شک وشبہ تھا۔ جب ان کے شک وشبہے کی خبریں لندن آفس تک پہنچیں تو انہیں تشویش ہوئی کہ کسی طرح سے ان کا شبہ دور کیا جائے۔ تاکہ جرمن یہ سمجھنے لگیں کہ اتحادی واقعی نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے اس سلسلے میں دو ترکیبیں سوچیں، یہ دونوں کامیاب رہیں۔ ایک یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنی کارروائیاں تیز کرنے کا حکم دیا جائے جو ہالینڈ میں مصروف عمل ہیں۔ ان کے ایک سربراہ کو خفیہ طیارے کے ذریعے لندن بلایا گیا۔ گفتگو تسلی بخش نہ ہوسکی۔ اس لیے کہ وہ ولندیزی تھا اور اسے ایک انگریز سے بات کرنا تھی۔ ایک مترجم کی ضرورت پڑی۔ اس کے بغیر کام نہیں چل رہا تھا۔ ایسا کوئی مترجم جس پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کیا جاسکے، ملنا دشوار تھا۔

گریگ نے بتایا کہ صوفیہ نامی ایک لڑکی اس کی دوست ہے اور ہالینڈ کی رہنے والی ہے۔ وہاں کی بولی اچھی طرح سے سمجھ لیتی ہے۔ سیکرٹ سروس نے اس کا نام اور پتا لے لیا اور کہا کہ ہم اس لڑکی کو یہاں بلائے لیتے ہیں۔ اگر وہ قابل اعتماد ہے تو اس کے سامنے ولندیزی سے گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بھی سیکرٹ سروس کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ولندیزی ایجنٹ کے سامنے ہالینڈ پر حملہ کرنے کا منصوبہ زور و شور سے پیش کیا جائے تاکہ صوفیہ کو سو فی صد یقین آجائے کہ اتحادی یہی کچھ کرنے والے ہیں۔ وہ پورے وثوق سے جرمنی کو یہ اطلاع دے گی اور بتائے گی کہ سیکرٹ سروس میں یہ سب تانے بانے بُنے جارہے ہیں۔

ولندیزی نے جو کچھ کہا وہ صوفیہ نے ترجمہ کرکے خود انگریزوں کو بتایا کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں اور ان کی فوجی تیاری بالکل مکمل ہے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی، لیکن دل ہی دل میں خوش تھی کہ وہ انتہائی خفیہ رازوں کی امین بن رہی ہے۔ یقیناً قدرت اس پر مہربان تھی کہ اس کی کوشش کے بغیر انمول اور بیش بہا چیزیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

چند انگریز سیکرٹ ایجنٹ اچھی طرح سے ولندیزی جانتے تھے تاکہ ان سے گفتگو کرسکیں، اس وقت بھی وہ سب کچھ سمجھ رہے تھے مگر بدھو بنے ہوئے تھے، تاکہ صوفیہ کو بیچ میں ڈال کر بات جرمنی تک پہنچائی جاسکے۔ مترجم کی حیثیت سے اس کا کام ختم ہوگیا تو اسے چھٹی دے دی گئی۔ صوفیہ نے اپنے ذرائع سے یہ خبر جرمنی تک پہنچا دی کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے میں سنجیدہ ہیں اور اس موضوع پر ہالینڈ کے ایک مقامی سیکرٹ ایجنٹ سے میرے توسط سے گفتگو کررہے تھے۔

جرمنی نے نارمنڈی سے فوجیں ہٹانے کا منصوبہ بنانا شروع کردیا۔ اس بات کی تصدیق ان اتحادی سیکرٹ ایجنٹوں نے بھی کی جو نارمنڈی میں کام کررہے تھے۔ اتحادیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ مچھلی نے بالآخر چارہ کھا لیا۔ انہوں نے صوفیہ کو اس فلم کمپنی میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اس نے منظور کرلی۔ اس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کرنا چاہتے تھے۔ یہ انتہائی خفیہ کام وہ انہی کے سیکرٹ ایجنٹ سے لے رہے تھے۔

اسٹوڈیو اور فلم کمپنی کا کام چوبیس گھنٹے ہونے لگا۔ اداکاروں کی ریل پیل شروع ہوگئی۔ کیمرے چلنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ فلمیں بننے اور ریلیز ہونے لگیں۔ پوسٹر خفیہ طریقوں سے ہالینڈ لے جائے گئے تاکہ جوش وخروش میں اضافہ ہوسکے اور منظر میں سچائی کا رنگ بھرا جاسکے۔

صوفیہ کو انہوں نے چونکہ کھلی چھٹی دے رکھی تھی، چنانچہ وہ فلم کمپنی میں استعمال ہونے والے کاغذات کی کاپیاں کرا کے ہالینڈ بھیج دیتی تھی۔

میجر گریگ اس بات سے لاعلم تھا کہ صوفیہ دشمنوں کی ایجنٹ ہے اور وہ جرمنی کو لندن سے اطلاعات فراہم کررہی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہوجاتا تو وہ سارا بھانڈا پھوڑ دیتا ایسی

صورت میں اسے گرفتار کر کے اس کے انجام تک پہنچانا ضروری ہو جاتا۔ اس طرح سے بنا بنایا کھیل خاک میں مل جاتا اور وہ کسی صورت بھی ہالینڈ تک یہ اطلاعات نہ بھیج پاتے کہ اتحادی وہاں حملہ کرنے والے ہیں۔

صوفیہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے اور ان کے لیے جاسوسی کر رہی ہے، اس کا علم معدودے چند افراد کو تھا۔ ایک سیکرٹ سروس کا سربراہ جنرل کوون اور دو اس کے معاونین۔ حد یہ ہے کہ میجر گریگ جو شب و روز اس کی بانہوں میں وقت گزارتا تھا وہ بھی اس سے ناواقف تھا۔ وہ ایک اچھا سیکرٹ ایجنٹ تھا مگر صوفیہ نے اسے ہوا ہی نہیں لگنے دی تھی۔

اتحادی اپنی جگہوں پر محتاط تھے تاکہ اس بار ان کا وار بالکل نشانے پر بیٹھے اور وہ ہٹلر کو شکست سے دوچار کر سکیں۔ ہٹلر کی خفیہ تنظیم گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو چکمہ دینا آسان کام نہ تھا۔ اتحادیوں کو اس مرحلے سے بہ خیر و خوبی گزرنا تھا۔ اسی پر ان کی کامیابی کا انحصار تھا۔

اسی اثنا میں اتحادیوں کے سیکرٹ ایجنٹوں نے ہیڈ آفس تک یہ خبر پہنچائی کہ ہٹلر کو اس ماسٹر پلان کی تلاش تھی، جس کی رو سے اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ کہاں کتنا اسلحہ استعمال کریں گے اور فوجیوں کی تعداد کہاں پر کتنی ہوگی۔ حملے کا آغاز کہاں سے اور کس وقت کیا جائے گا۔ اس ماسٹر پلان کو حاصل کرنے کے لیے اس نے گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو لندن بھیجا۔ اس کی ہدایت تھی کہ ہر کام احتیاط سے کیا جائے۔

دوسری طرف اتحادی کسی احتیاط کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ کسی طرح سے نقلی اور جعلی نقشہ جرمنی پہنچ جائے تاکہ جرمنی کو یقین ہو جائے کہ اتحادی افواج نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والی ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے ایک نقشہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا تاکہ ہٹلر کی سیکرٹ سروس گستاپو کے جوانوں کو چکمہ دیا جا سکے۔ نقشہ مہارت سے بنایا گیا تھا اور ویسا ہی تھا کہ جیسا کہ جنگ کے زمانے میں بنایا جاتا ہے اور اس کے مطابق فوج کو حرکت دی جاتی ہے۔ اس نقشے کو دیکھ کر ہٹلر کو سو فی صد یقین آ جاتا۔ نقشہ تیار ہونے کے بعد اتحادی سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کسی طرح سے صوفیہ کو اس کی چوری کی ترغیب دی جائے۔ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہونے کی وجہ سے اس کے کیے ہوئے کام کی قدر و قیمت زیادہ تھی۔ ہر شخص اس پر اعتبار کر لیتا۔

سیکرٹ سروس کے سربراہ کوون نے تین بار اپنی چابیاں میز پر یوں رکھ دیں جیسے بھول گیا ہو۔ مگر جب اس نے واپس آ کر دیکھا تو چابیاں ویسے ہی اس جگہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ایک بار کوون، گریگ کے گھر پر بھی گیا اور اس کی میز پر چابیاں بھول کر چلا آیا تاکہ وہ صوفیہ تک پہنچ جائیں اور وہ ان کی نقل تیار کرا لے۔

ایک دن سیکرٹ ایجنٹ کے سربراہ کوون نے نقشہ اپنی تجوری سے نکالا۔ پھر گریگ اور صوفیہ کی موجودگی میں ان سے مشورہ لیا۔ اس کے بعد اسے پھر تجوری میں رکھ دیا۔ اس نے گریگ سے کہا کہ اس نے بہت دنوں سے کسی اچھے ریستوران میں کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ صوفیہ تنہائی میں اس نقشے کو تجوری سے نکال کر اس کی کاپی کرا لے۔

جب صوفیہ کو کھلا موقع مل گیا تو اس نے تجوری کی چابی سے اسے کھولا۔ چابی اس نے پہلے ہی بنوا رکھی تھی۔ اس نے دو چابیاں تیار کرا رکھی تھیں۔ تجوری کھل گئی تو اس نے نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا۔ اس کے پاس ننھا سا خفیہ کیمرا تھا۔ اس نے اپنے وینٹی بیگ سے اسے نکالا اور نقشے کی تصاویر کھینچنا شروع کر دیں۔ اس نے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد نقشے کو تجوری میں رکھا اور اسے بند کرنے کے بعد سیکرٹ سروس کے آفس کو بند کیا اور وہاں سے نکل آئی۔ وہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی۔ سیکرٹ سروس کا آفس تھا۔ اس کی ہر حرکت کو نوٹ کیا جا رہا تھا مگر چیف کی ہدایت تھی کہ اسے روکا ٹوکا نہ جائے۔ اس کی کامیابی حقیقت میں ہماری کامیابی ہے۔

صوفیہ کو معلوم تھا کہ وہ نقشہ اتنا قیمتی ہے کہ جس کسی کے ہاتھ لگے گا وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے گا۔ چنانچہ اسے خود جرمنی جانا چاہیے۔ اس نے اپنے وسائل استعمال کیے اور جرمنی پہنچ کر ہائی کمان کو وہ نقشہ پیش کیا۔ ہٹلر اور اس کے جنرلوں نے اس پر اعتبار کر لیا کہ نقشہ درست ہے اور اس کے مطابق عمل ہونے جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہالینڈ میں فوج جمع کی اور اس کی صف بندی کر ڈالی۔

6 جون 1944ء کا سورج ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اتحادی افواج نے نارمنڈی کے ساحل پر اتر کر دھاوا بول دیا۔ یوں ہٹلر کا سورج جو نصف نہار پر پہنچا ہوا تھا غروب ہو گیا۔

خطرناک مہم

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان کبھی کبھی جوشِ جنوں میں کچھ ایسا کرجاتا ہے جو ناقابلِ یقین سا لگتا ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کارنامہ انجام دیا تھا۔ یورپ کی تاریخ میں اسے ایک افسانوی کردار جیسی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لاتعداد کارناموں میں سے ایک کارنامہ۔



دورانِ جنگ اس نے ہاری ہوئی بازی اُلٹ دی تھی

میں نے گھڑسوار دستے میں جونیئر کپتان کی حیثیت سے ملازمت کرلی تھی۔ اس وقت میری عمر پچیس برس تھی۔

جرمنی کی جنگ ختم ہوچکی تھی مگر اسپین میں معرکہ آرائی جاری تھی۔ شہنشاہ نپولین اعظم نے اسپین کی فوج کو مدد دینے کے لیے میرا تبادلہ سینئر کپتان کی حیثیت سے لڑاکا فوج میں کردیا جو اس وقت مارشل لینز کے زیرِ قیادت تھی۔ برلن سے اسپین تک یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ میری یہ نئی رجمنٹ بھی اس بڑی فوج کا ایک حصہ بنی ہوئی تھی جس سے مارشل لینیز اسپین کے ایک بڑے شہر سارا گوسا کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ایک ہفتہ یا اس سے کچھ زیادہ مجھے فرانسیسی ... میں بیٹھے ... پڑا۔ اس

کے بعد ہی مجھے کیمپ کی طرف جانے کا حکم ملا جہاں ہماری فوج ہسارس آف کنفلانس موجود تھی۔

مجھے یقین ہے آپ نے سارا گوسا کے مشہور و معروف محاصرے کے حالات پڑھے ہوں گے، ایسی مشکل مہم شاید ہی کسی جرنیل کو پیش آئی ہوگی جیسی مارشل لینیز کو پیش آئی تھی لیکن ان مصائب کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں اس شہر کا احوال سنادوں۔ یہ عظیم شہر اسپین کے باشندوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سپاہی بھی تھے، کسان بھی اور مذہبی ٹھیکے دار بھی، گویا ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور سب کے دلوں میں ہم فرانسیسیوں کے لیے نفرت و حقارت، بغض و عناد کی آگ

تھی۔ معلوم ہوتا تھا، بچے اور بوڑھے سب نے سوچ رکھا تھا کہ کٹ کر فنا ہو جانا، مغلوب ہونے سے بہتر ہے۔ شہر میں اسّی (80) ہزار آدمی تھے اور محاصرین کل تیس ہزار تھے مگر ہمارے پاس توپ خانہ تھا اور ہوشیار انجینئر تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں قلعہ بندی ٹوٹی شہر مطیع ہو گیا۔ مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ قلعہ بندی ٹوٹنے کے بعد اصل جنگ شروع ہوئی تھی، ہر مکان قلعہ تھا۔ ہر سڑک میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ ہم ہر روز بہ مشکل تھوڑا تھوڑا انہیں پیچھے دھکیلتے، بارودی سرنگیں بچھا کر مکانات گراتے جاتے اور فوجی ٹھکانے برباد کرتے جاتے۔ اسی طرح آدھے سے زیادہ شہر برباد ہو چکا تھا مگر ابھی آدھا باقی تھا اور یہ پہلے سے زیادہ دلیری اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ گرجا اور خانقاہیں باقی رہ گئی تھیں۔ ان کی دیواریں ہمارے راستے میں حائل تھیں جو سنگ و آہن کا مرکب تھیں اور انہیں ہٹانا آسان کام نہ تھا۔ میں ان حالات میں وہاں داخل ہوا۔ میں آپ کی یہ بات مانتا ہوں کہ رسالہ محاصرے میں زیادہ کارآمد نہیں ہوتا مگر میں نے یہ خیال باطل کر دکھایا۔ ہماری فوج کا کیمپ شہر کے جنوب میں تھا، اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ آگے کی طرف رہنے والے گشتی سپاہیوں کو اور آگے بھیج کر یہ معلوم کرائے کہ کوئی اور اسپینی سپاہ تو کسی طرف سے ان پر چڑھائی نہیں کر رہی ہے؟ رجمنٹ کا کرنل سپاہیانہ ذوق کا آدمی نہ تھا اس لیے رجمنٹ کی پوزیشن اس وقت کچھ بہتر نہ تھی مگر بعد میں اس نے خوب نام پایا۔ اس روز شام کو میں نے وہاں کے جو حالات دیکھے۔ ان سے بڑا افسوس ہوا کیونکہ کچھ بھی ہو فکر وخیال کے اعتبار سے میں ان سب سے اعلیٰ شخص تھا۔ کیمپ کی بے ترتیبی، لاغر، میلے اور سست رفتار گھوڑے دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس رات میں نے چھبیس ہم سر نوجوانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور یہ خیال کر کے دل میں پچھتا رہا تھا کہ کیوں میں نے جوش میں آ کر ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ جرمنی کے محاذ پر تو ہم نے بہت بہتر انتظام کیا تھا مگر یہاں کا انتظام بہت ناقص ہے۔ میرے اس اعتراض کے بعد میس میں خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ان کی ترچھی نظروں سے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ میری عاقبت نا اندیشی کا نتیجہ ہے، خاص طور پر کرنل نے اس بات کو محسوس کیا۔ ایک بڑا میجر جس کا نام اولیویئر تھا اور جو رجمنٹ میں آگ بگولا مشہور تھا۔ وہ میرے مقابل بیٹھا ہوا اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور میری طرف ایسے گھور رہا تھا گویا وہ مجھے کھائے بغیر نہ چھوڑے گا مگر میں نے اس کا یہ رویہ زیادہ محسوس نہ کیا کیونکہ میں اپنی بے وقوفی پر خود نادم تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ اگر کسی افسر سے آج پہلے ہی دن کی شام کو جھگڑا ہو گیا تو بہت برا ہو گا اور اس کا اثر صرف میری ذات پر پڑے گا۔

آخر کار ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غلطی سراسر میری ہی تھی کہ جو بات نہ کہنی کی تھی وہ کیوں کہہ دی۔ جب کھانا کھا چکے تو کرنل صاحب اور دیگر افسران کمرے سے باہر چلے گئے۔ اس میس کی جگہ پہلے کسی زمیندار کا فارم ہو گا۔ اب کمرے میں ایک درجن سے کم آدمی رہ گئے تھے۔ اسپینی شراب سے بھری ہوئی ایک مشک کمرے میں لائی گئی، اسے دیکھ کر ہم لوگ بہت خوش ہوئے، خوب مست ہوئے، اسی اثنا میں میجر اولیویئر نے مجھ سے جرمنی کی فوج کے متعلق کچھ سوالات کیے اور میں نے اس معرکے میں جو غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں ان کے متعلق دریافت کیا۔ جب شراب کا نشہ ذرا رنگ لایا تو میں نے بھی قصے میں قصہ جوڑنا شروع کر دیا۔ عزیز من! یہ کوئی غیر فطری چیز نہ تھی۔ میں اپنے سن وسال کے اعتبار سے فوج میں ہر ایک افسر کے لیے نمونہ تھا۔ میں بہترین شمشیر زن تھا، شہسوار تھا تقریباً ایک سو معرکوں کا ہیرو تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو غیر معروف ہی نہیں بلکہ نالائق محسوس کیا۔ کیا یہ غیر فطری چیز نہ تھی۔

انہیں یہ بتا دینا ضروری تھا کہ ان کے درمیان کس لیاقت اور قابلیت کا آدمی آیا ہوا ہے؟ میں ان کی ہر مسرت اور خوشی پر واہ واہ کہتا اور ان کے ہر نعرۂ تحسین کی داد دے رہا تھا۔ یہی میرے لیے مناسب تھا۔ ان پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آج کی شب جو شخص ان میں شامل ہوا ہے وہ ایک اونچے مزاج کا آدمی ہے جس کا نام جیرارڈ ہے، لائسین کا ہیرو، جینا کا فاتح، یہی وہ شخص ہے جس نے آسٹرلیٹیز کا چوحدہ توڑا تھا۔ یہ سب تو وہاں دہرانا فضول تھا مگر میں نے کم از کم وہ مشہور واقعات بیان کر دینے ضروری سمجھے جن کے ذریعے میں نامور شخص سمجھا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، میں کہتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے دریائے ڈینیوب میں اپنی فوج کو ایک خاص ترکیب سے دریا کے پار اتارنے میں اس کی رہبری کی تھی۔ میں یہ واقعہ ابھی سنا ہی رہا تھا کہ اچانک ان سب نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں اچھل پڑا، حیران ہو گیا۔ میں شرم اور غصے سے مرجھا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا میں ان کی نظروں میں محض ایک شیخی خور اور جھوٹا آدمی تھا۔

کچھ توقف کے بعد میجر نے کپتان پلیٹن سے دریافت کیا "کیوں...... کپتان، کیا آپ کو معلوم ہے مارشل لینیز ابھی تک فوج میں موجود ہیں؟"

"ہاں جناب! وہ ابھی موجود ہیں۔"

دوسرے نے کہا "میرے خیال میں کپتان جیرارڈ کے آجانے کے بعد ان کی موجودگی چنداں ضروری نہیں۔"

پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ میں ان کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کسی کی آنکھیں میچی جارہی تھیں اور کسی کا منہ ٹیڑھا ہوا جارہا تھا۔ اولیویئر کی مونچھوں کے بال سور کی گردن کے بالوں کی طرح کھڑے تھے۔ پلیٹن کا پتلا حقیر چہرہ ہنسی کے مارے سکڑ کر گچھا ہوا جارہا تھا۔ یا خدا، کیسی بے آبروئی ہوئی۔ بہ ظاہر میں برف کی طرح ٹھنڈا اور ساکت تھا مگر بہ باطن آگ بگولا تھا۔ میں نے فضا بدلنے کے لیے میجر سے دریافت کیا۔

"کیوں میجر صاحب! رجمنٹ میں پریڈ کے اوقات کیا ہیں؟"

"کپتان جیرارڈ، مجھے یقین ہے آپ ہمارے اوقات میں تبدیلی نہ فرمائیں گے۔" میجر نے جواب دیا۔ پھر ایک بے ساختہ قہقہہ پڑا، میں خاموش سا ہر ایک کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا جب ذرا سکون ہوا تو میں نے تیز لہجے میں کپتان پلیٹن سے دریافت کیا "مجلس مشاورت کس وقت ہوتی ہے؟"

ابھی اس کی زبان سے کوئی مضحکہ خیز جملہ نکلنے ہی والا تھا کہ میری کڑوی نظروں نے اسے روک دیا۔ اس نے جواب دیا "چھ بجے!"

میں نے کہا "آپ کا شکریہ!" اس کے بعد میں نے اس کمپنی کا جائزہ لیا۔ چودہ افسران تھے جن سے مجھے نمٹنا تھا۔ ان میں دو لڑکے بھی شامل تھے جو کم سن تھے اور حال ہی میں سینٹ سائر سے آئے تھے۔ میں نے ان کی حماقت نظر انداز کردی۔ اب رہ گئے دو میجر، چار کپتان اور سات لیفٹیننٹ، میں نے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور پھر کہا۔

"معززین، میں اپنے آپ کو اس نیک نام رجمنٹ کا اہل نہیں پاتا اور نہ میں آپ لوگوں سے اس گستاخانہ برتاؤ کی صفائی یا معذرت کا خواہاں ہوں جو میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ بس آپ اس کے ذمے دار ہیں، میں آپ سب کو سبق دیے بغیر نہ رہوں گا اور آپ کا کوئی حیلہ بہانہ چلنے نہیں دوں گا۔ از راہ کرم آپ تیار ہو جائیے۔"

"آپ کو اس کام میں ذرا بھی دقت نہ ہوگی، میں تیار ہوں۔ میں اپنی فوج نمبر 5 کے نام پر پرچم ہلاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ آپ کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، میں آپ کی ہر طرح تسلی کردوں گا۔" میجر نے کہا۔

"آپ کا شکریہ! مگر میرا چیلنج ان تمام حاضرین کے لیے ہے جو میرے اظہارِ خیال پر ہنسے تھے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"پھر آپ کس سے لڑیں گے؟" کپتان پلیٹن نے دریافت کیا۔

"آپ سب سے۔" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سب اُٹھے اور پیچھے کی طرف جاکر کھڑے ہوگئے۔ میں ان کی بڑبڑاہٹ اور کھسر پھسر سنتا رہا۔ وہ ہنس رہے تھے اور اس وقت تک مجھے محض شیخی خور سمجھ کر میرا مضحکہ اُڑا رہے تھے۔ پھر وہ کمرے میں واپس آگئے۔

"اگرچہ آپ کی خواہش غیر واجب ہے مگر منظور کرلی جائے گی۔ آپ یہ ڈوئیل کس طرح لڑنا چاہتے ہیں؟ شرائط بھی آپ خود ہی تجویز کردیں۔" میجر اولیویئر نے کہا۔

"تلوار سے، اور آپ میں سے جو لوگ بڑے عہدے دار ہیں ان سے پہلے لڑوں گا۔ ابتدا میجر اولیویئر سے ہوگی، صبح ساڑھے پانچ بجے یعنی اسمبلی بگل بجنے سے پہلے ہر ایک

حاضر جوابی

حضرت خواجہ حسن بصریؒ (21تا110ء) فرماتے ہیں کہ ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ شمع روشن کیے جارہا ہے۔ میں نے اس کو روک کر پوچھا "بیٹے! تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟"

میرا سوال سنتے ہی بچے نے ایک لمحے توقف کیا پھر فوراً ہی پھونک مار کر شمع گل کردی اور مجھ سے کہنے لگا۔

"آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں آپ کو بتادوں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی۔"

آپؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں لاجواب ہوگیا۔

انتخاب: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

کے لیے پانچ منٹ کافی ہوں گے۔ چونکہ میں نووارد ہوں اور مناسب مقامات سے ناواقف ہوں اس لیے جگہ کا انتخاب آپ خود کر لیجیے۔"

میری یہ سرد مہری اور عمل طرزِ عمل دیکھ کر وہ بہت بٹپٹائے، مسکراہٹ تو پہلے ہی ان کے چہروں سے دور ہو گئی تھی۔ اب اولیویئر کا چہرہ ٹیڑھے سے سیدھا ہو گیا تھا بلکہ اس پر متانت اور سنجیدگی مستزاد تھی، اس نے کہا "گھوڑوں کی لائن کے پیچھے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ ہم لوگ اس قسم کے کام وہیں انجام دیا کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ جگہ مناسب رہے گی۔ کپتان جیرارڈ آپ جس وقت فرمائیں، ہم لوگ وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں اس طرح کی منظوری کے اعلان کے لیے کھڑا ہو کر جھکنے ہی والا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کرنل جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا اندر آیا، اس نے کہا "صاحبو! مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں میں سے ایک رضاکار کا انتخاب کر کے لے جاؤں۔ اسے ایک نہایت خطرناک کام انجام دینا ہوگا۔ وہ کام میں آپ سے مخفی رکھوں گا۔ انتہائی مشکل کام ہے، مارشل لینیز رسالے کے افسران میں سے ایک آدمی چاہتا ہے، کیونکہ رسالہ کسی توپ خانے، پلٹن اور انجینئرنگ کے لوگوں سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ غیر شادی شدہ کو ترجیح دی جائے گی یا وہ شخص جو خود اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کر دے۔"

کرنل اس وقت کچھ بھونچکاں سا ہو رہا تھا اور میں اس کی پریشانی کی وجہ سمجھتا تھا۔ اس وقت اس سے بہتر آدمی اور کون ہو سکتا تھا۔

"جناب!" میں نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"

اس نے مجھے کڑوی نظروں سے دیکھا کیونکہ میں نے شام کے کھانے پر جو باتیں کی تھیں وہ انہیں بھولا نہیں تھا۔ اس نے کہا "کہیے۔"

"جناب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک مشن ہر طرح میرے شایانِ شان ہے، میرے سوا کوئی دوسرا شخص اسے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ حق کے اعتبار سے بھی اور فراغت کے اعتبار سے بھی۔"

"کیوں یہ کس طرح کپتان جیرارڈ؟"

"حق کے لحاظ سے اس لیے کہ میں سینئر ہوں اور فراغت کے اعتبار سے رجمنٹ کا ہر آدمی مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، یعنی مجرد ہوں۔"

یہ سن کر کرنل کا چہرہ ڈھلک گیا "کپتان جیرارڈ! تم نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں تمہی اس مہم کے لیے موزوں ترین آدمی ہو سکتے ہو، تم اس وقت میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں کچھ ہدایات دوں گا۔"

میں نے چلتے وقت اپنے ساتھیوں سے شب بخیر کہا اور پھر وہ بات دُہرائی کہ کل صبح ساڑھے پانچ بجے وقت کی پوری پابندی سے میں آپ کو ملوں گا۔ انہوں نے خاموشی سے سرِتسلیم خم کیے۔ ان کے چہرے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی رائے پہلے کی بہ نسبت اب میرے متعلق کچھ درست معلوم ہوتی تھی۔

میرا خیال تھا کرنل جلد ہی مجھے اس کام سے آگاہ کر دے گا جس کے لیے میرا انتخاب کیا گیا ہے مگر ایسا نہیں ہوا، وہ خاموشی سے آگے چلتا رہا اور اس کے پیچھے پیچھے میں۔ کیمپ سے گزر کر ہم خندقوں پر آ گئے جہاں اینٹ، پتھروں اور مسالے کے اونچے اونچے ڈھیر، ملبے اور مٹی کے انبار لگے ہوئے تھے، یہ برباد شدہ پُرانی دیواروں کا ملبہ تھا۔ وہ بڑے بڑے پختہ مکانات ڈھیر تھے۔ انہیں ہمارے انجینئروں نے بارودی سرنگوں کے ذریعے اُڑایا تھا۔ انہی میں راستے اور گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر موڑ اور مورچے پر لالٹینیں لگی ہوئی تھیں تاکہ راہ گیر راستہ نہ بھٹک جائیں۔ ہم ملبے کے ڈھیروں پر چڑھتے اُترتے ہوئے چل رہے تھے، کرنل لمبے لمبے قدموں سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ آخر ہمیں سیدھا راستہ مل گیا۔ یہ شہر پناہ کی دیوار کے نیچے دور تک چلا گیا تھا۔ ہمارے راستے کی دوسری جانب کچی مورچہ بندی تھی جس کے اندر خندقوں میں ایڈوانس گارڈ سو رہے تھے۔ کرنل مجھے ایک بغیر چھت کے مکان میں لے گیا۔ وہاں دو جرنیل نظر آئے جن کے سامنے ایک ڈرم پر نقشہ پھیلا ہوا تھا اور وہ دونوں گھٹنے ٹیکے لالٹین کی روشنی میں بڑے غور سے نقشہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک داڑھی مونچھ منڈا ٹیڑھی گردن کا مارشل لینیز تھا اور دوسرا جنرل رازوٹ، انجینئروں کا اعلیٰ افسر تھا۔

"جناب! یہ کپتان جیرارڈ اپنی مرضی سے جانے کے لیے تیار ہے۔" کرنل نے فوجی انداز میں اٹینشن ہو کر کہا۔

مارشل لینیز گھٹنوں کے بَل سیدھا کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا "آپ ایک بہادر آدمی ہیں، میں آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹیوب میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔

"یہ چیز ڈاکٹر فاروینٹ کی تیار کردہ ہے، اسے انتہائی خطرناک موقع پر اپنے ہونٹوں میں رکھ لینا۔ آن واحد میں

کام تمام کردے گی۔‘‘

دوستو! یہ خوشگوار تمہید سن کر میری کمر میں جاڑے کی سی پھریری آئی اور جسم کا رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ میں نے تسلیم خم کیا اور کہا ’’جناب عالی! معاف فرمائیے گا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ پُرخطر خدمت کیا ہے، جس کے لیے میں نے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا ہے، اس کی تفصیل مجھے اب تک نہیں بتائی گئی ہے؟‘‘

مارشل لینیئر نے کرنل پیرن سے سختی سے کہا ’’یہ بُری بات ہے، اس بہادر افسر کو رضاکار بنانے سے پہلے ان تمام خطرات سے آگاہ کردینا ضروری ہے جو اسے پیش آنے والے ہیں تاکہ یہ ابھی ان کا سدِباب سوچ لے۔‘‘

’’میں پہلے ہی تیار ہوکر آیا تھا جناب!‘‘ میں نے کہا ’’ہر خطرے کے بعد شادمانی ملتی ہے، آدمی جتنا زیادہ خطرناک کام انجام دیتا ہے، اس کی اتنی ہی زیادہ قدرومنزلت بڑھتی ہے۔ اگر مجھے پہلے یہ بتادیا جاتا کہ اس کام میں کوئی خطرہ نہیں ہے تو شاید میں پچھتاتا۔‘‘

میری یہ تقریر شاندار تھی اور میری ظاہری وجاہت نے الفاظ کو زوردار بنادیا تھا۔ اس وقت میں ایک بہادر شخص کی طرح تن کر کھڑا تھا۔ لینیئر کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی زبان حال سے یہ کہہ رہی تھیں کہ فرانس کی فوج سے انتخاب کرکے اس مہم پر بھیجنے کے لیے اس نے جو کارکن چنا ہے وہ واقعی شاندار ہے۔ میں نے سوچا اگر میں رات کو مارا گیا تو لوگ بہت جلد میرا نام بھول جائیں گے البتہ میرے وہ نئے اور پُرانے ساتھی مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گے جن سے میرا رابطۂ اتحاد کسی نہ کسی عنوان سے رہ چکا ہے۔

’’جنرل رازوٹ! تم مختصر طور پر صورتِ حال بتادو۔‘‘ مارشل لینیئر نے بڑی متانت سے کہا۔

انجینئر افسر ہاتھ میں پرکار لیے ہوئے اُٹھا اور مجھے دروازے کی طرف لے گیا اور اس خاکی رنگ کی بڑی دیوار کی طرف اشارہ کیا جو ٹوٹے ہوئے مکانات کے بڑے بڑے شگافوں میں سے نظر آرہی تھی، اس نے کہا ’’یہ...... یہ دشمن کی دفاعی حدفاصل اور یہی مُدونا کی بڑی خانقاہ کی دیوار ہے، اگر یہ ہمارے قبضے میں آجائے تو گویا شہر پر قبضہ ہوگیا۔ انہوں نے اس میں جابجا بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ دیوار اس قدر زیادہ موٹی ہے کہ ہمارے توپ خانے اسے توڑنے میں ناکام ہیں اور اس میں بہت زیادہ خرچ بھی ہے، ہمیں یہ بھی علم ہوا ہے کہ دشمن کے پاس بارود کا کافی ذخیرہ موجود ہے جو اس دیوار کے زیریں کمروں میں جمع ہے، کسی

طرح اس ذخیرے میں آگ لگادی جائے تو ہمارے لیے راستہ صاف ہے۔''
''میں وہاں کس طرح پہنچ سکتا ہوں؟'' میں نے دریافت کیا۔
''میں آپ کو ابھی بتاتا ہوں۔ اس شہر میں ہمارا ایک فرانسیسی ایجنٹ ہے، اس کا نام ہوبرٹ ہے، یہ بہادر شخص ہمیں اندر کی خبریں بھیجتا رہتا ہے۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح سویرے میگزین اُڑادے گا مگر آج دو دن گزر گئے، دو ہزار بہادر سپاہیوں کا طوفانی دستہ دو دن سے منتظر کھڑا ہے کہ کب دیوار میں شگاف ہو اور کب وہ شہر پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ آخر اسے ہوا کیا؟ دو دن سے نہ کوئی دھما کا ہوا نہ اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے۔''
''آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں وہاں جا کر اس سے ملوں۔''
''بالکل، پتا کرنا ضروری ہے کہ وہ بیمار ہے، زخمی ہے یا بدقسمتی سے مارا گیا ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہم اس کے منتظر رہیں یا دوسری جگہ سے حملہ کریں، جب تک ہمیں اس کی طرف سے کوئی خبر نہ ملے، ہم دوسرا اقدام نہیں اُٹھا سکتے۔''
وہ کچھ دیر دیر کے لیے رکا پھر سانس لے کر بولا ''دیکھو جیرارڈ! یہ شہر کا نقشہ ہے۔ تمہیں اس میں یہ عبادت خانے اور خانقاہوں کا حلقہ دکھائی دیتا ہے نا، اس کے ساتھ ہی یہ بہت سی سڑکیں ہیں۔ یہ اس بڑی سڑک کی شاخیں ہیں جو مرکزی اسکوائر سے گرجا گھر کو جاتی ہے۔ تم جب اس چوک پر پہنچ جاؤ گے تو اس سڑک کے ایک کونے میں گرجا ملے گا۔ اسی کونے پر نیٹ ٹولیڈو اسٹریٹ ہے، اس سڑک پر گرجا سے جاتے ہی داہنے ہاتھ پر ایک موچی کی اور دوسری شراب کی دکان ہے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹا سا مکان ہے، جس میں ہوبرٹ رہتا ہے۔ میں نے یہ جو کچھ کہا تم سمجھ گئے ناں؟''
''بالکل جناب! آپ کی باتیں خاصی دلچسپ ہیں۔''
''تمہیں اس مکان پر پہنچ کر ہوبرٹ سے ملنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس کی تجویز ابھی قابلِ عمل ہے یا ہم اسے متروک سمجھیں؟''
پھر اس نے مجھے ایک پلندا دیا جو ایک میلے کچیلے فلالین کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کہا ''لو یہ فرانسیسی درویش کی گدڑی ہے، یہ نہایت کارآمد بھی ثابت ہوگی۔''
میں نے گدڑی لینے سے پرہیز کیا اور کہا ''اسے پہن کر تو میں جاسوس معلوم ہونے لگوں گا۔ میں اپنی وردی میں جاؤں گا۔''

''ناممکن ہے یہ، بھلا شہر کی سڑکوں سے تم کس طرح گزر سکو گے؟ یاد رکھو اسپین والے دشمن کو قیدی بنا کر نہیں رکھتے، تم جس لباس میں پکڑے جاؤ گے اس کے مطابق تمہارا حشر ہوگا۔''
یہ بات اس نے ٹھیک کہی تھی۔ میں کافی عرصے اسپین کے نواح میں رہ چکا ہوں، مجھے خود معلوم تھا کہ وہاں قیدی کا انجام موت سے زیادہ دردناک ہوتا ہے، میں سرحد تک ان کے مظالم کی داستانیں سنتا چلا آیا تھا۔ میں نے فرانسیسی سادھو کا لباس پہن لیا اور کہا ''اب میں تیار ہوں۔''
''تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میرے پاس تلوار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''کیا وہ لوگ اس کی کھڑکھڑاہٹ سن کر چونکے گے نہیں؟ یہ چاقو اور تلوار یہیں چھوڑ دو۔ ہوبرٹ سے کہنا کل... علی الصباح چار بجے ہمارا طوفانی دستہ تیار رہے گا۔'' وہ پھر کچھ دیر کے لیے رکا۔ اِدھر اُدھر نظریں گھما کر بولا۔ ''یہاں سے باہر جاتے ہی تمہیں ایک سارجنٹ ملے گا جو تمہیں شہر میں داخل ہونے کا طریقہ بتائے گا، اچھا خدا حافظ!''
کمرے سے باہر نکلتے وقت میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں جرنیل سر جوڑ کر نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور ان کی ٹوپیوں کے پھندنے ہل ہل کر آپس میں گلے مل رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ اچھی فال ہے۔ میں دروازے پر آیا، دیکھا ماتحت انجینئر افسر میرا منتظر کھڑا تھا۔ میں نے اپنے خرقے کا کمر بند باندھا۔ فوجی ٹوپی اُتار کر قلندرانہ کفن سر سے لپیٹ لیا۔ سواری کے بوٹوں سے کانٹے علیٰحدہ کیے اور خاموشی سے اپنے رہبر کے ساتھ ہولیا۔
دیواروں پر اسپینی سنتریوں کی لائن لگی ہوئی تھی، وہ ہماری اگلی چوکیوں پر متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم دونوں ان سے بچتے ہوئے برباد شدہ دیوار کے ملبے پر چڑھتے اُترتے ایک بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے آ کر ٹھہرے۔ سارجنٹ رک گیا اور اس نے کہا۔
''اوپر چڑھنے کے لیے یہ درخت بہت اچھا ہے، ڈنڈوں کی سیڑھی بھی اس کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ بس چڑھ جاؤ، اوپر جا کے تم چھوٹی والی ڈال پکڑ کر آسانی سے مکان کی چھت پر اُتر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارا محافظ فرشتہ تمہاری رہبری کرے گا۔ اس سے زیادہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا، خدا حافظ۔''
میں بھاری خاکی گون کمر میں اڑس کر سارجنٹ کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ ایک شاخ سے دوسری پر

اُچھلتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ چوٹی کے قریب جا پہنچا۔ چھت کی کالی منڈیر سامنے نظر آ رہی تھی، اوپر تاروں بھرا آسمان تھا۔ اب مجھے ایک مضبوط ٹہنی کی تلاش تھی جس کے ذریعے میں دیوار پر پہنچ سکتا مگر یکا یک کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ میں ساکت ہو کر تنے سے چمٹ گیا۔ ایک آدمی چھت پر جھکا جھکا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والی بندوق تھی۔ اس کا انداز مشکوک اور خطرناک تھا۔ وہ ایک جگہ رکا اور پھر چلا، یہاں تک کہ وہ میرے قریب صرف چند گز کے فاصلے پر آ گیا اور فصیل کے کنارے پر گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا پھر اس نے گولی چلا دی۔

میری کہنی میں سخت کھرونچ آئی تھی اور میں درخت سے نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے یہ فائر مجھ پر نہ کیا ہو بلکہ کسی دوسرے کو نشانہ بنایا ہو، اس وقت درخت کے نیچے سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا کہ فائر کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے سارجنٹ کو تاڑ لیا تھا جو درخت کے نیچے کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسپینی نے اس غریب کو نشانہ بنایا تھا۔ آپ خیال کریں گے کہ اس نے اندھیرے کے باوجود ٹھیک نشانہ لگایا اس لیے کوئی اچھا نشانچی ہوگا۔ نہیں، یہ لوگ قرابیں استعمال کرتے ہیں جس میں گولی کی بجائے چھوٹے چھوٹے دھات کے ٹکڑے اور چھرے وغیرہ بھرے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسی ہی آسانی سے مار سکتے ہیں جس طرح میں درخت کی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے تیتر کو گولی مار سکتا ہوں۔

اسپینی اب تک جھکا ہوا اندھیرے میں نیچے جھانک رہا تھا کہ یکبارگی نیچے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی مرتے وقت کراہتا ہے، اسپینی نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی کھٹکا نہ تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ نیچے جا کر جلدی سے اس بدقسمت فرانسیسی کا کام تمام کر دے یا اس کی جامہ تلاشی لینی مقصود ہوگی کہ شاید کوئی مطلب کی چیز اس کی جیب سے برآمد ہو سکے غرض جو بھی اس کی منشا ہو۔ اس نے اپنی بندوق وہیں چھت پر ڈالی اور خود جھکا جھکا آگے بڑھا اور ایک ٹہنی پکڑ کر درخت پر جھول گیا۔ میں نے فوراً اپنا چاقو اس کے جسم میں پیوست کر دیا۔ وہ درخت کی شاخوں میں جھڑجھڑاتا ہوا دھم سے زمین پر جا گرا۔ زخمی سارجنٹ نے بھی اپنا بدلہ لینے میں دیر نہ کی کیونکہ میں نے کشتم کشتا ہونے اور فرانسیسی زبان میں ایک دو قسمیں کھانے کی آوازیں سنیں۔

میں نے چند منٹ تک تو ہلنے کی جرأت نہ کی، اس خیال سے کہ اس آواز پر ضرور کوئی آئے گا مگر ہر طرف خاموشی تھی۔

میں ٹہنیوں سے رینگتا ہوا چھت پر پہنچا۔ اسپینی کی بندوق وہاں پڑی تھی مگر وہ بیکار تھی اس لیے کہ بارود کی کپی اس کی پیٹی میں تھی۔ میں نے بندوق اُٹھا کر نیچے پھینک دی، اس خیال سے کہ اگر دشمن کا کوئی آدمی اسے یہاں پڑے ہوئے دیکھے گا تو ضرور خیال کرے گا کہ یہاں کوئی واقعہ ہوا ہے۔ پھر میں نے چھت سے نیچے اُتر کر شہر میں داخل ہونے کی ترکیب سوچی اور اِدھر اُدھر راستہ تلاش کیا۔ مجھے یقین تھا کہ جس راستے سے سنتری چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ اس راستے سے میں نیچے اُتر کر شہر میں پہنچ سکتا ہوں، بس وہی راستہ مناسب ہوگا۔

اچانک ''مینولو...... مینولو'' پکارنے کی آواز ابھری پھر ایک سایہ سا دکھائی دیا جیسے کوئی جھکا جھکا چور دروازے سے نکل کر چاندنی میں چھت پر آ رہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایک داڑھی والا نظر آیا۔ جب وہ بیچ چھت پر چاندنی میں آ گیا تو تین اور زرہ پوش سپاہی اس کے ساتھ آ کر مل گئے۔

میں نے بندوق چھت سے نیچے پھینک دی تھی ورنہ ضرور راز فاش ہو جاتا۔ جب انہیں سنتری کا کوئی پتا نہ چلا تو انہوں نے خیال کیا وہ ضرور چھت سے نیچے کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ سب واپس ہوئے اور بڑھتے چلے گئے پھر کچھ ٹھہر کر میں چور دروازے کی طرف بڑھا، کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں زینے سے اُتر کر اندر پہنچا۔ مکان قطعی خالی تھا، میں اس کے درمیان سے گزر کر سامنے کے کھلے ہوئے دروازے سے سڑک پر آ گیا۔

یہ ایک تنگ گلی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی جو آگے جا کر چوڑی سڑک سے مل گئی تھی۔ جگہ جگہ آگ کی ڈھیریاں اور جلنے کے نشانات تھے، سپاہی اور دہقان پڑے سو رہے تھے، شہر میں اس درجے تعفن پھیلا ہوا تھا کہ انسان کا زندہ رہنا محال تھا۔ محاصرے کو ایک ماہ سے زیادہ گزر چکا تھا۔ غلاظتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جابجا لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو صفائی اور تدفین کی مہلت ہی نہ تھی۔ یہاں بہت سے لوگ اِدھر سے اُدھر آگ تاپتے پھر رہے تھے، ان میں سے بعض لوگ قلندر یا فقیر قسم کے بھی نظر آئے۔ انہیں بے روک ٹوک چلتے پھرتے دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس ہوئی اور میں جلدی سے بڑے چوک کی طرف چل دیا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ اتفاقاً ایک شخص نے اُٹھ کر میری آستین پکڑ لی اور مجھے روک لیا پھر ایک عورت کی طرف اشارہ کیا جو بے حس و حرکت سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مر رہی ہے اور یہ شخص مجھ سے عیسائی مذہب کے دستور کے مطابق دعا و حلف کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے عورت کے حق میں چند دعائیہ کلمات استعمال کیے اور دستار

قلندری اس کے سینے تک جھکا دی۔ اس کے بعد میں نے اپنا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھایا اور آگے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے میری آستین چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میں متقیانہ انداز سے اپنے راستے پر روانہ ہوگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ سڑک سیدھی شہر کے اندر جائے گی جہاں فوجی دستے ہوں گے۔ شہر مشعلوں اور روشنیوں سے جگمگا رہا ہوگا۔ میں تیزی سے سڑک پر بڑھتا چلا گیا۔ راستے میں ایک دو آدمیوں نے ہتک آمیز کلمات کہہ کر مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر میں ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر گرجا والی سڑک سے تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا چلا گیا۔ اب میں شہر کی اس سمت میں تھا جو ہمارے حملے سے کافی فاصلے پر تھی، وہاں کوئی فوجی کیمپ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی سے اتفاقیہ کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔

جس مکان کا مجھے پتا دیا گیا تھا، اسے تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ مکان وہیں موچی کی دکان اور شراب خانے کے درمیان واقع تھا۔ اس میں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی، دروازہ بند تھا۔ تاہم میں نے چٹخنی کھولنی چاہی تو وہ کھل گئی، میں نہیں سمجھتا تھا کہ مکان میں کوئی ہوگا۔ اندر داخل ہوکر دروازہ بند کیا تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے چاروں طرف ٹٹولنا شروع کیا۔ میرا ہاتھ ایک میز کے کنارے سے لگا، میں خاموش کھڑا رہا کہ اب کیا کروں؟ ہوبرٹ کو کس سے اور کس طرح معلوم کروں؟

اس وقت میں جس مکان میں تھا وہاں ذرا سی غلطی سے جان جانے کا خطرہ اور مشن کے ناکام ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ تنہا نہ رہتا ہو، کسی اسپینی خاندان کے ساتھ شراکت میں رہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میری اور اس کی ملاقات سے ہم دونوں ہی کی جان خطرے میں پڑ جائے، میں مسلسل سوچے جا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے کان میں کھسر پھسر کی سی آواز آئی، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری رگوں کا خون سرد ہوکر جم گیا ہو۔

''مان ڈیئو...... مان ڈیئو......'' یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی جان کنی کے وقت کسی کو پکارتا ہے پھر اس اندھیرے میں کسی نے سسکی بھری پھر وہی خاموشی طاری ہوگئی۔ اس خوفناک سی آواز نے مجھے لرزا دیا تھا مگر یہ لرزش کچھ امید دلا رہی تھی کہ بولنے والا فرانسیسی تھا۔

''تم کون ہو؟'' ہمت کر کے میں نے پوچھا مگر گنگنانے کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔

''موسیو ہوبرٹ، کیا تم ہو؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''ہوں۔'' ایک آہ ابھری۔

آواز اس قدر دھیمی اور آہستہ تھی کہ میں اس سناٹے میں مشکل سے سن سکا۔

''پانی...... خدارا...... پانی!''

جس طرف سے یہ آواز آئی تھی، میں اس طرف بڑھا اور دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ پھر میں نے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ آواز میرے سر کے اوپر سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر اوپر ٹٹولا مگر خالی ہوا کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔

''تم کہاں ہو؟'' میں نے بہ آواز بلند پوچھا۔

''یہاں......'' نہایت کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر پھیرنے شروع کیے، یکبارگی میرے ہاتھ کسی برہنہ شخص کے پیروں سے جا لگے جو میرے سر سے اونچے تھے اور کسی چیز پر ٹکے ہوئے بھی نہ تھے۔ میں یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور چقماق کی ڈبیا جیب سے نکال کر روشن کی، پہلے ہی شعلے میں ایک آدمی ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا، گھبراہٹ کی وجہ سے ڈبیا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، میں نے مشکل سے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ڈبیا اٹھائی اور پھر پتھری اسٹیل پر ماری۔ اس دفعہ میں نے موم بتی جلالی تھی۔ اسے اوپر اٹھا کر جو دیکھا تو خوف و ہراس کی کوئی انتہا نہ رہی، ایک آدمی کو میخیں ٹھونک کر دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ جیسے کھلیان کے دروازے پر نیولے کو کیلوں سے جڑ دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں موٹی موٹی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بے چارہ، بدقسمت، اس وقت نزع کے عالم میں تھا۔ اس کا سر کاندھے پر ڈھلکا ہوا تھا اور کالی خشک زبان ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے لیے پیاس کی شدت زخموں کی تکلیف سے کم نہ تھی جو اس کی موت کے باعث ہوسکتی تھی۔ ان درندہ صفت انسانوں نے سونے پر سہاگا یہ کیا تھا کہ اس کے سامنے میز پر شراب کا بھرا ہوا بیکر رکھ دیا جو اس کی تکلیف میں ایک اور اضافہ تھا۔ میں نے میز کھینچی اور اس پر کھڑا ہوگیا پھر بیکر اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس میں نگلنے کی طاقت ابھی باقی تھی۔ اس کی دھندلی آنکھوں میں روشنی آگئی اور آہستہ سے گنگنا کر کہا۔

''کیا تم فرانسیسی ہو؟''

''ہاں، مجھے ان لوگوں نے تمہارا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''میرا راز فاش ہوگیا تھا، اس لیے انہوں نے میرے

سلوک کیا۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ مرنے سے پہلے
تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں جو مجھے معلوم ہیں۔
ذرا سی شراب اور دو مہربانی، جلدی کرو، میرا دم نکلا
جا رہا ہے۔ آہ......" وہ کراہا "م...... میری تمام طاقتیں اب
جواب دے چکی ہیں، میں جو کہتا ہوں وہ سنو، بڑی ماں کے
کمرے میں بارود کا ذخیرہ ہے، گرجا کے سامنے چھوٹی ماں
سزا نجس کی کوٹھری ہے، وہاں دیوار کے ایک سوراخ میں
فیتہ ابھرا ہے، جس کا سلسلہ بارود تک ہے، دو دن گزر گئے، یہ
کام تیار ہو چکا تھا لیکن انہوں نے ایک خط پکڑ لیا جس کی وجہ
سے مجھے سولی دے دی گئی۔"

"یا خدا! تم دو دن سے یہاں لٹکے ہوئے ہو؟"

"میرے رفیق! معلوم ہوتا ہے، دو سال گزر گئے، کیا
میں نے اپنے وطن فرانس کے لیے یہ خدمت انجام نہیں دی؟
بس اب ایک خدمت تم میری کر دو، میرے دل پر خنجر مار دو
کہ میری تکلیف جلد ختم ہو جائے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں
اس کی۔ میں تمہاری خوشامد کرتا ہوں۔"

درحقیقت وہ علاج و معالجے جیسی شے سے مایوس ہو گیا
تھا۔ اس کے ساتھ اس وقت سب سے بڑی ہمدردی کا عمل
یہی ہو سکتا تھا جو اس کی التجا تھی مگر اس قسم کے سرد خون سے
چاقو آلودہ کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے سوچا اگر اس
حال میں اس کی جگہ میں ہوتا اور اس طرح کے رحم کی
درخواست کرتا تو......؟

فوراً خیال آیا کہ میری جیب میں ایک ایسی چیز ہے جس
سے فی الفور موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہ چیز میں نے اپنے
نازک وقت کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ اس وقت مجھ سے زیادہ
اس کا مستحق یہ لاچار ہے، جس نے درحقیقت ملک اور قوم کی
ایک اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، میں نے جیب سے چھوٹی سی
شیشی نکالی اور وہ چند قطرے جو اس میں تھے، شراب کے
پیالے میں جھاڑ دیے اور اوپر اٹھا کر اسے دینا چاہا تھا کہ
دروازے پر ہتھیاروں کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔

میں نے روشنی گل کر دی اور کھڑکی کے پردے کے پیچھے
چھپ گیا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور دو اسپینی کمرے میں
داخل ہوئے، ان کے چہرے خوفناک اور کالے تھے، وہ شہری
لباس پہنے کاندھوں پر بندوقیں رکھے ہوئے سامنے آ گئے۔
ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی، میں پردے کی
جھریوں سے ان کی ہر حرکت دیکھ رہا تھا اور یہ خیال کر کے ڈر
بھی رہا تھا کہ کہیں میرا سراغ نہ مل گیا ہو مگر پھر یقین ہو گیا کہ
وہ شخص میرے بدقسمت ہم وطن کا آخری نظارہ کرنے آئے
ہیں، جس شخص کے ہاتھ میں لالٹین تھی، اس نے ہاتھ اونچا
اٹھا کر لالٹین مرتے ہوئے آدمی کے سامنے کی، پھر دونوں
نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

لالٹین کی روشنی میں قریب ہی رکھے ہوئے پیالے پر ان
کی نظر پڑ گئی۔ ایک شخص نے پیالہ ہاتھ میں اٹھا کر مجبور اور
لاچار ہوبرٹ کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ ہوبرٹ نے پینے
کے لیے گردن آگے بڑھائی تو اس نے پیالہ پیچھے ہٹا لیا اور
خود ایک لمبا گھونٹ لے کر پیٹ میں اتار لیا مگر فوراً ہی اس نے
ایک چیخ ماری۔ دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا اور مٹی کے ڈھیلے
کی طرح زمین پر گر پڑا۔ دوسرے شخص نے جب اپنے ساتھی
کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا اٹھا اور خوف زدہ ہو کر دیوانوں کی
طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اس کے سڑک پر دوڑتے
قدموں کی آوازیں سنتا رہا، کچھ فاصلے پر جا کر آواز آنا
موقوف ہو گئی۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر میں نے دیکھا کہ وہ لالٹین
میز پر رکھی ہوئی جل رہی تھی جو اسپینی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس
کی روشنی میں دیکھا کہ ہوبرٹ کا سر کاندھے سے ڈھلک کر اس
کے سینے پر آ گیا تھا گویا اس کا دم نکل چکا تھا۔ شراب کے
پیالے تک ہونٹ بڑھانے کی یہ اس کی آخری کوشش تھی۔

کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ قطعی خاموشی
تھی۔ دیوار پر میرے فرانسیسی دوست کی خمیدہ ڈراؤنی شکل
لٹک رہی تھی اور فرش پر میرے اسپینی دشمن کی بے حس و حرکت
لاش پڑی تھی۔ دو رخی لالٹین کی دھندلی روشنی میں یہ منظر اس
قدر ہیبت ناک اور لرزہ خیز تھا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں نہ
دیکھا تھا۔ دس ہزار مقتولوں کا میدان میں نے دیکھا تھا جہاں
لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے مگر کبھی ایسا پریشان نہیں ہوا تھا
جیسا اس وقت اس دھندلی روشنی میں تھا۔ میں کمرے میں دو
شکلیں دیکھ دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ میرے ایسا مضبوط اعصاب کا
آدمی بھی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ پھر میں بھی جھپٹ کر کمرے
سے باہر نکل گیا جیسے وہ اسپینی اس اندوہناک مکان سے نکل کر
بھاگا تھا۔ جب تک گرجا سامنے دکھائی دیتا رہا، میں برابر
دوڑتا رہا...... یہاں تک کہ میں نے گرجا کی دیوار کے نیچے
جا کر دم لیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑے وہاں کھڑا
ہوا سانس درست کرتا رہا۔ جب میں وہاں کھڑا ہوا سانس
ٹھیک کر رہا تھا تو میرے سر کے اوپر کی جانب گرجا کے گھنٹوں
نے پُرشور صدا کے ساتھ دو بجائے۔ میں نے سوچا، چار بجے
طوفانی لشکر کو اس جگہ حملہ کر دینا ہے۔ اس لیے مجھے کل دو گھنٹے
میں پورا کام انجام دینا تھا۔

گرجا اندر سے منور نظر آرہا تھا۔ بہت سے آدمی اندر باہر آجا رہے تھے، اپنی تجویز بروئے کار لانے کا یہ اچھا موقع مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مجھے کون پہچان سکتا تھا۔ میں بھی بے نیازی سے اندر داخل ہوگیا۔ ہر آدمی پہلی نظر میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ جگہ پناہ گاہ، اسپتال اور ذخیرہ گاہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔

گرجا کے بغلی گوشے میں سامان رسد بھرا ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں بیماروں اور زخمیوں کے لیے گھاس وغیرہ کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ صحن کے وسط میں سیکڑوں مجبور، اپاہج اور بے کس لوگ کیچڑ اور گارے میں کھانا پکا رہے تھے۔ کچھ لوگ اندر کی طرف عبادت میں مشغول تھے۔ میں بھی ایک تھم کی آڑ میں جاکر دوزانو بیٹھ گیا اور تہ دل سے اپنی خوش قسمتی پر شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے زندہ سلامت نکل آیا۔ میں نے دعا مانگی۔ ''یا خدا! آج کی رات میرے ہاتھوں وہ کام انجام پائے، جس سے میرا نام جرمنی کی طرح اسپین میں بھی روشن ہوجائے۔ اے خدا! اپنے جیرارڈ کو شادکام کردے۔''

☆☆☆

تین بج رہے تھے، میں گرجا سے نکل کر میڈونا کی خانقاہ کی طرف چلا جہاں حملہ ہونے والا تھا۔ آپ نے غور فرمایا، میں ایسا آدمی نہیں ہوں جو یوں ہی کاہلوں کی طرح فرانسیسی کیمپ واپس چلا جاتا اور یہ رپورٹ کردیتا کہ افسوس ہے، ہمارا ایجنٹ مارا گیا۔ اس لیے شہر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں، یہ اپنے وطن سے غداری اور بدنیتی کے مترادف ہوتا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ خواہ کچھ ہو، کسی نہ کسی طرح ہوبرٹ کا ناممکن کام پایۂ تکمیل تک پہنچا کر رہوں گا ورنہ فوج میں ایک لائق اور دلیر سینئر کپتان کی جگہ خالی ہوجائے گی۔

میں بے روک ٹوک اس کھلے صحن یا چوڑی سڑک سے گزر گیا جس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس عظیم الشان سنگین خانقاہ میں آگیا جو شہر کے بچاؤ کے لیے پشت پناہ بنی ہوئی تھی۔ یہ مربع شکل کی عمارت تھی جس کے بیچوں بیچ ایک باغیچہ تھا۔ باغیچے میں سیکڑوں مسلح اشخاص کیل کانٹے سے لیس بیٹھے تھے، انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ فرانسیسی اس جگہ حملہ کرنے والے ہیں۔

اب تک جتنی لڑائیاں ہم نے لڑی تھیں ان میں سپاہ کا مقابلہ سپاہ سے ہوا تھا مگر اسپین میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ عوام سے لڑنا مشکل کام ہے، ذرا غور کیجیے اگر آپ نے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تیلی تنبولیوں کا ہجوم یا سوداگروں
دیوانوں کا مشتعل ہجوم زیر کرلیا تو کیا بہادری ہوئی؟ یہ کس کی فتح کہلائے گی؟ دوسرے اس مقابلے میں خطرے کی بات یہ ہوتی ہے کہ عوام کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے، اور غصے کے جذبے سے مجبور ہوکر بانس، بلی، گنڈاسے، گرز لے کر پل پڑتے ہیں اور خوانخواہ مجروح کرڈالتے ہیں۔

جب میں نے یہ بوقلمونی مشتعل فوج خانقاہ کے باغیچے میں دیکھی تو غور کیا کہ ہمارا کام کس قدر مشکل اور عجیب تر ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم سپاہیوں کا کام یہ نہیں ہے کہ سیاست میں زیادہ غور وفکر کریں اور اپنا دماغ پریشان کریں۔ اسپین کی جنگ تو شروع ہی سے عجیب ہے اور جیرارڈ عجیب وغریب قسم کے کاموں کو سرانجام دینے کے لیے فرانس میں پیدا ہوا ہے۔

بھلا اس قسم کے غور وفکر کا مجھے وقت کہاں تھا۔ باغیچے کی طرح خانقاہ میں بے روک ٹوک داخل ہونا ناممکن تھا۔ پہلے میں نے باغیچے کا ایک چکر لگایا، اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ایک طرف ایک بڑی کھڑکی نظر آئی جس کے کواڑوں کے شیشے دھندلے تھے اور وہ گرجا سے ملحق تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ہوبرٹ کا کہنا یاد آگیا کہ بڑی ماں کا کمرا اس جگہ کے قریب ہے جہاں بارود کا ذخیرہ ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کا فلیتہ بھی قریب ہی کے کسی کمرے میں ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی خانقاہ میں داخل ہونا چاہیے۔ دروازے پر گارڈ تعینات تھا، میں روک ٹوک کے بغیر اندر نہیں جاسکتا تھا مگر ایک فوری تجویز الہام کی طرح میرے دماغ میں آئی اور میں سمجھ گیا کہ کام اسی طرح بن سکتا ہے، باغیچے میں ایک کنواں تھا، اس کنویں پر بہت سے خالی ڈول رکھے ہوئے تھے، ان میں سے دو ڈول میں نے پانی سے بھر لیے اور دونوں ڈول لے کر دروازے پر پہنچا۔ کسی شخص کے دونوں ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے دو ڈول ہوں اور وہ انہیں لے کر اندر جارہا ہو تو دیکھنے والا یہی سمجھ سکتا ہے کہ اسی خدمت پر مامور ہوگا۔ سوال وجواب کی کیا ضرورت ہے۔ دربان نے دروازہ کھول دیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ اب میں اس راستے پر تھا جو سلیٹ کے پتھروں کی چوڑی چوڑی سلوں سے پٹا ہوا تھا اور اس میں دائیں اور بائیں راہباؤں یعنی تارک الدنیا عورتوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ میں بے پس وپیش بڑھتا چلا گیا کیونکہ میں نے پہلے ہی باغیچے میں سوچ لیا تھا کہ گرجا کی طرف چلنا ہے۔

کچھ اسپینی سپاہی راستے پر کھڑے ہوئے تمباکو پی رہے

تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے مجھے مخاطب کرنا چاہا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی مجھ سے دعا کے طالب ہوں گے، میں نے وہی دعائیہ کلمے جو مجھے یاد تھے۔ پڑھے اور ان پر دم کر دیا۔ وہ مطمئن سے ہوگئے۔ اس مقام سے گرجا قریب تھا۔ میں نے غور کیا اور سمجھ گیا کہ پہلی کوٹھری کے بعد دوسری کوٹھری میں بارود ہے، دروازے کے آگے زمین کچھ دور تک کالی ہو رہی تھی اور دروازے میں بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

دو سنتری ایک دوسرے کے مقابل بندوقیں لیے کھڑے تھے، ان میں سے ایک کی پیٹی میں کنجی اڑسی ہوئی تھی، میں نے سوچا اگر یہ دوسرا سنتری نہ ہوتا تو زیادہ دیر نہ لگتی اور کنجی میرے ہاتھ میں ہوتی۔ مگر دو آدمیوں کی موجودگی میں کنجی لینا ہونا مشکل تھا۔ بارود کی کوٹھری سے دوسری کوٹھری گرجا سے متصل تھی۔ یہ ضرور سسٹر اینجلس یعنی چھوٹی ماں کی ہوتی ہوگی۔ اس کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دل مضبوط کر کے پانی کے ڈول راستے میں رکھ دیے اور اجازت کے بغیر کمرے میں داخل ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم نصب درجن بیباک قسم کے راہبیں اندر دکھائی دیں گے مگر امید کے خلاف میری آنکھوں نے کچھ اور ہی دیکھا۔ وہ کمرا قطعی طور پر ان تارک الدنیا عورتوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جنہوں نے چند وجوہ کی بنا پر اپنا مسکن چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہاں میں نے تین عورتیں ایک طرف بیٹھی ہوئی دیکھیں۔ ان میں ایک پکے چہرے کی معمر عورت تھی جو غالباً بڑی ماں ہوگی، اس کے علاوہ دو جوان اور خوبصورت عورتیں تھیں۔ میں داخل ہوا تو وہ سب کھڑی ہوگئیں، ان کے چہروں پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔ میرا دماغ حاضر تھا۔ میں معاملے کی اصلیت تاڑ گیا۔ چونکہ خانقاہ پر حملہ ہونے والا تھا۔ اس لیے اصولاً انہیں دوسری جگہ منتقل کر دینا ضروری تھا، کچھ عجب نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی منتظر بیٹھی ہوں، اس لیے میرا ان کے پاس آنا توقع کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک عہد کے تحت ان دیواروں کے سائے میں رہتی چلی آرہی تھیں اس لیے وہ اپنے مذہبی پیشوا کے حکم کے بغیر کوٹھریاں نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں عمل شروع کیا۔ دروازے پر نظر گئی تو دیکھا کہ کنجی تالے میں پھنسی ہے۔ میں نے ان راہب عورتوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ذرا تامل کیا تو میں نے تحکمانہ انداز سے اپنا پیر زور سے زمین پر مارا اور انہیں فوراً باہر نکل جانے کا اشارہ کیا اور اشاروں ہی سے بتایا کہ وہ یہاں کی نسبت گرجا میں زیادہ محفوظ رہیں گی۔ غرض وہ میرے پیچھے ہولیں اور میں نے انہیں گرجا میں قربان گاہ تک پہنچا دیا۔ یہ جگہ بارود سے کافی فاصلے پر تھی۔ جب یہ تینوں تارک الدنیا عورتیں گرجا کی قربان گاہ تک پہنچ گئیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ ایک بڑا خطرہ راستے سے دور ہوگیا تھا۔

میں اکثر نازک موقعوں پر پیش آنے والے خطرات پہلے سے تاڑ جاتا ہوں۔ میں نے آخری نظر بڑی ماں کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی بڑی بڑی کالی چمک دار آنکھیں میرے داہنے ہاتھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے تعجب کا اظہار ہو رہا تھا اور چہرے سے شک کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں، پہلی یہ کہ میرا داہنا ہاتھ اس سنتری کے خون سے سرخ ہو رہا تھا جسے میں نے درخت پر چاقو مار کر ہلاک کیا تھا۔ خیر یہ بات تو نبھ سکتی تھی کیونکہ چاقو وغیرہ مارنا سارا گوسا میں اس وقت عام تھا اور وہاں کے پادریوں کی بہادری بھی مشہور تھی مگر میں اپنی بیچ کی انگلی میں ایک سونے کی انگشتری پہنے ہوئے تھا۔ یہ ایک جرمن نواب زادی کا تحفہ تھا جس کا نام میں یہاں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ انگوٹھی اس وقت قربان گاہ کے لیمپ کی روشنی میں تیزی سے چمک رہی تھی۔ ایک درویش کے ہاتھ میں انگوٹھی کا ہونا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ درویش لوگ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرنے کی قسم کھا چکے ہوتے ہیں۔ میں یکدم پیچھے پلٹا اور تیزی سے گرجا کے دروازے کی طرف چلا مگر فتنہ بیدار ہو چکا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑی ماں پیچھے لپکی چلی آرہی تھی۔ میں دوڑ کر گرجا کے دروازے سے باہر نکل گیا اور خانقاہ کی غلام گردش پر ہولیا۔ مگر وہ چیخ کر کھڑے ہوئے سنتریوں کو مخاطب کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''اسے پکڑو۔'' خوش قسمتی سے اس وقت میرا دماغ حاضر تھا۔ میں نے بھی دوڑتے ہوئے سامنے کی طرف اشارہ کر کے چلانا شروع کر دیا۔ گویا ہم دونوں ایک ہی مقصد کے لیے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ میں دوسرے ہی لمحے میں کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا اور اندر سے بھاری دروازہ بند کر کے اوپر کی چٹخنی لگا دی اور بھاری موسل کواڑوں کے بیچ میں اڑا دیا۔

اگر وہ ذہین ہوتے تو مجھے تباہ کرنے کے لیے بارود کی نلی دروازے کے پیچھے رکھ کر دروازہ اُڑا سکتے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ ترکیب انہیں سوجھی ہی نہیں۔ یہ آخری موقع تھا کیونکہ میں اب اپنی اس ''خطرناک مہم'' کی انتہائی اور آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس قدر مصائب اور آلام کے بعد اب میں سارا گوسا کے بارود کے فلیتے کی تلاش میں کبھی ادھر تھا کبھی اُدھر

تھا۔ دشمن بھیڑیوں کی طرح غرا غرا کر دروازے پر بندوقوں سے ٹھوکے مار رہے تھے مگر میں ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں ہوبرٹ کے کہنے کے مطابق بارود کا فلیتہ چاروں کونوں میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فلیتہ ضرور بارود کے سامنے کی دیوار کے کسی سوراخ میں ہوگا۔ میں نے گھٹنوں کے بَل رینگ رینگ کر ہاتھوں سے ٹٹولا، ناخنوں سے دیوار کی درزیں کریدیں مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اچانک دو گولیاں دروازے کے پار ہو کر دیوار پر آکر لگیں۔ اب دھڑ دھڑ اور چھڑ چھڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کی ڈھیری سی نظر آئی۔ میں خوشی سے اس کی طرف بڑھا لیکن وہ محض راکھ کا ڈھیر نکلا۔ میں لاچار پیچھے ہٹ کر ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں گولی لگنے کا امکان نہیں تھا۔ دشمن دروازے پر امنڈ امنڈ کر آرہے تھے اور انہوں نے بے حد شور مچا رکھا تھا۔ میں حتی الامکان دماغی توازن صحیح رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ان کے شور وشر کی طرف میرا دھیان نہ جائے اور میں فلیتے کی تلاش میں ہمہ تن متوجہ اور مصروف رہوں۔ میں نے یکسو ہو کر پھر ایک بار غور کیا کہ ہوبرٹ نے ضرور فلیتہ کسی ایسی جگہ چھپایا ہوگا کہ وہ ان گوشہ نشین عورتوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس جگہ چھپاتا؟ یہ سوچتے ہی میری نظر ایک مجسمے پر پڑی جو ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس کے قدموں پر پھولوں کے ہار پڑے تھے، درمیان میں ایک چراغ روشن تھا۔ بڑی عجلت سے میں نے پھولوں کی پتیاں سمیٹ کر ایک طرف کیں، غور سے دیکھا تو ایک باریک سیاہ ڈوری نظر آئی جو دیوار کے ایک سوراخ میں جا کر غائب ہوگئی تھی۔ میں نے اس کا سرا ابھار کر چراغ کی لو سے ملا دیا اور خود زمین سے چمٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بجلی گرنے کی سی کڑک اور بھاری گرج کی صدا بلند ہوئی اور دیواریں لہرا گئیں۔ چھت چڑ چڑا اٹھی۔ خوف زدہ اسپینیوں کی چیخ پکار اور بھاگنے کی آوازیں آئیں اور طوفانی لشکر کے سپاہیوں کے نعرے ابھرے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کوئی دل خوش کرنے والا خواب دیکھ رہا ہوں، اس کے بعد مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

جب ہوش آیا تو دیکھا کہ دو فرانسیسی سپاہی مجھے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا سر دیگچی کی طرح سن سن پک رہا تھا۔ میں پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر قدم ڈگمگائے جا رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، کمرے میں دیواروں اور چھت کے پلاسٹر کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ فرنیچر منتشر پڑا تھا۔ دیواروں کی اینٹوں میں لمبی لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں مگر کوئی بڑا شگاف نہ تھا۔ دراصل خانقاہ کی دیواریں اس قدر مستحکم اور مضبوط بنی ہوئی تھیں کہ بارود کا دھماکا انہیں تباہ نہیں کر سکا تھا البتہ اس حادثے نے کھڑکیاں کھول دی تھیں جس کے ذریعے ہمارا طوفانی لشکر چڑھا چلا آیا۔

مدافعین میں ایسا خوف وہراس پھیلا کہ انہوں نے مقابلہ کیے بغیر دروازے کھول دیے۔ میں دوڑ کر کمرے سے باہر غلام گردش کی طرف آیا۔ تمام راستہ میرے ہم وطن فرانسیسی سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں مارشل لینیز سے ملا جو اپنے اسٹاف کے ساتھ داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے روک لیا اور نہایت شوق سے میرا قصہ سنا۔

”شاباش...... شاباش...... کپتان جیرارڈ!“ اس نے کہا ”تم نے عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی اطلاع ملک معظم شہنشاہ نپولین کو دی جائے گی۔“

”جناب عالی!“ میں نے کہا ”یہ سب کچھ بے چارے ہوبرٹ کا کیا دھرا ہے۔ میں نے تو صرف اس کی تجویز پایہ تکمیل تک پہنچا دی جس کے لیے اس نے اپنی جان تک دے دی اور دوسرے جناب عالی! اگر آپ مجھے کہنے کی اجازت دیں تو کہوں، خوش قسمتی سے اس اہم کام کے لیے جیرارڈ جیسا مناسب آدمی بھی آپ کے ہاتھ لگ گیا۔“

”بلاشبہ تمہاری اور ہوبرٹ کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔“ مارشل لینیز نے کہا ”کپتان جیرارڈ، اس وقت ساڑھے چار بجے ہیں، تمام رات کی مشقت نے تمہیں بھوکا مار دیا ہوگا۔ میں اور میرا اسٹاف شہر میں جا کر ناشتا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے معزز مہمان ہوگے۔“

”دوستو! اس کے بعد تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ مجھ پر طعنہ زنی کرنے، پھبتیاں کسنے اور طنزیہ قہقہے لگانے والے اور مجھے شیخی خور سمجھنے والوں نے مجھے بارہ تلواروں کی سر جھکا کے سلامی دی تھی۔ تب میں نے نہایت جذبات میں ایک پُراثر تقریر کی۔

”میرے رفیقو! ایک کمزور آدمی خطرے کے مقابلے میں خود کو فولاد بنا سکتا ہے مگر کسی شخص کے ضمیر یا جذبات بدل ڈالنا اور اس پر قابو پالینا بڑا مشکل کام ہے۔ میرے رفیقو......!“

اس کے بعد جانے کیوں میری آواز گھٹ گئی۔

میرے بارہ کے بارہ رفیقوں نے میرے سامنے اپنے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔





زندگی جیت گئی

امیمہ سلیم

وہ ایک تجرباتی اڑان پرنکلے تھے۔ انہیں لیبیا کے صحرائی علاقے پرسے گزرنا تھا کہ جہاز حادثے کاشکار ہوگیا۔ وہ دونوں بھوکے پیاسے جلتی ریت میں بھٹکتے رہے۔ سسکتی ہوئی موت قدم بہ قدم ہمرکاب تھی۔ ان پر جوگزری یہ اہلِ دنیا کے لیے سبق ہے۔ اللّٰہ کس کس طرح اپنے بندوں کو محفوظ رکھتاہے ، صحرا میں بھی غذا کا اہتمام کردیتا ہے ۔ بے شک اللّٰہ ہی بہتر رزق دینے والا اور محافظ ہے۔

ایک پائلٹ اور اس کے ساتھی پر گزرنے والی افتاد کا ذکر

یہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک جیٹ فائٹر میں کچھ ترمیم واضافہ کیا تھا۔ فرانسیسی ایرونائیکل انجینئروں کا دعویٰ تھا کہ یہ جیٹ فائٹر فرانس کے ہوائی بیڑے میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ اس کی رفتار دوسرے فرانسیسی لڑاکا طیاروں کی نسبت دوگنی تھی۔ انجینئرز نے اس کے انجن کے ساتھ ساتھ اس کے آٹو میٹک سسٹم میں بھی بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔

اب جہاز آزمائشی پرواز کے لیے تیار تھا۔ جہاز کے

معائنے کے لیے ایئر بیس کے تقریباً تمام ہی ہواباز وہاں موجود تھے۔ ان میں انتہائی ماہر پائلٹ بھی تھے۔

''سر! اس آزمائشی پرواز کا پائلٹ کون ہوگا سر؟'' اس نے ایئر کموڈور سے پوچھا۔ وہ خاص طور پر طیارے کے تکنیکی نظام کا جائزہ لینے آیا تھا۔

''آپ بہتر سمجھتے ہیں؟'' ایئر کموڈور نے کہا۔ ''ویسے میرا خیال ہے کہ اس آزمائشی پرواز پر اینٹوئن کو جانا چاہیے۔'' ایئر کموڈور نے میری طرف توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ وہاں فرانسیسی ایئر فورس کے بہترین پائلٹ موجود تھے۔ مجھے بھی ہوابازی کا تجربہ تھا، مہارت بھی تھی لیکن وہاں مجھ سے کہیں زیادہ سینئر اور ماہر ہواباز موجود تھے۔ میرا سینہ فخر سے کچھ پھول گیا۔ دوسرے آفیسر مجھے رشک آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ مجھے ایئر کموڈور نے منتخب کیا تھا۔

''اینٹوئن!'' کمانڈر نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ جو انجینئر جائے گا اس کا انتخاب تم خود کرو۔'' اگرچہ یہ کوئی جنگی مہم نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کمانڈر اصول وضوابط کی پابندی کررہا تھا۔

ایئروناٹیکل انجینئر پریواٹ نہ صرف ماہر انجینئر تھا بلکہ وہ میرا بہترین دوست بھی تھا۔ میں نے فوراً پریواٹ کا نام لے دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن علی الصباح ہمیں اس مختصر آزمائشی پرواز پر روانہ ہونا تھا۔ ہمیں فرانس کے ایئر بیس سے پرواز کر کے انڈوچائنا تک جانا تھا۔ انڈوچائنا اس وقت فرانسیسی نوآبادی تھا۔ جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں لیبیا کے وسیع وعریض صحرا کو عبور کرنا تھا۔ یہ بھی معمول کی بات تھی۔ اس سے قبل میں پروازوں میں نہ جانے کتنے دریا، سمندر، پہاڑ اور صحرا عبور کر چکا تھا۔

میں نے ایئر فورس میں ملازمت تو بعد میں کی تھی لیکن بہت نوعمری سے ہوابازی کررہا تھا۔ میں نے تو اپنے طور پر ایک طیارہ خود بھی بنایا تھا۔ اس لیے یہ آزمائشی پرواز بھی میرے لیے معمول کی ایک پرواز تھی۔

ایئر بیس کے crew نے طیارے کو ہر طرح سے چیک کرنے کے بعد پرواز کے لیے گرین سگنل دے دیا۔

پریواٹ نے اپنے طور پر پہلے ہی جہاز کے انجن وغیرہ کا جائزہ لے لیا تھا۔

میں اپنی چمکتی ہوئی کلف دار یونیفارم میں باہر نکلا اور طیارے کے کاک پٹ میں سوار ہوگیا۔ پریواٹ پہلے سے ہی طیارے میں موجود تھا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور طیارے کو بہت مہارت سے اوپر اٹھالیا۔

''آج موسم بہت خوش گوار ہے اینٹوئن۔'' پریواٹ نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن پرواز کے دوران تم بیئر کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔'' میں نے اسے سختی سے تاکید کی۔

میں جانتا تھا کہ جب وہ موسم خوش گوار ہونے کی بات کرتا تھا تو ضرور بیئر کی بوتل کھول لیتا تھا۔

''یار تمہاری یہ ہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' پریواٹ نے منہ بنا کر کہا۔ ''ہم کون سا کسی جنگی مہم پر جارہے ہیں؟''

''ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے پریواٹ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم تو اس سے پہلے بھی میرے ساتھ بہت سی پروازوں میں شریک رہ چکے ہو۔''

''ہاں یار، رہ چکا ہوں۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''لیکن ہر مرتبہ بھول جاتا ہوں کہ تم کسی بھی قیمت پر ڈرنک کی اجازت نہیں دو گے۔ او کے، میں طیارے کے لینڈ کرنے کے بعد ساری کسر پوری کرلوں گا۔''

''طیارے کی رفتار واقعی بہت زبردست ہے۔ ہم نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ فاصلہ طے کرلیا ہے۔ واقعی یہ فرانسیسی ایئروناٹیکل انجینئروں کا زبردست کارنامہ ہے۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''میں طیارے کو انتہائی بلندی پر لے جاکر ایک دم نیچے کی طرف لاؤں گا۔ ممکن ہے فضا میں جہاز دو تین قلابازیاں بھی لگائے اس لیے اپنی سیٹ بیلٹ مضبوطی سے باندھ لو۔''

''میں نے سیٹ بیلٹ کھولی ہی کب ہے؟'' پریواٹ نے کہا۔

میں نے اچانک طیارے کا رخ اوپر کی جانب کیا اور اسے انتہائی بلندی تک لے گیا۔

''یار یہ کرتب دکھانے کا موقع نہیں ہے۔'' پریواٹ نے کہا۔ ''ہمیں ایک ڈائریکشن میں چلنا ہے۔ تمہارے کرتبوں سے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی دوسرے جنگی طیارے یا مسافر بردار طیارے سے ٹکراجائیں۔ کنٹرول ٹاور کو کیا معلوم

کہ ان کا ماہر ہوا باز آزمائشی پرواز کے موقع پر کرتب دکھا رہا ہے۔''

''ارے یار، یہ بھی تو اس آزمائشی پرواز کا حصہ ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے اچانک طیارے کو فضا میں دو قلابازیاں کھلائیں اور پھر تیزی سے نیچے کی طرف آنے لگا۔

اچانک جہاز کے پینل پر لگی ہوئی ایک لائٹ بلنک کرنے لگی۔ اس میٹر میں سرخ نقطہ بار بار روشن ہو رہا تھا۔

''اب طیارے کی رفتار ہموار رکھنا۔'' پریواٹ نے کہا۔ ''میں اپنی سیٹ بیلٹ کھول کر پینل کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ سرخ نقطہ آخر کیوں بار بار جل بجھ رہا ہے۔''

میں نے طیارے کی اڑان نہ صرف ہموار کر دی بلکہ اس کی رفتار بھی کم کر دی۔ مجھے خود بھی تشویش ہو رہی تھی کہ یہ ریڈ لائٹ کیوں بلنک کر رہی ہے؟

طیارے کا ڈیش بورڈ دوسرے طیاروں کے مقابلے میں خاصا مختلف تھا۔ طیارے نے اچانک ہلکا سا ایک جھٹکا کھایا۔

پریواٹ چیخ کر بولا۔ ''اینٹوئن! طیارے کا ایندھن دیکھو۔'' حالانکہ وہ خود بھی پورے پینل کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ایندھن ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔'' میں نے پینل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اسی وقت طیارے نے دوسرا جھٹکا کھایا اور اس کی رفتار میں نمایاں کمی آ گئی۔

پریواٹ کے ساتھ ساتھ اس صورتِ حال سے میں بھی پریشان ہو گیا۔

''اینٹوئن!'' پریواٹ چیخ کر بولا۔ ''طیارے کے ایک انجن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔'' وہ تیزی سے طیارے کے ڈیش بورڈ پر جھکا مختلف آلات پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ ''میں نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کرنا چاہا لیکن طیارے کا ریڈیو سسٹم کام نہیں کر رہا۔''

''کوشش کرو اینٹوئن!'' پریواٹ نے کہا۔ ''ہمارا رابطہ کسی دوسرے ایئر بیس یا مسافر بردار کنٹرول ٹاور سے ہو جائے۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں لیکن ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔'' شور کی وجہ سے ہمیں چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فون بھی کام نہیں کر رہے تھے۔

''بٹن دبا کر طیارے کے باہر آ جاؤ۔'' پریواٹ نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم اب کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

میں نے طیارے کے پینل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب تو یہ بھی ممکن نہیں ہے پریواٹ۔ ہم لوگ بہت نیچے آ چکے ہیں۔ نیچے لیبیا کا وسیع و عریض صحرا ہے۔ میں اس صحرا میں کریش لینڈنگ کی کوشش کرتا ہوں۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے اینٹوئن!'' پریواٹ نے کہا۔ ''اس صحرا میں تم لینڈنگ کرو گے؟''

''دوسری صورت میں طیارہ زیادہ قوت کے ساتھ زمین سے ٹکرائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''گرتے ہی طیارے میں آگ لگ جائے گی پھر ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' میں نے طیارے کے پینل سے الجھتے ہوئے کہا۔

زمین بہت تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔ بس اب دو منٹ کی دیر تھی۔ طیارے کے وہیل میں نے پہلے ہی کھول دیے تھے۔ اچانک ایک زوردار دھچکا لگا۔ اگر ہم لوگوں کے جسم سیٹ بیلٹس سے بندھے ہوئے نہ ہوتے تو ہم میں سے کسی کی گردن یا ریڑھ کی ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی لیکن حیرت انگیز طور پر ہم دونوں ہی محفوظ تھے۔ طیارہ البتہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

ہم دونوں نے بہت عجلت میں اپنی سیٹ بیلٹ سے نجات حاصل کی پھر کود کر طیارے سے باہر آ گئے۔ طیارہ جس مقام پر گرا تھا یا میں نے جہاں کریش لینڈنگ کی احمقانہ کوشش کی تھی۔ وہاں ریت میں خاصا گہرا گڑھا پڑ گیا تھا۔ طیارے کے ٹکڑے چاروں طرف دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ یہ ایک آزمائشی پرواز تھی۔ اگر ہم لوگ کسی جنگی مشن پر ہوتے تو ہمارا جینا محال تھا۔ طیارے میں موجود ایمونیشن ہی سب سے پہلے پھٹتا۔ اس کے ساتھ ہمارے بھی پرخچے اڑ جاتے اور طیارے کے بھی۔

طیارے سے باہر آ کر ہم دونوں کچھ دیر تک ریت پر لیٹے رہے۔ صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی ریت میں حدت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر بعد سورج آگ برسائے گا اور صحرا کی ریت ہمیں جھلسا کر رکھ دے گی۔ میں اس سے پہلے ہی کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پریواٹ ابھی تک ریت پر پڑا تھا اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس کی ناک سے خون بہہ رہا

ہے۔
میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ''تم ٹھیک تو ہو پریواٹ؟''
''ہاں، کسی صحرا میں طیارہ تباہ ہونے کے بعد میں جتنا ٹھیک ہوسکتا ہوں، ٹھیک ہوں۔''
''تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا چوٹ زیادہ آئی ہے؟''
''اس وقت تو مجھے احساس نہیں ہورہا ہے''۔ پریواٹ نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
میں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہ جھٹکا لگنے سے ہیلمٹ سمیت طیارے کی چھت سے ٹکرا گیا تھا۔ دھچکا اتنا شدید تھا کہ چھت سے ٹکرانے کے بعد اس کی ناک کسی اور چیز سے ٹکرائی ہوگی۔ میں نے اس کی ناک کا جائزہ لیا۔ معمولی سا زخم تھا۔ میں نے رومال نکال کر اس کی ناک اور چہرے پر بہتا ہوا خون صاف کردیا۔
ہم کسی دور دراز کی پرواز یا مشن پر ہوتے تو ہمارے پاس لنچ کٹ بھی ہوتا۔ پرواز سے پہلے ایک بار کٹ میں کچھ سینڈوچز، کافی کا تھرماس وغیرہ رکھ دیا گیا تھا۔ پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں اور بیئر کے دو تین ٹن اور ایک بوتل پریواٹ اپنے طور پر لے کر آیا تھا لیکن اب وہ چیزیں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ طیارے میں ایک فرسٹ ایڈ باکس بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس کی تلاش تھی۔
طبیعت بحال ہونے کے بعد پریواٹ اٹھا اور بے چینی سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں تو فرسٹ ایڈ باکس کی تلاش میں تھا لیکن وہاں نہ فرسٹ ایڈ باکس تھا نہ کھانے پینے کی کوئی چیز۔ میں نے پریواٹ سے پوچھا۔ ''تم کیا تلاش کررہے ہو؟''
''میں دیکھ رہا ہوں کہ کھانے پینے کی کوئی چیز محفوظ ہے؟'' پریواٹ نے جواب دیا۔
''ہماری پرواز بہت طویل نہیں تھی اس لیے صرف کچھ سینڈوچز اور کافی کا تھرماس تھا۔ پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں۔ بیئر کی بوتلوں کا علم تمہیں ہوگا لیکن اب یہاں سوائے طیارے کے بچے ہوئے ڈھانچے اور ریت کے کچھ بھی نہیں ہے۔''
''اب......اب کیا ہوگا اینٹوئن؟'' پریواٹ نے پوچھا۔
''اسی سوال کا جواب تو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''تم پائلٹ کے طور پر ان صحراؤں سے کسی حد تک واقف ہو۔ تم نے اس صحرا کے اوپر سے بے شمار پروازیں کی ہوں گی۔ نقشے دیکھے ہوں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا کہ اس وقت ہم کسی آبادی سے کتنا دور ہیں؟'' پریواٹ نے روہانسے لہجے میں پوچھا۔
''نقشے دیکھنا اور صحراؤں کے اوپر سے پرواز کرنا علیحدہ بات ہے اور کسی صحرا میں راستہ تلاش کرنا بالکل ہی مختلف ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے پاس تو قطب نما تک نہیں ہے۔ ابھی جب سورج نکلے گا تو اتنی شدید گرمی ہوگی کہ سانس لینا بھی دشوار ہوجائے گا۔ مجھے خود تو اس کا تجربہ نہیں ہے لیکن میں نے ایسے کئی افراد کی داستان سنی ہے جو صحرا میں راستہ بھٹک گئے تھے۔ بہرحال، آؤ کوشش کرتے ہیں۔ شاید ہم کسی آبادی تک پہنچ ہی جائیں۔''
ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سورج طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ یہ تو غنیمت تھا کہ کلائیوں میں بندھی گھڑیاں محفوظ تھیں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ہمیں دس بجے تک اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ مجھے ایک اُمید تھی کہ جب ہم مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچیں گے تو وہ لوگ تشویش میں مبتلا ہوں گے اور ہماری تلاش میں کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر ضرور بھیجیں گے۔
ہم نے چلنا شروع ہی کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر مجھے ریت میں پانی کی دو بوتلیں دبی دکھائی دیں۔ ان کا صرف کچھ حصہ نظر آرہا تھا ورنہ ہم انہیں دیکھے بغیر گزر جاتے۔
پریواٹ نے بھی شاید وہ بوتلیں دیکھ لی تھیں۔ وہ تیر کی طرح جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی ریت ہٹانے لگا۔
اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ دونوں بوتلیں نہ صرف محفوظ تھیں بلکہ ریت ہٹانے کے بعد اسے بیئر کی ایک بوتل بھی مل گئی۔
یہ ایک نیک شگون تھا۔ گویا قدرت ہم پر مہربان تھی۔ پریواٹ نے ایک بوتل کا ڈھکنا کھولا اور اسے منہ سے لگانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ''یہ چار لیٹر پانی ہمیں بہت کفایت شعاری سے خرچ کرنا ہوگا۔ ہمیں اس صحرا میں راستہ ڈھونڈتے نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔''
بات پریواٹ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے پانی کا

صرف ایک گھونٹ پیا اور بوتل کا ڈھکنا بند کردیا اور بولا۔ ''اینتونی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر ہم کفایت شعاری سے کام لیں تو یہ پانی کئی گھنٹے تک استعمال کرسکتے ہیں۔''

ہم نے سب سے پہلے اپنے پیراشوٹ سے نجات حاصل کی تھی لیکن انہیں ضائع نہیں کیا تھا بلکہ ریت میں دبادیا تھا اور نشانی کے طور پر جہاز کا لمبا سا ایک ٹکڑا ان پر گاڑ کر اس ٹکڑے پر اپنا ہیلمٹ رکھ دیا تھا۔ اب اگر فضا سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ صحرا میں کوئی شخص ہیلمٹ پہنے کھڑا ہے۔

میری پشت پر جو تھیلا تھا میں نے اس میں سے اضافی سامان نکال کر پھینک دیا۔ صرف ایک طاقت ور دوربین اور بڑا سا ایک شکاری چاقو اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے پانی کی ایک بوتل بھی اسی تھیلے میں ٹھونس دی اور سورج کے رخ پر اندازے سے چلنا شروع کردیا۔

تاحد نگاہ ریت ہی ریت تھی...... سرمئی ریت۔ اس وسیع وعریض صحرا کو دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ دور دور تک انسانی زندگی تو در کنار کسی جانور کے آثار بھی نہیں تھے۔

جب ہمیں چلتے چلتے ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا تو ہماری حالت تباہ ہوگئی۔ سورج گویا آگ برسا رہا تھا۔ ریت اتنی گرم تھی کہ اس میں چلتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم آگ پر چل رہے ہوں۔

پریواٹ کے مقابلے میں میری صحت بھی اچھی تھی اور مجھ میں قوت برداشت بھی زیادہ تھی۔

اس سے قبل بھی مجھے ایک بار ہنگامی طور پر طیارے سے چھلانگ لگانا پڑی تھی۔ طیارہ زمین سے قریب تھا اس لیے میرا پیراشوٹ نہ کھل سکا اور میں درختوں کے جھنڈ میں جا پھنسا۔ اس وقت اگر میری زندگی نہ ہوتی تو شاید کسی درخت کی ابھری ہوئی شاخ میرے جسم کے آر پار ہوجاتی۔ اس کے باوجود درختوں کے جھنڈ میں گرنے سے میرے جسم پر نہ صرف شدید خراشیں آئی تھیں بلکہ میری کمر اور گھٹنوں میں بھی شدید چوٹ لگی تھی۔ صرف میرا سر اور چہرہ ہیلمٹ کی وجہ سے محفوظ رہ گیا تھا۔

وہاں بھی اس وقت دور دور تک آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں پیراشوٹ سمیت درخت میں پھنسا ہوا تھا۔

میں نے کوشش کرکے اپنی پشت پر بندھے ہوئے تھیلے سے چاقو نکالا تھا لیکن اس کوشش میں میری کراہیں نکل گئیں تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ نہ صرف میری کمر بلکہ کندھوں اور کہنیوں میں بھی شدید چوٹ آئی تھی۔

میں نے کچھ دیر دم لیا اور پھر ایک ایک کرکے پیراشوٹ کی ڈوریاں کاٹ دیں۔ اس ذرا سی مشقت ہی سے میں بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں درخت سے کیسے اترا وہ ایک انتہائی اذیت ناک تجربہ تھا پھر مجھے مزید ایک گھنٹے تک اس گھنے جنگل میں بھٹکنا پڑا تھا۔ ہر لمحے یہ ہی خوف تھا کہ کسی جھاڑی کی اوٹ سے کوئی جانور نکل کر مجھ پر حملہ نہ کردے۔ اسی دوران میں مجھے امدادی ٹیم نے ڈھونڈ نکالا تھا اور میں مزید اذیت سے بچ گیا تھا لیکن مجھے تین ماہ تک اسپتال میں گزارنا پڑے تھے۔

موجودہ تجربہ اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ اس میں تو امدادی ٹیم کی ہم تک پہنچنے کی امید بھی برائے نام ہی تھی اس وسیع وعریض صحرا میں وہ ہمیں کیسے تلاش کرسکتے تھے۔

اب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ہمارے کپڑے پسینے سے یوں شرابور ہورہے تھے جیسے ہم نے ابھی ابھی کسی سوئمنگ پول میں غوطہ لگایا ہو۔

پریواٹ کا رنگ جھلس کر جلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگیا تھا۔ یقیناً یہ ہی حال میرا بھی ہوگا۔ ہمارے بال ریت میں اٹے ہوئے اور ریت کے ذرات ہوا سے اڑ کر ہمارے بھیگے لباس اور جسموں پر چپک گئے تھے۔ اس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے جسموں میں بے شمار سوئیاں پیوست ہوگئی ہوں۔

انتہائی کفایت شعاری سے پانی استعمال کرنے کے باوجود ہم ایک چوتھائی بوتل خالی کرچکے تھے۔

پریواٹ چلتے چلتے لڑکھڑایا اور اوندھے منہ ریت پر گر پڑا۔ وہ مجھ سے چند قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ریت میں پیر دھنساتا ہوا بہ مشکل اس تک پہنچا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ریت پر اوندھا گرنے کی وجہ سے اس کی سانسوں سے بھی ریت اڑ رہی تھی۔

میں نے اسے ہلایا جلایا اور آواز دی۔ ''پریواٹ! اٹھو، کیا تم اسی ریت میں دفن ہونا چاہتے ہو؟''

میں نے کئی دفعہ اسے پکارا، اس کے چہرے پر تھپڑ مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو پھر وہ پُرامید لہجے میں بولا۔ ''کیا امدادی ٹیم آگئی؟ پہلے تو میں خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیوں گا پھر......''

''ہوش میں آؤ پریواٹ۔'' میں نے اس کی بات

جامعہ

اصطلاح میں جامعہ کا اطلاق اعلیٰ مذہبی تعلیم کے قدیم اداروں مثلاً جامعہ الازہر وغیرہ پر ہوتا۔ موجودہ دور میں سرکاری طور پر اس لفظ کا اطلاق جدید طرز کی ایسی یونیورسٹی تک محدود ہے جسے مغربی نمونے پر چلایا جا رہا ہو۔
جامعہ کی اصطلاح پہلی بار انیسویں صدی کے وسط میں استعمال کی گئی۔ یونیورسٹی کے معنوں میں جامعہ کا لفظ پہلی بار 1906ء میں استعمال ہوا جب جامعہ المصریتہ کے قیام کے لیے مصر کے چند دانشوروں اور مصلحین نے ایک تحریک کی ابتدا کی۔ اسی زمانے سے اسلامی ملکوں میں جامعہ یونیورسٹی کا ہم معنی قرار پایا۔ بعض اسلامی ممالک میں جامعہ کے علاوہ چند اور اصطلاحات بھی استعمال کی جانے لگیں اور یہ اصطلاحات یا تو قومی زبانوں سے ماخوذ تھیں یا پھر یورپ سے مستعار لی گئی تھیں۔ مثلاً ترکی میں (UNIVERSITE) پاکستان میں "یونیورسٹی" بھارت و بنگلہ دیش میں" وِشوودالیہ" ایران میں" دانش گاہ" اور انڈونیشیا میں (UNIVERSITAS) ذیل میں ہم صرف چند بڑی اور مشہور یونیورسٹیوں کا ذکر کریں گے۔
برِعظیم پاک و ہند میں سر چارلس ووڈ کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے 1857ء میں کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور تقریباً پچیس سال تک پورے ہندوستان میں انہیں یونیورسٹیوں سے کام چلایا جاتا رہا۔ 1882ء میں لاہور میں

کاٹ دی۔ " کوئی امدادی ٹیم نہیں آئی ہے۔ تم چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ اس وقت سورج شدید آگ برسا رہا ہے اور اس سے بچنے کے لیے ہمیں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنا ہوگی۔"

"پناہ گاہ۔" پریواٹ نے مایوسی سے کہا۔ "اس لق و دق صحرا میں ریت کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟"

"تم اٹھو تو سہی۔" میں نے کہا۔ "میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں فوری طور پر ہم اس قیامت خیز تپش سے بچ سکیں۔" مجھے اپنے الفاظ خود ہی کھوکھلے سے لگے تھے۔

میں نے بہ مشکل پریواٹ کو اٹھایا اور ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ریت کا خاصا اونچا ٹیلا تھا اور ایسے رخ پر تھا جہاں اس کا سایہ بھی موجود تھا۔

ہم لوگ گرتے پڑتے وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے سے اتنا ضرور ہوا کہ سورج کی جھلسا دینے والی کرنیں اب براہ راست ہمارے جسموں پر نہیں پڑ رہی تھیں۔ کھلے آسمان کے مقابلے میں یہ جگہ بہرحال نسبتاً بہتر تھی لیکن ریت کی تپش کا وہی عالم تھا۔

ٹیلے کے سائے میں بیٹھ کر ہم نے پانی کی بوتل نکالی جو اب تقریباً ختم ہونے کے قریب تھی۔ گویا انتہائی کفایت شعاری اور احتیاط کے باوجود ہم نے چند گھنٹوں میں ڈیڑھ لیٹر پانی پی لیا تھا۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔ ابھی پانی کی ایک بوتل موجود تھی لیکن وہ بھی کب تک ساتھ دے سکتی تھی۔

اس کے علاوہ بھوک کا عذاب الگ تھا۔ میں نے روانگی سے قبل بہت ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ دو سلائس اور ایک مگ کافی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ لنچ سے پہلے ہی ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

پریواٹ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صحرا میں تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی ریت کو دیکھ رہا تھا پھر چیخ کر بولا۔ "اینٹوئن! مجھے کچھ فاصلے پر ایک دریا دکھائی دے رہا ہے۔ چلو وہاں پانی تو ملے گا ہی۔ کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا۔"

میں نے اس سمت دیکھا مجھے بھی ایسا لگا جیسے وہاں کوئی دریا موجود ہو۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگا کر دور دور تک جائزہ لیا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہاں کوئی دریا نہیں بلکہ نظر کا دھوکا ہے۔ صحرا میں اس قسم کے سراب عموماً نظر آتے ہیں۔

"چلو ناں اینٹوئن کیا سوچ رہے ہو؟" پریواٹ نے بے تابی سے کہا۔ صحرا کا وہ سراب دیکھ کر اسے یقین آ گیا تھا کہ وہاں کوئی دریا موجود ہے۔

"وہاں کوئی دریا نہیں ہے پریواٹ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ سب نظروں کا دھوکا ہے۔ اسے سراب کہتے ہیں۔ تم نے شاید اس سے پہلے کوئی صحرا نہیں دیکھا؟ میں نے بہت سے صحرا دیکھے ہیں لیکن صرف تفریحی طور پر۔"

"ہم کبھی کسی انسانی آبادی تک پہنچ بھی سکیں

پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی۔ 1887ء میں الہ آباد میں ایک اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے پہلی جنگ عظیم تک کوئی اور یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن دو مختلف ادوار میں یعنی 1915ء سے 1921ء کے درمیان اور دوسرے تقسیم پاک و ہند کے بعد یونیورسٹی اداروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔

برصغیر میں دو یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ ان میں ایک تو علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ سر سید احمد خان نے 1875ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جسے 1920ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ جس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کو جدید سائنسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔ دوسری یونیورسٹی حیدر آباد دکن کی "جامعہ عثمانیہ" 1918ء میں قائم ہوئی اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی طرف خاص توجہ دی گئی تھی۔

پاکستان میں سب سے قدیم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی ہے جو 1882ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ پشاور یونیورسٹی 1950ء اور کراچی یونیورسٹی 1951ء میں قائم ہوئیں۔ لاہور میں ایک انجینئرنگ یونیورسٹی اور فیصل آباد میں زرعی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ حال ہی میں چند اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں ملتان یونیورسٹی، اسکردو یونیورسٹی، اسلام آباد میں قائداعظم یونیورسٹی، گومل یونیورسٹی، ہزارہ یونیورسٹی، کوئٹہ یونیورسٹی شامل ہیں۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو بھی اب باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

مرسلہ: زاہد حسین زاہد، کامل پور سٹی

گے؟" پریوات نے کہا۔

"اگر ہم ہمت سے کام لیں تو پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اینٹونیٔ! میں تو ایک ایئروناٹیکل انجینئر ہوں۔ تم تو پائلٹ ہو۔ تمہارے ذہن میں تو ان راستوں کے نقشے بھی ہوں گے اور رستہ تلاش کرنے کے طریقے بھی آتے ہوں گے۔"

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ راستہ دیکھنے کے لیے قطب نما جیسے پرانے آلے سمیت اب بہت سے جدید آلات ہوتے ہیں جن سے راستہ سیکنڈوں میں معلوم ہوجاتا ہے اور میں پائلٹ تھا مجھے ایئر روٹ کا علم تھا۔ کوئی ٹرک ڈرائیور نہیں تھا کہ زمینی راستوں سے بھی واقف ہوتا لیکن یہ بات کہہ کر میں اس کا حوصلہ نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریوات بہترین ایئروناٹیکل انجینئر تھا۔ طیارے کے جہاز میں کیسی بھی خرابی کیوں نہ ہو وہ اسے ٹھیک کر لیتا لیکن یہاں تو سرے سے انجن تھا ہی نہیں، طیارے کا ملبہ۔

سورج کی تمازت کچھ کم ہو چلی تھی۔ میں نے ریت کی ڈھیری سی بنا کر تکیہ بنایا اور اس پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔ ریت اس وقت بھی گرم تھی لیکن اتنی گرم نہیں تھی کہ ناقابلِ برداشت ہوتی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ میں بھی اتنا تھکا ہوا تھا کہ بھوک اور نقاہت کے باوجود مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ سورج کی جھلسا دینے والی تپش اور چہرے اور جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی ریت سے کھلی۔ میں بوکھلا کر اٹھا تو مجھ سے اٹھا نہ گیا۔ میرا آدھے سے زیادہ جسم ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ ٹیلا غائب تھا جس کے سائے میں ہم بیٹھے تھے۔ صحرا کی تیز ہواؤں نے اس ٹیلے کو گرا دیا تھا۔

میں نے پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے ریت اپنے جسم سے ہٹائی اور اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور زبان بالکل اینٹھ کر رہ گئی تھی۔ بھوک کے باعث شدید نقاہت طاری تھی۔

اچانک مجھے پریوات کا خیال آیا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا، کہیں میری طرح وہ بھی صحرا کی اس اڑتی ہوئی ریت میں دفن تو نہیں ہوگیا۔ میں نے دیوانہ وار اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پریوات بیٹھا تھا لیکن وہاں اب چمکیلی اور دہکتی ہوئی ریت کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے نقاہت کے باوجود دیوانہ وار اس جگہ سے ریت ہٹانا شروع کردی جہاں پریوات کی موجودگی کا امکان تھا۔ میں جنون کے عالم میں ریت کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہی چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پریوات کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس وقت میں اپنی آواز خود بھی بہ مشکل سن سکتا تھا۔

اچانک میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔ میرے

ہاتھ کسی کھوپڑی سے ٹکرائے تھے۔ میں لرز کر رہ گیا کہ پریواٹ کیا ریت میں زندہ دفن ہوگیا۔

میں.... نے بہ غور اس کھوپڑی کا جائزہ لیا تو مجھے اپنی حماقت پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

وہ کوئی کھوپڑی نہیں بلکہ بڑا سا ایک تربوز تھا جس کی اوپری سطح مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ مارے خوشی کے میں نقاہت کے باوجود بے ساختہ اچھلنے لگا پھر میں نے ریت دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی ہٹا کر وہ تربوز نکال لیا۔ وہ خاصا بڑا تربوز تھا۔ بیل آگے بھی تھی مگر پتا نہیں کتنی دور تک بیل پھیلی ہوئی تھی میں نے سنا تو تھا کہ صحرا میں تربوز خود بخود اگ آتے ہیں لیکن اس کا عملی تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔

وہ تربوز خاصا وزنی تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے گڑھے سے نکالا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ پانی کی دوسری بوتل تو میرے پاس ہی تھی۔ تھیلا میری پشت پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے بوتل نکال کر دو گھونٹ پانی کے پیے تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے تن مردہ میں نئی جان آ گئی ہو۔

میں نے پھر پوری قوت سے پریواٹ کو پکارا۔ ’’پریواٹ...... پریواٹ......‘‘ اس مرتبہ میری آواز بہت بلند اور جان دار تھی۔ نہ جانے یہ اس دو گھونٹ پانی کا کمال تھا یا تربوز ملنے کی خوشی تھی۔ میں چاہتا تو پورا تربوز اکیلے ہی ہضم کر سکتا تھا لیکن ابھی مجھ پر وہ وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے جنگ عظیم اوّل کے بہت سے واقعات یاد آئے جب کچھ فوجی فرار ہو کر صحرا میں بھٹک گئے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے اور ایک دوسرے کے مرنے کی تمنا کرتے تاکہ اس کے حصے کا راشن بھی دوسروں میں تقسیم ہو۔

میں نے پریواٹ کو پھر زور سے چیخ کر آواز دی۔

’’پریواٹ!‘‘

’’یار کیوں گلا پھاڑ رہے ہو۔ میں یہاں ہوں۔‘‘ پریواٹ کی نحیف آواز میرے عقب سے آئی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے عجیب الخلقت ایک شخص نظر آیا۔ اس کے سر کے بالوں اور کپڑوں میں بے تحاشا ریت تھی۔ جسم کی جلد جھلس کر جلے ہوئے تانبے کی طرح سیاہ ہو چکی تھی اور وہ اپنی عمر سے دگنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریواٹ تھا اور ویران ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

’’کہاں گئے ہوئے تھے تم؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’سورج کی تپش سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اونٹوں کا ایک کارواں دکھائی دیا۔ وہ مقامی بدو تھے اور عربی زبان میں کوئی نغمہ گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے چیخ کر انہیں آواز دی۔ ان میں سے ایک نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں دیوانہ وار گرتا پڑتا انہیں آوازیں دیتا ان کی طرف دوڑا لیکن وہ قافلہ فوراً ہی ریت کے اس صحرا میں اوجھل ہو گیا۔‘‘

’’تم نے کوئی قافلہ نہیں دیکھا پریواٹ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ سب سراب تھا۔ وہ اگر سچ مچ کے انسان ہوتے تو ہماری مدد کو نہ آتے۔ چھوڑو اس بات کو۔ میں نے آج کے کھانے کا بندوبست تو کر ہی لیا ہے۔‘‘

’’تم نے بندوبست کر لیا ہے؟‘‘ پریواٹ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔ اس نے کہا۔ ’’اینٹوئن! لگتا ہے میری طرح تم بھی سراب کا شکار ہونے لگے ہو۔ کھانے میں ہرن کا بھنا ہوا گوشت، پنیر اور بکری کے دودھ کے ساتھ رس بھری کھجوریں بھی ہوں گی؟‘‘ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

’’ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’مجھے ایک تربوز ملا ہے۔ یہ آج کے دن ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ ہمارے پاس کوئی برتن بھی نہیں ہے۔ اسے کاٹنے میں اس کا کچھ پانی ضائع ہو جائے گا۔‘‘

پریواٹ نے تربوز دیکھا تو اسے بھی یقین آ گیا کہ یہ کوئی سراب نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ’’میں نے پیراشوٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت ہمارے کام آئے گا۔‘‘ اس نے اپنے تھیلے سے پیراشوٹ کا وہ ٹکڑا نکالا جو بلاشبہ خاصا بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اسے بچھا کر ہم دونوں اس پر لیٹ بھی سکتے تھے۔

پیراشوٹ کا وہ ٹکڑا بچھانے کے بعد میں نے اپنے بیگ سے چاقو نکالا اور تربوز دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا کچھ پانی پیراشوٹ پر گرا لیکن ہم نے اسے مزید پیراشوٹ پر نہیں گرنے دیا اور بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ اپنے اپنے حصے کے تربوز کا پانی پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں زندگی کی نئی لہر دوڑ رہی ہو۔ یہی حال پریواٹ کا بھی تھا پھر ہم چاقو سے اس کا گودا نکال کر کھانے لگے۔

میں نے فوراً ہی پریواٹ کو روک دیا۔ ’’سارا تربوز ایک ہی وقت میں ختم مت کرو۔ ہمیں راستہ تلاش کرنے میں مزید نہ جانے کتنی دیر لگے۔‘‘ ہم نے اپنے اپنے حصے کا بچا

بوز اسی پیراشوٹ کے ٹکڑے میں باندھ لیا اور ہم نے ایک نئے عزم سے سفر کا آغاز کیا۔

''اس مرتبہ ہم مخالف سمت میں راستہ تلاش کریں گے۔''میں نے کہا۔'' لگتا ہے، ہم نے شروع میں ہی غلطی کی ہے ورنہ اب تک کسی آبادی تک پہنچ چکے ہوتے۔''

ہم نے اس وقت تک صحرا میں تقریباً چھتیس میل کا سفر طے کیا تھا۔ ہم گرتے پڑتے پھر اسی جگہ آ گئے جہاں ہمارے جہاز کا ملبہ تھا۔

''یار اینٹوئن! مجھے امدادی ٹیم کی بے حسی پر حیرت بھی ہے اور غصہ بھی۔ آخر وہ لوگ ہماری تلاش میں کیوں نہیں آئے؟''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہماری تلاش میں نہیں آئے۔ یہ صحرا میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ممکن ہے امدادی ٹیمیں ہماری تلاش میں کہیں اور بھٹک کر واپس چلی گئی ہوں۔''

جہاز کے ملبے تک پہنچتے پہنچتے ہماری زبانیں اور حلق پھر خشک ہو گئے تھے۔ میں نے ایک ایک گھونٹ پینے کے لیے اپنے تھیلے سے پانی کی بوتل نکالی وراسے منہ سے لگایا ہی تھا کہ بوتل میرے ہاتھ سے پھسل کر ریت پر ایسی جگہ گری جہاں جہاز کا ملبہ تھا۔ وہ نہ جانے جہاز کے کس ٹکڑے سے ٹکرائی کہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ہم دونوں کے حلق سے ایک ساتھ بھرپور چیخ نکلی۔ جیسے اس بوتل میں ہماری جان ہو۔ بوتل سے گرنے والا پانی لمحوں میں صحرا کی جھلستی ہوئی پیاسی ریت نے جذب کر لیا۔ اب ہمارے پاس تربوز کے صرف دو ٹکڑے تھے۔

ہم دونوں کچھ دیر صدمے کی حالت میں یوں بیٹھے رہے جیسے اپنے کسی عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ہوں پھر پریواٹ چیخ کر بولا۔''تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا اینٹوئن۔ تم کیا بچے ہو؟''

''میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔''میں نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔''وہ بوتل نہ جانے کیسے میرے ہاتھ سے پھسل گئی اور گری بھی تو تباہ شدہ جہاز کے کسی ٹکڑے پر۔ اگر ریت پر گرتی تو پانی تو ضائع نہ ہوتا۔''

''اگر یوں ہوتو یہ ہوتا مگر یہ نہیں ہوا تو کیا ہوا۔''پریواٹ نے کہا۔''یہ اگر مگر چھوڑو یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''پریواٹ!''میں نے کہا۔''یہ محض ایک حادثہ تھا۔ ہاں، اس وقت تو میں اسے حادثہ ہی کہوں گا۔ ہم اگر آپس میں لڑتے رہے تو کبھی کسی آبادی تک نہیں پہنچ سکیں گے اور اسی صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔''

بات شاید پریواٹ کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔''سوری یار! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں آپس میں الجھنا نہیں چاہیے۔''(اس دور میں پلاسٹک کی بوتلیں اور برتن استعمال نہیں ہوتے تھے۔)

اس مرتبہ ہم نے مخالف سمت میں سفر شروع کیا اور چند میل چل کر ہی ہانپنے لگے۔ مزید چند میل چلنے کے بعد مجھے زور کا چکر آیا اور میں اوندھے منہ ریت پر گر پڑا۔ پریواٹ فوراً میری طرف لپکا اور بولا۔''اینٹوئن! تم ٹھیک تو ہو؟ ابھی تک تم مجھے حوصلہ دے رہے تھے اب خود چکرا کر گر پڑے۔''اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔''خدا کی پناہ، تمہیں تو بہت شدید بخار ہے۔''

میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا جسم ہلکا پھلکا ہو کر پرندوں کی طرح فضا میں پرواز کر رہا ہو۔

''اینٹوئن! پلیز ہمت کرو ہم دونوں ریت کے اس صحرا میں دفن ہو جائیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ریت کی چمک

آنحضرت ﷺ نے ابوسعید بن المعلیٰؓ سے فرمایا: کیا نہ سکھلاؤں میں تجھ کو ایسی سورت جو قرآن میں (از روئے فضائل) سب سورتوں سے بڑی ہے۔ پھر فرمایا وہ سورۂ الحمد للہ رب العالمین ہے۔ وہ سات آیات ہیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن ہے بڑا کہ دیا گیا ہے مجھ کو۔ اس حدیث کے آخری کلمات میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ولقد اٰتینٰک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم (اے پیغمبر) دیں ہم نے تم کو سات آیتیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں نماز میں یا ثنا کی گئی ہے ان کی فصاحت و اعجاز کے متعلق۔ اور دیا ہم نے تم کو قرآنِ عظیم۔ اس سے مراد فاتحہ ہے چونکہ یہ قرآن کا جزوِ اعظم ہے۔ اس لیے اس کو قرآنِ عظیم سے تعبیر فرمایا۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا
مرسلہ: احسن فاروق، کوٹ ادو

سے میری بینائی زائل ہو رہی ہے۔“
میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور گرتا پڑتا پھر اپنے نامعلوم سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہم اس دن بھی صحرا میں میلوں بھٹکے لیکن کسی آبادی، کسی کارواں کا کوئی نشان نہ ملا۔ رات تک تھک ہار کر ہم پھر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ تربوز کے ٹکڑے بھی ہم نے دن بھر میں ختم کر دیے تھے بلکہ ان کے چھلکے تک کھا لیے تھے۔
ہم لوگوں کو پھر شدید پیاس لگ رہی تھی لیکن اب تو پینے کے لیے ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔
رات کو خنکی بہت ہو گئی تھی مجھے بخار بھی تھا اس لیے شدید سردی محسوس ہو رہی تھی۔ پریواٹ نے پیراشوٹ کا وہی ٹکڑا مجھے اوڑھنے کے لیے دے دیا۔ اس سے سردی میں کچھ کمی واقع ہوئی لیکن ریت بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی اس لیے مجھے شدید سردی لگ رہی تھی۔
وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ میں پریواٹ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری حالت بہت ابتر تھی۔ ساری قوت ارادی اور قوت مدافعت خاک میں مل گئی تھی۔
صبح طیارے کے پروں پر شبنم کے جمع ہونے والے قطروں کو ہم نے روئی میں جذب کیا اور اسے نچوڑ لیا۔ اس طرح گریس ملا ہوا اتنا پانی میسر آ گیا کہ ہمارے ہونٹ اور حلق تر ہو گئے۔
گریس والا بدذائقہ پانی پینے کے بعد پریواٹ نے کہا۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ ہمارے پاس ریوالور ہوتے پھر ہم یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتے۔“
میں پریواٹ کی جانب لپکا۔ اس کا ذہنی توازن آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا۔ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہمارے پاس ریوالور نہیں تھے۔
”دیکھو پریواٹ!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ ہماری قوت برداشت اور قوت ارادی کی آزمائش ہے۔ مجھے شروع ہی سے مقدر پر یقین ہے۔ اگر ہماری زندگی ہوئی تو ہم بچ جائیں گے لیکن آخری سانس تک ان حالات کا مقابلہ کریں گے۔“
پھر ابتر حالت کے باوجود ہم نے نئے سرے سے ہمت باندھی اور مخالف سمت میں پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیبیا کے اس عظیم صحرا کے بارے میں میرے پاس معلومات بہت تھیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بھٹکنے کی صورت میں راستہ کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ویسے تو لیبیا کے صحرا میں نمی کا تناسب تقریباً چالیس، پینتالیس فی صد ہے لیکن جس علاقے میں ہم اس وقت موجود تھے، وہاں صحرا میں نمی صرف اٹھارہ فی صد تھی یعنی اس صورتِ حال میں زندگی بخارات کی شکل میں اڑ جاتی ہے۔
مقامی افراد اور وہاں نو آبادکار اطالین افسروں کے لیے بتایا گیا تھا کہ صحرا کے اس علاقے میں انسان پانی پیے بغیر انیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔
اگر ہمیں وہ تربوز نہ ملتا تو اب تک ہم بھی صحرا کی اڑتی ہوئی گرم ریت میں دفن ہو چکے ہوتے۔ دوسری خوش گوار بات یہ تھی کہ صحرا میں شمال مشرق سے چلنے والی ہوا میں نمی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس وجہ سے اب تک ہم زندہ تھے۔ اب یہ ہماری قوت مدافعت پر منحصر تھا کہ یہ ہوا ہمیں مزید کتنی دیر تک زندہ رکھ سکتی تھی۔
صحرا میں تاحد نگاہ چمکیلی ریت بکھری ہوئی تھی۔ اس وسیع و عریض اور بے کراں صحرا کو دیکھ کر ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ سورج کی کرنیں چمکیلی ریت پر پڑتی تھیں تو وہ مزید چکا چوند پیدا کرتی تھیں۔ وہ منظر دیکھ دیکھ کر ہماری بینائی متاثر ہونے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں کچھ گھنٹے زندہ بھی رہ گیا تو اپنی بینائی ضرور کھو بیٹھوں گا۔
اگر یہ آزمائشی پرواز نہ ہوتی اور ہم کسی مشن پر ہوتے تو ہمارے پاس بہت ساز و سامان ہوتا۔ آنکھوں پر لگانے والے گہرے رنگ کے چشمے ہوتے، کھانے پینے کا سامان ہوتا۔ صحراؤں، جنگلوں اور ہوائی علاقوں میں چلنے والی چوڑے پہیوں اور چھوٹے انجنوں کی موٹر سائیکلیں ہوتیں۔ وہ موٹر سائیکل وزن میں بہت ہلکی ہوتی تھیں لیکن پائلٹ اگر کسی ناگہانی افتاد میں پڑ جائے تو ان کے ذریعے وہ میلوں کا سفر کر سکتا تھا۔ وہ چھوٹی اور ہلکی موٹر سائیکلیں امریکا کی ایک کمپنی نے بنائی تھیں اور پہلی جنگ عظیم میں انہیں بہت کامیابی سے استعمال کیا گیا تھا۔ زمین سے ان کی اونچائی بہ مشکل ڈیڑھ فٹ ہو گی۔ اس پر سفر کرنے والا یوں بیٹھتا تھا جیسے کسی بچے کی ٹرائی سائیکل پر بیٹھ گیا ہو لیکن سکڑ سمٹ کر بیٹھنا پیدل چلنے سے بہرحال بہتر تھا۔
ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے اب اپنے ڈپارٹمنٹ پر بھی غصہ آیا۔ آزمائشی پرواز تو آزمائشی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے دھوکا دے سکتی ہے۔ طیارہ کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے پھر ہمارے انجینئرز اور افسران نے یہ

...ں نہیں سوچی کہ اگر ہم کسی حادثے کا شکار ہو گئے تو اس صورت میں کیا کریں گے۔

یہ سب سوچنا اب بعد از وقت تھا۔ میں خود بھی پرواز پر روانہ ہونے سے پہلے اس نکتے پر غور کر سکتا تھا لیکن مجھے تو اپنی اور پریواٹ کی مہارت پر ناز تھا۔ ہم کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس آزمائشی پرواز پر روانہ ہو گئے تھے۔

اچانک میں بری طرح چونک اٹھا۔ مجھے ایک کارواں نظر آیا تھا اور مجھے دیکھ کر ایک شخص نے ہاتھ بھی ہلایا تھا۔ کارواں میں اونٹ بھی تھے اور گدھے بھی۔ گویا پورے صحرا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ''ٹھہرو ہم آرہے ہیں۔''

''تم کس سے بات کررہے ہو اینٹوئن؟'' پریواٹ کے جھلسے ہوئے چہرے پر حیرت تھی۔

''وہ......وہ......وہ دیکھ رہے ہو ایک کارواں جارہا ہے۔ اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہی ہیں؟''

''اب تم پاگل ہو رہے ہو۔'' پریواٹ نے کہا۔ ''یہاں دور دور تک اس جھلستی ہوئی بے رحم ریت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

دوسرے ہی لمحے مجھے بھی احساس ہوا کہ یہ سب میرے تصور کی کارفرمائی ہے۔ انسان کو سراب بھی وہی دکھاتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ ہم انسانوں کے درمیان پہنچ جائیں۔

ہم دونوں نہ جانے کس طرح شام تک جھلستے ہوئے اس صحرا میں چلتے رہے۔ چلتے کیا گھسٹتے رہے۔ مجھے یہ سوچ کر آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے بھوک اور شدید پیاس کے عالم میں میلوں کا وہ سفر کیسے طے کیا تھا۔

یہ سوچ کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی کہ اب ہم اپنے اصل ٹھکانے سے بھی بہت دور ہیں۔ شام کا جھٹ پٹا پھیل رہا تھا اور اب واپس جانا بھی بے فائدہ تھا پھر واپس جا کر ہم کر بھی کیا سکتے تھے صرف ایک امید کہ شاید ہماری تلاش میں کوئی امدادی ٹیم وہاں پہنچی ہو۔

پریواٹ بھی شاید میری طرح یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے اصل ٹھکانے سے بہت دور نہ جانے کتنے میل کے فاصلے پر ہم ہیں۔ ہم دونوں کی جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ذہنی حالت بھی لحظہ بہ لحظہ ابتر ہوتی جارہی تھی اور ہم دونوں ہی ذہنی طور پر سراب کا شکار ہو گئے تھے۔

کبھی پریواٹ وحشیوں کی طرح چیختا کہ مجھے ابھی صحرا میں کچھ بدو دکھائی دے رہے ہیں۔ ''وہ دیکھو وہ جارہے ہیں۔'' وہ دوڑنے کی کرتا تو میں اسے روک لیتا۔ کبھی مجھے کسی کارواں کے گزرنے کا احساس ہوتا تو پریواٹ مجھے تھام لیتا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی سراب کا شکار ہوتا تھا۔ دوسرے کا ذہن اس وقت فعال ہوتا تھا ورنہ دونوں اگر سراب کے پیچھے بھاگ نکلتے تو تھوڑی دیر میں ریت پر کہیں نہ اٹھنے کے لیے گر جاتے۔ سراب کے پیچھے جتنا دوڑو وہ اتنی ہی تیزی سے آگے دوڑتا ہے۔

دو گھنٹے مزید چلنے کے بعد بھی جب ہمیں آبادی کا کوئی نشان نہ ملا تو مجھ سے زیادہ پریواٹ وحشت زدہ ہو گیا اور وہ بلند آواز میں دعائیں پڑھنے لگا جو اسے یاد تھیں۔

میں نے پہلی دفعہ اسے جھڑک دیا اور کہا۔ ''پریواٹ! تمہارے اس شور شرابے سے میرا ذہن مزید ماؤف ہو جائے گا۔ مجھے سوچنے دو، سورج کس طرف غروب ہوا ہے۔ ہم اگر تھوڑی ہمت کرلیں تو کسی آبادی تک پہنچ جائیں گے۔'' میرا لہجہ اور الفاظ دونوں کھوکھلے تھے۔

ہم دونوں ایک گھنٹا مزید گھسٹ گھسٹ کر چلتے رہے پھر اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور میں ایک مرتبہ پھر ریت پر اوندھے منہ گر پڑا۔

میں نقاہت اور مدہوشی کی کیفیت سے باہر آیا تو مجھے پریواٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دو مقامی بدوؤں سے بات چیت کررہا تھا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گویا ہم نے موت کو شکست دے دی تھی۔ لیبیا کے اس بے کراں صحرا کو شکست دے دی تھی جو نہ جانے اب تک کتنے زندہ انسانوں کو نگل چکا تھا۔

میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں چیخ کر پریواٹ کو آواز دی۔ ''اے پریواٹ!''

دونوں بدو مجھے گھورنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں پہلی دفعہ میری موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

پریواٹ لپک کر میری طرف آیا۔ نقاہت کے باوجود میں کھڑا ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ پریواٹ نے مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اینٹوئن؟''

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ لوگ آگئے؟ کیا

ہم کسی انسانی آبادی یا کاررواں تک پہنچ گئے؟"
"کون لوگ؟" پریواٹ نے سرد اور نحیف لہجے میں پوچھا۔ "یہ دونوں مقامی بدو جن سے تم ابھی باتیں کر رہے تھے؟"
"کون سے بدو؟" پریواٹ نے الجھ کر کہا۔ "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں خود بھی غنودگی میں تھا۔ تمہارے چیخنے سے جاگا ہوں۔"
میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ریت پر ڈھے گیا۔ "تو کیا میں پھر کسی سراب کا شکار ہو گیا تھا؟"
"ہاں میرے دوست۔" پریواٹ نے کہا۔ "خود کو سنبھالو۔ اگر تم نے بھی ہمت ہار دی تو پھر مجھے کون سنبھالے گا۔ میں تو تمہارے سہارے آگے بڑھ رہا ہوں۔" پریواٹ کی آواز میں خوف کی لرزش تھی۔
میں نے اپنے سر کو دو تین دفعہ جھٹکا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ تمام اندیشے اور خطرات بھی ذہن سے جھٹک دیے ہوں جو ہمیں لاحق تھے۔
میں شدید مایوسی کی حالت میں ریت پر ڈھے گیا لیکن پریواٹ پر اپنی مایوسی ظاہر نہیں ہونے دی۔
گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران میں ہمارے پاس صرف اتنا پانی بچا تھا جس سے صرف ایک چمچا بھرا جا سکتا تھا۔
ہم نے پیراشوٹ کو پھیلا دیا کہ اس پر جمع ہونے والی شبنم کو استعمال کر سکیں۔
میں پریواٹ کا اور اس سے زیادہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "پریواٹ! تمہیں بھوری آنکھوں اور بھورے بالوں والی وہ لڑکی یاد ہے جو ہمیں پیرس میں ملی تھی؟"
"سلویا!" پریواٹ نے کہا۔
"ہاں، سلویا۔" میں نے کہا۔ "اس سے ہماری کتنی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔"
"ہاں یار، ہم جب اس کے فلیٹ پر جاتے تھے تو وہ ہماری تواضع بیئر یا وہسکی سے کرتی تھی۔ اکثر وہ ہمارے ساتھ ڈنر پر بھی جاتی تھی۔ وہاں ہم لوگ خوب ہلا گلا کرتے تھے۔ کھاتے پیتے تھے۔ پیرس کے ہوٹلوں میں اچھی شرابوں کے ساتھ صاف شفاف اور ٹھنڈا پانی بھی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ پانی...... پانی کتنی بڑی نعمت ہے...... پانی!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور سائے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اینٹوئن! مجھے کچھ فاصلے پر ایسی آواز آ رہی ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ سنو...... تم بھی سنو۔" وہ اپنی باتیں کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر سراب کا شکار ہونے لگا تھا۔
"یار وہ سے سلویا......"
"لعنت بھیجو سلویا پر۔" پریواٹ جھنجلا کر بولا۔ "اٹھو یہاں نزدیک ہی کوئی دریا بہہ رہا ہے۔"
"پاگل مت بنو پریواٹ۔" میں نے کہا۔ "کسی صحرا میں دریا کا بھلا کیا کام۔ تم ایک مرتبہ پھر سراب کا شکار ہو رہے ہو۔"
"لعنت ہے یار، بھوک اور پیاس کی شدت میں سراب کے اس عذاب سے لڑنا بھی ایک آزمائش ہے۔ میری ماں کہتی تھی کہ زندگی میں انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"
"تمہاری ماں کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔" میں نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا۔
"ہاں، وہ رنگ برنگے پھولوں کی دیوانی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے لان کو سنوارتی تھیں۔ کیاریاں بناتی تھیں، ان میں روزانہ پانی ڈالتی تھیں...... پانی...... تو پودوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ اینٹوئن! ہم تو انسان ہیں۔" وہ گھوم پھر کر دوبارہ پانی کے موضوع پر آ گیا۔
اس مرتبہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا کیونکہ مجھ پر ایک مرتبہ پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے نہ جانے رات کے کس پہر نیند آ گئی۔
صبح جب میری آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ڈنڈوں سے مجھے بہت بری طرح مارا ہو۔ میں بہ وقت تمام ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ پریواٹ بھی دھوپ کی شدت سے کسمسا رہا تھا پھر وہ بھی اٹھ گیا۔
ہم نے رات شبنم کے قطروں کے لیے جو پیراشوٹ پھیلایا تھا وہ اس وقت تقریباً شبنم سے گیلا ہو رہا تھا ہم نے پیراشوٹ نچوڑ کر پانی نکالا تو پریواٹ کے پاس پانی کی بچی ہوئی خالی بوتل آدھی بھر گئی۔
ہم دونوں نے پانی پیا اور یوں ہماری پیاس کی شدت کم ہوئی۔ پانی کا رنگ ایسا تھا جیسے پالک کو پانی میں جوش دے کر اس کا سوپ بنایا گیا ہو یعنی سبزی مائل زرد۔ جب میں نے پانی کا پہلا گھونٹ لیا تو مجھے اس کا ذائقہ ہی خاصا ناگوار لگا۔ اس میں عجیب سی بو تھی لیکن میں سب کچھ بھلا کر

دو پیاں پی گیا۔ پیاس میں تو لوگ گندے پانی کے جوہڑوں کا کھڑا ہوا پانی تک پی لیتے ہیں۔ ایسا پانی جسے جانور بھی نہ پینا چاہیں۔

میں نے دیکھا، پانی پینے کے بعد پریواٹ عجیب سی بے چینی کا شکار ہوگیا۔ وہ اٹھ کر دیوانہ وار ٹہلنے لگا۔ خود میری بھی یہی کیفیت تھی۔ کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پریواٹ زمین پر بیٹھا اور اس نے قے کردی۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ بھوک کی حالت میں قے کرنا کتنا اذیت ناک ہے، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس اذیت سے گزرے ہوں۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی لیکن اس وقت خود میری طبیعت بھی مالش کر رہی تھی۔ جی متلا رہا تھا پھر چند منٹ بعد میں بھی ریت پر بیٹھا ہوا پریواٹ کی طرح قے کر رہا تھا۔ اس قے سے ہمارے جسموں کی رہی سہی توانائی بھی زائل ہوگئی اور مجھے اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کیا پیراشوٹ پر کوئی کلر تھا یا پانی میں کوئی اور کیمیکل شامل ہوگیا تھا۔

اب مزید چلنے کی سکت تو نہ تھی لیکن ہم نے بھی آخری سانس تک موت اور اس مہیب صحرا سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ہم نے اپنا رخ ایک مرتبہ پھر بدلا اور دوبارہ چلنا شروع کردیا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ انسانی زندگی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے یا پھر جینے کی آرزو کتنی شدید ہوتی ہے۔

ہم دونوں اب بغیر سوچے سمجھے اب مسلسل چلے جارہے تھے۔ ہم نہ جانے کتنے میل تک چلتے رہے پھر نڈھال ہوکر ایک طرف گر پڑے۔

''اینٹونئن! اب مجھ میں مزید چلنے کی سکت نہیں ہے۔ تم میں اگر ہمت ہے تو جاؤ۔ اگر تم کسی طرح بچ جاؤ تو میری گرل فرینڈ کو یہ بتادینا کہ میں نے آخری سانس تک اسے یاد کیا ہے۔''

پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔'' حالانکہ اس کی امید صرف ایک پرسنٹ ہے کہ تم بھی کبھی کسی انسانی آبادی تک پہنچ سکو گے۔''

''تم پھر بہک رہے ہو پریواٹ۔'' میں نے کہا۔''ہم اب انسانی آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بس تھوڑی سی ہمت اور کرلو۔''

پریواٹ اپنی ہمت مجتمع کر کے اٹھ بیٹھا اور نحیف لہجے میں بولا۔'' اگر تم یہ چاہتے ہو کہ لیٹے رہنے کے بجائے چلتے ہوئے میرا جسم بے جان ہوکر اسی ریت پر گر پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں اس آخری وقت میں بھی تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ حیرت انگیز طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو، کہاں چلنا ہے؟''

اس دن تو واقعی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میری زندگی کا آخری دن ہو۔ ذہن ماؤف ہوکر رہ گیا تھا اور سراب تھے کہ پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ہم بار بار سورج کے سائے کی مدد سے اپنی سمت درست کرتے، کچھ دیر گرم گرم ریت پر بیٹھ کر دم لیتے اور آگے روانہ ہوجاتے۔

چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر رات ہوگئی۔ ہمارے جسم تھکن سے نڈھال تھے۔ ہم ریت پر گر پڑے اور گہرے گہرے سانس لینے لگے لیکن اس میں بھی تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ ہر سانس پر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ریت

فاضل الدین قادری

سید ابوالفرح محمد، المعروف بہ قطب معظم، پنجاب میں سلسلہ قادریہ فاضلیہ کے بانی۔ گیلانی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں روحانیت کی شمع روشن کی اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کا بلخ و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں بھی کی۔ ان کے اجداد کئی پشت سے برصغیر کی اسلامی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے بٹالے میں انہوں نے علوم دینی کے لیے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا، جہاں سے بڑے بڑے عالم فارغ التحصیل ہوئے اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ انہوں نے 7 ذوالحج 1151ھ کو بٹالہ میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ ان کی ایک تصنیف ''بیان الاسرار'' پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

مرسلہ: نعمان قادری لاہور

میرے حلق میں جا رہی ہو۔

ہم نے اب کپڑوں اور بالوں میں اٹی ہوئی ریت صاف کرنا بھی چھوڑ دی تھی کیونکہ چند منٹ بعد پھر وہی ریت ہمارے بالوں اور کپڑوں پر جمع ہو جاتی تھی۔

اچانک پریواٹ پُرجوش انداز میں چیخا۔ ''اینٹوئن! ضروری نہیں کہ ہم ہر بار ہی سراب کا شکار ہوں۔ میں اس وقت پورے ہوش وحواس میں ہوں اور جھیل کے پانی کی بو اچھی طرح سونگھ سکتا ہوں۔'' وہ اچانک اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''میں اس جھیل کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں سے زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ کی مسافت پر ہوگی۔''

اس سے پہلے کہ میں پریواٹ کو اس اقدام سے باز رکھتا، وہ حیرت انگیز طور پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ''واپس آجاؤ پریواٹ، ورنہ تم اس ہیبت ناک صحرا میں گم ہو جاؤ گے۔''

''مرنا تو ضرور ہے۔'' پریواٹ کی آواز دور سے سنائی دی۔ ''تو پھر ایک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

میں چاہتا تو دوڑ کر اسے پکڑ سکتا تھا لیکن مجھ میں دوڑنا تو درکنار تیز چلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں جانتا کہ اب پریواٹ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ صحراؤں کے سراب بھٹکنے والوں کو مزید بھٹکا دیتے ہیں۔

موت تو میری بھی یقینی تھی پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ہم دونوں کی موت ایک ساتھ واقع ہوتی ہے یا علیحدہ علیحدہ! میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے اور ریت پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا۔ میں نے پریواٹ کے بارے میں سوچا، وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ مجھے اس کے انجام پر صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ صحرا میں بھٹک کر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جائے گا اور لیبیا کا یہ صحرا اسے نگل لے گا پھر یہ سوچ کر مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی کہ انجام تو بالآخر میرا بھی یہ ہی ہونا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے بہرحال صحرا میں راستہ تلاش کرنا تھا۔ پیاس کی شدت سے میرے ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اب بھی کچھ نگل سکتا ہوں۔ گویا میرا حلق اب تک سوکھا نہیں تھا۔

میں نے سوچا، مجھے ابھی اور کتنی دور جانا ہے لیکن مجھے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ منزل کا یقین ہو تو حوصلہ بھی ساتھ رہتا ہے۔ یہاں تو منزل کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔

میں دوبارہ چلنے کے لیے ہمت جمع کر رہا تھا کہ مجھے تقریباً پچاس سو گز کے فاصلے پر ایک لالٹین روشن نظر آئی۔ وہ پریواٹ تھا پھر اس کے پیچھے دوسری لالٹین پھر تیسری لالٹین۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ شاید پریواٹ نے کسی کھوجی ٹیم کو ڈھونڈ لیا تھا یا پھر اس کھوجی ٹیم نے پریواٹ کا سراغ پالیا تھا۔ میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پریواٹ!'' لیکن مجھے ایسا لگا جیسے مجھے خود اپنی آواز سنائی نہ دی ہو۔ میں نے جسم کی پوری قوت جمع کر کے آواز لگائی۔ ''پریواٹ!''

جواب میں پریواٹ کی آواز سنائی دی تو مجھے یقین آگیا کہ میری آنکھیں کوئی سراب نہیں دکھا رہی ہیں بلکہ پریواٹ واقعی کسی امدادی ٹیم کے ساتھ آرہا ہے۔ پریواٹ نزدیک پہنچا تو روشنیاں اس سے کچھ فاصلے پر رہ گئیں۔

''تم نے آخر اس امدادی ٹیم کو ڈھونڈ ہی نکالا۔'' میں نے لرزتی ہوئی نحیف آواز میں کہا۔

''کون سی امدادی ٹیم؟'' پریواٹ نے کہا۔

''وہ ٹیم جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرے ساتھ تو کوئی نہیں ہے۔'' پریواٹ نے کہا۔

''پھر...... پھر ...... یہ روشنیاں، یہ لالٹینیں کیسی ہیں؟''

''کون سی روشنیاں اینٹوئن؟'' پریواٹ مجھ سے بولا۔ روشنیاں اچانک ہی غائب ہوگئیں اور صحرائی ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا۔

میں بے دم سا ہو کر ریت پر گر گیا۔ ''ایک اور سراب۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا حلق خشک ہو رہا ہے اور اس میں کانٹے سے پڑ رہے ہیں۔ پریواٹ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ رک رک کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ ''اینٹوئن! مجھے تو اب سانس لینا بھی محال ہو رہا ہے۔ میں جھیل کی تلاش میں دور دور تک گیا لیکن آس پاس کوئی جھیل نہیں ملی تو میں لوٹ آیا۔ اب میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔

"میرے پاس کچھ ایتھر ہے اس سے حلق تر کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر پریواٹ نے اپنے تھیلے سے ایتھر کی شیشی نکالی۔ میں نے اس سے پہلے ہی وہ بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی اور اس کا ایک گھونٹ بھرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی تیز دھار بلیڈ نگل لیا ہو جو میرے حلق سے معدے تک کاٹتا ہوا جا رہا ہو۔

پریواٹ نے بوتل میرے ہاتھ سے لی اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے بھی ایتھر کا ایک گھونٹ بھر لیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میرے پیٹ میں کھولن سی ہو رہی تھی پھر آہستہ آہستہ میری تکلیف کچھ کم ہو گئی۔

جوں جوں رات بڑھتی جا رہی تھی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ مغربی سمت سے چلنے والی ہواؤں کا اثر تھا۔ جن ہواؤں کے سہارے ہم ابھی تک زندگی کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا وہی ہوائیں ہمیں سردی سے مار دیں گی۔

مزید ایک گھنٹے بعد سردی اتنی بڑھی کہ میرے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریت میں گڑھا سا بنایا اور اس میں بیٹھ کر خود کو اچھی طرح ریت میں ڈھانپ لیا۔ اب صرف میرا چہرہ باہر تھا۔ فوراً ہی سردی کی شدت کا احساس زائل ہو گیا اور مجھے کافی سکون ملا۔ میں نے پریواٹ کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی ایک گڑھا کھود کر اس میں بیٹھ جاؤ۔"

"مجھے جیتے جی اس ریت میں دفن ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" پریواٹ نے کہا۔

مجھے سکون ملا تو تھکن کی شدت سے مجھے نیند آ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو اس وقت تک سورج نہیں نکلا تھا اور صبح کا دھندلکا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

پریواٹ بھی ریت کی ایک ڈھیری سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ سو کیا رہا تھا بلکہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

ہم نے گزشتہ رات کی طرح پیرا شوٹ پھیلایا تھا لیکن وہ بالکل خشک تھا۔ اس رات شبنم نہیں گری تھی۔

میں نے پریواٹ کو آواز دے کر جگایا اور اس سے کہا۔ "اٹھو، ہمیں اس وقت روانہ ہو جانا چاہیے۔ سورج نکل آیا تو اس کی گرمی میں ہم زیادہ دور تک نہیں جا سکیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" پریواٹ نے کہا۔ "گرمی بڑھے گی تو ہم لوگ سفر کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور گرتے پڑتے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہمارے جسم اتنے لاغر اور کمزور ہو چکے تھے کہ ہم ساٹھ ستر گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بے دم ہو کر ریت پر گر جاتے تھے پھر کچھ دیر دم لے کر آگے بڑھتے تھے۔

چلتے چلتے اچانک مجھے کچھ فاصلے پر جھاڑیاں نظر آئیں لیکن میں انہیں سراب سمجھا۔ اس کے باوجود اس طرف بڑھتا رہا۔

اچانک پریواٹ چلّایا۔ "اینٹوئن! تمہیں وہ جھاڑیاں دکھائی دے رہی ہیں؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بھی وہ جھاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔" میں نے پریواٹ سے پوچھا اور نااُمیدی کے کئی قیامت خیز گھنٹوں کے بعد اُمید کی ایک کرن نظر آئی کہ یہ میری نظر کا سراب نہیں تھا۔

ہم دونوں گرتے پڑتے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ جھاڑیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں واقعی جھاڑیاں تھیں۔ یہ ہماری نظروں کا سراب ہوتا تو جھاڑیاں ہم سے دور ہو جاتیں۔

ہم کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ان جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔

"پریواٹ! یہ تو واقعی جھاڑیاں ہیں۔ جھاڑیاں اور پودے زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ ہم کسی آبادی کے قریب ہیں۔"

اچانک میرے کان میں مرغ کی آواز آئی۔ میں نے سر جھٹکا کہ اب میرے کان بھی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ مرغ کی آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ آواز بہت واضح تھی۔

"اینٹوئن! کیا تم کسی مرغ کی آواز سن رہے ہو؟"

"ہاں، کیا تم بھی وہ آواز سن رہے ہو؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

اچانک سامنے والے ٹیلے پر مجھے ایک بدو نظر آیا۔ وہ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ہوگا لیکن ہماری طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔ "او بھائی!" اس نے میری آواز نہیں سنی اور مسلسل چلتا رہا۔

ہم میں سے کسی میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ دوڑ کر اس بدو تک پہنچ پاتے۔ پریواٹ نے بھی اسے آواز دی اور پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ ہلائے لیکن بدو نے ہماری

طرف نہیں دیکھا اور ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

پھر اچانک اس ٹیلے پر ایک دوسرا بدو نمودار ہوا۔ وہ بھی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے اسے آوازیں .... دیں لیکن ہمارے حلق سے اتنی ہی آواز نکل رہی تھی کہ ہم خود ہی انہیں سن سکتے تھے۔ ہم دونوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ لہرائے۔ اس کے باوجود اس بدو نے ہمیں نہیں دیکھا پھر وہ پلٹ کر جانے لگا۔

مجھے یک دم مایوسی نے گھیر لیا کہ شاید یہ بھی کوئی سراب تھا۔ پریواٹ کے چہرے پر بھی مایوسی تھی۔ ہم دونوں ہارے ہوئے جواریوں کی طرح ریت پر دھپ سے بیٹھ گئے۔

اچانک وہ بدو پھر اس ٹیلے پر نمودار ہوا اور دیکھے بغیر سیدھا سیدھا چلنے لگا۔ ہم نے اسے پھر آواز دی، ہاتھ ہلایا لیکن اس نے ہم پر کوئی توجہ نہیں دی۔

ہم ایک دفعہ پھر مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئے کہ اچانک گویا معجزہ ہو گیا۔

بدو نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے ہاتھ ہلائے تو جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلائے اور تیزی سے ٹیلا اتر کے ہماری طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اب بھی یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ بھی کوئی سراب ہی ہے۔ پہلے کی طرح یہ بدو بھی اچانک غائب ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ ہمارے نزدیک پہنچا تو ہم دونوں بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں ہمارے شانے دبائے تو مجھے یقین آیا کہ یہ سراب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

میں اور پریواٹ دونوں عربی سے نابلد تھے۔ ہم نے بہ مشکل تمام اشاروں سے اسے سمجھایا کہ ہمارا جہاز صحرا میں گر کے تباہ ہو گیا ہے اور ہم دو دن اور دو راتوں سے اس صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔

بدو نے سہارا دے کر ہم دونوں کو ٹیلے پر چڑھنے میں مدد دی پھر اس کا دوسرا ساتھی بھی آ گیا۔ وہ بڑے سے ایک برتن میں پانی لے آیا۔ ہم اس برتن سے یوں پانی پینے لگے جیسے جانور پیتے ہیں۔

اس مہربان بدو نے ہمیں مزید پانی پینے سے روکا اور اشارے سے بتایا کہ ایک دم اتنا پانی پینا بھی مناسب نہیں ہے۔

پھر اس نے ہمیں ایک اونٹ پر بٹھایا اور وہاں سے نزدیک ایک اٹالین کیمپ میں لے گیا۔

کیمپ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ سب لوگ ہماری تلاش میں گئے ہوئے تھے۔ ہم نے صحرا میں تو اذیت برداشت کی ہی تھی تین گھنٹے تک اس بدو کے اونٹ پر ہچکولے بھی کھائے تھے۔

ہم دونوں نے غسل کیا اور کیمپ میں موجود گارڈ سے لے کر دوسرے کپڑے پہنے۔ میں نے بال سنوارنے کے لیے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ آئینے میں کوئی لاغر سا، جلے ہوئے تانبے جیسی چمڑی والا بانس کی طرح لمبا ایک شخص کھڑا تھا۔ کئی لمحے بعد مجھے یقین آیا کہ یہ میرا ہی عکس تھا۔ صحرا میں تین دن تک جھلسنے کے بعد میری جلد کی رنگت سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی۔ وہ جسم جس پر مجھے بہت ناز تھا وہ فاقوں اور مشقت سہتے سہتے ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اس وقت تو مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

یہ ہی حال پوائٹ کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنی شکل دیکھ کر ڈر گیا پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے۔

کیمپ آفیسرز واپس آئے تو انہوں نے سب سے پہلے ہمارے کھانے کا بندوبست کیا۔ ہمیں ہلکی پھلکی خوراک دی گئی۔ کیمپ میں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس نے مجھے اور پریواٹ کو کچھ دوائیں دیں تھوڑی دیر بعد ہم دونوں گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ کئی دن بعد ہمیں تحفظ کا احساس ہوا تھا تو نیند بھی بھرپور آئی۔

دوسرے دن ان لوگوں نے جیپ کے ذریعے ہمیں ایک قریبی ہوائی سفر پر بھیج دیا۔ وہاں سے ایک خصوصی طیارے نے ہمیں قاہرہ پہنچا دیا۔

قاہرہ پہنچ کر میں نے بچوں کی طرح جام، پھل، مکھن اور آملیٹ کھایا۔ مجھے ان چیزوں کا ذائقہ ویسا ہی لگا جیسے بچپن میں لگتا تھا۔

بعد میں ہم نے اس صحرا کو دیکھا جس میں ہم بھٹک رہے تھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے اس جھلستے ہوئے صحرا میں ایک سو بیس میل کا سفر طے کیا ہے۔

مجھے اب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تجربہ ہی بہت بھیانک تھا۔ ہم نے موت کو خود سے بہت قریب دیکھا تھا۔ اگر زندگی نہ ہوتی تو آج ہم دونوں کے ڈھانچے بھی اس صحرا کی ریت میں دفن ہوتے۔

O

میرا فرار

شکیل ادریس

جنگِ عظیم دوم کا ایک اہم واقعہ، فرار کی دلچسپ کتھا

قید کسے گوارا ہے؟ آزادی سب کو پسند ہے۔ برطانیہ کا وزیراعظم بننے سے پیشتر ونسٹنٹ چرچل ایک جنگی نامہ نگار بھی تھا۔ ایک بہت بڑے، عالمی پیمانے پر مشہور نیوزمیگزین کے لیے رپورٹنگ کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں اسے دشمنوں نے محاذِ جنگ سے قید کیا تھا۔ اس اذیت ناک قید سے وہ کس طرح فرار ہوا؟ انہی شب وروز اور تگ ودو کی رُوداد۔





... برطانیہ کا وزیراعظم بننے سے میں نے متعدد شعبوں
... کمال دکھایا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر
... تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ
... نے ایک مشہور اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام
... جنگ کے دوران میں گرفتار ہو گیا اور پرتگال لے
... گیا۔ پھر وہاں سے فرار ہو کر اپنے وطن کیسے پہنچا، یہ وہی
... ہے۔

... دسمبر کے مہینے میں بوئروں کے کیمپ میں تھا۔ میں
... رہائی کی درخواست دی، انہیں قائل کرنا چاہا لیکن میری...
... ان لوگوں پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ یوں کہنا چاہیے
... ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔ میں نے دلیل دی کہ
... نے جنگ میں بالکل حصہ نہیں لیا۔ یہاں تک کہ ایک گولی
... نہیں چلائی۔ جب گرفتار ہوا تو میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں
تھا۔ میں تو ایک اخباری نامہ نگار کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں گھوم رہا تھا۔

میری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ اس اخبار کے چند شمارے ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئے۔ بس پھر کیا تھا انہیں میری سرگرمیوں کا پتا چل گیا کہ میں آزادی کی تحریکوں میں بھی حصہ لیتا رہتا ہوں۔ میں نے ایک بار ایک ریلوے انجن میں بہت سے بم رکھ کر اسے دشمن کے کیمپ کی طرف روانہ کر دیا تھا جس سے ہولناک تباہی مچی تھی۔ اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے رہائی دینا ایسے ہی ہے کہ کسی سانپ کو کھلے بندوں پھرنے دیا جائے۔

تب میرے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ مجھے وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے جنگی ٹربیونل کے سامنے پیش کر کے سزا سنا دیں گے اور پھر عوامی عدالت میں

مقدمہ چلائے بغیر جیل میں بند کریں گے اور میں بے موت مر جاؤں گا۔

ہم لوگ ایک اسکول میں قید تھے جس کے ایک طرف بہت سے کمرے اور دوسری طرف خاردار تاروں کی دس فٹ اونچی باڑ تھی۔ اس کے قریب کوئی نہیں پھٹک سکتا تھا اس لیے کہ وہاں زبردست پہرا لگا رہتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں دھول کیسے جھونکی جائے یہ ایک مسئلہ تھا۔

قید خانے کی مشرقی دیوار کچھ ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے پھلانگ کر نکلا جا سکتا تھا۔ مگر وہاں مسلح سپاہی ٹہلتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب وہ سپاہی ٹہلتے ہوئے وہاں سے دیوار کے دوسرے کنارے تک پہنچ جائیں تو یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ اگر انہیں آہٹ مل گئی اور انہوں نے پلٹ کر دیکھ لیا تو خیر نہیں۔ میں اپنے ملک کے بجائے راہیِ عدم ہو جاؤں گا۔

اگر بالفرض محال میں وہاں سے نکل بھی جاتا تو اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ میں زندہ بچ جاؤں گا، اس لیے کہ وہ ایک اجنبی ملک تھا جہاں کے باشندے بھی اجنبی تھے۔ مجھے ان کی بولی سے ناواقفیت تھی اور یہاں سے پرتگال کی سرحد تین سو میل دور تھی۔ وہاں تک کوئی کیسے پہنچ سکتا تھا؟ ان سب باتوں کو سوچ سوچ کر ہول آتا تھا اور آزادی ایک سہانا خواب معلوم ہونے لگتی تھی۔

11 دسمبر کو میں نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے کا ایک مبہم سا خاکہ بنایا۔ ہم اسی ٹوٹی دیوار کو پھلانگ کر فرار ہونا چاہتے تھے، مگر نگرانی اتنی سخت تھی کہ ہمت نہیں پڑتی تھی۔ 12 دسمبر کی رات کو ہم اس دیوار کے قریب پہنچے، میرے ساتھیوں نے منہ نکال کر دیکھا اور پھر مایوسی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اب میری باری تھی۔ میں دیوار کے قریب گیا تو میں نے پہرے داروں کی رائفلیں اور ان کی چمکتی سنگینیں دیکھیں۔ ایک لمحے کے لیے کلیجا خشک ہو گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے سگریٹ منہ میں دبا رکھا تھا اور دوسرا ماچس جلا کر اسے شعلہ دکھا رہا تھا۔

اس وقت ورنہ پھر کبھی نہیں کے مصداق میں نے دیوار پر پاؤں رکھا اور دوسری طرف اترنے لگا۔ اسی لمحے میری قمیص ایک کیل میں پھنس گئی۔ مجھے پسینا آ گیا۔ میرا ایک ہاتھ دیوار کی نگر پر رکھا تھا اور دوسرے سے میں کیل نکالنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ کوشش یہ بھی تھی کہ آہٹ نہ ہونے پائے اور ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ وہ ناہنجار کیل کسی طرح سے قمیص سے نکل گئی اور میں نے اپنے پاؤں زمین پر ٹکا دیے۔ میں فوراً ہی بیٹھ گیا تاکہ ان پہرے داروں کو نظر نہ آ سکوں۔ چند گہرے گہرے سانس لینے کے بعد میں اسی صورت میں جھکے جھکے ان لوگوں کی مخالف سمت میں چلا گیا۔

وہ کسی ایسے موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے ٹہلنا موقوف کر رکھا تھا۔ میں فوراً ہی چار دیواری کی طرف نہیں گیا اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں بھی نوکیلی سنگینوں والے گارڈز پہرا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے چند پتھر اٹھا کر جیب میں ڈالے اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ تاریکی تھی مگر وہاں سے منظر واضح ہو گیا تھا۔ میں نے گنتی کی تو پتا چلا کہ چار دیواری کی حفاظت کے لیے چھ گارڈ متعین کیے گئے ہیں۔ اب ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ چار دیواری مجھ سے بہت نزدیک تھی۔ میں اس پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف جا سکتا تھا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑیں تو دیوار کے پار ایک ڈرم رکھا دکھائی دیا۔

میں نے وہ پتھر جو درخت کے نیچے سے اٹھائے تھے ان میں سے ایک سے اس ڈرم کا نشانہ لگایا۔ سناٹے میں بہت زور کی آواز آئی۔ سب گارڈز اس طرف متوجہ ہو گئے، لہٰذا میں نے دیوار پر پاؤں رکھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ سامنے ایک گلی تھی۔ میں اس کی طرف گیا۔ وہاں ایک کوڑے کا ڈرم رکھا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک آوارہ بلی اندر بیٹھی تھی۔ وہ اچھل کر باہر آ گئی تو میں اندر چلا گیا۔

وہ ایک لمحاتی مہلت تھی جو قدرت نے مجھے دی تھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد میں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی تھی، وہ گارڈز کوڑے کے ڈرم کے نزدیک سے گزرتے ہوئے گلی میں چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ دو چار فقرے میری سماعت سے ٹکرائے تو پتا چلا کہ سونے سے پہلے قیدیوں کی گنتی ہوئی تھی تو میں غائب تھا۔ یہ خبر باہر تک پہنچا دی گئی اور محتاط رہنے کی تاکید کی گئی۔

میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اگر میں نے اپنی ناک کو چٹکی سے نہ دبا رکھا ہوتا تو شاید میری آنتیں الٹ کر معدے میں آ جاتیں۔ مناسب وقت کا انتظار کرنے کے بعد میں نے سر ابھار کر دیکھا، میدان صاف تھا۔ وہ سب اسکول کی چار دیواری کے قریب چلے گئے تھے۔

ہم سب ہنگامی طور پر وہاں قید کر دیے گئے تھے، اس لیے وہاں قیدیوں کی کڑی نگرانی کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ بات جو میرے حق میں جاتی تھی فلڈ لائٹ تھی۔ غالباً فوری

لیے گارڈز کے پاس
پر اس کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے گارڈز کے پاس
میں تھیں جن کی محدود روشنی میں وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے
ے تھے۔ چار دیواری کے گرد زیادہ روشنی ہوتی تو میں کسی
ے کی موت مارا جاتا۔ اس کے علاوہ میرے جسم پر قیدیوں
یا اس نہیں تھا۔

گلی میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ کسی
وم ست سے گولی آئے گی اور مجھے چاٹ لے گی۔ لیکن
بھی نہ ہوا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تاہم اس وقت
اپنا سانس رکتا ہوا بھی معلوم ہوا جب میں اس گلی کے
م پر پہنچا۔ وہ گلی بند تھی۔ دیوار اتنی اونچی تھی کہ اسے عبور
کیا جا سکتا تھا۔ اس پر مستزاد ایک مسلح گارڈ تھا جو نزدیکی
ی کی آڑ سے نکلا تھا۔ اس نے اپنی رائفل کی نال میرے
ی طرف اٹھاتے ہوئے کچھ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ یقیناً
سکی دے رہا تھا۔ پھر قدرت نے میری مدد کی اور اچانک
م کا گھنٹا بجنے لگا۔ بہت سے دروازے کھل گئے اور گلی
ورتیں اور مرد نکل آئے۔ میں جلدی سے ایک عورت کے
چلا گیا۔ وہ سب چرچ کی طرف چلنے لگے۔
میں کسی خاص لباس میں نہیں تھا کہ وہ گارڈ مجھے نگاہ
کو لیتا اور نشانہ بنا ڈالتا۔ میں ان لوگوں میں شامل ہو گیا
وہ سب جس طرف جا رہے تھے میں بھی اسی طرف چل
جب وہ چرچ میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ
یا اس کے بعد میں نے دوسرے دروازے سے نکلنے میں
ں لگائی۔

اس آبادی کو چھوڑ کر میں مضافات کی طرف جا
وہاں ایک پل تھا۔ میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم
کہ میں ہمہ وقت دشمن کی زد میں ہوں اور وہ مجھے تلاش
نے کے لیے سب کو الرٹ کر دیں گے۔ ممکن ہے اب تک
چرچ کے گرد جمع ہو چکے ہوں۔ میرے وہاں نہ ملنے پر یقیناً
اطراف کے سارے راستے مسدود کر دیے گئے ہوں۔
میری جیب میں اس وقت ساٹھ پاؤنڈ اور چاکلیٹ
کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔
مجھے اتنا معلوم تھا کہ اب ڈیلا گووا پہنچنا ہے۔ میں کسی
ریل کے ذریعے ہی اس علاقے سے نکل سکتا تھا۔ آزادی تو
جانوروں کو بھی عزیز ہوتی ہے۔ میرے دل میں بھی ایک شعلہ
بھڑک رہا تھا۔ میں تذبذب میں تھا کہ کدھر کو جاؤں کہ
اچانک دائیں جانب سے تیز سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ ٹرین
کی سیٹی تھی۔ گویا مجھے اس طرف جانا تھا۔
میں اس طرف چل پڑا۔ صبح ہو چکی تھی اس لیے اکا دکا
آدمی چلتے پھرتے نظر آئے۔ میں سیٹی بجاتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر ایک اور ٹرین کھڑی تھی۔ میں اس وقت پلیٹ فارم پر نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ وہاں مجھے دو سپاہی نگرانی کرتے دکھائی دیے تھے۔ ایک اور الجھن آمیز بات یہ تھی کہ یہ ٹرین کہاں جاتی ہے جو اس وقت وہاں کھڑی ہے؟ پیٹرز برگ یا ڈیلا گووا؟

مجھے معلوم تھا کہ جب ٹرین پلیٹ فارم سے نکلتی ہے تو اس کی رفتار سست ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر میں اسٹیشن سے آگے چلا جاؤں تو مسلح سپاہیوں کی نظر میں آئے بغیر ٹرین میں داخل ہو سکتا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ کہاں جائے گی۔ اپنی اس ترکیب سے میں ٹرین میں سوار ہو گیا اور مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن ٹرین میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ پسنجر ٹرین نہیں بلکہ مال گاڑی ہے۔ اس کی بوگیوں میں کوئلا لدا ہوا تھا۔ میں نے دو بوریوں کے درمیان جگہ بنائی اور لیٹ گیا۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد اب نیند آ رہی تھی۔

معلوم نہیں کتنی دیر تک سفر جاری رہا۔ جب آنکھ کھلی تو میں الجھن میں پڑ گیا کہ مال گاڑی کدھر جا رہی ہے؟ ایسا نہ ہو کہ میں اپنی منزلِ مقصود سے مخالف سمت میں سفر کرتا رہوں اور پوری زندگی اس ملک سے چھٹکارا نہ پا سکوں۔ چنانچہ جب ایک جگہ گاڑی مال اتارنے کے لیے رکی تو میں اتر گیا۔ میں نے اپنی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھائی اور پھر ایک چشمے پر جا کر پانی پیا۔

وہ مضافاتی علاقہ تھا۔ بنجر اور ویران۔ میں ایک سمت میں چل پڑا۔ آگے جا کر جھاڑیاں ملیں۔ میں نے ان میں جگہ بنائی اور لیٹ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک گدھ بیٹھا مجھے مکروہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ میری تکا بوٹیاں کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ یقیناً وہ بھی میری طرح بھوکا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں کھانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گیا مگر اس ویرانے میں کچھ نہ ملا۔

بھوک سے بہرحال نمٹنا تھا، اس لیے کہ بغیر کھائے پیے میری موت واقع ہو سکتی تھی۔ میں ایک طرف کو چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد چمنیاں نظر آئیں جن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ نزدیک گیا تو اندازہ ہوا کہ وہ کوئلے کی کان کے کارکنوں کی آبادی ہے۔ اس لیے کہ مزدوروں کے کپڑے سیاہ تھے اور سر پر فولادی ہیلمٹ تھے۔ کچھ کانوں کی طرف جا رہے تھے اور کچھ ڈیوٹی انجام دے کر لوٹ رہے تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے سن رکھا تھا کہ مڈل برگ اور رٹ بنک کی کوئلے کی کانوں میں چند انگریز بھی کام کرتے

ہیں۔اس خیال سے تسلی تو ہو رہی تھی لیکن یہ سوچ کر دل میں وسوسے بھی پیدا ہو رہے تھے کہ میں جو دروازہ کھٹکھٹانے جا رہا ہوں وہ دوست کا نکلتا ہے یا کسی دشمن کا؟ دھڑکتے دل سے میں نے ایک دروازے پر دستک دی۔اندر سے کسی نے پرتگالی زبان میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔اگر میں وہاں سے بھاگتا تو مشکوک ہو جاتا اور پکڑا جاتا۔ چنانچہ میں نے حالات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔

''میں ایک غریب شخص ہوں اور امداد چاہتا ہوں۔'' میں نے مسکینیت سے کہا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک شخص نے دروازہ کھولا جو ایک انگریز تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔میری حالتِ زار دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک ٹرک میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ ہمارا پروگرام شکار کھیلنے کا تھا۔ چند شریر لڑکوں نے مجھے دھکا دے کر ٹرک سے گرا دیا۔ان کا کہنا تھا کہ میری ٹانگوں میں قدرت نے بہت طاقت دی ہے، لہٰذا اب میں باقی فاصلہ پیدل طے کروں۔ میں عجیب مصیبت میں مارا گیا ہوں۔'' میں نے فوری طور پر گھڑی ہوئی ایک کہانی سنائی۔

میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔اسے میری کہانی پر اعتبار آیا ہے یا نہیں؟ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور بے چارگی کی تصویر بن گیا۔اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے صحن تھا اور اس کے بعد دو کمرے۔ایک خواب گاہ اور دوسرا مہمان خانہ۔اس نے مجھے مہمان خانے میں بٹھایا اور پھر میز کی دراز کھول کر ایک ریوالور نکالا اور اس کی نال کا رُخ میرے سینے کی طرف کرتا ہوا بولا۔ ''مسٹر چالاکی نہیں چلے گی۔ صحیح طور پر بتا دو کہ تم کون ہو؟''

میں نے سوچا جھوٹ بولنا اس وقت مناسب نہیں ہے۔اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے سچ کہہ دوں۔ ''میں جنگی قیدی ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ایک ماڈل اسکول میں رکھا گیا تھا۔ میں وہاں سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ونسٹن چرچل!'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ایک جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے محاذ پر تھا۔''

''میں نے تمہارے کالم اور مضامین گارڈین [illegible] پڑھے ہیں۔'' وہ سر ہلا کر مسکرایا۔ ''تم اچھا لکھتے ہو۔''

''کیا مجھے یہاں پناہ مل سکتی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مل سکتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس [illegible] کہ یہاں سب انگریز رہتے ہیں۔کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گارڈز تمہاری تلاش میں یہاں تک آ چکے ہیں۔ بہرحال وہ مایوس ہو جائیں گے تو ہم تمہیں یہاں سے نکالنے [illegible] بندوبست بھی کر دیں گے۔ مجھے ہارورڈ کہتے ہیں اور میں [illegible] سپروائزر ہوں۔تمہاری پناہ گاہ کے لیے کان بہت منا[illegible] رہے گی۔''

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔خوشی تھی کہ [illegible] والے کی حیثیت سے لوگ مجھے بیرونِ ملک بھی پہچانتے [illegible] اور اس حوالے سے میری مدد کرنے کے بھی خواہاں ہیں۔

''ہم لوگوں کی ہمہ وقت نگرانی ہوتی رہتی ہے۔'' [illegible] نے سرگوشی میں بتایا۔ ''اس لیے کہ ہم انگریز ہیں۔ پرتگا[illegible] کو اندیشہ رہتا ہے کہ ہمارا تعلق برطانیہ سے نہ ہو۔ تمہیں [illegible] کر حیرت ہوگی کہ ہماری سراغرسانی ملازمائیں کرتی [illegible] انہیں سٹی گورنمنٹ کی طرف سے متعین کیا گیا ہے۔''

''تو کیا وہ ہر وقت گھروں میں جھانکتی پھرتی ہیں؟''

''وہ ہر وقت تو ہمارے سروں پر مسلط نہیں رہتیں، [illegible] ان کی نگاہ ایسی چیزوں پر رہتی ہے جسے ہم بادی النظر [illegible] اہمیت نہیں دیتے۔''

''یعنی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ گھروں میں استعمال ہونے والی اشیائے خو[illegible] نوش پر نگاہ رکھتی ہیں۔اگر وہ زیادہ صرف ہو جائیں تو ان[illegible] شبہ ہو جاتا ہے کہ کوئی اور بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شری[illegible] ہو چکا ہے۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے نکلا۔

ہارورڈ نے مجھے ڈبل روٹی، بھنا گوشت اور تھوڑی [illegible] شراب لا کر دی تا کہ میں اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکوں۔ [illegible] قلیل خوراک کھا کر مجھے طمانیت محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہ[illegible] کہ توانائی لوٹ رہی ہے۔

اس نے مجھے اپنے اسٹور میں لٹا دیا۔ جہاں لال بیگ اور مچھروں کی بہتات تھی۔ غالباً اسٹور کی صفائی نہیں ہوتی تھی اور اس میں کوئی جھانکتا نہیں تھا۔ میرے بدن کا ریشہ ریشہ دکھ رہا تھا اس لیے میں لیٹتے ہی ..... سو گیا۔ معلوم نہیں کب تک سوتا رہتا کہ ہارورڈ نے مجھے جگا دیا۔

اس نے بتایا کہ ملازمہ کو شک ہو گیا ہے۔ چنانچہ میرا

ں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ باہر کڑی نگرانی ہو رہی لہٰذا اب مجھے کوئلے کی کان میں چند دن گزارنا پڑیں اس نے پولورائڈ کیمرے سے میری تصویر کھینچی اور بتایا اس سے جعلی شناختی کارڈ تیار کیا جا سکے گا۔ اس کے بعد وہ کے پچھلے پہر مجھے کان کی طرف لے گیا۔ راستے میں ں کا ایک ٹرک ملا۔ اس نے ہمیں روک کر شناختی کارڈ کیا۔ ہارورڈ نے اتنی جلدی نہ جانے کیسے میرا شناختی کارڈ کر لیا تھا۔

وہ چونکہ سپروائزر تھا، اس لیے انہوں نے اس سے دو سوالات نہیں کیے اور ہمیں آگے جانے کا اشارہ کر صبح کی شفٹ والے فجر کے بعد آتے تھے اور ہم کچھ پہلے گئے تھے۔ یہ حکمتِ عملی ہارورڈ نے اس لیے اختیار کی تھی میں کسی کی نگاہ میں آئے بغیر کان تک پہنچ جاؤں۔ تاہم ں میں یقیناً اس نے پیشگی بات کر رکھی ہوگی جو مجھ سے کسی کوئی سوال نہیں کیا اور جانے دیا۔ انہوں نے میرے ے پر رجسٹر میں کوئی اندراج نہیں کیا تھا۔

لفٹ کے ذریعے ہم سطحِ زمین سے نیچے گئے۔ وہ کان بانچ تھی جہاں میں نے اس وقت قدم رکھا تھا۔ مجھے ن کی روشنی میں راستہ دکھایا گیا۔ میں چونکہ پہلی بار کسی ے کی کان میں داخل ہوا تھا چنانچہ ہر چیز میرے لیے نئی حیران کن تھی۔ ہارورڈ نے مجھے ایک تنگ اور تاریک سی ر پر چٹائی بچھا کر لٹا دیا۔ اوڑھنے کے لیے اس نے مجھے ۔ کمبل دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں ایک برس تک بھی ں پڑا رہوں گا تو کسی کو پتا نہ چل سکے گا۔ میں نے ہنس کر ے بتایا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں جلد از جلد وطن ا چاہتا ہوں۔

جانے سے پہلے اس نے ایک موم بتی اور ماچس مجھے ی کہ ضرورت کے وقت میں اسے جلا کر اپنا کام ر سکوں۔ دو چار روز کی بات ہے اس کے بعد وہ اس کان ے نکال کر مجھے عازمِ وطن کر دے گا۔

میں نہ معلوم کتنی دیر تک سویا۔ اس کے بعد میں نے م بتی جلانے کی کوشش کی تو وہ نہ ملی۔ ماچس البتہ ہاتھ میں ی۔ میں نے اس کی تیلی سے کام چلایا۔ کوئلے کی کان میں چس جلاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ورڈ آ گیا۔ وہ میرے لیے بھنا ہوا مرغ لایا تھا۔ اس نے ایا کہ یہ مرغ اس نے دس میل دور ایک ڈاکٹر کے ہاں سے ریا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک ملازمہ نے خوراک کے رے میں شک ظاہر کر دیا تھا اس لیے سارے انگریزوں کے گھروں کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ اس سے بھی کافی سوالات کیے گئے لیکن اس نے سب کا تسلی بخش جواب دیا۔ یوں اس کی جان بچ گئی۔

میں نے اس سے موم بتی کے غائب ہونے کی شکایت کی تو اس نے ہنس کر بتایا کہ یہاں موٹے اور توانا چوہے آتے ہیں۔ یہ ان کا کام ہے۔ اس نے اپنی جیب سے ایک اور موم بتی نکال کر میرے حوالے کی۔

”مسٹر ہارورڈ میری وجہ سے تمہیں بہت پریشان ہونا پڑ رہا ہے، اس لیے تم مجھے پرتگالی فوجیوں کے سپرد کر دو۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میرے دوست! تمہیں گنوا کر ہم اپنی قوم کو کیا منہ دکھائیں گے؟“ اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ ”جنگ اور محبت میں یہ سب پریشانیاں اٹھانا پڑتی ہیں۔“

میں لاجواب ہو گیا۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد میرے پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف ہونے لگی۔ میں نے اٹھ کر تکیے کے نیچے سے موم بتی نکال کر جلائی تو دیکھا کہ ایک فربہ چوہا میرے گرد چکر لگا رہا ہے۔ دو اور فاصلے پر کھڑے اپنے چمکیلے دیدوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

موم بتی جلتے ہی وہ کلبلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔ غالباً بھوک سے بے تاب ہو کر اس نے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر اپنے دانت آزمائے تھے۔ انگوٹھے سے خون رس رہا تھا، اس لیے میں نے موم لگا لیا۔ اگر میری آنکھ نہ کھل جاتی تو یقیناً وہ میرے جسم کا سارا گوشت ہڑپ کر جاتے اور ہارورڈ کو دوسرے روز میرا ڈھانچا ملتا۔

میں نے موم بتی جلتی رہنے دی۔ اسی کرب کے عالم میں، میں نے چار دن وہاں کاٹ دیے۔ پانچویں دن ہارورڈ نے بتایا کہ نگرانی ختم ہو چکی ہے۔ پرتگالی فوجیوں کا خیال ہے کہ میں اسکول سے فرار ہو کر پیرے ٹوریا کی طرف چلا گیا ہوں۔ میں ہنس دیا، اس لیے کہ میں مخالف سمت میں ایک سو میل دور بیٹھا تھا۔ ہارورڈ مجھے وہاں سے نکال کر اپنے آفس میں لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ آفس بھی محفوظ ہے، وہاں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرے دن اون کا ایک سوداگر اپنے دو ٹرک ڈیلا گوا بھیج رہا تھا۔ ہارورڈ نے تجویز پیش کی کہ مجھے کسی ایک ٹرک میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے مجھے نقشہ تو نہیں دیا البتہ نقشہ دکھا دیا تاکہ میں اس کی جزئیات اپنے ذہن میں محفوظ کر لوں۔ اس کا کہنا تھا کہ جب میں وہاں پہنچ

جاؤں تو برطانوی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرلوں اور وطن چلا جاؤں۔

میں نے ہامی بھرلی۔

دوسرے دن مجھے اون کے ٹرک میں جگہ بنا کر لٹا دیا گیا۔انہوں نے اتنا اہتمام کیا تھا کہ میں سانس لیتا رہوں اس کے علاوہ سارا جسم اون کے گولوں سے ڈھانک دیا۔اس کے بعد ترپال ڈال کر ٹرک کو ڈھانک دیا گیا۔میرے لیے انہوں نے کھانے پینے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔میرا خیال ہے کہ وہ پندرہ روز کے لیے کافی ہوتا۔اس کے علاوہ تھیلے میں ایک ریوالور بھی تھا۔

اندیشے اور وسوسے اب بھی ذہن میں کلبلا رہے تھے کہ اگر راستے میں ان ٹرکوں کی تلاشی لی گئی تو میں زندہ نہیں بچوں گا۔جنگ میں نامہ نگار کی حیثیت سے شریک ہونا اور بات تھی مگر جنگی قیدی کی حیثیت سے اِدھر اُدھر چھپتے پھرنا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھنا اور بات تھی۔میں امید و بیم کے دوراہے پر کھڑا تھا!

کبھی خیال آتا کہ میں سلامتی سے وطن پہنچ جاؤں گا اور کبھی یہ سوچ کر حلق خشک ہونے لگتا کہ جب ٹرک کی تلاشی ہوگی تو مجھے گرفتار کرلیا جائے گا اور پھر فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنادیا جائے گا۔

ٹرک رات میں کسی مناسب جگہ پر ٹھہر جاتا تھا اور ڈرائیور مجھے بتا دیتا تھا کہ ہم اس وقت کہاں پہنچ چکے ہیں۔میں نے اندازہ لگایا کہ سفر زیادہ تر ویران سڑکوں پر کیا جارہا ہے۔ایک آدھ جگہ میں نے جنگل بھی دیکھا۔چوتھے روز مجھے اطلاع دی گئی کہ ہم کرمانی کی بندرگاہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔اس لیے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔وہاں تلاشی ہوسکتی تھی۔یہ سن کر دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔

جب بھی ٹرک کے قریب سے کچھ لوگ باتیں کرتے ہوئے گزرتے مجھ پر وحشت طاری ہونے لگتی کہ اب تلاشی کا مرحلہ آنے والا ہے اور میری آزادی ختم ہونے والی ہے۔میں چونکہ مفرور تھا چنانچہ وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے۔موت میرا مقدر بن چکی تھی۔

وہاں ٹرک کی تلاشی تو ہوئی لیکن واجبی سی اس لیے کہ ڈرائیور نے تلاشی لینے والوں کی مٹھی گرم کر دی تھی۔تلاشی لینے پر اس وقت جرمانہ ہوتا تھا جب ٹرک میں مقررہ مقدار سے زیادہ مال لاد دیا جائے۔کاغذات پر کچھ لکھا ہو اور حقیقت میں کچھ اور نکلے۔ایک گھنٹے بعد ٹرک ایک جھٹکے سے وہاں سے چل پڑا۔مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہاں چیکنگ کرنے کے سخت احکامات ہیں۔لیکن گارڈز اپنی جیبیں گرم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

اگلی منزل ریسانہ گارسیا تھی۔اس کے بعد ہم لورنکیو مارکوئس پہنچ گئے۔وہاں ٹرک ایک گودام میں داخل ہوا اور اس پر سے مال اتارا جانے لگا۔اس کے بعد میری باری آئی۔ٹرک ڈرائیور نے کہا کہ اس کی ذمے داری ختم ہوگئی۔اب میں جہاں جانا چاہوں جاسکتا ہوں۔اس نے مجھے برطانوی سفارت خانے کا راستہ سمجھا دیا تھا پھر کہا کہ اب قسمت تم پر مہربان ہوگی تو تم وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاؤ گے ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

رات کا وقت تھا۔میں بچتا بچاتا گلیوں کو طے کر کے سفارت خانے کے دروازے تک پہنچ گیا۔وہاں ایک دربان کھڑا تھا۔اس نے درشت لہجے میں کہا کہ سفیر محترم آرام کر رہے ہیں۔اس لیے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔میں چیخنے چلّانے لگا۔اس سے کہا کہ وہ جانتا نہیں ہے کہ کس سے گفتگو کر رہا ہے۔

بات زیادہ بڑھ گئی تو بالکونی کا دروازہ کھلا اور سفیر محترم نے جھانک کر دیکھا اور مجھ سے نام پوچھا۔اطمینان ہونے کے بعد انہوں نے دربان کو ہدایت دی کہ مجھے آنے دیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد میری حالت میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔غسل، کھانا اور آرام دہ بستر۔صبح مجھے ایک ماہ کے اخبارات بھی فراہم کردیے گئے۔سفیر مجھ سے اچھی طرح واقف تھا اور بڑی حد تک میرا مداح بھی تھا۔اخبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد پتا چلا کہ جنگ کی صورتِ حال تبدیل ہوچکی ہے اور برطانیہ فتح سے ہم کنار ہے۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح سے میں اس جنگ میں حصہ لوں اور اپنے وطن پر قربان ہوجاؤں۔

چوتھے روز سفیر نے بتایا کہ ایک بحری جہاز ڈربن جارہا ہے۔میرے لیے ایک عام مسافر کی حیثیت سے سیٹ بک کرا دی گئی ہے۔مجھے اپنے حلیے میں قدرے تبدیلی کرنا پڑے گی۔میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جعلی پاسپورٹ لے کر جہاز میں بیٹھ گیا۔

جب میں ڈربن کے ساحل پر اترا تو میرا فقید المثال استقبال کیا گیا۔شہر کے سارے لوگ میری جھلک دیکھنے کے لیے امڈ آئے تھے۔احساسِ تشکر سے میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔



وطن کی آزادی کے لیے اس نے بہت اہم کام انجام دیا تھا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

گمنام جاسوس

دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر نے پوری دنیا کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا تھا، اس وقت اپنے وطن کی محبت میں سرشار ایسے بے شمار لوگ تھے جنہوں نے پسِ پردہ رہ کر وطن کے لیئے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا۔ ایسے ہی آزادی کے متوالوں میں سے ایک شخص کی روداد۔

فکر معاش سے بھلا کون بچا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی ت اور اہلیت کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے ک "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر"، مگر بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان کو اپنی اہلیت یا صلاحیت بلکہ اپنی مرضی اور پسند کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر زمانہ جنگ کا ہو اور آپ کو جاسوسی پر لگا دیا جائے تو وہی ہوگا جو جمی ہوشے کے ساتھ ہوا اور بالآخر وہ ایک بہت بڑے اعزاز کا بھی مستحق ٹھہرا، لیکن قسمت کو تو کچھ

اور ہی منظور تھا۔یہی سبب تھا کہ جمی ہوشے جیسا۔ایک ایسا شخص ،جسے فکر معاش بھی لاحق ہو اور پھر اس پر مستزاد کہ وہ اپنے اوپر یہ قدغن بھی لگا بیٹھے کہ وہ ایسی جگہ پر ہرگز ملازمت نہیں کرے گا جہاں دشمنوں کا اثر ورسوخ ہو تو ایسے انسان کی زندگی قابلِ رحم حد تک مشکل ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔یوں تو دورانِ جنگ ملازمت کا حصول ویسے ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس کے باوجود جمی ہوشے نے یہ بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایسی جگہ کام نہیں کرے گا جہاں نازیوں کا اثر ورسوخ ہو۔

اسے جرمنوں سے شدید نفرت تھی۔فرانس کی شکست کے بعد اس نفرت میں اور بھی اضافہ ہوا تھا،لہٰذا وہ نازیوں کے حامی اداروں میں کام کر کے ان کے ہاتھ مضبوط نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے ملازمت تلاش کرتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ساری جمع پونجی خرچ ہونے لگی لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔

اوائل اگست میں وہ حسب معمول اخبار بینی میں مشغول تھا کہ اچانک اس کی نظر ''دیجان'' کے ایک اشتہار پر پڑی۔

''دیجان'' کی ایک موٹر ساز فرم کو پیرس میں کسی موزوں نمائندے کی ضرورت تھی جو اس کے تیار کردہ نئے موٹر انجن کو مارکیٹ میں متعارف کروا سکے۔

چونکہ یہ ایک خالصتاً فرانسیسی فرم تھی ،اس لیے اس نے سوچا کہ کیوں نہ قسمت کی دیوی کو آزمایا جائے۔

امیدواروں سے بذریعہ ڈاک درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔لیکن اس نے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے بالمشافہ گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن ہی پہلی گاڑی سے دیجان روانہ ہو گیا۔

کمپنی نے عارضی طور پر آدھے پیرس کی ایجنسی اسے دے دی۔ملک میں پیٹرول کی قلت تھی۔اس لیے لوگ گیس سے چلنے والے انجن کو ترجیح دینے لگے۔جمی ہوشے کا کام چل نکلا تو فرم نے اسے پیرس میں ہی اپنا چیف ایجنٹ مقرر کر دیا۔

اب اسے کمپنی کے ایما پر مختلف اداروں سے لین دین کرنے اور اپنے کارندے مقرر کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہو چکے تھے۔

کاروبار تیزی سے ترقی کرتا چلا گیا اور اسے مالی پریشانیوں سے نجات مل گئی۔اب جو فراغت اور اطمینان نصیب ہوا تو پھر اس کے دل میں جرمنوں کے خلاف نفرت کی دبی چنگاری بھڑک اٹھی۔وہ فرانس کے دشمنوں سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ان دنوں بی بی سی سے فرانسیسی تحریک مزاحمت کا زور وشور سے پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔

جمی نے اس تحریک کا کھوج لگانے کی کوشش کی،مگر ناکام رہا۔

درحقیقت تحریک کا ابھی تک کوئی وجود ہی نہ تھا، یہ ''شیر آیا......شیر آیا'' والا معاملہ تھا۔اور یہ سارا پروپیگنڈہ خود اتحادی کر رہے تھے۔چنانچہ اس نے ان سے براہ راست ''رابطہ'' کرنے کا فیصلہ کیا۔

41- 1940ء کا موسم سرما اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ وبچار میں گزر گیا۔

ان دنوں رودبار انگلستان پہنچنا خارج از بحث تھا کیونکہ ساحل کے چپے چپے پر نازی پہرے دار موجود تھے ...اسپین کی سرحد نہ صرف پیرس سے دور تھی بلکہ اسے اس علاقے کے حالات کا بھی صحیح علم نہ تھا۔لے دے کے سوئٹزر لینڈ رہ جاتا تھا۔اس کی سرحد نسبتاً قریب تھی اور وہ اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔پھر سفر کرنے کا ایک بنا بنایا بہانہ بھی موجود تھا۔یہاں جنگلات تھے جن کی لکڑی سے کوئلہ بنتا تھا۔جمی ہوشے ایک ایسی کمپنی کا نمائندہ تھا جو گیس سے چلنے والے موٹر انجن تیار کرتی تھی اور گیس پیدا کرنے کے لیے کوئلہ درکار تھا۔اس طرح جنگلات اور کوئلے میں اس کی توجہ اور دلچسپی ،پیشہ ورانہ ضرورت کا حصہ قرار دی جا سکتی تھی۔

نازی سپاہی اسے اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے پکڑ بھی لیتے تو وہ باآسانی اس بہانے سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔

اس طرف سے سرحد پار کرنے میں صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ یہ کہ ''زون روج'' میں سے ہو کر گزرنا پڑتا۔یہ ممنوع علاقے کی ایک طویل پٹی تھی جو فرانس کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔یہ خطہ پچاس سے ساٹھ میل تک چوڑا تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے جرمن حکام سے خصوصی پاس حاصل کرنا ضروری تھا۔یہ پاس بہت کم لوگوں کو جاری کیے جاتے تھے۔جمی کو پاس ملنے کی امید نہ تھی۔اگر درخواست دیتا بھی تو اندیشہ تھا کہ جرمن پیچھے پڑ جائیں گے اور اس کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھیں

گے۔ چنانچہ اس نے پاس کے بغیر ہی ''زون روج'' سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔

15 مئی کی رات۔ وہ دیجان جانے والی گاڑی میں سوار ہوا۔

یہ قصبہ سرحد کے قریب تھا۔ اس نے اپنی سیکریٹری کو بتایا کہ وہ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں ڈائریکٹر سے تفصیلی بات چیت کرنے جا رہا ہے، اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد سرحدی علاقے میں کوئلہ دستیاب ہونے کے امکانات کا جائزہ بھی لے گا۔

سرحد تک پہنچنے اور دیجان تک کسی سواری کا بندوبست ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنی سائیکل ساتھ رکھ لی۔ صبح سویرے وہ دیجان پہنچا۔ دن بھر ڈائریکٹر اور دوسرے افسروں سے پروجیکٹ کے متعلق گفتگو اور بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ کاروبار کو ترقی دینے کے لیے کوئلے کے نئے وسائل اور ذخیرے تلاش کرنا ضروری تھا۔

سب نے اس کا منصوبہ پسند کیا اور یوں اس طرح اس نے آسانی سے سرحدی علاقے میں جانے کا جواز پیدا کر لیا۔

شام کے وقت وہ دفتر سے نکلا اور اپنی ''مہم'' پر نکل پڑا۔ جمی نے جان بوجھ کر نہر کے ساتھ ساتھ بہت اجاڑ اور ویران راستہ اختیار کیا۔ ادھر نازیوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ نہ تھا۔

''زون روج'' تک کا سفر تو بہ خیر و عافیت طے پا گیا لیکن ممنوعہ علاقے کی سرحد کے پاس مجبوراً رک جانا پڑا۔ پل کا راستہ خاردار باڑ سے بند کر دیا گیا تھا اور ایک بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''خبردار! باڑھ سے دور رہیے، بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔''

بات اگر صرف خاردار باڑھ کی ہوتی تو جمی شاید کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لیتا لیکن بارودی سرنگوں کی موجودگی میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کا وہ ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

نہر زیادہ چوڑی نہ تھی اور سائیکل کے ساتھ بھی تیر کر پار کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس میں وقت صرف ہوتا اور شور سے دشمن کے متوجہ ہونے کا خطرہ بھی تھا۔

وہ گنجان جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں دبکا ہوا ابھی سوچ و بچار میں گم تھا کہ اچانک دور سے تین موٹر سائیکل سوار آتے نظر آئے۔

وہ قریب پہنچے تو اس نے دیکھا، یہ ایک جرمن گشتی دستہ ہے، سب سے آگے سارجنٹ تھا اور اس کے پیچھے دو سپاہی، خاردار باڑھ کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

سارجنٹ نے اپنی سائیکل ایک سپاہی کے حوالے کی اور خود اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا، پھر ایک جگہ ہاتھ بڑھا کر خاردار تار کو اپنی طرف کھینچا، جمی سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے پوری توقع تھی کہ بارودی سرنگیں ایک لرزہ خیز دھماکے سے اب پھٹیں کہ تب پھٹیں، اور جرمن سپاہیوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ مگر کسی دھماکے کی آواز تک سنائی نہ دی۔ اس کے برعکس دیکھتے ہی دیکھتے باڑھ میں ایک آدمی کے گزرنے کا راستہ بن گیا۔

پل عبور کرنے کے بعد سارجنٹ نے اس ''خلا'' کو دوبارہ بند کر دیا، اور پھر وہ تینوں سائیکلوں پر سوار ہو کر چل دیے۔

جب وہ تینوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو جمی اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ دور دور تک کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ بڑی احتیاط سے قدم رکھتا ہوا وہ باڑھ کے قریب پہنچا۔ اس پر اب نوٹس بورڈ کی حقیقت کھل چکی تھی۔ یہ محض لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے تھا۔ اس نے بلا تعویق و تامل جرمن سارجنٹ کی طرح باڑھ کا خفیہ تالا کھولا اور سائیکل سمیت دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھر باڑھ کو پہلے کی طرح آپس میں جوڑ دیا اور اپنی راہ پر ہو لیا۔

شام ہو چلی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کرفیو کے اوقات شروع ہونے سے پہلے ''لی سرنیواس'' تک تو کم از کم پہنچ ہی جائے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

پیرس کے ایک دوست نے اسے لی سرنیواس کے ایک کسٹم گارڈ کا پتا دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اعتماد میں لیا جا سکتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا۔ لہٰذا ایک گھنٹے بعد جمی اس کے پاس بیٹھا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ کسٹم گارڈ نے بڑے غور سے اس کی باتیں سنیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دیوار کے پاس لے گیا، جہاں علاقے کا ایک بڑا سا نقشہ دیوار پر ٹنگا ہوا تھا۔

انگلی کے اشارے سے سرحد تک پہنچنے کا نسبتاً محفوظ اور چھوٹا راستہ دکھایا۔

کسٹم ہاؤس کے ایک حصے میں جرمن پولیس نے اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار کوئی جرمن سپاہی ان کے کمرے میں بھی آ دھمکتا۔ لیکن وہ گرد و پیش سے بے نیاز اپنی

باتوں میں ہی مصروف رہے، تھوڑی دیر بعد جمی نے اپنی سائیکل گارڈ کے پاس ہی چھوڑ دی اور خود پیدل اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس دوران ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی...... وہ بارش میں بھیگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ سامنے سے تین جرمن بوبی (سپاہی) آتے نظر آئے۔ جمی نے گھبرا کر اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں، مگر اسے چھپنے کی کوئی جگہ یا آڑ نظر نہ آئی... اثنائے راہ، سپاہیوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اب جمی ہوشے کے پاس، بہ دستور اسی طرح چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

قریب پہنچا تو انہوں نے اسے روک لیا۔ بارش میں بھیگنے سے اس کے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ پھر کئی گھنٹوں کے مسلسل سفر سے حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ پھر سپاہیوں کو اس کی بات پر یقین کیوں کر آتا کہ وہ ایک موٹر ساز فرم کا نمائندہ ہے، اور جنگلات میں کوئلے کے لئے مناسب لکڑی تلاش کر رہا ہے۔

جرمن سپاہی اسے ساتھ لے کر واپس کسٹم ہاؤس پہنچے۔ ساری عمارت خالی تھی۔ کسٹم گارڈ کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ دروازے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ سپاہیوں نے اسے اس میں سوار کیا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گئے۔

اب تک سارا معاملہ ایک دلچسپ مہم معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن جب ٹرک روانہ ہوا تو جمی کو پہلی بار حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس ہوا۔

''زون روج'' میں پرمٹ کے بغیر قدم رکھنا بہت بڑا جرم ہے۔ جرمن اب آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی، لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ وطن عزیز کی خاطر وہ ایک بار نہیں سو بار قربان ہونے کو تیار تھا۔

☆☆☆

ٹرک مقامی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا تو خاصی رات گزر چکی تھی۔ جمی کو ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ صبح سویرے ایک نازی لیفٹیننٹ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔

جمی نے ٹوٹی پھوٹی جرمن زبان میں بتایا کہ وہ ایک فرم کی طرف سے اس علاقے میں کوئلے کی لکڑی کا جائزہ لینے آیا ہے۔ اتفاق سے اس کے پاس وزارت صنعت و حرفت کی ایک مستند دستاویز بھی تھی۔ اس میں فرانسیسی کارخانوں میں جرمنوں کے لیے ماہانہ تیار ہونے والی فوجی گاڑیوں کے اعداد و شمار درج تھے۔ جمی نے یہ دستاویز بڑی... میں وزارت صنعت و حرفت کے دفتر سے حاصل کی تھی۔ اس پر متعلقہ افسر کی مہر اور دستخط ثبت تھے۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ دستاویز خود حکومت نے اس کے حوالے کی ہے۔

اس طرح اس کی داستان میں کچھ وزن پیدا ہو گیا۔

تحقیقات اور پوچھ گچھ کا سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جرمن افسر نے اس سے کئی اور بھی سوالات کیے اور جمی کو ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہا کہ اب تب میں وہ پوچھے گا کہ ''زون روج میں داخلے کا پرمٹ کہاں ہے؟'' لیکن قسمت اچھی تھی کہ نہ لیفٹیننٹ نے یہ سوال کیا نہ کسی سپاہی نے۔

بہر طور لیفٹیننٹ دیر تک جمی کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اسے پیرس جانے والی پہلی گاڑی میں بٹھا دو۔''

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ سپاہی اسے ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی چلنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ انہوں نے انتظار کرنے کی بجائے، جمی کو ایک ڈبے میں بٹھایا اور واپس چلے گئے۔

ڈبے میں صرف چند سواریاں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی کسی کام سے ایک ایک کر کے نیچے اتر گئیں۔ جمی موقع پا کر چپکے سے نیچے اترا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گیا اور جب پیرس ایکسپریس روانہ ہو گئی تو سامنے سڑک پر کھڑی ہوئی ایک بس میں بیٹھ گیا۔

بس مورتیو جا رہی تھی۔

جرمنوں سے پہلی مڈبھیڑ ہونے کے بعد یوں صاف بچ نکل آنے سے، اس کا حوصلہ خاصا بلند ہو چکا تھا۔

دوپہر کے قریب بس منزل مقصود تک پہنچی۔ مورتیو ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا۔ جمی نے قریبی ہوٹل میں کھانا کھایا اور ایک نقشہ خرید کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

سوئٹزر لینڈ کی سرحد وہاں سے صرف چار میل دور تھی۔

اس نے رات وہیں گزاری۔ صبح ہوئی تو پھرتا پھراتا لکڑیاں چیرنے والے ایک چھوٹے سے کارخانے میں داخل ہوا، اور اس کے مالک سے اپنا تعارف کرایا پھر اس علاقے کے جنگلات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، کارخانے دار نے ایک نوکر ساتھ بھیج دیا۔ اس کا نام پال کیناٹ تھا اور وہ

سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے پہاڑی راستہ طے کرتے رہے، چاروں طرف گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جمی اپنے مطلب کی بات دریافت کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک دوراہے پر پہنچ گئے۔

پال کناٹ نے ایک ذیلی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''چوٹی تک جانے کے لیے یہ راستہ زیادہ محفوظ ہے، پھر ادھر جرمن پہرے داروں کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خوامخواہ کون ان کے الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دیتا پھرے گا''۔

جمی کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ اب پال کیناٹ کو شریک راز بنانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ چنانچہ جمی نے اسے اپنے دل کی بات بتا دی۔ پال کیناٹ نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئلے کا محض چکر ہے، اصل بات کچھ اور ہے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں جنگل ختم ہوگیا تھا۔ نیچے وادی میں چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کے پار چند گز تک زمین خالی تھی۔ آگے گھنا جنگل شروع ہوگیا تھا۔ پال کیناٹ نے سامنے ایک ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس جگہ ایک چھوٹی سی دیوار ہے، اس کے دوسری طرف سوئٹزرلینڈ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دیوار آسانی سے پار کی جاسکتی ہے...... فاصلہ آدھ میل سے زیادہ نہیں، لیکن احتیاط لازمی ہے۔ جرمن سپاہی اس علاقے میں اجنبیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔ پوچھ گچھ کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے، پھر ان کے ساتھ خونخوار کتے بھی ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی آگے نہیں جانے دیتے۔''

پال کیناٹ کی یہ باتیں سن کر جمی گھبرا سا گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر پال نے داہنی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''وہ سامنے میری جھونپڑی ہے...... میں بھی کبھی اپنی گائیں ادھر چرانے آجاتا ہوں، کل جب واپس آؤ تو وادی میں داخل ہونے سے پہلے جھونپڑی کا دروازہ دیکھ لینا، وہ سامنے صاف نظر آتا ہے۔ دروازہ کھلا ہو تو بے دھڑک چلے آنا اور اگر بند ہو تو خبردار اپنی کمین گاہ سے باہر مت نکلنا، بند دروازہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ جرمن سپاہی آس پاس موجود ہیں۔''

اتنا کہنے کے بعد پال کیناٹ تو رخصت ہوگیا اور جمی آہستہ آہستہ وادی کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

چہار سو گہرا اور اسرار بھرا سکوت طاری تھا۔ چند گایوں کے سوا جو ایک طرف گھاس چر رہی تھیں، دور دور تک زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ ذرا دیر بعد جب وہ ایک کھلی جگہ پہنچا تو جانے کیوں خوف سے اس کا دم خشک ہونے لگا۔ تاہم جی کڑا کر کے چلتا رہا۔ ندی پار کی، رکڑ آیا، اس کے بعد جھنگر میں داخل ہوگیا، یہاں سے آگے وہ گھنے درختوں کے جھنڈ کی محفوظ آڑ لیے آگے بڑھتا رہا۔

آدھے گھنٹے تک چلنے کے بعد سرحد کی نشاندہی کرنے والی دیوار نظر آگئی۔ وہ اسے پھاند کر دوسری جانب پہنچا۔ اب وہ سوئٹزرلینڈ کی آزاد سرزمین پر کھڑا تھا۔ دور ایک مکان نظر آرہا تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسٹم چوکی ہے۔

کسٹم افسر نے مختصر سی لیت ولعل کے بعد اس کا شناختی کارڈ رکھ لیا اور اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ آخر ایک قصبے میں پہنچا، یہاں سے دارالحکومت کی طرف گاڑی جاتی تھی۔ وہ چند منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ وہ اسٹیشن سے باہر آرہا تھا کہ راستے میں پولیس کے ایک سپاہی نے روک لیا اور شناختی کارڈ طلب کیا۔ جمی نے اسے بتایا کہ وہ تو سرحد پر کسٹم افسر نے رکھ لیا ہے۔

سپاہی اسے ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن آیا اور کسٹم آفیسر کو فون کر کے اس کے بیان کی تصدیق کی، اسی دوران ایک مقامی انٹیلی جینس افسر بھی آگیا۔ وہ اس سے کرید کرید کر فرانس اور جرمنوں کے حالات دریافت کرنے لگا۔ جمی پریشان ہوگیا۔ وہ اتحادیوں کو اپنی خدمات پیش کرنے آیا تھا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ والے پیچھے پڑ گئے تھے۔ انٹیلی جینس افسر کی ناراضی بہت سی دشواریاں پیش کرسکتی تھیں۔ اسے خوش کرنے کے لیے اس نے جرمن سپاہیوں سے ملاقات کا واقعہ خوب مرچ مسالا لگا کر سنایا، جن سے راستے میں اس کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ آخر میں وزارت صنعت وحرفت کا اعداد وشمار والی دستاویز بھی دکھا دی۔

سوئس انٹیلی جینس افسر خوشی سے جھوم اٹھا۔ یہ سب اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے خوشی خوشی جمی کو کھانے کی دعوت دے ڈالی اور پھر اسے اگلے قصبے تک

پہنچانے کے لیے بھی تیار ہوگیا۔اس چکر میں جمی کے تین قیمتی گھنٹے ضائع ہو گئے۔مگر اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی کیوں کہ آئندہ بلا روک ٹوک سرحد پار کرنے کے لیے سوئس افسر سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے انتہائی ضروری تھے۔

جمی اتوار کے دن دارالحکومت برن پہنچا۔تمام کاروباری ادارے اور دفاتر بند تھے۔وہ پچھلے چار دنوں سے مسلسل سفر کر رہا تھا۔کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔داڑھی بڑھ گئی تھی اور ایک بوٹ کا تلوا بھی غائب تھا۔

اس حلیے میں جب وہ برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہونے لگا تو، دربان نے اٹھائی گیرہ سمجھ کر اسے بھگانے کی کوشش کی مگر جب جمی نے سفیر سے ملاقات پر اصرار کیا تھا تو دربان تذبذب کا شکار ہوگیا اور اسے کلرک کے پاس لے گیا۔کلرک نے انتظار گاہ میں بٹھانے کی ہدایت کی۔اسے ابھی وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک لمبا تڑنگا خوش پوش انگریز اندر داخل ہوا۔جمی پر ایک سرسری نظر ڈالی اور نہایت بے دلی سے اس کا مقصد دریافت کیا۔اس نے جمی سے نہ تو اپنا تعارف کروایا اور نہ اسے اخلاقاً کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔دونوں کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔

جمی کو بعد میں پتا چلا کہ وہ اسسٹنٹ ملٹری اتاشی میجر بی ہے۔

جمی ہوشے نے رضا کارانہ جاسوسی کی پیش کش کر دی تو میجر نے برا سا منہ بنایا، جیسے کوئی کڑوی گولی نگل لی ہو، پھر روکھے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے بولا۔"افسوس، آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔"

جمی غصے اور بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ذرا دیر سوچتا رہا، پھر کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھا اور اسے میجر بی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"یہ دو انگریز معززین کے نام ہیں، یہ دونوں معاشرے میں عزت کا مقام رکھتے ہیں، میرے چال چلن اور کردار کی تصدیق ان سے کرائی جا سکتی ہے۔"

میجر بی نے لاتعلقی کے انداز میں کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔چند ثانیے خاموشی طاری رہی جسے جمی نے ہی توڑا۔"میں ایک ماہ بعد پھر آؤں گا، میں نہیں چاہتا کہ میری تگ و دو ضائع جائے۔یہ لیجیے، فرانس کی ایک سرکاری دستاویز، شاید آپ کے لئے مفید ثابت ہو۔"اس نے ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔

یہ وزارت صنعت و حرفت والی دستاویز تھی، جو برطانوی حکومت کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔میجر بی نے جب اسے لندن بھیجا تو وہاں بی بی سی نے فرانس کی بو حکومت کے خلاف پروپیگنڈے میں اس سے خوب کام لیا اور اس کے چیدہ چیدہ حصے نشر بھی کیے۔لیکن اس وقت میجر بی نے اس میں کوئی زیادہ دلچسپی نہ لی۔ایک بے کار سا کاغذ سمجھ کے بے دلی سے رکھ لیا۔گفتگو کو طول دینا لا حاصل تھا۔جمی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا سفارت خانے سے باہر آیا۔

واپس سرحد پر پہنچا تو پال کیناٹ کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

جمی نے بڑی احتیاط سے ندی پار کی اور گھنی جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا ہوا چوٹی تک پہنچ گیا۔پھر جس راستے سے وہ پال کیناٹ کے ساتھ آیا تھا، اس سے ہوتا ہوا پال کے گھر آ گیا۔وہ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ جمی تھوڑی دیر ستانے کے بعد لی سرینواس کی طرف چل پڑا۔وہاں کسٹم ہاؤس میں اس کی سائیکل پڑی ہوئی تھی۔اگر چہ جرمنوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ موجود تھا، لیکن وہ سائیکل کے بغیر پیرس واپس جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ان دنوں سائیکل بہت قیمتی اور نایاب تھی۔پھر زون روج میں سے تیزی کے ساتھ گزرنے کے لیے بھی وہ نہایت ضروری تھی۔

وہ دوپہر کے قریب لی سرینواس پہنچا۔کسٹم ہاؤس سے وہ ابھی پانچ، چھ سو گز دور تھا کہ سامنے سے اچانک ایک جرمن سپاہی نکل آیا، دونوں قریب پہنچے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔جمی کو سپاہی کی صورت شناسا سا نظر آئی۔ معاً اس کا حافظہ تازہ ہوگیا۔یہ اس گشتی دستے کا سپاہی تھا جس نے چند دن پہلے اسے گرفتار کیا تھا۔اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور کسی قسم کی پریشانی کا مظاہر کئے بغیر نہایت بے تکلفانہ انداز میں بولا۔"ہیلو، دیکھا مجھے فرانسیسی حکام نے دوبارہ واپس آنے کی اجازت دے دی۔لیفٹیننٹ کہاں ہے؟ میں اپنی سائیکل لینے آیا ہوں۔"

جرمن سپاہی نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے اور شانے اچکاتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔"سیدھے چلے جاؤ، وہ کسٹم ہاؤس میں بیٹھا ہوگا۔"یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

جمی سوچنے لگا، برے پھنسے، واپس جانے کا موقع بھی نہ رہا تھا، بادل نخواستہ آگے بڑھا۔کسٹم ہاؤس کے قریب پہنچا تو عمارت خالی نظر آئی۔سب لوگ دوپہر کا کھانا کھانے

آرام کرنے جاچکے تھے۔ کسٹم گارڈ کا بھی کہیں نام ونشان نہ تھا۔اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ باری باری تمام کمروں میں جھانک کر دیکھا۔آخر گودام میں اپنی سائیکل کھڑی نظر آگئی۔اسے جلدی سے باہر نکالا۔اس پر سوار ہوا، اور 'زون روج' جانے والے راستے کی طرف ہولیا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ باڑھ تک پہنچ گیا۔جرمن سپاہی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔اس نے اطمینان سے پہلے کی طرح باڑھ پار کی، اور چند گھنٹے بعد وہ دیجان پہنچ گیا۔

یہاں اس نے ڈائریکٹر کو رپورٹ پیش کی اور لکھا۔

''مورتیو کے گردونواح سے عمدہ کوئلہ بنانے کے لیے مناسب لکڑی باآسانی مل سکتی ہے۔''

دوبارہ سرحد پار کرنے کے ٹھیک بہتر گھنٹے بعد وہ پیرس میں تھا۔

☆☆☆

اتحادیوں سے پہلی ملاقات خاصی حوصلہ شکن تھی لیکن جمی نے ہمت نہیں ہاری، وقت مقررہ پر وہ چھپتا چھپاتا دوبارہ سوئٹزر لینڈ کی سرحد میں داخل ہوا۔کسٹم گارڈ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔مگر اس نے جمی کو آگے جانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔جمی نے چال چلی اور بتایا کہ وہ سوئس حکومت کے لیے سرحد پار سے نہایت اہم فوجی راز اور معلومات لے کر آیا ہے۔پھر اس نے ایک ماہ پہلے سوئس انٹیلی جینس افسر سے اپنے انٹرویو کا قصہ سنایا۔اس پر گارڈ قدرے نرم پڑ گیا۔اس نے ہیڈ کوارٹر فون کیا تو وہاں سے جمی کو روکے رکھنے کا حکم صادر ہوا۔دو گھنٹے بعد ایک افسر آیا۔

اس نے جمی سے انٹیلی جینس افسر کا نام اور پتا دریافت کرکے فون کیا۔انٹیلی جینس افسر نے نہ صرف جمی کے بیان کی تصدیق کی بلکہ اس سے مسلسل رابطہ کرنے کی پُرزور سفارش بھی کی۔اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔سوئس حکام جمی کے ساتھ یوں پیش آنے لگے، جیسے وہ کوئی ٹھنک اہم اور بڑی شخصیت ہو۔سوئس ملٹری انٹیلی جینس نے اسے آیندہ کے لیے ملک کی سرحد بلا روک ٹوک پار کرنے کی خصوصی اجازت دے دی۔

اگلی صبح وہ میجر بی سے ملا۔وہ اگرچہ گرم جوشی سے پیش نہ آیا، تاہم اس کے انداز میں پہلے جیسی اجنبیت اور بے التفاتی نہیں تھی۔بلکہ وہ خاصی خوش اخلاقی سے کام لے رہا تھا۔

دونوں کمرے میں بیٹھ گئے۔

میجر بی نے اس سے خاندان کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔اس کے سامنے میز پر ٹائپ شدہ کاغذ رکھا تھا۔

جمی جواب دیتا تو وہ اس کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈال لیتا۔تھوڑی دیر بعد پہلی مرتبہ اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ جمی کے جوابات سے مطمئن ہے۔اس نے ٹائپ شدہ کاغذ جمی کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

''یہ معلومات ہمیں لندن سے موصول ہوئی ہیں۔ آپ نے جن عزیزوں کے پتے دیئے تھے، انہوں نے تفصیل سے آپ کے حالات لکھ بھیجے ہیں۔'' تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر میجر بی گلا صاف کرکے بولا۔''اب ذرا کام کی باتیں ہوجائیں، کیا آپ کی پیشکش بدستور قائم ہے؟''

''یقیناً'' جمی نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔''میری دوبارہ آمد اس بات کا واضح ثبوت ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ آسانی سے کتنے کتنے عرصے بعد میرے پاس آسکتے ہیں؟''

جمی سوچنے لگا۔کوئلے کی فروخت کی کہانی اب فرسودہ ہوتی جارہی ہے، اس لیے جلد جلد آنے کے امکانات بہت کم تھے۔اس نے لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد ہر تین ہفتے بعد ایک چکر لگانے کی حامی بھر لی۔

میجر بی بہت خوش ہوا۔پھر ابتدائی مشن کے طور پر مقبوضہ علاقے میں دشمن فوج کی یونٹوں کے صحیح نام اور پڑاؤ معلوم کرنے، ہوائی اڈوں، پیٹرول اور اسلحے کے ذخیروں کی نشاندہی اور نازیوں کے دفاعی انتظامات سے آگاہ کرنے کا کام اس کے سپرد کردیا۔

جمی کا خیال تھا کہ یہ معمولی کام ہیں، انہیں انجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔لیکن جب عمل شروع کیا تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

پیرس، جرمن فوجیوں سے بھرا ہوا تھا۔اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دوسرے علاقوں سے چھٹیاں گذارنے آئے تھے۔ان کی یونٹوں کے نام اور پتے معلوم کرنا آسان نہ تھا۔پھر جرمن کیمپ ہمیشہ آبادی سے باہر ہوتے۔اس علاقے میں جانا ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جمی کئی دنوں تک پیرس اور اس کے مضافات میں چکر لگاتا رہا۔لیکن کوئی نئی اور مفید بات معلوم نہ ہوئی۔تھک ہار کر اس نے ایسے موزوں افراد کی تلاش شروع کردی جو اس کا ہاتھ بٹا

سکیں۔یہ بڑا خطرناک کام تھا۔گسٹاپو کو خبر ہوجاتی تو اس کی موت یقینی تھی۔لیکن خوش قسمتی سے اس نے جس فرانسیسی سے بھی بات کی وہ محب وطن نکلا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ساتھ دینے پر آمادہ ہوگیا۔اس طرح اس نے اپنے ارد گرد ایسے افراد جمع کر لیے جنہیں نازیوں سے دلی نفرت تھی۔یہ لوگ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔کوئی بس ڈرائیور تھا اور کوئی ریلوے کا ملازم، کسی کا اپنا ہوٹل تھا اور کوئی ٹیکسی چلاتا تھا۔انہیں اپنے فرائض انجام دینے کے سلسلے میں اکثر ممنوعہ فوجی علاقوں میں جانے کا موقع ملتا اور وہ جمی کے لیے مفید اور ضروری معلومات اکٹھی کرتے رہتے، جمی انہیں مرتب کر کے سرحد پار میجر بی کو پہنچا دیتا۔

یہ سلسلہ نہایت کامیابی سے چلتا رہا، لیکن جمی مطمئن نہ تھا، کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے اس نے ہمہ وقتی ایجنٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔سب سے پہلے اس نے اپنے ایک دوست کے بیٹے آلیور کو ساتھ ملایا۔وہ نوجوان کام کرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔اس کا بچپن سوئٹزرلینڈ کے سرحدی علاقوں میں گزرا تھا اور تمام علاقے اس کے جانے پہچانے تھے۔جمی نے اسے میجر بی کو پیغامات پہنچانے اور لانے کا کام سونپ دیا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ دیجان اور مضافاتی علاقے سے معلومات اکٹھی کرنے کا فرض بھی انجام دیتا۔

آلیور کے آنے سے جمی کو ہر تین ہفتے بعد سرحد پار کرنے کی زحمت سے نجات مل گئی۔اس طرح جو وقت بچتا وہ کاروباری معاملات نمٹانے اور خفیہ تنظیم جس کا نام اس نے ''آغیر'' رکھ دیا تھا کو پھیلانے کے منصوبے سوچنے میں صرف ہونے لگا۔

1942ء کے اوائل میں اس نے چار ایجنٹ اور بھرتی کیے۔یہ، مارگٹ، جان، وکٹر اور جوزف تھے۔

ابتداء میں ان لوگوں کے اخراجات جمی اپنی جیب سے ادا کرتا رہا لیکن رفتہ رفتہ جب تعداد بڑھ گئی اور اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تو مجبوراً میجر بی سے ذکر کرنا پڑا۔اس نے فوراً معقول رقم کا بندوبست کر دیا۔

جمی کی خفیہ تنظیم ''آغیر'' بڑی کامیابی سے کام کر رہی تھی کہ جون میں اسے پہلے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

آلیور طبعاً مہم جو تھا۔''ہرکارے'' کے خشک کام سے جلد اکتا گیا۔ایک مرتبہ کسی دوست سے پتا چلا، چند ولندیزی فرار ہوکر سوئٹزرلینڈ جانا چاہتے ہیں۔آلیور فوراً ان کی مدد کرنے کو تیار ہوگیا۔جمی پر اس حرکت کا انکشاف بعد میں ہوا۔آلیور پہلی پارٹی کے بعد ایک اور گروپ کو اسمگل کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ جمی نے اسے خواہ مخواہ خطرات مول لینے سے روکا......آلیور نے وعدہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو پار پہنچانے کے بعد دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا، جمی چپ ہوگیا۔

آلیور چند دن بعد اپنے ایک ساتھی جان کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ولندیزی پیرس سے دیجان آرہے تھے۔گاڑی رکی مگر اسے کوئی ولندیزی نظر نہ آیا۔اس نے جان کو باہر چھوڑا، اور خود صورتِ حال کا جائزہ لینے پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔کئی منٹ گزر گئے، جان بے چینی سے انتظار کرتا رہا، مگر آلیور کی صورت نظر نہ آئی۔وہ تقریباً مایوس ہو چلا تھا کہ اچانک بھاری بھرکم بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ذرا دیر بعد ایک جرمن سپاہی نظر آیا، اس کے پیچھے دس بارہ ولندیزیوں کے درمیان آلیور سر جھکائے چلا آرہا تھا۔ان سب کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مسلح فوجیوں کے ایک دستے نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

جمی تین دن بعد کاروباری سفر سے لوٹا تو اس نے آلیور کے گرفتار ہونے کی خبر سنی۔وہ بہت پریشان ہوا۔اسے خطرہ تھا آلیور تنظیم کے متعلق نازیوں کو کچھ نہ بتا دے......آلیور کو دیجان کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ایک نرم اور مہربان آسٹروی پہرے دار کی وساطت سے جمی نے رابطہ قائم کیا تو اس نے پیغام بھجوایا کہ میں نے اسمگلنگ کے جرم کا اقرار کرلیا ہے لیکن تنظیم کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور نہ آئندہ نکالوں گا۔''

جمی کا سر فخر سے تن گیا۔اسمگلنگ جرمنوں کے نزدیک سنگین جرم نہ تھا، اس لیے امید تھی کہ آلیور جلد رہا ہوکر آجائے گا، لیکن اسی دوران کسی نے مخبری کردی کہ آلیور باقاعدگی سے سرحد پار جا کر برطانوی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہے۔اس پر از سرِ نو پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔آلیور کو خوفناک مظالم ...کا نشانہ بنایا گیا۔لیکن اس نے چپ سادھ لی۔نازی جب کچھ اگلوانے میں ناکام رہے تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

آلیور مر گیا، تو جمی نے دوبارہ سرحد پار آنا جانا شروع کر دیا۔

ابتداء میں وہ ایک ہی راستے سے آتا جاتا رہا مگر اس طرح پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔اس نے جلد ہی دو

نئے راستے ڈھونڈ لیے، پال کیناٹ کی طرح نئے مقامات پر بھی چند مقامی افراد کا تعاون حاصل ہوگیا۔ وہ ہمیشہ کسانوں کا بھیس بدل کر سفر کرتا۔ ہاتھ میں بیلچہ اور کلہاڑا ہوتا اور پیٹھ پر بوری جس میں آلوؤں کے ڈھیر میں خفیہ کاغذات رکھے ہوتے۔ سرحد سے واپسی کے بعد وہ قریبی اسٹیشن پہنچتا، چپکے سے لباس تبدیل کر کے سارا سامان آلوؤں کی بوری میں بند کر دیتا اور اسے اسٹیشن کے امانت خانے میں رکھوا دیتا۔

تین سال میں اس نے اٹھانوے بار سرحد پار کی لیکن کبھی جرمنوں کے ہتھے نہ چڑھا۔

بڑی وجہ صحیح منصوبہ بندی اور اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے کے لیے ان تھک محنت تھی۔ وہ اپنے طے شدہ پروگرام کی سختی سے پابندی کرتا، اور کبھی ایک دن سے زیادہ لیٹ نہ ہوتا، بارش، طوفان، اندھیرا، کوئی شے اس کا راستہ نہ روک سکتی۔

چنانچہ وقت مقررہ پر وہ سرحد کے قریب پہنچتا تو وہاں مقامی دوست پہلے سے اس کے منتظر کھڑے ہوتے۔ ان سے پتا چل جاتا کہ علاقے میں جرمن موجود ہیں یا نہیں؟

دوستوں کی مدد اور تعاون کے علاوہ خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی نازک موقعوں پر گرفتار ہوتے ہوتے بھی بچا۔

ایک بار پال کیناٹ کی طرف سے ''اوکے'' کا سگنل ملا۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور آگے بڑھا۔

جرمنوں نے کچھ عرصے سے سرحد پر خاردار باڑھ بھی لگا دی تھی۔ جمی نے قریب پہنچ کر آلوؤں کی بوری اور کلہاڑا دوسری طرف پھینکے۔ پھر تار کاٹ کر گزرنے کا راستہ بنا رہا تھا کہ پیچھے سے جرمن پولیس کے کتے نے اچانک جھپٹ کر اس کی ٹانگ دبوچ لی۔

جمی اس غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ پولیس کا کتا خاموشی سے اس کی ٹانگ دبوچے کھڑا تھا۔ جمی نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی بہت کوشش کی، مگر بے سود خالی ہاتھوں سے خونخوار کتے کا مقابلہ کرنا ناممکن ہی تھا۔ پھر یہ خطرہ بھی تھا کہ جرمن گشتی دستہ کتے کی تلاش میں اس طرف نہ آ نکلے۔ اس نے بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اتفاق سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی اٹھائی اور کتے کے منہ میں ٹھونس دی، لکڑی کتے کے پیٹ میں گھستی چلی گئی۔ وہ بری طرح تلملایا، مگر ٹانگ پھر بھی اس نے نہ چھوڑی۔ جمی نے اور زور لگایا۔ کتے کا منہ کھل گیا اور جمی کی ٹانگ آزاد ہوگئی۔ کتا ایک دو بار تڑپا اور ٹھنڈا ہوگیا۔

جمی نے اس کی لاش ایک طرف کی اور تیزی سے سرحد پار پہنچ گیا۔ لیکن ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ درخت کی اوٹ سے سوئس پہرے دار بندوق تانے نمودار ہوا۔ بندوق کا رخ اس کی طرف تھا، جمی پریشان ہوگیا۔

معاً پہرے دار جرمن زبان میں چلّایا۔ ''خبردار''۔

جمی نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ دو جرمن سپاہی اس کی طرف نشانہ باندھے کھڑے تھے۔ سوئس پہرے دار نے للکارا تو انہوں نے بندوقیں نیچی کرلیں اور زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

ایک مرتبہ دیر سے واپسی ہوئی۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا تیزی سے چلا جارہا تھا۔ رات بے حد تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ معاً کسی نے جرمن زبان میں زور سے رک جانے کا حکم دیا۔ آواز بالکل قریب سے آئی تھی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ چند لمحے تک خاموشی رہی، پھر وہی آواز بلند ہوئی۔

''ہالٹ'' اور اس کے ساتھ ہی گھوڑا چڑھانے کی مخصوص آواز آئی۔ جمی نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا، لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ سوچنے لگا، اس تاریکی میں مجھے تو چند قدم دور کے درخت بھی نظر نہیں آرہے، پھر میں کیسے دکھائی دے رہا ہوں؟

اچانک اس کی نظر اپنے سلگتے ہوئے سگریٹ پر پڑی جو تاریکی میں انگارے کی طرح روشن تھا۔ پل بھر میں سارا معمہ حل ہوگیا۔ چغلی سلگتے ہوئے سگریٹ نے کھائی تھی۔ جمی کا تو اس طرف دھیان بھی نہ گیا تھا۔ اب جو گیا تو اس نے فوراً کوٹ کے کالر میں سے پن نکالی سگریٹ کو اس میں پرو دیا، اسے قریبی درخت کے تنے میں گاڑا اور خود دبے پاؤں دوسری طرف نکل گیا۔

''تڑ......تڑ......تڑ......تڑ'' کی دھماکے دار آواز سے جلد ہی سارا جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ جرمن سپاہی اس کے دھوکے میں سلگتے سگریٹ پر دیر تک گولیاں برساتے رہے اور وہ دور محفوظ مقام پر کھڑا دل ہی دل میں ان کی بے وقوفی پر مسکراتا رہا۔

☆☆☆

اتحادی فوجیں تیونس میں داخل ہوئیں تو فرانس میں جرمن فوج اور گولہ بارود کی وسیع پیمانے پر نقل وحرکت شروع ہوگئی اور دن رات خصوصی ٹرینیں آنے جانے لگیں۔ میجر بی نے جمی سے اس نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھنے کی درخواست کی۔ جمی نے اپنے ایجنٹوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والے ڈویژنوں، ان کے کمانڈروں کے نام اور منزل مقصود معلوم کرنے پر مامور کردیا۔ سارا کام ریل کے ذریعے انجام پا رہا تھا۔ اس لیے اہم اور بڑے جنکشنوں پر متعین ریلوے ملازم بہت مفید ثابت ہوئے۔ جمی کو فوجی نقل وحرکت کی جو رپورٹیں اور سامان حرب کی تفصیلات ملیں، وہ اس نے فوراً سرحد پار پہنچادیں۔ 1942ء کے آخر تک جمی کے ایجنٹوں کی تعداد ساٹھ ہوگئی۔ ان سے رپورٹیں اکٹھی کرنے اور میجر بی تک پہنچانے کا کام بے حد صبر آزما اور تھکا دینے والا تھا۔ جمی ہوشے وطن عزیز کی خاطر تمام مصائب اور تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کا بیشتر وقت ریل گاڑیوں کے سفر میں کٹتا، ان دنوں ریل کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ جرمن اچانک گاڑی روک کر سواریوں کے شناختی کارڈ اور کاغذات چیک کرنے لگتے تھے۔

جمی نے جرمنوں کے خوف سے پہلا دفتر بند کرکے پیرس کے مضافات میں ایک نئی فرم کھول لی تھی۔

شناختی کارڈ میں اسے فرم کا ایجنٹ اور سیلز مین ظاہر کیا گیا تھا۔

ریل گاڑی میں چیکنگ کے خطرے سے بچنے کے لئے وہ ہمیشہ دیجان کے ریلوے اسٹیشن پر اترتا اور وہاں سے سرحد تک کا فاصلہ سائیکل پر طے کرتا۔

کچھ عرصے بعد جرمنوں نے گاڑیوں کی چیکنگ میں کسی قدر نرمی برتنا شروع کردی تو جمی سرحد کے آخری اسٹیشن تک ریل گاڑی میں سفر کرنے لگا۔

اب اچانک چھاپے مارنے کی بجائے ہر مہینے کے چند مخصوص دنوں میں مختلف گاڑیوں کے سامان اور کاغذات کی جانچ پڑتال کی جاتی۔ جمی کو اس کے دوست پہلے سے مطلع کردیتے تھے کہ چھاپہ کس روز پڑ رہا ہے، وہ اس دن سفر نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ دوست اطلاع نہ دے سکے۔ وہ سوئٹزر لینڈ سے واپس آرہا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف خفیہ دستاویز تھیں بلکہ جرمن ہائی کمان کے فوٹو بھی تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ پہلے اچانک معلوم ہوا کہ اگلے اسٹیشن پر چھاپہ پڑنے والا ہے

فرار کی..... صرف ایک ہی صورت تھی، فوراً کہیں چھپ جائے۔ وہ اٹھا اور تیزی سے گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا، مگر چھپنے کی کوئی جگہ نہ ملی۔ آخر دروازے سے لٹک کر گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوگیا۔ وہ ایک بوڑھا فرانسیسی تھا۔

جمی بولا۔ ''خدا کے لیے، مجھے کہیں چھپادو، میں سخت مصیبت میں ہوں''۔ گارڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

جمی نے دوبارہ کہا۔ مجھے اگر جلد ہی چھپنے کی جگہ نہ ملی تو میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا۔'' یہ کہہ کر جمی دروازے کی طرف بڑھا۔ گارڈ نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آؤ...... میرے ساتھ آؤ......''

گارڈ کے ڈبے میں ایک طرف کتوں کا چھوٹا سا پنجرہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خالی تھا۔ گارڈ نے جمی کو اس میں بند کرکے تالا لگا دیا۔ پنجرے میں سخت ناگوار بو اور گھٹن تھی۔ لیکن جمی جان کے خوف سے سکڑ سمٹ کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ پندرہ، بیس منٹ بعد اسٹیشن آگیا اور گاڑی رک گئی۔

پلیٹ فارم پر بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک اور جرمن زبان میں اونچی اونچی آوازوں سے باتیں کرنے کا شور سنائی دیا۔ اس کے بعد فوجی تمام ڈبوں میں پھیل گئے۔ دو فوجی گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ جمی سانس روکے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پنجرے کی جالی میں سے چمکتے ہوئے جرمنی فوجی بوٹ صاف نظر آرہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر پنجرے کو ٹھوکر لگائی۔ گارڈ سے کچھ پوچھا۔ جمی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تاہم قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے فوجی ڈبے سے اتر گئے اور گاڑی دوبارہ چل دی۔

گارڈ نے تالا کھول کر جمی کو باہر نکالا تو اس کا حلیہ دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مدت سے پنجرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ جمی کا منہ اور کپڑے سب اٹ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، ابھی ابھی کوئلے کی کان سے برآمد ہوا ہے۔ گارڈ نے اسے بتایا...... اس قسم کے پنجرے اب گاڑیوں میں نہیں بنائے جاتے، یہ تو پہلی جنگ عظیم کا ایک پرانا پنجرہ ہے۔

☆☆☆

1943ء کے موسم گرما میں جمی سے ایک ہوائی کے بارے میں تفصیلات مہیا کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ اڈہ پیرس کے نواح میں تھا۔ اتحادیوں کو خبر ملی تھی کہ جرمن فضائیہ کے طیارے یہاں سے پرواز کرکے لندن پر بمباری کرتے ہیں۔

اس کا رن وے بیس میل لمبا اور تین حصوں میں منقسم تھا۔ایک حصہ پروازوں کے لیے مخصوص تھا ،اسے بڑی مہارت سے کیموفلاج کیا گیا تھا۔دوسرے حصے میں سرچ لائٹس اور طیارہ شکن توپیں نصب تھیں۔تیسرا حصہ ویران اور اجاڑ تھا۔

جمی کو ہر حصے کی الگ الگ نشان دہی کرنا تھی۔اس نے سوچ بچار کے بعد یہ کام مارگٹ کے سپرد کیا جو آلیور کے بعد اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد اور ذہین ایجنٹ تھا۔

ہوائی اڈے پر اگرچہ پہرے کا نہایت کڑا انتظام تھا لیکن رقبے کی غیر معمولی وسعت کی وجہ سے زیادہ موثر نہ تھا۔مارگٹ آسانی سے ممنوعہ علاقے میں داخل ہوگیا۔اس کے پاس ایک بڑا نقشہ اور دوربین تھی اڈے کے ایک طرف گرجا اور چند گھرے نظر آرہے تھے۔وہ چھپتا چھپاتا قریب پہنچا تو بڑا دلچسپ منظر تھا۔

دشمن طیاروں کو دھوکا دینے کے لیے مصنوعی عمارتیں کھڑی کی گئی تھیں۔رہائشی گھرے نظر آنے والی عمارت ورکشاپ تھی۔چند گز پرے ایک بھاری بھرکم ٹریکٹر کھڑا دکھائی دیا۔مارگٹ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا،اچانک پیچھے سے ”ہینڈز اپ“ کی تیز اور غصیلی آواز سن کر چونک گیا۔پلٹ کر دیکھا،چند قدم کے فاصلے پر ایک جرمن سپاہی بندوق تانے کھڑا تھا۔راہ فرار اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔اس نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا دیے۔سپاہی اسے گارڈ روم میں لے آیا،جہاں فضائیہ کا ایک افسر بیٹھا تھا۔

مارگٹ نے اپنی کہانی پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔اس نے بتایا،ہوائی اڈے کے قریب گزرتے ہوئے گرجے اور دوسری عمارتوں پر نظر پڑی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔کچھ عرصے پہلے جب اس علاقے میں رہائش پذیر تھا،تو یہاں کوئی عمارت نہ تھی۔بس،یہی تجسس ادھر لے آیا۔

دوربین اور نقشے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

”یہاں سے چند میل دور ایک قصبے میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔میں نے یہ دوربین اس سے لی تھی،اب واپس کرنے جارہا ہوں۔“ یہ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔اس نے فی الحقیقت دوربین چند دن پہلے ایک دوست سے حاصل کرلی تھی۔نقشے کے متعلق بتایا۔”یہ اسٹیشن کے ایک بینچ پر پڑا تھا اور اس پر جو نشان نظر آتے ہیں،وہ اس نے نہیں لگائے۔“

سپاہیوں نے گھنٹا بھر اس کی خوب مرمت کی،مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔آخر اسے جرمن خفیہ پولیس ”گسٹاپو“ کے حوالے کردیا گیا۔

گسٹاپو نے اس پر تشدد کے مختلف طریقے آزمائے۔پھر تحریر کا نمونہ لے کر ایک تحریر شناس کو بھجوایا،اور کہا۔

”اگر نقشے کے مندرجات سے اس تحریر کی مشابہت ثابت ہوگئی تو تمہیں جاسوس قرار دے کر فوراً گولی ماردی جائے گی“۔مارگٹ خاموش رہا۔

اس کی کوٹھری تیسری منزل پر تھی۔مار پیٹ سے اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔پھر بھی اس کی ہمت پست نہ ہوئی،وہ رہ رہ کر فرار ہونے کی سوچتا رہا۔اس نے اگرچہ تحریر کا نمونہ دیتے وقت طرز تحریر بدلنے کی کوشش چاہی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکا تھا۔اسے سوفیصد یقین تھا کہ گسٹاپو کی تحریر شناس ونگ کے ماہرین کی رپورٹ اس کے لیے موت کا پیغام لے کر آئے گی۔

موت اور زندگی کے درمیان صرف ایک ہی رات تھی۔اس نے روشندان کا تختہ اکھیڑنے اور جالی کاٹنے کی سرتوڑ کوشش شروع کردی۔خالی ہاتھ یہ کام کرنا آسان نہ تھا۔ہاتھوں کے ناخن اکھڑ گئے،اور انگلیاں لہولہان ہوگئیں مگر آدھی رات کے قریب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔اب کھڑکی سے کودنے کا مسئلہ تھا۔کھڑکی زمین سے کم از کم پچاس فٹ اونچی تھی۔اتنی بلندی سے کودنا،ہڈی پسلی تڑانے کے ہی مترادف تھا۔لیکن اس کے سواء اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”گولی کھا کے کتے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ کرکے مرا جائے۔“

اس نے سوچا۔پھر بستر کی چادریں اور کمبل،جسم پر خوب اچھی طرح لپیٹ لئے،تاکہ زمین پر گرتے وقت کم سے کم چوٹ آئے۔اور پھر اس نے چھلانگ لگادی......

اتنی بلندی سے کود کر زندہ بچ جانا فی الواقع ایک معجزہ ہی تھا۔وہ نہ تو بے ہوش ہوا نہ کسی قسم کی چوٹ لگی،لیکن جونہی اٹھ کر کھڑا ہوا،جسم میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں،اور وہ چکرا کر گر پڑا۔پھر کہنیوں اور ہاتھوں کے بل،رینگتا ہوا قید خانے کی عمارت سے دور نکل آیا۔

فرلانگ بھر کے فاصلے پر چند مکانوں کے دھندلے دھندلے نقوش نظر آرہے تھے۔وہ چوپایوں کی طرح ہاتھ

پاؤں پر چلتے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کی کوشش کرنا چاہی، مگر طاقت جواب دے گئی اور بے ہوش ہو کر وہیں دہلیز پر اوندھے منہ گر پڑا۔

ہوش آیا تو ایک آرام دہ بستر پر خود کو پڑے پایا۔ سرہانے ایک بوڑھی عورت شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مارگت نے اپنی داستان، اس کو سنائی اور درخواست کی کہ اسے شہر پہنچا دیا جائے۔ بڑھیا نے بڑی مشکل سے اس کو شہر کے ایک ہوٹل تک پہنچایا۔ جمی نے یہاں ایک کمرا مستقل طور پر کرائے پر لے رکھا تھا۔ مارگت اسی کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

تیسرے دن جمی آیا تو وہ بے ہوش تھا۔ جمی نے بھاگ دوڑ کر کے اسے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل کرایا۔ ایکسرے رپورٹ سے پتا چلا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی جلد ٹھیک ہونے کی توقع نہ تھی۔ پھر جرمنوں کے خوف سے پیرس میں اس کا علاج بھی نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جمی ایک ہفتے بعد اسے کسی نہ کسی طرح سوئٹزرلینڈ چھوڑ آیا۔

سرحد پار سے واپسی پر ویلٹی نے خبر دی کہ جرمن مختلف مقامات پر کچھ نئی اور عجیب عجیب عمارتیں بنوا رہے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والا میٹریل بہت قیمتی اور عمدہ قسم کا ہے۔

جرمن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان عمارتوں کا محل وقوع بالکل درست ہونا چاہیے۔

جمی نے ایک پادری کا بھیس بدل کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر ناکام رہا۔ جرمن واقعتاً عجیب اور پُراسرار عمارتیں بنوا رہے تھے۔ لیکن وہ ان کا مصرف معلوم نہ کر سکا۔ ایک جگہ مشہور تھا کہ یہ گیراج تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ لیکن آبادی سے باہر گیراج تعمیر کرنے کی وجہ جمی کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ پھر یہ عمارتیں نہ تو زیادہ اونچی تھیں اور نہ طویل۔ ان میں آخر کس قسم کی گاڑیاں رکھی جاتیں؟

ایک عجیب چیز جو ہر جگہ مشترک نظر آئی، وہ کنکریٹ کے چبوترے تھے۔ ان سب کا ڈیزائن ایک تھا۔ جمی نے قطب نما کی مدد سے ان کا رخ معلوم کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ سب کا رخ ایک ہی سمت یعنی شمال مغرب کی طرف تھا۔ اسے کچھ شک سا ہوا اور خیال کا کوندا برق کی طرح لپکا۔ جرمن ضرور کسی نئے ہتھیار کی تیاریوں میں مصروف ہیں جس کا سب سے بڑا نشانہ برطانوی دارالحکومت لندن ہوگا۔ اس نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے میجر بی کو پہنچا دی۔

برطانوی حکومت کو خبر تھی کہ جرمنی ایک نیا اور خوفناک ہتھیار تیار کر رہا ہے، لیکن یہ علم نہ تھا کہ یہ ہتھیار خود برطانیہ کے خلاف استعمال ہوگا۔ اس ہتھیار کی ہلاکت خیزی کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔

جمی کے پیغام سے وزارت دفاع کے اعلیٰ حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ فوراً جوابی پیغام بھیجا گیا۔ تمام معلومات اکٹھی کی جائیں، اور عمارتوں کا ماسٹر پلان حاصل کیا جائے۔

جمی اور اس کے ساتھیوں نے دن رات ایک کر کے ضروری معلومات حاصل کیں۔ تین ہفتوں کے اندر اندر ساٹھ سے زیادہ نئی بننے والی عمارتوں کا سراغ لگایا۔ ہتھیار کے بارے میں وقتی طور پر کچھ پتا نہ چل سکا۔ ابھی تک کوئی ہتھیار فرانس نہیں لایا گیا تھا۔ جمی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

جلد ہی ایک دوست کی وساطت سے اینڈرے نامی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اینڈرے انجینئر تھا اور ایک جرمن انجینئر کی نگرانی میں چبوترے تعمیر کرنے میں مامور تھا۔

جمی نے اسے وطن کی آزادی کا واسطہ دے کر ماسٹر پلان کا بلیو پرنٹ اڑانے کی ترغیب دی۔ اینڈرے پس و پیش کرنے لگا۔ یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔ بلیو پرنٹ، جرمن انجینئر ہر وقت اپنے اوور کوٹ کی جیب میں رکھتا تھا، جسے وہ صرف صبح کے وقت ٹائلٹ جاتے وقت اتارتا تھا۔

اتحادیوں کی طرف سے ماسٹر پلان حاصل کرنے کا اصرار برابر جاری تھا۔

جمی نے بھی اینڈرے کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخرکار اسے منانے میں کامیاب ہوگیا۔

ایک صبح جرمن انجینئر حسب معمول اوور کوٹ اتار کر واش روم گیا تو اینڈرے نے موقع غنیمت جان کر اس کی جیب سے بلیو پرنٹ نکالا اور جلدی جلدی ٹریس کر کے واپس رکھ دیا۔ تین منٹ بعد جرمن انجینئر باہر نکلا تو اینڈرے پورے انہماک سے اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔

اگلے دن اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے رخصت لے لی اور سیدھا جمی ہوشے کے پاس پہنچا۔ وہاں ان دونوں نے رات بھر بیٹھ کر ٹریس شدہ خاکے کی مدد سے ٹھیک اور صاف نقشہ تیار کیا۔ صبح ہوئی تو جمی نقشہ لے کر سوئٹزرلینڈ روانہ ہوگیا اور اینڈرے نے اپنے کیمپ کی راہ لی۔

کچھ عرصے بعد اینڈرے نے جمی کو نیا ہتھیار پہنچ

اطلاع دی۔ یہ وی۔ون (V-1) تھا، ہواباز کے بغیر چلنے والا طیارہ نما بم۔

مسجربی کی وساطت سے یہ خبر لندن پہنچی تو فضائیہ فوراً حرکت میں آ گئی۔ اور چند دن بعد بمباری کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی۔

وی ون کے دوسرے مستقروں پر بھی فضائی حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مستقر بالکل تباہ و برباد ہو گئے اور باقی ماندہ کو شدید نقصان پہنچا۔ ہٹلر، ان مرکزوں سے لندن پر وی ون کی بارش کر کے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن جمی اور اس کے ساتھیوں نے اسے پورا نہ ہونے دیا۔ یہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جمی کو اس کی خدمت کے صلے میں برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز (D.S.O) دینے کی سفارش کی گئی۔

یہ برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز تھا، جو کسی غیر ملکی کو دیا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

جمی کی زندگی خطرات سے عبارت تھی۔ وہ کسی وقت بھی گسٹاپو کے ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ خود اسے کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ وی ون کے مراکز کی تباہی سے جرمن ہکا بکا رہ گئے تھے۔ گسٹاپو ”تخریب کاروں“ کا سراغ لگانے کے لیے پوری تندہی سے سرگرم ہو گئی۔ جمی نے اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہر ممکن احتیاطی تدابیر اختیار کر لیں۔ وہ کسی جگہ ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ جیب میں ہر وقت شناخت کے کاغذات ہوتے۔ اگرچہ ان میں سے اس کا نام اور پتا سب جعلی ہوتا تھا۔ حتی الامکان اجنبیوں سے اغراض برتنے کی کوشش کرتا، مبادا ان میں کوئی گسٹاپو کا ایجنٹ نہ ہو۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ جمی سے بھی آخر ایک روز فاش غلطی ہو گئی۔ ایک ایجنٹ نے کسی خاتون سے تعارف کرایا۔ اس کے شوہر نے طیاروں کی رفتار کنٹرول کرنے والا آلہ ایجاد کیا تھا اور وہ اسے اتحادیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کا خواہش مند تھا۔ جمی نے اسے اپنے دفتر کا پتا دیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ دفتر میں وہ بہت کم بیٹھتا تھا۔ خاتون روزانہ چکر لگاتی مگر ملاقات نہ ہوتی۔ جمی کو شک تھا کہ خاتون گسٹاپو کی آلہ کار ہے۔ وہ اسی لئے ملاقات سے گریزاں رہا، اور اپنی سیکریٹری کو بھی سختی سے منع کر دیا کہ وہ اسے کوئی اتہ پتہ نہ دے۔ چنانچہ جب وہ آتی تو سیکریٹری، یہ کہہ کر اسے ٹال دیتی کہ جمی فرانس سے باہر گیا ہوا ہے۔

ایک دن خاتون آئی تو بڑی اداس اور غمگین تھی۔ اس نے نہایت افسردہ لہجے میں سیکریٹری کو بتایا کہ، ”میرے ایک عزیز کی جان خطرے میں ہے، اسے فرانس سے نکالنا ہے اور یہ کام جمی ہی کر سکتا ہے۔“ سیکریٹری کا دل پسیج گیا۔ اس نے اسے ہوٹل پیلس کا پتا دے دیا۔ جہاں اگلے دن صبح نو بجے جمی کو اپنے چند ایجنٹ ساتھیوں سے ملاقات کرنا تھی۔

جمی وقت مقررہ سے چند منٹ پہلے ہوٹل پیلس پہنچا۔ یہاں وہ پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا، اور کوئی بھی خطرہ محسوس نہ کیا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول کچھ عجیب سی وحشت اور بے چینی کا احساس ہوا۔ کوئی غیبی آواز اندر جانے سے بار بار منع کر رہی تھی۔ وہ توہمات کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ اس قدرتی وارننگ کو نظر انداز کر کے ہوٹل میں داخل ہوا۔

ویلٹی اور رابرٹ اس کے منتظر تھے۔ جمی کے بیٹھتے ہی باتیں چھڑ گئیں۔ معاً پیچھے سے کسی کی تیز اور کرخت آواز سنائی دی۔

”خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ہاتھ اوپر اٹھالو، جرمن پولیس......“

جمی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ چاروں طرف سے سفید کپڑوں میں ملبوس جرمن سپاہیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ انہیں فوراً ہتھکڑیاں پہنادی گئیں۔

تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیشی ہوئی تو کمیشن کے صدر گڈی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”تم برطانیہ کے جاسوس ہو؟“

جواب ملا۔ ”نہیں، میں ایک محب وطن فرانسیسی ہوں۔ وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہوں۔“

تنظیم کے ارکان کا نام معلوم کرنے کے لیے انہوں نے بڑے سبز باغ دکھائے۔ پھر مایوس ہو کر تشدد پر اتر آئے لیکن جمی نے کچھ مان کر نہیں دیا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔

”میرے ساتھ کوئی نہیں، میں تنہا ہوں۔“

ایک دن چار پانچ لحیم شحیم سپاہی اسے برفیلے پانی میں غوطے دے رہے تھے کہ گڈی آ گیا۔

ہاتھ میں جمی کی ڈائری تھی جو جامہ تلاشی کے وقت برآمد ہوئی تھی۔ اس میں ایک دن بعد کی تاریخ میں جمی نے سی جی نامی کسی شخص سے اسٹیشن پر ملاقات کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔

گڈی نے سی جی کے بارے میں پوچھا۔ یہ جمی کے ایک نئے ایجنٹ چارلس جیلارڈ کا مخفف تھا۔ جمی کو اس سے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ملاقات کرنا تھی۔ وہ خاموش رہا۔

گھونسوں سے اس کی خوب تواضع کی گئی۔

صبح دو سپاہیوں نے اسے ساتھ لیا اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ صدر دروازے پر انہوں نے موٹر کھڑی کی اور انتظار کرنے لگے۔ جمی سے کہا گیا کہ اگر تم نے سی جی کی نشاندہی نہ کی تو فوراً گولی مار دی جائے گی۔ جمی چپ رہا، لیکن دل میں پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ چارلس جیلارڈ کو دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے نہیں دے گا۔ گاڑی آئی تو پولیس کے سپاہی چوکس ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد مسافر اسٹیشن سے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ جمی نے دیکھا کہ باہر آنے والا پہلا شخص چارلس جیلارڈ تھا۔ جمی بے اختیار پریشان ہو گیا۔ یہ پریشانی اس قدر واضح اور نمایاں تھی کہ سپاہیوں کی اگر نظر اس پر پڑ جاتی تو فوراً بھانپ لیتے اور چارلس جیلارڈ کو دھر لیتے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ تھے۔

چارلس جیلارڈ بریف کیس ہاتھ میں لیے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، فوراً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک ایک کرکے سب مسافر چلے گئے۔ اب وہاں ریلوے کے عملے کے سوا کوئی آدمی نہ تھا۔ گاڑی بھی جا چکی تھی۔ سپاہیوں نے جمی کو برا بھلا کہا اور پھر دونوں اس پر پل پڑے۔ پستول کے دستے مار مار کر اس کا سر اور چہرہ لہولہان کر دیا۔

ہفتے بھر کی مسلسل پوچھ گچھ اور مار پیٹ کے بعد اسے سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ دس دن بعد تحقیقاتی کمیشن نے جمی کو سزائے موت سنا دی۔

ولیٹی اور رابرٹ کو عدم ثبوت کی بناء پر رہا کر دیا گیا۔

جمی موت کا منتظر تھا کہ ایک دن اسے اطلاع ملی کہ اس کی سزائے موت، عمر قید میں بدل گئی ہے۔ جیلر نے بتایا۔ ''اب تم بیگار کیمپوں میں مشقت کرو گے۔''

بیگار کے لیے منتخب کیے جانے والے لوگ الگ کیمپوں میں رکھے جاتے تھے۔ اسے بھی ایک ایسے ہی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ پھر اسے جرمنی جانے کا حکم ملا۔ جمی دوسرے قیدیوں کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچا تو سیکیورٹی پولیس نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

قیدی مال گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہونے لگے۔ جگہ کم تھی اور آدمی بہت زیادہ۔ ڈبے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور ابھی آدھے سے زیادہ قیدی پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ وہ قطار باندھے منتظر تھے کہ جگہ ملے تو اندر جائیں۔ اچانک سیکیورٹی پولیس ان پر اندھا دھند کوڑے برسانے لگی۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی۔ قیدی کوڑوں کی مار سے بچنے کی خاطر دھکم پیل کرکے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔

تین دن اور دو راتوں کے مسلسل اور پریشان سفر کے بعد گاڑی منزل مقصود پر پہنچی۔ ڈبہ ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ بھوک پیاس اور نقاہت کے مارے کئی قیدی راستے میں ہی چل بسے تھے۔ زندوں کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ بمشکل گرتے پڑتے گاڑی سے اترے اور تقریباً گھسٹتے ہوئے کیمپ تک پہنچے۔ جہاں انہیں مختلف بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔

صبح کیمپ کمانڈر نے معائنہ کیا۔ اور ہر شخص کو اس کے پیشے اور استعداد کے مطابق کام سونپ دیا گیا۔ جمی کے حصے میں اسلحے کا شعبہ آیا جہاں بندوق کے چھوٹے چھوٹے پرزے تیار ہوتے تھے۔

کیمپ کی زندگی عذاب سے کم نہ تھی۔ قیدیوں سے لگاتار بارہ گھنٹے سخت مشقت لی جاتی تھی۔ خوراک بے حد ناقص اور برائے نام دی جاتی تھی۔ پہرے دار معمولی قصور پر ٹھوکریں مار مار کر ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ لوگوں کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور چند ماہ کے اندر اندر وہ ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر رہ گئے۔ جمی کی حالت بھی دوسروں سے مختلف نہ تھی۔ البتہ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ جرمنوں سے نفرت کا جذبہ اور شدید تر ہونے لگا اور اس نے اس کی تسکین کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا۔

اسے روز شام تک دو سو پرزے پالش کرنے ہوتے تھے۔ مگر وہ کبھی ایک سو سے زیادہ پالش نہ کرتا۔ کچھ عرصے بعد اس نے پرزے چرانا شروع کر دیے۔ ہر روز تین چار اچھے خاصے پرزے اڑاتا اور کیمپ کے ٹوائلٹ میں پھینک دیتا۔ یہ حرکت صریحاً سبوتاژ تھی۔ پکڑے جانے کی صورت میں سزائے موت یقینی تھی لیکن قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

ورکشاپ سے واپسی پر ہمیشہ ہر ایک کی تلاشی لی جاتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ سپاہی اپنی مرضی سے جن قیدیوں کو چاہتے، روک لیتے تھے۔ کیمپ میں ملنے والی چیزوں کے علاوہ جو شے بھی برآمد ہوتی، چاہے وہ سگریٹ ہوتا یا معمولی ٹوتھ برش، قیدی کو چوری کا ملزم قرار دے کر اس کی خوب پٹائی کرتے۔

کو جمی کے ساتھ قطار میں آگے پیچھے کھڑے ہوئے قیدیوں کی تلاشی لی گئی، لیکن وہ ہر بار صاف بچ گیا۔ البتہ وہ ایک بار کیمپ سے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ دراصل ایک ساتھی بیمار تھا۔ جمی اس کے لیے لنگر سے بچا کھچا کھانا لارہا تھا کہ سپاہی نے دیکھ لیا۔

فوراً پچیس کوڑوں کی اسے سزا ملی۔ بیس کوڑے تو اس نے صبر اور استقلال سے کھائے، پھر قوت برداشت جواب دے گئی، اور وہ نڈھال ہو کر اوندھے منہ گر پڑا۔ کوڑے مارنے والا سپاہی غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اسے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں جمی جانتا تھا، جب تک وہ کھڑا نہیں ہوگا...... جرمن سپاہی برابر اسی طرح اسے ٹھوکریں مارتا رہے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کئی قیدی مر چکے تھے۔

اٹھنے کی اس نے کوشش کی، مگر جسم میں طاقت ہوتی تو وہ اٹھتا۔ آخر منڈیر کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھا اور باقی کے پانچ کوڑے کھائے۔

☆☆☆

جون کے وسط میں خبر پھیلی کہ اتحادی نارمنڈی پہنچ گئے ہیں لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ جرمن ابھی تک فرانس میں برسرِپیکار ہیں یا لڑائی بند ہو گئی ہے۔ فتح کی خبر سننے کی آس میں کئی مہینے بیت گئے۔

1944ء کا موسم خزاں شروع ہوا تو سیکڑوں قیدی مایوسی اور نقاہت کا شکار ہو کر دم توڑ گئے۔

جمی اور اس کے ساتھی تازہ جنگی صورتِ حال سے بے خبر تھے کہ اپریل 1945ء میں کیمپ کے گرد و نواح سے توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی جنگ کا دائرہ پھیل کر جرمنی تک آپہنچا تھا۔ انہوں نے دھیان نہ دیا۔ کیمپ سے زندہ بچ نکلنے کی کسی کو امید نہ تھی۔

ایک دن صبح سویرے کیمپ کے بیس ہزار قیدیوں کو صحن میں جمع ہونے کا حکم ملا۔ اعلان کیا گیا کہ انہیں دوسرے بیگار کیمپ میں بھیجا جارہا ہے۔ چند منٹ بعد انہیں ٹرکوں میں ٹھونس کر لیوبک کی بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں کئی بحری جہاز لنگر انداز تھے۔ قیدیوں کو ان کے تہ خانوں میں بھر کر کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے گئے۔

جمی نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کونے میں بہ مشکل جگہ بنائی۔ قیدی یہاں کئی دن تک بند رہے۔ گاہے گاہے غذا اور پانی دینے کے لیے کھڑکی کھولی جاتی تو وہ باہر کی جھلک دیکھ لیتے، ورنہ تاریکی میں پڑے اونگھتے رہتے۔ کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ رات کب شروع ہوئی اور دن کب نکلا؟

جمی کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے کلبلاتے اور وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگتا، کئی قیدیوں نے تو یہاں تک مشہور کر دیا کہ اب بس ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے، جرمن انہیں سمندر میں غرق کرنے جارہے ہیں۔

ایک دن جہاز چلتے چلتے رک گیا۔ بھاری بھرکم بوٹوں سے عرشہ لرزنے لگا۔ اونچی اونچی آوازوں کا شور صاف سنائی دینے لگا۔ قیدی دم سادھے، چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پھر فائروں کی آواز گونجی اور خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد جہاز دوبارہ چل پڑا۔ ساتھ ہی تہ خانے کے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں۔ چند سپاہی اندر داخل ہوئے۔ جمی کی نظر ان کی وردی پر پڑی تو فرطِ حیرت سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ برطانوی بحریہ کے سپاہی تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ سمجھا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔

ایک برطانوی جہاز نے ان کا جہاز نرغے میں لے کر جرمنوں سے ہتھیار رکھوا لیے تھے۔ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور جرمنی کو شکست ہو گئی تھی۔

آخر ان کا جہاز سویڈن کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ساحل پر ریڈ کراس کے نمائندے ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ جمی چند ہفتے تک اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ تب کہیں جا کر کھوئی ہوئی صحت کسی قدر بحال ہوئی۔

18 جون 1945ء کو شہنشاہ کے حکم سے برطانوی فضائیہ کا ایک طیارہ اسے لینے کے لیے سویڈن پہنچا۔

اس عظیم الشان خدمت کے صلے میں اسے ''ڈی۔ایس۔او'' کا اعلیٰ جنگی اعزاز دینے کے لیے لندن میں خصوصی تقریب منعقد کی جارہی تھی، لیکن ہوا باز کو خالی ہاتھ واپس لوٹنا پڑا۔ کیونکہ جمی صرف چند گھنٹے پہلے قیدیوں کے ایک گروپ کے ساتھ ریڈ کراس کے طیارے میں فرانس روانہ ہو چکا تھا۔ فرانس، جس کی خاطر اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور بے پناہ مصائب برداشت کیے۔ اب وہ آزاد فرانس کا آزاد شہری تھا۔

زندگی کا مقصد حصولِ مسرت نہیں، بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔

افسانہ

جرمِ وفا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

دوسری جنگِ عظیم کے وقت بے شمار حیران کن واقعات رونما ہوئے۔ انہی واقعات میں سے ایک واقعہ جو انسانی جبلت کی نشاندہی کرتا ہے، بطورِ خاص ہٹلر کے مزاج کی تشریح ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران ایسے واقعات بے شمار رونما ہوئے کچھ سامنے آئے کچھ مخفی رہے۔

دوسری جنگِ عظیم کا ایک انوکھا واقعہ

وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اہم عہدے پر فائز تھا اور اس عہدے تک پہنچنے میں نہ صرف اس کی ذہانت اور بہادری کو دخل تھا بلکہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت نے اس کے دل میں عزم و جرأت کے وہ چراغ روشن کردیے تھے جو کسی صورت نہیں بجھ سکتے۔

وہ پوجنے کی حد تک ہٹلر کی پرستش کرتا تھا اور ہٹلر کو ملک و قوم کا عظیم سرمایہ تصور کرتا تھا۔

ہرچند کہ وہ ہٹلر سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اس کے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ کبھی اسے یہ سعادت نصیب ہوسکے کہ وہ اس عظیم رہنما سے ہاتھ ملاسکے، اسے قریب سے دیکھ سکے، اس سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کرسکے۔

کچھ دن قبل اس کی یہ خواہش شدید ہوگئی تھی جب اس نے ایک اخبار میں ہٹلر کی تازہ تصویر دیکھی تھی جس میں کسی فوجی افسر کے سینے پر خود اپنے ہاتھ سے تمغا سجا رہا تھا۔ اس نے چشمِ تصور سے دیکھا تھا کہ اس فوجی افسر کی جگہ وہ خود ہے اور ہٹلر اس کے سینے پر تمغا سجا رہا ہے۔ اس افسر نے جنگ کے دوران میں کوئی عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی دن کھویا کھویا سا رہا تھا۔

اس کے سارے وجود پر جیسے وہ تمغا محیط ہوگیا تھا اور اس نے سوچا تھا۔ کیا وہ بھی کبھی ایسا کوئی کارنامہ انجام دے سکے گا کہ اس کے سینے پر بھی تمغا سجے، وہ بھی ہٹلر سے ہاتھ ملائے اور مستقبل کا مورخ اس کا نام بھی جرمنی کے ان عظیم سپوتوں میں درج کرے جس کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جنگِ عظیم دوم...... اب اس مرحلے میں داخل ہوچکی تھی کہ ہر محاذ پر جرمن فوجیں پسپا ہورہی تھیں۔ اتحادیوں نے اب جرمن علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کردی تھی اور بہت سے جرمن گاؤں اور قصبے ان کے قبضے میں آچکے تھے لیکن ابھی جرمن قوم کے حوصلے بلند تھے کیونکہ اس میں شیفر جیسے جوان موجود تھے جو ہٹلر کے حکم کو آخری حکم تصور کرتے تھے۔ چاہے انہیں اپنی زندگی ہی سے کیوں نہ گزر جانا پڑے۔

انہی دنوں شیفر کو اس کے چیف نے طلب کیا۔ وہ شیفر...... جو تمغے کے خواب دیکھتا تھا جو ہٹلر کو جرمن قوم کا نجات دہندہ تصور کرتا تھا اور وہ شیفر جو اپنے ملک و قوم کے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔ جب اسے طلب کیا گیا تو اس کے ذہن میں ایک بار پھر تمغا ناچنے لگا۔ شاید اسے کوئی اہم کام سونپا جائے گا۔ اس نے سوچا۔

چیف ملٹری انٹیلی جنس کے احکامات اسے مختلف ذرائع سے ملتے رہتے تھے اور وہ ان پر عمل کرتا رہتا تھا مگر ایسے موقع بہت کم آتے تھے کہ اسے طلب کیا جاتا۔ وہ ان مواقع کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ جب بھی اسے طلب کیا گیا تھا تو کوئی اہم کام سپرد کیا گیا تھا جس میں انتہائی رازداری کی ضرورت ہوتی تھی۔

شیفر انہی خیالات میں غلطاں چیف کے کمرے میں



داخل ہوا۔ چیف نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ساؤنڈ پروف کمرے میں ہونے والی گفتگو انتہائی اہم نوعیت کی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"شیفر تمہارا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ تم ذہین، بہادر اور محبِ وطن ہو۔ تم جرمن قوم کے لیے جان تک دے سکتے ہو۔ تمہاری وفاداری اور جان نثاری پر رشک کیا جا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر چیف نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شیفر کا چہرہ جوش کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔ چیف کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔

"دراصل میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے طلب کیا ہے اور میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں سر!" شیفر نے چیف کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"دراصل ہائی کمان نے پانچ ایسے افراد کے نام طلب کیے تھے جن کا ریکارڈ بے داغ ہو۔ جو ذہین، بہادر اور وطن پرست ہوں اور جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ تمہیں شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ ان پانچ افراد میں تمہارا نام بھی شامل تھا۔" چیف نے رک کر شیفر کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"میرا...... میرا نام سر!" شیفر کے لہجے میں دبا دبا جوش اور مسرت کا عنصر تھا۔

"ہاں! شیفر تمہارا نام! اور یہ جان کر تمہیں بے حد مسرت ہوگی کہ وہ پانچوں نام اور ان کے متعلق تفصیلات عظیم فیوہرر نے خود ملاحظہ کیں پھر وہ نام مجھے واپس بھیج دیئے گئے۔ کیا تم یقین کرو گے شیفر کہ عظیم فیوہرر نے جس نام پر خود اپنے دستِ مبارک سے نشان لگایا وہ نام تمہارا نام تھا۔ شیفر تمہارا نام!"

شیفر کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے چیخ پڑے، رقص کرنے لگے، جھومنے لگے، اتنا بڑا اعزاز، وہ خوابوں میں کھو گیا اور پھر اس وقت چونکا جب چیف نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"کیا تمہیں اس بات سے خوشی نہیں ہوئی شیفر۔"

"سر! سر! م...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ...... م...... مجھے...... مجھے اتنا بڑا اعزاز ملے گا۔" شیفر نے خوشی

سے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔
”ملک وقوم کے لیے جان قربان کر دینے کے مواقع خوش نصیبوں ہی کو میسر آتے ہیں شیفر! اور تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ایک ایسے ہی کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔“ چیف برنارڈ کی آواز پُرجوش ہوتی گئی۔ ”تمہیں ایک عظیم مقصد کے حصول کی خاطر ملک وقوم کے حضور نذرانۂ جاں پیش کرنا ہے۔ کیا تم ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ ہو شیفر؟“
”میں اپنی خوش نصیبی پر جتنا ناز کروں، کم ہے سر!“ شیفر نے بھی پُرجوش لہجے میں کہا۔
”تو سنو شیفر! تمہیں اس مشن پر جانا ہے جس کا نام ہم نے ”ڈیتھ مشن“ رکھا ہے۔ یہ حقیقتاً بھی موت کا مشن ہے اور اسے تم جان دے کر ہی پورا کر سکتے ہو۔“ چیف برنارڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم واقف ہو کہ اتحادی درندوں کے ناپاک قدم اب جرمن علاقوں تک بھی آ پہنچے ہیں۔ تمہیں انہی مقبوضہ علاقوں میں سے ایک علاقے میں بھیجا جائے گا۔“
چیف برنارڈ نے بہت مدھم لہجے میں شیفر کو اس علاقے کا نام بتایا اور یہ نام سن کر شیفر چونک پڑا۔ وہ اس علاقہ کی اہمیت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔
شیفر جب برنارڈ سے مکمل تفصیلی گفتگو کر کے باہر نکلا تو اس کے چشمِ تصور میں تمغا رقص کر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش! اسے کسی ایسی مہم پر بھیجا جاتا جس میں اس کے زندہ بچنے کے امکانات ہوتے۔
شیفر کو جرمن مقبوضہ علاقہ میں ایک ایسے فوجی ہیڈ کوارٹر کو تباہ کرنا تھا جو اتحادیوں کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔
اتحادیوں نے اسی لیے اس کی حفاظت کے زبردست انتظامات کر رکھے تھے۔ اگرچہ اس مقبوضہ علاقہ کی جرمن آبادی اتحادیوں کے حق میں نہیں تھی لیکن انہوں نے مقامی آبادی کو جبر وتشدد سے دبا رکھا تھا۔ اس علاقے کی حفاظت کے لیے اتحادیوں نے جدید ترین وسائل سے کام لیا تھا اس کا سبب وہ فوجی ہیڈ کوارٹر تھا جو ایک مٹیالے رنگ کی عمارت میں تھا اور اس عمارت سے بہت سے اسرار وابستہ تھے۔
منصوبے کے مطابق ایک جرمن جنگی جہاز کو اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی فصیل عبور کرنی تھی کیونکہ جہاز کے اس علاقے میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا جاتا۔ قدم قدم پر ریڈار نصب تھے۔ جرمن جہاز کو دیکھتے ہی اتحادیوں کی گنز آگ برسانے لگتیں جن کی زد سے جہاز کا بچ نکلنا مح
سے کم نہ ہوتا۔
شیفر کو جہاز تباہ ہونے سے پہلے کسی مناسب مقام
پہ چھلانگ لگانی تھی۔ اس مہم کی کامیابی شیفر کی موت کے
ممکن نہیں تھی اور وہ مرنے کے لیے تیار تھا۔
شیفر کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ کسی مرحلے
کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جو اسے دوسرے لوگوں
ممتاز کر دے۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی آرزو اسے ہمیشہ مضطر
رکھتی تھی۔
جب عظیم جرمنی کے عظیم رہنما ہٹلر نے آگ اور خ
کا کھیل شروع کیا تھا تو شیفر اس میں شریک ہوئے بغیر
سکا تھا۔ جنگ میں شریک ہو کر کوئی یادگار کارنامہ انجام د
کے مواقع بہرحال زیادہ تھے۔ اس نے اپنی بے جگری
جیالے پن سے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔
نے عظیم جرمن پر اپنی جان نثار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا
چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام د
سکے کہ آئندہ نسلیں اسے عزت واحترام سے یاد کریں۔
پر فخر کریں اس کے کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اب ا
یہ موقع نصیب ہو گیا تھا۔
جب وہ چیف برنارڈ سے مل کر لوٹ رہا تھا تو با
اس کے ذہن میں چیف کا کہا ہوا ایک جملہ گونج رہا تھا۔
”شیفر! تم مادرِ وطن کی خاطر جان دینے جا رہے
وطن کا ذرہ ذرہ تمہاری اس قربانی کو یاد رکھے گا۔“

☆☆☆

وہ حیات شکن جھٹکا شیفر کے لیے حیات بخ
کیونکہ اس کے ساتھ ہی پیراشوٹ کھل گیا تھا۔ وہ
دیر سے فضا میں کلابازیاں کھاتا ہوا زمین کی طرف گر
تھا۔ اس کے صحیح سلامت بچنے کا امکان پیراشوٹ
کھلنے پر تھا۔
لمحے صدیوں پر محیط لگ رہے تھے اور وہ خوف
احساس لیے ہر ممکن حادثے کے لیے تیار تھا۔ اس کی ر
لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سو
سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے
پیراشوٹ کھلنے کا مخصوص جھٹکا اسے زندگی کی نوید د
گیا۔ ہوا نارمل تھی اس لیے پیراشوٹ آہستہ روی سے
میں تیرنے لگا۔ اس نے طویل سانس لے کر پیراشوٹ
طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے یہ محسوس ہو رہا تھا ک

شخص پچھلے آدھے گھنٹے میں دوبارہ شدید خطرے سے گزر چکا تھا۔ وہ جس مہم پر نکلا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فولادی اعصاب اور مضبوط ارادے والے شخص کی ضرورت تھی اور وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا جب ہی اسے اس مہم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

اس نے اپنی پشت پر بندھے تھیلے میں اس مخصوص بم کو محسوس کیا جو اس منصوبے کی جان تھا۔ اسے یہ بم سینے سے باندھ کر اس عمارت میں داخل ہونا تھا۔ یہ بم انتہائی طاقت ور اور اثر انگیز تھا۔

دفعتاً...... فضا پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔

اینٹی ایئر کرافٹ گنز کے دہانے کھل گئے۔ چند لمحے بعد ہی اس نے ایک زبردست دھماکا سنا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آگ کا ایک گولا زمین کی طرف گر رہا تھا۔ اسے جو جہاز اس علاقے میں لے کر آیا تھا اسے دشمن نے مار گرایا تھا چند لمحے اس کا ذہن سائیں سائیں کرتا رہا پھر پُرسکون ہو گیا۔

اس نے منصوبے کی جزئیات سوچیں۔ وہ جس عمارت کو تباہ کرنے جا رہا تھا وہاں بھی حفاظت کا کڑا انتظام تھا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کا واحد راستہ وہ آہنی گیٹ تھا جو صرف صبح شام کے وقت کھلتا تھا، اس کے علاوہ یہاں چیکنگ کا اتنا سخت انتظام تھا کہ کسی غیر متعلقہ شخص کا صحیح سلامت داخل ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ شیفر کو انہی مواقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اسے گیٹ کھلتے ہی پوری قوت سے عمارت کے اندر داخل ہونا تھا۔ ظاہر ہے اسے دیوانہ وار عمارت میں گھستا دیکھ کر وہاں متعین محافظ اس پر گولیاں برساتے اور ادھر وہ بم کا سیفٹی کیچ ہٹا چکا ہوتا۔ بم ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتا اور ساتھ ہی وہ عمارت بھی نیست و نابود ہو جاتی۔

اسے زمین کے قریب آنے کا احساس ہوا تو اس نے زمین پر اترنے کی پوزیشن لے لی۔ زمین نے آہستگی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے جلدی جلدی پیراشوٹ سے نجات حاصل کی اور اسے ایک طرف پھینک کر سمت کا اندازہ کیا اور اپنی مطلوبہ سمت کی طرف دوڑنے لگا۔ پتھریلی اور دشوار گزار راہ سے نسبتاً ہموار جگہ آ کر اس نے طویل سانس لیا اور چہرے کا پسینا پونچھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے چوکنا نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت اس نے اچانک دوڑتے قدموں کی آواز سنی پھر معاً فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ مخالف سمت بھاگ کھڑا ہوا مگر دوسری جانب سے بھی گولیوں نے استقبال کیا۔ قریب ہی کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ اس سمت لپکا لیکن آبادی سے پہلے ہی ایک گولی نے اس کی پنڈلی چھید دی وہ گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ اس بم کی فکر تھی جو اس کی پشت سے بندھا ہوا تھا، اگر کوئی بھولی بھٹکی گولی اس سے ٹکرا جاتی تو نہ صرف اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر جاتا بلکہ اس کا منصوبہ بھی ناکام ہو جاتا۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا کہ ایک اور گولی اس کے بازو میں بھی پیوست ہو گئی۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا اور یہ بہت خطرناک تھا۔ اس کی پنڈلی اور بازو سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا اور اب وہ ایک طرح گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا آ جاتا لیکن وہ مسلسل بڑھتا رہا۔

وہ کوئی ابھرا ہوا پتھر تھا جس سے ٹکرا کر وہ گر پڑا تھا اور اس کا سر دوسرے پتھر سے ٹکرایا تھا۔ حواس کھونے سے پہلے اس نے بہت سے لوگوں کو اپنی جانب دوڑتے دیکھا تھا اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اس کی طرف دوڑنے والے اس کے دشمن ہی ہو سکتے تھے جو اس پر گولیاں برساتے رہے تھے اور ہر قیمت پر اسے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔

☆☆☆

ہوش آنے پر شیفر نے خود کو چند اجنبی چہروں کے درمیان پایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک نوجوان بول پڑا۔ ”ہم نے تمہیں جرمن جنگی جہاز سے کودتے دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ تم اپنے ہو، اس لیے ہم نے تمہیں اتحادی کتّوں سے بچا لیا۔ تم یقیناً کوئی عظیم مقصد لے کر یہاں آئے ہو گے۔“

شیفر تکلیف سے کراہا اور اس وقت ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کے زخموں کی ڈریسنگ کی جا چکی ہے۔ ابھی شیفر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور نوجوان گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی جرمن زبان میں چیخا۔

”اتحادی کُتّے اِدھر آ رہے ہیں۔“

شیفر کو تین چار نوجوانوں نے تیزی سے اٹھایا اور اس مکان کے پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ہی شیفر ایک اور بوسیدہ سے مکان میں تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے بچانے والے مقامی جرمن ہیں۔

دو دن تک شیفر ایک مکان سے دوسرے اور دوسرے

سے تیسرے میں منتقل کیا جاتا رہا اور پھر اسے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا گیا جہاں خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ عمارت بمباری کے سبب تباہ ہو چکی تھی۔ عمارت کی جگہ اب کھنڈر رہ گئے تھے۔

جس شب شیفر کو اس کھنڈر نما عمارت میں پہنچایا گیا اس کی صبح ایک حسین و نوجوان لڑکی شیفر کے لیے ناشتا لے کر آئی۔

اس لڑکی نے اپنا نام جیمی بتایا تھا۔ شیفر کو پہلی ہی نظر میں وہ گڑیا سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

شیفر کے زخم ابھی پوری طرح بھرے نہیں تھے۔ جیمی صبح شام آتی رہی پھر ایک دن جیمی نے شیفر سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ شیفر اس حسین و معصوم لڑکی سے جھوٹ نہ بول سکا کیونکہ اس نے بھی لڑکی کی آنکھوں میں محبت کی تحریر پڑھ لی تھی۔ دوسرے دن جیمی آئی تو اس کے ہمراہ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ وہ نوجوان جیمی کا بھائی تھا۔ اس نے اپنا نام ہیون بتایا تھا۔ اس نے شیفر سے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ ہیون نوجوان جرمنوں کی ایک خفیہ تنظیم کا رکن تھا جو اتحادیوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔ ہیون کو بھی تمام منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

ہیون نے کچھ سوچتے ہوئے شیفر کو مخاطب کیا۔ ''شیفر تمہارا مقصد وہ عمارت تباہ کرنا ہے نا؟''

''ہاں!'' شیفر نے مختصراً کہا۔

''اگر تم چاہو تو ایک متبادل راستے سے اس عمارت میں داخل ہو سکتے ہو۔'' ہیون نے انکشاف کیا۔

''لیکن میرے دوست اس عمارت میں داخل ہونے کا واحد راستہ......''

''پہلے میری بات سن لو! یہ بتاؤ کیا تم اپنے پروگرام میں خاطر خواہ تبدیلی کر سکتے ہو؟''

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔'' شیفر بولا۔

''میں تمہیں ایک دوسرے راستے سے عمارت میں داخل کرا سکتا ہوں، اگر تم چاہو تو......''

''......مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق عمارت کی حفاظت کا بہت کڑا انتظام ہے۔ اس عمارت میں کسی اور طریقے سے داخل ہونا ناممکن ہے۔''

''میرے دوست یہ تمہاری لاعلمی ہے جو تم اپنی بات پر اصرار کر رہے ہو، غور سے سنو! عمارت کے عقب میں سیکڑوں میل پر محیط خوفناک جنگل ہے۔ یہ جنگل دلدلی سرزمین کی وجہ سے بدنما ہے۔ اتحادی فوجوں نے عمارت کی حفاظت کے لیے وہاں فوجی دستے متعین کرنا چاہے مگر ان کے بہت سے سپاہی دلدل کا شکار ہو گئے۔ دوسرے یہ جنگل حشرات الارض اور درندوں کی وجہ سے اب تک کسی کے قابو میں نہیں آیا ہے۔ اجنبی لوگ یہاں داخل ہو کر زندہ واپس نہیں نکلتے۔ مجھے اس علاقے سے مکمل واقفیت ہے۔ تم چاہو تو میں تمہیں عمارت کی عقبی دیوار تک پہنچانے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ تم غور کر لو، کل میں پھر آؤں گا۔''

یہ کہہ کر ہیون اٹھ کھڑا ہوا اور جیمی بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی۔ اسی وقت شیفر اور جیمی کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور شیفر نے محسوس کیا جیسے جیمی کی خاموش نگاہیں اس سے التجا کر رہی ہوں کہ وہ ہیون کی بات مان لے۔ ان دونوں کے قدموں کی دور ہوتی چاپ کے ساتھ ساتھ شیفر کے چشم تصور میں تمغا رقص کرنے لگا۔ وہ زندہ رہ کر تمغے کا حق دار بن سکتا تھا۔

ہیون کی پیش کش معمولی نہ تھی۔ اس نے زندگی کی نوید دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکتا تھا زندگی ست رنگ آرزوؤں اور رعنائیوں کا محور! زندگی کے ساتھ ہی جیمی کا سراپا بھی منسوب تھا۔ جیمی جواب اس کی دوسری بڑی آرزو بن گئی تھی۔ ہیون کی بات مان کر وہ جیمی کے ساتھ ساتھ اپنی سب سے بڑی خواہش پوری ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سوچا جب وہ زندہ سلامت اپنے چیف کے سامنے پہنچے گا تو وہ حیرت زدہ رہ جائے گا پھر اس کے کارنامے کی دھوم مچ جائے گی۔ وہ ناممکن بات ممکن کر دکھائے گا۔ وہ عمارت تباہ کرنے کے باوجود زندہ بچ گیا ہے، زندہ رہنے کی آرزو نے اسے ہیون کی بات ماننے پر اکسایا۔ جیمی کے تصور نے اس کی تائید کی اور وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔ ابھی اس کے پاس عمارت تباہ کرنے کے لیے دو دن باقی تھے۔ محکمے کے پروگرام کے مطابق اسے جو مدت دی گئی تھی وہ دو دن بعد ختم ہو رہی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ مقبوضہ علاقے کے باشندوں نے اسے اتحادی دشمنوں سے بچا لیا تھا اور ہیون نے اسے جینے کی راہ دکھائی تھی۔

لوگوں کے سُتے ہوئے چہرے، بے رونق ماحول جنگ سے تباہ شدہ عمارتیں اور دن رات طیاروں کی گرج نے لوگوں کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں زندہ رہنے کی خواہش نے انہیں بڑی حد تک

پرست اور مطلبی بنا دیا تھا۔ دنیا تباہ ہو رہی تھی۔ بھوک اور افلاس کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ لہو بہہ رہا تھا اور لوگ جینے کی خواہش میں بھٹک رہے تھے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ لیکن ان کے سینوں میں جینے کی آرزو اب بھی باقی تھی۔ ایسے میں کچھ لوگوں نے وطن پر جان نثار کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لیے جدوجہد میں مصروف تھے اور انہی جیالوں میں سے ایک ہیون تھا جس نے شیفر کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

یکا یک ہوائی حملے کا سائرن ہوا۔ اور شیفر کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ اینٹی ایئر کرافٹ گنز کے دہانے شعلے اگلنے لگے۔ دھماکے، آگ اور دھوئیں کے بادل۔ شاید دشمن اپنے حریف کو غافل جان کر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کا وار ناکام ہوگیا۔ جہاز کے ساتھ ہی اس کے سوار بھی گوشت کے لوتھڑوں کی شکل میں بکھر گئے۔ کون جانے دور کہیں کوئی اکیلی نار اکیلی سوتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور اس کا دل سینے سے نکلتا محسوس ہوا ہو یا کچھ ننھے منے بچے اپنی آنکھوں میں اپنے ڈیڈی کی چاہت کے گلاب سجائے سوتے میں مسکراتے مسکراتے رو پڑے ہوں۔ کون جانے.....کون جانے۔

”جاناں! تم رو رہی ہو؟“ شیفر نے بوکھلا کر جیمی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”نہیں، نہیں تو“ جیمی نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”دیکھو جان! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ذرا مسکرا کر الوداع کہو تاکہ اگر کسی مشکل میں پھنس جاؤں تو تمہاری مسکراہٹ کے سہارے زندہ رہنے کا حوصلہ پاسکوں۔“

”ڈیئر! نہ جانے کیوں میرا دل لرز رہا ہے، تم آج نہ جاؤ۔“

”کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو۔ میں نے کل وہاں جا کر حالات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں، آج میں عمارت میں داخل ہو کر کسی مناسب جگہ بم رکھ دوں گا۔“

”یہ سب ٹھیک ہے ڈیئر! لیکن نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

”نہیں جان! میں خواہ مخواہ کے واہموں میں پڑ کر نہیں رکوں گا۔ مجھے مسکرا کر الوداع کہو۔“

”اچھا تو خدا حافظ!“ جیمی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا

کدو ریس

کینیڈا کے علاقے نووا اسکاٹیا میں ہر سال بڑے بڑے کدوؤں کی بنائی ہوئی کشتیوں کی ریس ہوتی ہے۔ دی ونڈسر پمپکن ریگاٹا اینڈ پریڈ کے نام سے منعقد ہونے والے اس ایونٹ کا آغاز 1999ء میں کیا گیا۔

ریس شروع ہونے سے پہلے پریڈ ہوتی ہے، جس میں لوگ اپنی اپنی اگائی ہوئی سبزیاں لے کر آتے ہیں۔ اس پریڈ میں کھوکھلے کیے ہوئے بڑے بڑے کدوؤں کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ بعدازاں یہی کھوکھلے کدو پیس کونڈ جھیل میں 0.8 کلومیٹر کی ریس کے لیے کشتی کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی کدو کشتی کو کھینچنے کے لیے چپو استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض لوگ اپنی کدو کشتی کو جھیل کے دوسرے کنارے تک پہنچانے کے لیے موٹر بوٹ کے چھوٹے انجن بھی استعمال کرتے ہیں۔

اور پھر اسے نہ جانے کیا ہوا وہ تیزی سے شیفر کی بانہوں میں سما گئی۔ شیفر نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جیمی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اضطراری کیفیت میں وہ اسے دیکھنے لگا۔ جذب و شوق کے بے شمار لمحے گزر گئے پھر شیفر کو احساسِ فرض نے چونکا دیا۔

اس نے آہستگی سے جیمی کو الگ کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ جہاں ہیون اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد وہ عمارت کے عقبی حصے تک پہنچ چکے تھے۔

ہیون نے اپنے ساتھی کو ایک درخت پر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود شیفر کے ہمراہ دوسرے درخت کی طرف بڑھ گیا۔

شیفر نے چھت تک پہنچنے میں بڑی پھرتی سے کام لیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے اطراف کا جائزہ لیا، اس کے اندازے کے مطابق نیچے اترنے کا راستہ سرچ لائٹوں کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ہیون سے حاصل کی ہوئی معلومات تازہ ہوگئیں پھر اس نے زینے سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ زینے کا اختتام ایک راہداری پر

ہوا تھا۔ جس کے ساتھ نچلی منزل تک جانے کا راستہ تھا۔ معاً اس کی چھٹی حس بیدار ہو کر خطرے کا سگنل دینے لگی۔ اس نے چوکنا انداز میں راہداری کا جائزہ لیا۔ اسے نچلی منزل کے زینے کی طرف آہٹ محسوس ہوئی تو وہ تیزی سے ایک جانب کو لپکا۔ کئی کمروں کے سامنے سے گزر کر نسبتاً الگ تھلگ ایک کمرا منتخب کر کے اس نے پشت سے بیگ اتارا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔

کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ شیفر نے پھرتی سے بیگ اس کباڑ کے اندر چھپا دیا۔ اسی وقت کمرے کے سامنے آہٹ ہوئی۔ کسی نے دروازے پر پے در پے کئی ضربیں لگائیں۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سامنے موجود سپاہی نے اپنی گن اس کی طرف تان لی اور اسے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سر جھکا کر باہر نکل آیا۔

اسے گرفتار کرنے والا محافظ دستے کا نگراں تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ اسے راہداری میں کسی کی جھلک دکھائی دی۔ یہاں اس کے سوا کسی اور کی رہائش نہیں تھی۔ اس وقت یہاں کسی کی موجودگی خلافِ معمول تھی اس لیے اسے غیر معمولی نقل و حرکت نے چوکنا کر دیا اور اس نے بالآخر شیفر کو گرفتار کر لیا اور ایک نوجوان اس عمارت میں موجود کرنل کو خبر دینے روانہ ہو گیا۔ کرنل نچلی منزل میں مقیم تھا۔

بے وقت کی مداخلت نے کرنل پر جھنجلاہٹ طاری کر دی تھی لیکن معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔ محافظ دستے کا نگراں شیفر سے کچھ اگلوانے کی کوشش میں تھا۔ شیفر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کچھ نہیں بولے گا۔ چاہے اس پر کچھ ہی بیت جائے۔

کرنل کمرے میں آیا تو نگراں نے مختصراً اسے تمام رُوداد سنا دی اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"کیپٹن کرٹس کو بلاؤ۔" وہ غصے سے بولا۔ ایک نوجوان بجلی کی تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد کیپٹن وہاں موجود تھا۔ وہ بھی اپنی شبینہ مصروفیات میں مگن تھا کہ نادر شاہی حکم نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

کرنل نے اس قیدی سے عمارت میں داخل ہونے کا سبب اگلوانے کا حکم دیا۔ کیپٹن آگے بڑھا اور نرمی سے کچھ پوچھنے لگا۔ شیفر نے ظاہر کیا جیسے اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آرہی ہو۔ کیپٹن نے چیخ کر ہیٹر اور لوہے کی سلاخیں منگوائیں اور شیفر کا بایاں ہاتھ آہنی کڑے میں پھنسا کر اسے قریبی روشندان کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اب شیفر بایاں ہاتھ اوپر اٹھائے دیوار کے سہارے سر جھکائے کھڑا تھا۔ کیپٹن سلاخیں سرخ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک آواز گونجی۔

"اوہ کرنل! یہاں کیا ہو رہا ہے؟" شیفر نے یہ آواز سن کر اس طرف دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے میں ایک نیم عریاں لڑکی بڑے بے ہودہ انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے بے حیائی جھلک رہی تھی۔

"اوہ ہنی، تم جا کر آرام کرو۔ چلو جاؤ۔" کرنل نے اسے جانے کے لیے کہا مگر وہ اس کے قریب آ کر اس کے شانے سے ٹک گئی۔

"کرنل، کون ہے؟" لڑکی کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کرنل نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ وہ آگے بڑھی اور شیفر کی آنکھوں کے سامنے انگلی نچاتے ہوئے بولی۔ "اے تم کون ہو؟"

"تم نے آ کر ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا کمینے! کہیں کے۔" لڑکی کا لہجہ اس کے جرمن ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ شیفر نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف رخ کر لیا۔

"اوہ ہنی! اِدھر آؤ۔" کرنل نے اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ "تم بڑی جلدی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ تم اتنی زیادہ مت پیا کرو۔" کرنل نے اسے سرزنش کی۔

"نہیں کرنل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایک دم فس کلاس۔ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں پی۔" وہ ٹھنکتے ہوئے بولی پھر اس نے سامنے کھڑے فوجی سے کہا۔ "اے سنو! نیچے سے ہماری بوتل اور گلاس لے آؤ۔ ہم اپنی محفل یہیں سجائے لیتے ہیں۔"

وہ کرنل کی محبوبِ نظر کے حکم سے سرتابی کرنے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ چنانچہ وہ حکم ملتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

واپسی پر اس کے ہاتھ میں خوبصورت ٹرے تھی جس میں شراب کی بوتل اور نازک سے جام تھے۔ لڑکی نے شراب انڈیلی اور جام کرنل کے منہ سے لگا دیا۔ کرنل نے جلدی سے پینا چاہا تو اسے اُچھو لگ گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ لڑکی نے قہقہے برساتے ہوئے باقی شراب اس کے اوپر انڈیل دی۔ اسی لمحے کمرے میں ایک انسانی سسکی

ابھری۔ تیز اور روح میں سرایت کر جانے والی سسکی۔ لڑکی نے چونک کر شیفر کی طرف دیکھا جسے کیپٹن سرخ سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ یہ سسکی اس کے انتہائی ضبط کے باوجود صرف ایک بار نکلی۔ فضا میں انسانی گوشت جلنے کی بو لہرا رہی تھی۔ شیفر سختی سے منہ بند کیے اذیتیں برداشت کرتا رہا۔

'' یہ کتا چپ کیوں ہے؟ چیخ کیوں نہیں رہا؟'' لڑکی نے کیپٹن سے سوال کیا۔

'' کتیا، ضمیر فروش، بے غیرت، بے حیا۔'' شیفر کے ہونٹوں نے جرمن میں ایک جملہ ادا کیا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

'' یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' کرنل نے چونک کر لڑکی سے پوچھا۔

'' کچھ نہیں! یہ اپنی ماں کو یاد کر رہا ہے۔'' لڑکی نے جھوٹ بولا۔

'' ہنی، تم ایک کام کر سکتی ہو؟'' کرنل نے اس کے کان میں سرگوشی کی پھر جواب سنے بغیر آگے بولا۔ '' تم اپنے جرمن ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے ہمدردی کا اظہار کرو اور اس سے یہاں آنے کا مقصد پوچھو۔'' کرنل نے اسے ہدایت کی۔

'' اوہ...... کیوں نہیں...... لیکن......'' لڑکی نے کیپٹن اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کچھ اشارہ کیا۔ کرنل نے کیپٹن کو روکا پھر ایک طرف لے جا کر کچھ سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں کرنل اور لڑکی کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔

'' اے سنو!'' لڑکی نے آگے بڑھ کر شیفر کو ہلایا۔ شیفر نے غضب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔

'' میں...... میں عظیم جرمن پر جان دے دوں گا...... لل...... لیکن۔''

شیفر نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے اور جملہ پورا کیے بغیر ہی بے ہوش ہو گیا۔

'' کرنل! یہ تو بے ہوش ہو گیا۔'' لڑکی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

'' کوئی بات نہیں۔ جلد ہی ہوش آ جائے گا اسے۔'' کرنل نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر دھیمے لہجے میں لڑکی کو کچھ سمجھانے لگا۔ لڑکی اس کی باتیں سننے کے دوران میں جیسے کہیں کھو رہی تھی۔ شاید وہ کسی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ کیا وہ اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر سکتی تھی۔ مگر کس طرح؟ اس نے سوچا۔

عظیم جرمن! میں تیرے بیٹے کا مقصد پورا کرنے کا ایک موقع ضرور فراہم کروں گی۔'' یہ فیصلہ کر کے وہ لہراتی ہوئی آگے بڑھی اور بے حجابانہ کرنل کے قریب ہو گئی۔ اسی دوران کرنل کو کچھ خیال آیا تو اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شیفر کو ہوش آیا تو کمرا خالی پڑا تھا۔ اس نے زخمی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ لوہے کی زنجیر میں اس کا ہاتھ بدستور جکڑا ہوا تھا۔ زنجیر کا دوسرا سرا روشندان سے نکل کر دوسری طرف کہیں بندھا ہوا تھا۔ کمرے میں شراب کی خالی بوتل اور جام پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک لمحے اپنی حالت پر غور کیا اور پھر اسے یاد آگیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

تو کیا وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گا۔ اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ نہیں مجھے ہر قیمت پر اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ میں ناکام نہیں رہ سکتا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ بم میں ٹائم فکس کرنے سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گرفتاری سے پہلے ہی بم چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اتحادی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے وہ تو صرف اس سے عمارت میں داخل ہونے کا راستہ اور یہاں آنے کا سبب جاننا چاہتے تھے۔ یہ ان کی توقع کے خلاف تھا کہ ایک اجنبی شخص ان کے سارے حصار توڑ کر اس عمارت میں داخل ہو گیا تھا جہاں ان کی مرضی کے بغیر ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کا واضح جواب تھا کہ ان کے انتظامات میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور موجود ہے۔ وہ اس بارے میں جاننے کے خواہاں تھے۔ شیفر نے بڑی تیزی سے اس نایاب موقع سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا۔

اچانک اس کی نگاہ فولادی زنجیر پر پڑی جو اس کے بائیں ہاتھ کو جکڑے ہوئے تھی۔ اس کمرے سے نکلنے کے لیے زنجیر سے نجات پانا از بس ضروری تھا مگر کس طرح؟ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اسے دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی شخص اسے چیک کرنے آیا تھا۔

'' یہ تو ابھی تک بے ہوش ہے۔'' اس نے کسی سے

کہا۔
''ممکن ہے یہ صبح تک زندہ نہ بچے۔'' دوسرے شخص نے رائے دی۔ ''بے حد زخمی ہو چکا ہے۔''
''اچھا چلو کرنل صاحب کو مطلع کریں۔'' پہلے شخص نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکل گئے۔
اس کے سارے جسم سے آگ کی لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ آزاد کرنے کی ترکیب سوچی۔ زنجیر کٹنا یا ٹوٹنا ناممکن تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس طرح اسے آزادی نصیب ہو سکتی تھی۔ یہ مہنگا سودا ضرور تھا مگر جان سے زیادہ نہیں۔ اس کی نگاہ شراب کی اس خالی بوتل پر جمی ہوئی تھی جو اس کے نزدیک ہی پڑی تھی۔ اس نے پاؤں آگے بڑھا کر بوتل اپنی طرف لڑھکائی۔ پاؤں ہی کی مدد سے اس نے بوتل اوپر اٹھائی۔ اب بوتل شیفر کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے بوتل ایک خاص انداز سے پکڑی اور دیوار سے ٹکرا دی۔ پہلی ہی بھرپور ضرب میں بوتل ٹوٹ گئی۔ اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بوتل کی دھار اپنی کلائی کے جوڑ پر رکھی اور آنکھیں بند کرلیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دائیں ہاتھ کو حرکت ہوئی۔ گرم گرم خون بھل بھل بہہ کر اس کے اوپر گرنے لگا وہ اپنے دانتوں میں زبان بھینچے کلائی کا جوڑ کاٹتا رہا۔ جب کھال اور نسیں کٹ گئیں تو اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کا پنجہ آہنی کڑے میں رہ گیا اور کٹا ہوا ہاتھ گرفت سے آزاد ہو گیا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کو اندھیرا چھا گیا مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس نے پھرتی سے قریب پڑی قمیص پھاڑی اور کلائی پر باندھ دی۔ خون بہنا کم ہو گیا۔ اس نے خنجر نما بوتل اٹھائی اور تیز قدموں سے دروازے تک پہنچا اور ہوشیاری سے باہر جھانکا۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ اس نے زقند بھری اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اب اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں اس نے بم چھپایا تھا۔ اس سمت جاتے ہوئے اس کی بے چین نگاہ اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔
مطلوبہ کمرے کے سامنے جا کر اس نے دروازے کے ہینڈل پر زور آزمایا۔ دروازہ حسبِ سابق مقفل نہ تھا۔ اس نے آہستگی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور کباڑ میں سے بم نکالنے لگا۔ بم موجود تھا اس نے دیوار کے سہارے ٹک کر بم دونوں گھٹنوں کے درمیان دبایا پھر اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بم دس منٹ بعد پھٹنے...... کے لیے تیار تھا۔
کمرے سے باہر آنے سے پہلے اس نے راہداری خالی ہونے کا اطمینان کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔ بم اب بھی اس کے پاس تھا۔ اس نے بم ایک روشن دان کے ذریعے درمیانی کمرے میں ڈالا اور تیزی سے چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ آخری سیڑھی طے کر کے جیسے ہی اس نے چھت پر قدم رکھا اسے ایک کرخت آواز سنائی دی۔
''ہینڈز اَپ!''
سپاہی نے چیخ کر کہا اور رائفل کی نال اس کی طرف سیدھی کرلی۔ اس نے گولی کی پروا کیے بغیر سپاہی پر حملہ کر دیا اور اپنا دایاں بازو سپاہی کی گردن میں ڈال دیا۔ سپاہی نے اس پر حملہ کرنے کی غرض سے رائفل نیچے گرادی اور جوابی حملہ کرنا چاہا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ شیفر پر خون سوار تھا۔ وہ سپاہی کی گردن دباتا چلا گیا۔ جیسے ہی سپاہی کا جسم جھول گیا، شیفر نے اسے فرش پر پٹخ دیا اور سیڑھیوں کی طرف متوجہ ہوا جن پر آنے والوں کے قدموں کی دھمک گونج رہی تھی۔ اس نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ دوسری طرف سے دروازے پر چوٹیں پڑنے لگیں۔ کسی نے خطرے کا سائرن بجا دیا تھا۔ شیفر دوڑتا ہوا اس جگہ آیا جہاں اس نے کمند ڈالی تھی۔ کمند بہ دستور موجود تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے رسی تھامی اور نیچے اترنے لگا۔ چھت سے فائرنگ کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ شاید اتحادی فوجی دروازہ توڑنے میں ناکام ہو کر اپنی حسرت نکال رہے تھے یا ان کے خیال میں یہی مناسب تھا۔
شیفر تیزی سے پھسلتا چلا گیا۔ ابھی زمین اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا کہ اس نے رسی چھوڑ دی اور زمین پر آرہا۔ نیچے گرتے ہی اس نے سمت کا اندازہ کیا اور دوڑنا چاہا مگر اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ایک بار لڑکھڑا کر گرا اور پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ اس نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے عقب میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس نے مڑے بغیر جان لیا کہ اس کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ عمارت تباہ ہو گئی تھی۔ پے درپے دھماکے اب بھی سنائی دے رہے تھے اور شیفر زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل شیفر نے ہیون کو اپنے اوپر جھکتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

''جیمی.....جیمی.....! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں صحیح سلامت نہ لوٹ سکا۔''

شیفر نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ اس کے قریب موجود جیمی نے اس کے چہرے پہ اپنی زلفیں بکھیر دیں۔ شاید وہ شیفر کو قربت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

''شیفر! میرے محبوب! میری زندگی!'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

شیفر نے کسمسا کر رخ بدلنا چاہا۔ جیمی نے اس کی تپتی پیشانی پر اپنے حیات بخش ہونٹ رکھ دیے۔

''میرے محبوب! میں ہر حال میں صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری رہوں گی۔'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور اس کا بازو سہلانے لگی۔

شیفر کی واپسی کے بعد وہ مسلسل اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ مسلسل شب بیداریوں نے اس کے صبیح چہرے پہ اپنے تاثرات چھوڑ دیے تھے۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنی اپنے محبوب کی تیمارداری کر رہی تھی۔ شیفر جب عمارت تباہ کرنے روانہ ہوا تھا تو اسے احساس تھا کہ جیمی کی چند روزہ رفاقت نے اس کے دل پر کتنے نقش چھوڑے ہیں۔

ہیون نے اپنے ذرائع کے مطابق اس کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ خون کی کمی نے شیفر کی ساری توانائیاں چھین لی تھیں پھر رہی سہی کسر ان زخموں نے پوری کردی تھی جو گرم گرم سلاخوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ابتدا میں اس کا سانس بھی رک رک کر چل رہا تھا۔ اسے مناسب علاج اور دواؤں کی ضرورت تھی جبکہ جنگ کے دوران میں دواؤں کی فراہمی مشکل تھی پھر بھی اس تنظیم کے جیالے ہر قیمت پر شیفر کی جان بچانے کے خواہاں تھے۔

رفتہ رفتہ شیفر کی حالت سدھرتی چلی گئی۔ اس نے پہلی بار آنکھ کھولی تو اس کے سامنے اپنے مسیحا کا چہرہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بکھری بکھری زلفوں اور سوجی ہوئی آنکھوں نے شیفر کو بے چین کر دیا۔

''جیمی..... جان!'' اس نے بے اختیار کہا۔

جیمی نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو اس کے سینے سے لگا دیا۔

''جان! تم رو رہی تھیں؟'' اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''نہیں..... نہیں تو.....'' جیمی نے چہرہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

اس لمحے اس نے دوسرا ہاتھ اٹھانا چاہا تو اس نے کلائی پر بندھی پٹیاں دیکھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ماضی زندہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی مہم میں اپنا ہاتھ ضائع کر آیا تھا۔ ہاتھ سے محرومی نے اسے ایک لمحے کے لیے اداس کر دیا۔

جیمی نے اس کی اداسی محسوس کر لی اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

''شیفر! تمہارے کارنامے نے اتحادیوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ وہ بھوکے کتوں کی طرح بستی بستی گلی گلی دشمنوں کا کھوج لگاتے پھر رہے ہیں اور نہتے شہریوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔''

''جیمی! میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔'' میں اپنے چیف کو رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، تم ابھی سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دوسرے یہ کہ تم یہاں سے تنہا نہیں جاؤ گے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں تمہارے بغیر کس طرح رہ سکتی ہوں۔'' جیمی یہ کہتے ہوئے شرما سی گئی۔

شیفر چونک اٹھا۔ اس نے حیا بار جیمی کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر سرگوشی کی۔ ''جیمی، میری کائنات!'' شیفر کی حالت سنبھلی تو اس نے علاقے سے نکلنے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ اس بار اسے اپنے ذرائع پر انحصار کرنا تھا کیونکہ اس کی واپسی غیر متوقع تھی۔ اس کے محکمے نے تو اس کی موت کی تصدیق کر دی ہو گی کیونکہ مہم کی کامیابی اس کی موت سے مشروط تھی۔

ہیون نے جیمی کو اس کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ جیمی کی وجہ سے اسے زیادہ احتیاط برتنی پڑی اور خصوصی انتظامات کرنا پڑے۔ اس کا بس چلتا تو وہ کسی طرح اُڑ کر اپنے چیف کے سامنے جا پہنچتا۔ جہاں اسے اس کے عظیم کارنامے پر شاندار انعام ملتا۔ اس نے یقیناً ایک ایسا کارنامہ انجام دیا تھا کہ اس کے سینے پر تمغا لگایا جاتا، اس نے بارہا اپنے سینے پر ملک کے اعلیٰ ترین تمغوں میں سے ایک تمغا جھلملاتا محسوس کیا۔ تصور میں کئی بار ہٹلر بذاتِ خود اسے مبارک باد دیتا رہا اور وہ جلد از جلد اپنی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل کے خواب سجائے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

ہیون نے اسے واپسی کا نسبتاً محفوظ راستہ سمجھایا۔ اب اس کے ساتھ جیمی کا مستقبل بھی وابستہ تھا۔ ہیون کی خواہش تھی کہ وہ دونوں خیریت سے جرمنی پہنچ جائیں۔ اس لیے اس نے انہیں اس جنگل تک چھوڑنے کا فیصلہ کیا جسے عبور کر کے وہ جرمن کے زیرِتسلط علاقے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ اس نے شیفر کی خواہش کے مطابق اسلحہ وغیرہ کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔

جیمی کے حسین اور نازک وجود نے اسے زندگی سے پیار کرنا سکھا دیا تھا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جیمی کا قرب میسر تھا۔ ہیون اسے مناسب مقام تک چھوڑ کر نیک خواہشات کے ساتھ واپس ہو گیا۔

سفر کا آخری مرحلہ اسے اپنی صلاحیت اور ذہانت سے طے کرنا تھا۔ مسلسل سفر نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ جیمی نے درختوں سے گھری ایک مناسب جگہ تلاش کی اور اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔ ''ہاں جان! اب ہم آرام ہی کریں گے جان! تم میرے لیے بلاوجہ اتنی پریشانیاں اٹھا رہی ہو۔''

''شیفر! ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں یہ سب اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔'' جیمی نے ایک ادا سے کہا اور اسے سہارا دے کر نیم دراز کر دیا اور ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگی۔

''جاناں!'' شیفر کی خواب آلود آواز ابھری۔

''ہاں کہو۔'' جیمی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ وہ وقت کتنا عجیب ہو گا جب میں اپنے چیف کے سامنے زندہ موجود ہوں گا اور وہ حیرت زدہ ہو کر میری رُوداد سن رہا ہو گا۔ جانتی ہو پھر کیا ہو گا؟'' اس نے جیمی سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' جیمی نے جواب دیا۔

''جب میں وہاں پہنچوں گا تو ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ سب لوگ مجھے اپنے گھیرے میں لے لیں گے۔ میں بڑے فخر سے اپنا کارنامہ سناؤں گا۔ مجھے یقین ہے میرا کارنامہ سن کر وہ مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں گے۔ پھر میرا چیف فوری طور پر میرے کارنامے سے ہائی کمان کو آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد، ہاں اس کے بعد...... یقیناً مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ مجھے برلن بھیجا جائے گا اور...... اور پھر یقیناً عظیم فیوہرر، عظیم جرمن کا عظیم رہنما مجھ سے ہاتھ ملائے گا۔ مجھے مبارکباد دے گا اور میرے سینے پر خود اپنے ہاتھوں سے تمغا سجا دے گا۔'' شیفر یہ کہتے کہتے خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

جیمی نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اچھا ڈیئر! اب آرام کرو۔ سورج غروب ہوتے ہی ہمیں اپنا سفر شروع کرنا ہے۔'' شیفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ خواب میں ہٹلر سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سورج کی چمکدار کرنوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ پرندوں نے اپنے رین بسیروں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ شب بیداری کے عادی جانور اپنا راگ الاپنے لگے تھے۔ فضا ملی جلی آوازوں کے شور سے گونج رہی تھی۔ جیمی کے اعصاب اسے کسی ممکنہ خطرے کا احساس دلا رہے تھے۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ جس جگہ موجود تھے وہ عام رہ گزر سے یقیناً ہٹ کر تھی لیکن وہاں بھی دونوں کی بیک وقت موجودگی مناسب نہ تھی۔

اس نے شیفر کا کندھا ہلا کر اسے بیدار کرنا چاہا مگر وہ کروٹ بدل کر رہ گیا۔ اب اس کے پاس موجودہ صورتِ حال کا یہی حل رہ گیا تھا کہ وہ تھکے ہوئے شیفر کو سونے دے اور کہیں قریب رہ کر اس کی حفاظت کرے۔ اس نے قریب ہی ایک درخت کو بھانپ لیا۔ وہ اس پر چڑھنے لگی۔ ایک رائفل اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔

تھوڑی سی مشکل کے بعد وہ درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہاں سے وہ شیفر کے ساتھ ساتھ قریبی پگڈنڈی پر بھی نگاہ رکھ سکتی تھی۔

سورج غروب ہوتے ہی پرندوں کی چہکار معدوم ہو گئی۔ اِدھر اُدھر سے جھینگروں کے جھائیں جھائیں بولنے کی آواز بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے سوچا کہ شیفر کو سوتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ اب اسے جگا کر آگے بڑھنا چاہیے۔

ابھی وہ پیڑ سے اترنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کسی جانور نے کرخت آواز میں شور مچایا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس وقت قریب سے کچھ لوگوں کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ اس نے سانس روک کر اس طرف دیکھا۔ رائفل اس کے شانے سے ہاتھوں میں آ گئی۔ آنے والے اتحادی فوج کے سپاہی تھے جو شاید معمول کے مطابق گشت پر نکلے

تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں تھیں جن کی روشنی جیمی کے درخت کے نیچے سے گزر کر ایک جگہ رک گئی۔ جیمی نے دیکھا کہ وہ سپاہی کچھ نشانات کو دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ وہ نشانات ایک خاص سمت کی نشاندہی کر رہے تھے۔ سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو آنے کا اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف بڑھا جہاں شیفر محوِ خواب تھا۔

"اسے گھیرلو۔" جیمی نے کسی کی کرخت آواز سنی۔

ایک ٹارچ کی روشنی بدستور شیفر پر پڑ رہی تھی۔

"کیا خیال ہے؟" ایک سپاہی نے دوسرے سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہیں اس کا قصہ پاک کردو۔" جواب ملا۔ اسی لمحے شیفر نے کروٹ بدلی۔

ایک سپاہی نے رائفل تان لی اور شیفر کے سر کا نشانہ لینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر جیمی کے اعصاب تن گئے۔ اس کے سامنے اس کا محبوب، اس کا دلبر موت سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا۔ کیا وہ اپنے محبوب کو مرنے دے۔ اس نے تیزی سے سوچا اگر وہ شیفر کو بچانے کی کوشش کرتی تو باقی فوجی اس کی طرف متوجہ ہوجاتے اور پھر اس کا بچنا محال ہوتا۔ فوجی نے شست باندھ کر جیسے ہی ٹریگر دبانا چاہا جیمی نے رائفل سیدھی کی اور سپاہی کے گولی چلانے سے پہلے فائر کردیا۔ جیمی کی چلائی ہوئی گولی فوجی کے سر میں لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ باقی فوجیوں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پوزیشن لیتے ہوئے اس طرف دیکھا جدھر سے فائر ہوا تھا اور یکے بعد دیگرے کئی رائفلیں بیک وقت گرجیں۔ درخت جیمی کا دریدہ جسم نہ سنبھال سکا۔

پے در پے دھماکوں نے شیفر کو بیدار کردیا۔ اس نے گھبرا کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ جیمی کی چیخ نے اسے اپنے حواسوں میں لوٹا دیا تھا۔ اس نے سامنے پڑی رائفل اٹھائی اور کچھ فاصلے پر موجود سپاہی پر گولی چلادی۔ ایک انسانی چیخ اور بلند ہوئی۔ باقی دونوں فوجیوں نے جان بچانے کے لیے ایک طرف زقند لگائی۔ اسی وقت شیفر نے درختوں کے پیچھے چھپ کر ایک فائر داغ دیا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔

وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جُل دیتا اور ان کی برسائی ہوئی گولیوں سے بچتا اندر ہی اندر دوڑتا رہا۔ اسے صرف سمت کا اندازہ تھا۔ اجنبی راستے کی دشواریاں اور غلط

راستے کے انتخاب نے اسے بہت سے نئے زخم بخش دیے۔ بھاگتے بھاگتے اس کا سانس اکھڑنے لگا مگر زندگی کی آرزو اسے دوڑنے پر مجبور کرتی رہی۔ وہ آنکھوں کے سامنے رقص کرتے اندھیرے اور رنگ برنگے دائروں کو نظرانداز کرکے آگے بڑھتا رہا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں اور اکھڑے ہوئے درختوں کی شاخوں سے الجھتا رہا پھر اسے محسوس ہوا جیسے درختوں کا علاقہ ختم ہورہا ہے۔ فضا اب پہلے کے مقابلے میں روشن روشن سی ہوگئی تھی۔ اس کا تعاقب ختم ہوچکا تھا مگر وہ پھر بھی بھاگتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اپنے قدموں کے نیچے پکی سڑک محسوس کی۔ وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکا۔ اسی لمحے ایک گاڑی تیزی سے اس طرف آئی۔ اس کی زد سے بچنے کے لیے اس نے قدم بڑھانا چاہے مگر جیسے اس کے پاؤں بے جان ہوگئے تھے۔ وہ اپنی قوت کھوچکا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے مگر پھر بھی وہ زد میں آئے بغیر نہ رہ سکا اور گاڑی کے ساتھ دور تک گھسٹتا چلا گیا۔

☆☆☆

”شیفر! تم...... تم...... زندہ ہو؟“ ملٹری انٹیلی جنس کے چیف برنارڈ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یس سر! میں نے وہ عمارت تباہ کردی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے پروگرام میں کچھ تبدیلی کردی تھی لیکن سر! میں کامیاب رہا ہوں...... یہ دیکھیے...... میں نے......“

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔“ چیف برنارڈ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹی پھر اس کا دوسرا ہاتھ میز کے نیچے رینگ گیا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا ہی تھا کہ کمرے میں پانچ مسلح فوجی داخل ہوئے۔ چیف برنارڈ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”اسے گرفتار کرلو۔“ چیف برنارڈ کی انگلی شیفر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”سر...... سر...... آپ کو یقیناً...... یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... شاید آپ تک اس عمارت کے تباہ ہونے کی خبر نہیں پہنچی...... شاید......“

”لے جاؤ اسے......“ چیف برنارڈ دہاڑا اور مسلح فوجیوں نے شیفر کو نرغے میں لے لیا۔

☆☆☆

در زنداں کھلا اور شیفر کے تاریک چہرے پر روشنی عود کر آئی۔ رات بھر وہ ذہنی عذاب میں مبتلا رہا تھا اور اب شاید اسے رہا کیا جارہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید عمارت تباہ ہونے کی تصدیق ہوچکی ہے۔ لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اسے رہا نہیں کیا جارہا تھا بلکہ فوجی اسے اپنے نرغے میں لیے کسی سمت بڑھ رہے تھے۔

”تت...... تم لوگ...... مجھے کہاں لے جارہے ہو؟“ شیفر نے ہکلاتے ہوئے فوجیوں سے سوال کیا۔

شیفر کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ کچھ راہ داریاں عبور کرکے فوجی اسے لیے ایک میدان میں پہنچ گئے۔ شیفر اس میدان کو پہچانتا تھا۔ یہاں فوجی نشانے بازی کی مشق کرتے تھے۔ میدان کے درمیان ایک آہنی کھمبا تھا۔ شیفر کو اس کھمبے سے باندھ کر فوجی رخصت ہوگئے۔ چند ہی لمحے بعد شیفر نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ شیفر کے چہرے سے شدید الجھن اور ہراس مترشح تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دور سے ایک فوجی دستہ مارچ کرتا ہوا آرہا تھا اور اس کے ساتھ چیف برنارڈ بھی تھا۔ مسلح فوجی دستہ کچھ فاصلے پر رک گیا مگر چیف برنارڈ، شیفر کی طرف بڑھا اور پھر اس کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”شیفر! ہمیں اس عمارت کی تباہی کا علم دوسرے دن ہی ہوگیا تھا۔ کل جب تم اس موت کے مشن سے زندہ بچ کر آئے اور مجھ سے ملے تو میں نے تمہاری آمد سے ہائی کمان کو مطلع کیا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے رات ہی کو ہائی کمان سے احکامات موصول ہوگئے تھے تمہیں موت کے مشن پر بھیجا گیا تھا جس میں تمہیں اپنی جان دینی تھی۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم نے حکم عدولی کی۔ اس حکم عدولی کے سبب عظیم فیوہرر نے حکم دیا ہے کہ تمہیں فوری طور پر گولی ماردی جائے۔“ یہ کہتے ہی چیف برنارڈ تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس نے جیب سے رومال نکالا۔ فائرنگ اسکواڈ نے رائفلیں سیدھی کرلیں۔ پھر چیف برنارڈ کا ہاتھ بلند ہوا اور رومال لہرایا۔ فضا پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ شیفر کا سر ڈھلک کر سینے پر آرہا تھا اور اس کے جوان سینے پر یکے بعد دیگرے تمغے سجتے جارہے تھے۔ پہلا تمغا، دوسرا تمغا، تیسرا تمغا اور چوتھا تمغا...... مگر شیفر نے تو پہلے ہی تمغے سے مطمئن ہوکر اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ جیسے اس کا خواب پورا ہوگیا ہو......



عقوبت خانہ

افسر آذر

انسان اشرف المخلوقات قرار پایا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے مرتبے کا لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ کتنا گرسکتا ہے۔ ظلم پر اترآئے تو کس طرح حیوانوں سے بدترین جاتا ہے اسی کا ایک نمونہ پیش کررہا ہوں۔ گوکہ ان واقعات کو گزرے عرصہ ہوگیا ہے لیکن اب بھی ان میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں جو ان ایام کو یاد کرکے لرزاٹھتے ہیں

دل کو دہلا دینے والے واقعات کا ذکرِ خاص

مئی ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے جب ایک مال گاڑی مسلسل چار دن تک سفر کرنے کے بعد ہنگری سے "آش وٹز" پہنچی۔ یہ ٹرین سلوواکیہ سے ہوتی ہوئی جرمنی میں داخل ہوئی اور پھر لبلن اور کراکاؤ سے ہوتی ہوئی آش وٹز پہنچی تھی۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران لبلن اور کراکاؤ کے شہر بڑی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ یہاں یورپ کے مختلف ممالک سے نازی دشمن عناصر کو لاکر رکھا جاتا تھا۔ انہیں انسانوں کا باڑہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ بعد میں یہاں لائے جانے والے بد قسمت لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا لیکن مرنے سے قبل انہیں ایسے عذابوں سے گزرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے مرنے کی دعائیں ہی مانگا کرتے تھے۔ اس طرح یہ انسانی باڑے نہ صرف جیلیں تھیں بلکہ عقوبت خانے بھی تھے اور مقتل بھی۔ لیکن "آش وٹز" کا نام ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

جس مال گاڑی کا میں ذکر کررہا ہوں اس میں ۴۰ ڈبے

سخت لہجے میں کہا "لیکن صرف وہی لوگ جو اس کام کے ماہر ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی میرے معیار پر پورا نہ اترا تو..." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کے لہجے میں ایسی دھمکی اور اتنی سنگینی تھی کہ دوسرے ڈاکٹر اپنی جگہ سہم کر رہ گئے تھے۔ میں نے سوچ کر کہ اب جو ہو سو ہو قدم آگے بڑھا دیا۔

پھر ڈاکٹر مینگلے بڑی دیر تک میرا انٹرویو لیتا رہا۔ میں نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے استاد کون تھے۔ کہاں کہاں عدالتوں کے لیے کام کیا ہے۔ میرا تجربہ کیا ہے۔ میں اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ وہ میرے جوابات سے مطمئن ہوگیا اور باقی تمام ڈاکٹروں کو پھر اپنی اپنی جگہ واپس جانے کی ہدایت کردی۔ ان لوگوں کی موت بھی عارضی طور پر ٹل گئی تھی۔ یہاں میں ایک حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس حقیقت سے میں اس وقت تک آگاہ نہیں تھا۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو بائیں ہاتھ والے گروپ میں رکھا گیا تھا اور جنہیں تھوڑی دیر قبل وہاں سے ریڈ کراس کے ٹرکوں میں لے جایا گیا تھا، چند منٹ بعد وہ سب لاش بھٹیوں کے دروازوں سے گزر رہے تھے، ان دروازوں میں داخل ہونے والا کوئی شخص کبھی واپس نہ آیا تھا لیکن مرنا تو بہرحال دائیں ہاتھ والے گروپ میں شامل لوگوں کو بھی تھا لیکن فوراً نہیں، چند ماہ بعد۔

سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ اوپر آسمان پر ستارے چم چم چمک رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی جلتی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کی ناگوار بو طبیعت کو مکدر کیے ہوئے تھی۔ کنکریٹ کے کھمبوں پر سرچ لائٹیں روشن تھیں۔ ایک دو نہیں، سیکڑوں سرچ لائٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ آخر ڈاکٹر مینگلے اپنے کام سے فارغ ہوگیا۔ اس نے ایس ایس گارڈز کو آخری ہدایات دیں اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت کی۔

میں کار کی پچھلی نشست پر ایک جونیئر ایس ایس آفیسر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کار خود ڈاکٹر مینگلے ڈرائیو کررہا تھا۔ ہم خاردار تاروں کی باڑھ اور بیرکوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ یہ سفر ایک نسبتاً بہتر عمارت پر ختم ہوا جس پر جلی حروف میں "کیمپ آفس" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

اس عمارت کے اندر کئی افراد قیدیوں کا لباس پہنے اپنی میزوں پر بیٹھے کام کررہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر مینگلے کو دیکھتے ہی اٹینشن حالت میں کھڑے

گائیڈڈ میزائل
(Guided Missile)

ایک ہتھیاری نظام جو اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے ہدف کا پیچھا کر کے اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اسے یا تو باہر سے کنٹرول کیا جاتا ہے یا پھر اس کے اندر کمپیوٹر نصب کر کے اس سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اس کے اندر برقی نظام ہوتا ہے اس کے ذریعے میزائل کو ہدایات ملتی ہیں اور وہ ان پر ہی عمل کر کے اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔ اسی بنا پر اسے گائیڈڈ میزائل کا نام دیا گیا ہے۔

مرسلہ: نیاز احسن، راولپنڈی

ہو گئے۔ ڈاکٹر مینگلے میزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اس کے سامنے ۵۰، ۵۵ برس کی عمر کا ایک قیدی کھڑا تھا جس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ "ایف" کیمپ کا ڈاکٹر سینٹ کیلر تھا۔ مینگلے مجھے اس کے حوالے کر کے چلا گیا۔ پھر وہاں چند ضروری کاغذات کی خانہ پری ہوئی۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا جس کے دوران میری تلاشی ہوئی، میرے میڈیکل بیگ۔ پھر مجھے ایک ایسی بیرک میں لے جایا گیا جس پر نمایاں حروف میں "حمام اور جراثیم کشی" کے الفاظ نمایاں تھے۔ یہاں میرے کپڑے اتروا لیے گئے۔ ایک قیدی نائی نے میرے سر کے بالوں اور جسم کے تمام بالوں کو استرے سے صاف کردیا اور میرا سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف ہوگیا۔ میرے سر کو کیلشیم کلورائڈ کے محلول سے رگڑا گیا۔ کچھ محلول میری آنکھوں میں چلا گیا جس سے کئی منٹ تک میری آنکھوں میں مرچیں اور آگ سی لگی رہی۔ پھر مجھے دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں مجھے ایک بھاری جیکٹ اور لائن دار پتلون دی گئی۔ انہیں پہنتے ہوئے میں یہی سوچتا رہا کہ نہ معلوم مجھ سے پہلے یہ لباس کس کس نے پہنا ہوگا۔ وہاں سے مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں میرے ایک بازو پر ایک نمبر گودا گیا۔

اس وقت سے ڈاکٹر "مکلوس نے سیزلی" کا وجود جیسے ختم ہوگیا۔ اب میں قیدی نمبر A-۸۴۵۰ تھا۔

○☆○

اس کارروائی میں آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آرہے تھے جس کی بنا پر نہ تو مجھے نیند آرہی تھی، نہ تکان ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا مستقبل قطعی غیر واضح تھا۔ بیرک کا ناظم جو ایک قیدی تھا، مجھے قیدیوں کی زندگی کے معمولات بتا رہا تھا جو میں بڑی توجہ سے سن رہا تھا اور ذہن نشین کیے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "آش وٹز" کوئی کارگاہ یا بیگار کیمپ نہیں ہے بلکہ جرمنی میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں ہر روز ہزاروں افراد لائے جاتے ہیں اور پھر لاش بھٹیوں میں انہیں جلا دیا جاتا ہے۔

بیرک کے ناظم نے مجھے بتایا کہ ہر بیرک میں ۸۰۰ سے ایک ہزار کے قریب قیدی رکھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے جگہ اتنی تنگ ہوتی ہے کہ بے چارے رات کو ٹانگیں سیدھی کرکے سو بھی نہیں سکتے۔ ان کی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ بے چارے تمام انسانی قدریں بھول چکے ہیں۔ رات کو وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں، مکے مارتے ہیں، ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے ہیں، صرف اس لیے کہ انہیں قدرے آرام سے سونے کے لیے چند انچ زیادہ جگہ مل جائے۔ وہ غریب ایسا کرنے پر مجبور ہیں اس لیے کہ انہیں پوری نیند بھی تو نہیں ملتی۔ صبح تین بجے سائرن بج اٹھتا ہے اور ایس ایس گارڈز، ربر کے موٹے موٹے ڈنڈے لے کر بیرکوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انہیں کھدیڑ کر بیرکوں سے نکالتے ہیں اور پھر "کے زیڈ" میں ان قیدیوں کی زندگی کا سب سے غیر انسانی پروگرام شروع ہوتا ہے۔ یعنی قیدیوں کی حاضری لی جاتی ہے۔

بیرک کے قیدی، باہر کھلے میں، پہلو بہ پہلو پانچ قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیرک کے کلرک انہیں اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ سب سے طویل قامت قیدی سب سے آگے اور سب سے پستہ قد بالکل پیچھے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کارروائی کے دوران انہیں گھسیٹا جاتا ہے، مکے مارے جاتے ہیں۔ تھپڑ اور لاتیں ماری جاتی ہیں۔

خدا خدا کرکے یہ کارروائی مکمل ہوتی ہے تو دوسرا گارڈ آجاتا ہے جو عہدے میں پہلے گارڈ سے بڑا ہوتا ہے۔ اسے قیدیوں کی قطاریں پسند نہیں آتیں اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر پستہ قد قیدی کو سامنے اور طویل قامت قیدی کو پیچھے لے جانے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس مقصد کو بھی بے رحمی سے قیدیوں کو مار پیٹ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اب بیرک کا لیڈر معائنے کے لیے آتا ہے۔ وہ بھی قیدیوں ہی کے لباس میں ہوتا ہے لیکن خوب لمبا تڑنگا، مضبوط و توانا۔ اس کا لباس دوسرے قیدیوں سے عمدہ ہوتا ہے۔ وہ غور سے قطار میں کھڑے ہوئے قیدیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسے بھی قطاریں پسند نہیں آتیں۔ غصے سے لال پیلا ہو کر وہ سامنے کھڑے ہوئے قیدیوں کو گھونسے مارتا ہے، ان کے گریبان پکڑ کر انہیں زور زور سے جھکائیاں دے کر زمین پر پٹختا ہے۔ آگے کھڑے ہوئے قیدیوں کو پیچھے کرتا ہے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے، کوئی بتانے والا نہیں۔

یہ مشق کئی گھنٹے جاری رہتی ہے۔ قطاروں میں کھڑے ہوئے قیدیوں کو پندرہ سے بیس مرتبہ شمار کیا جاتا ہے۔ کوئی قطار اگر سیدھی نہیں ہوتی تو اس بیرک کے تمام قیدیوں کو ایک گھنٹے اٹھک بیٹھک کرائی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوتے ہیں۔ تھکن اور بھوک اور سردی سے ان کی ٹانگیں کپکپا رہی ہوتی ہیں۔ "آش وٹز" کی صبحیں تو گرمیوں میں بھی سرد ہوتی ہیں اور قیدیوں کے ہلکے لباس اس سردی کے لیے ناکافی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود سردی ہو... یا گرمی قیدیوں کی حاضری صبح تین بجے شروع ہوتی ہے اور سات بجے ختم ہوتی ہے۔

بیرک کا ناظم مجھے یہ تفصیلات بتاتا رہا اور میں اس غیر انسانی طرزِ عمل پر حیران ہوتا رہا اس لیے کہ میں نے جو کچھ ان قید خانوں کے بارے میں سنا تھا حقائق اس سے زیادہ سنگین تھے۔ بیرک کے قیدیوں کا ناظم مجھے بتا رہا تھا کہ ہر بیرک کا لیڈر جرمن قیدی ہے۔ وہ ایس ایس کا نہایت فرمانبردار خادم ہے۔ یہ لیڈر مختلف جرائم میں سزا یافتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے قیدیوں کے مقابلے میں یہ قیدی زیادہ معزز اور باعزت ہوتے ہیں ان کی شناخت کے لیے ان کی قمیص کی جیب پر سبز رنگ سے ایک نشان بنا ہوتا ہے۔ بہرحال جب یہ لیڈر مطمئن ہو جاتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو ایس ایس گارڈز معائنے کے لیے آتے ہیں۔ وہ اپنی نوٹ بکیں لے کر ان قیدیوں کو نمبروار شمار کرتے ہیں۔ ہر بیرک میں روزانہ صبح کے وقت پانچ چھ افراد مرے ہوئے ملتے تھے لیکن حکم یہ تھا کہ حاضری اور معائنے کے وقت وہ بھی باہر موجود ہوں۔ ان کے ساتھی قیدی ان مردہ قیدیوں کو ننگا کرکے باہر لاتے اور سہارا دے کر اپنے درمیان کھڑا کیے رکھتے کیونکہ حاضری اور گنتی کے وقت قیدیوں کی تعداد پوری ہونا ضروری تھا۔ مرنے والے قیدیوں کو لے جانے کے لیے خاص کمانڈوز مقرر تھے جو ہتھ گاڑیوں میں ڈال کر لاشیں لے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کام کی زیادتی کے سبب کئی کئی دن نہ آتے اس لیے مرنے والوں کو واپس بیرک میں لے جایا جاتا اور اگلے دن پھر

حاضری میں اسی طرح لایا جاتا۔ رجسٹر سے ان مرنے والے قیدیوں کے نام اس وقت کاٹے جاتے جب یہ کمانڈوز انہیں لے جاتے۔

یہ حالات سن کر میں اس لیے خوش ہوگیا کہ میں اس غیر انسانی سلوک کا شکار نہیں ہوں گا۔ میں اسپتال کی بیرک میں سویا کروں گا۔ شاید میری یہ خوشی، میری سفاکانہ خود غرضی کا مظہر تھی۔

صبح ۷ بجے ہم ڈاکٹروں کی بھی حاضری ہوتی تھی۔ ہم سب بیرک کے سامنے قطار میں کھڑے ہوجاتے تھے اور ہماری گنتی کی جاتی تھی۔ اس عمل میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ یہاں بھی بیمار زندہ مریضوں کے ساتھ مرنے والے مریضوں کو بھی شمار کیا جاتا تھا اور انہیں زندہ مریضوں کے پہلو بہ پہلو لٹایا جاتا تھا۔

ناشتے پر میری ملاقات دوسرے ساتھی ڈاکٹروں سے ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر لیوی اور ڈاکٹر گراس بھی شامل تھے۔ دونوں بڑے مشہور ڈاکٹر تھے، یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے اور اپنے تحقیقی کاموں کی بنا پر یورپ میں ان کی شہرت تھی۔ یہ لوگ بغیر مناسب دواؤں اور کم و بیش بے کار یا ناقص طبی آلات کے باوجود اپنے بیمار ساتھیوں کا علاج کرتے تھے اور ان کی تکلیف اور دکھ درد کو کم سے کم حد پر رکھنے کی کوششیں کرتے تھے۔ ان ڈاکٹروں کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں عجیب صورت حال کا سامنا تھا۔ وہ صرف بیماروں کے معالج نہیں تھے بلکہ ایسے افراد کے معالج تھے جو زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تھے۔ وہاں ہر قیدی ہی مردہ تھا۔ اس کی زندگی محض سراب اور دھوکا تھی۔

”آش وِتز“ ایک عقوبت خانہ بھی تھا اور لاش بھٹی بھی۔ یہاں لائے جانے والے افراد کو بہرحال ٹھکانے لگانا ہی مقصود تھا۔ یہاں کی زندگی اتنی سخت تھی کہ انتہائی صحت مند شخص بھی بھوک، گندگی اور صبح و شام مارپیٹ اور غیر انسانی مشقت کے نتیجے میں تین چار ہفتے کے اندر ہی زندہ ڈھانچے میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے مریضوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ یہاں کے مریض خون اور پانی کی کمی، کم اور ناقص خوراک کی وجہ سے سانس لیتے پنجر ہوتے تھے۔ ہونٹ پھٹے ہوئے، چہروں پر ورم، ناقابلِ علاج کھچ کھچ میں مبتلا جسموں پر جگہ جگہ رستے ہوئے بدنما زخم، پیپ سے بھرے اور سڑے ہوئے زخم۔ ایسے مریض جن کا علاج بہترین سے بہترین سہولتوں اور ہر قسم کی دواؤں سے آراستہ اسپتالوں میں بھی شاید ممکن نہ تھا، وہ آش وتز کے زیڈ کے اسپتالوں میں مریض تھے جہاں نہ دوائیں تھیں، نہ مرہم پٹی کا سامان، نہ صحیح طبی آلات!

○☆○

میں اسپتالوں کی بیرک میں تو مقیم تھا لیکن ابھی تک مجھے کوئی خاص کام نہیں سونپا گیا تھا۔ اس لیے میں اسپتال کی بیرکوں میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ ایک دن میں ایک فرانسیسی ڈاکٹر کے ساتھ ایک بیرک کی طرف گیا تو دیکھا کہ اس بیرک کے ساتھ ایک طرف باہر کو ایک کمرا سا بنا ہوا تھا۔ باہر سے یہ کوئی اسٹور روم معلوم ہوتا تھا۔ اندر جاکر دیکھا تو وہاں ایک بڑی سی میز پڑی دیکھی۔ میز کیا تھی، ناہموار تختوں کو جوڑ کر میز کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرف کرسی پڑی تھی۔ چھوٹی سی میز پر کُند اور ناقص آلات جراحی پڑے تھے۔ میرے پوچھنے پر فرانسیسی ڈاکٹر نے بتایا کہ پورے اسپتال میں یہی واحد کمرا ہے جو چیر پھاڑ کے لیے کام آتا ہے۔ کافی عرصے سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ پوسٹ مارٹم اور چیر پھاڑ کا کوئی ماہر ہی یہاں نہیں ہے۔ اب تم آگئے ہو تو شاید یہاں پھر سے سرگرمیاں شروع ہوجائیں۔

یہ سن کر تو جیسے میرا دم ہی نکل گیا۔ میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اس قدر ناقص انتظام پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات کے طور پر میں نے اس ماحول کو بھی قبول کرلیا۔ قبول نہ کرتا تو کیا کرتا۔ میرے اختیار میں تھا بھی کیا؟ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہاں مجھ سے کیا کام لیا جائے گا۔

میں نے یہاں کی کھڑکی سے باہر خاردار تاروں کی باڑھ کے پیچھے کے احاطے پر نظر ڈالی۔ وہاں میدان میں گہری رنگت والے دبلے پتلے بچے دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ ایک طرف شوخ رنگ کے لباس میں گول چہروں والی عورتیں بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف نیم عریاں مرد دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ یہ آش وتز کا بدنام زمانہ ”خانہ بدوش کیمپ“ تھا۔ نازی جرمنوں نے تمام مقبوضہ ممالک سے خانہ بدوشوں کو پکڑ کر یہاں لاکر رکھا ہوا تھا۔ یہودیوں کی طرح ان خانہ بدوشوں کو بھی کم تر نسل سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ چونکہ کیتھولک عیسائی تھے اس لیے انہیں خاندانوں کی صورت میں رہنے کی سہولت حاصل تھی۔

اس کیمپ میں کوئی ساڑھے چار ہزار خانہ بدوش بند تھے۔ یہ لوگ کام نہیں کرتے تھے بس آس پاس کے یہودی کیمپوں کی نگرانی ان کی ذمے داری تھی اور یہ فرض یہ لوگ انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے پورا کرتے تھے۔ خانہ بدوش

کیمپ میں سب سے حیرت انگیز چیز وہ بیرک تھی جو ''طبی تجربات'' کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس کی ریسرچ لیبارٹری کا انچارج ڈاکٹر ا لپسٹائن تھا۔ وہ یونیورسٹی آف پراگ کا پروفیسر تھا اور جینیات کا عالمی شہرت یافتہ ماہر تھا۔ ۱۹۴۰ء سے وہ آش وٹز کے زیڈ کا قیدی تھا۔ اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر بینڈل تھا' یونیورسٹی آف پیرس کے میڈیکل اسکول کا پروفیسر۔

اس ریسرچ لیبارٹری میں تین اقسام کے تجربات کیے جاتے تھے۔ دو یا دو سے زائد بچوں کی بیک وقت پیدائش کے اسباب و علل، ٹھنگنے اور بلند قامت افراد کی پیدائش کے اسباب اور چہرے کی خشک گینگرین نامی مرض کے اسباب۔ یہ بیماری چونکہ خانہ بدوشوں میں عام تھی اس لیے یہاں اس مرض کی تحقیق کے مواقع وافر تعداد میں موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں اس مرض کا علاج دریافت کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی گئی تھی' ڈاکٹر مینگلے روزانہ اس لیبارٹری آیا کرتا تھا اور طبی تحقیق کے ہر مرحلے میں گہری دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اس کام میں دو قیدی ڈاکٹر اس کی مدد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈینا نامی ایک خوب صورت مصورہ تجربات کے سلسلے میں اسکیچ وغیرہ بناتی تھی۔ اس کا تعلق پراگ سے تھا اور وہ تین برس سے یہاں مقید تھی۔ ڈاکٹر مینگلے اس پر بہت مہربان تھا اس وجہ سے اسے ایسی سہولتیں حاصل تھیں جو کسی اور قیدی کو حاصل نہ تھیں۔

ڈاکٹر مینگلے آدمی کیا تھا' جن تھا۔ تھکن تو شاید اس پر کبھی غالب ہی نہیں آتی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے طبی لیبارٹری میں کام کرتا تھا اور پھر وہاں سے سیدھا اسٹیشن جایا کرتا تھا۔ جہاں ہر روز نئے قیدیوں کو لے کر گاڑیاں پہنچا کرتی تھیں۔ ان نو آمدہ قیدیوں کی چھانٹی کا کام وہ نہایت عرق ریزی سے کرتا تھا۔ کن لوگوں کو فوری طور پر لاش بھٹیوں کے حوالے کرنا ہے' کن لوگوں کو بیگار لینے کے لیے منتخب کیا جانا ہے یہ فیصلہ وہی کرتا تھا جو حتمی ہوتا تھا۔ ان مصروفیات کے بعد وہ میرے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔

ایک روز دو قیدی ایک ہتھ گاڑی سے دو لاشیں لے کر اسپتال پہنچے یہ لاشیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں رکھ دی گئیں۔ ان لاشوں کے سینوں پر خاص چاک سے زیڈ اور ایس کے حروف لکھے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ان لاشوں کی چیر پھاڑ ہونا ہے پوسٹ مارٹم مطلوب ہے۔ اسپتال کے ناظم نے میری مدد کے لیے ایک ذہین قیدی کی خدمات میرے حوالے کردیں۔ ہم نے ایک لاش میز پر رکھ دی۔ اس کی گردن پر میں نے ایک سیاہ لکیر دیکھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو یا تو پھانسی دی گئی ہے یا پھر اس نے خود کو پھانسی لگا کر ہلاک کرلیا ہے۔ دوسری لاش پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ شخص بجلی کا جھٹکا لگنے سے زندگی کے عذاب سے نجات پاچکا ہے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ اس شخص نے مرنے کے لیے خود کو ہائی ٹینشن تاروں پر گرایا تھا یا اسے دھکا دے کر ان تاروں پر پھینک دیا گیا تھا جن میں تیز برقی رو گزر رہی تھی۔ آش وٹز کے زیڈ میں یہ دونوں طریقے عام تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے دو لاشیں میرے معائنے کے لیے بھیجی تھیں۔ اس سے ایک روز پہلے اس نے مجھے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ میں نہایت توجہ' مہارت اور ہوشیاری سے یہ کام کروں اور میں اس کے احکام پر پوری طرح عمل کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ مجھے اپنی عارضی زندگی بھی بہت عزیز تھی۔

ڈاکٹر مینگلے اس دن اچانک ہی دو سینئر ایس ایس افسروں کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ بیرک کے لیڈر کی رپورٹ سننے کے بعد وہ سیدھا چیر پھاڑ کے اس کمرے کی طرف آیا۔ وہ پوسٹ مارٹم کی میز کے گرد اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے وہ کسی اہم میڈیکل سینٹر کے پوسٹ مارٹم روم میں موجود ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب میرا کڑا امتحان لیا جانے والا ہے اور میرے ممتحن بہت سفاک اور سخت گیر ہیں۔ ڈاکٹر مینگلے کی ہدایات پر میں نے ایک لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ اس موقعے پر میں اپنے تمام تجربے کو بروئے کار لارہا تھا۔ طے شدہ طریق کار کے مطابق میں نے سب سے پہلے لاش کی کھوپڑی کھولی اور سب سے آخر میں پیٹ چاک کیا۔ اس دوران میں' کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے' میں اپنے ممتحنوں کے چہروں کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ وہ سب میرے کام سے مطمئن اور متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دوسری لاش کا پوسٹ مارٹم شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے کہا ''ٹھیک ہے۔ اپنی رپورٹ آج رات تیار کرلینا۔ کل صبح کوئی بھی شخص آکر وہ رپورٹ لے جائے گا۔''

○☆○

اس کے بعد تین دن یونہی گزر گئے۔ میرے پاس کوئی کام نہ تھا اس لیے میں بس اس اسپتال کے مختلف حصوں میں چکر لگاتا رہتا یا پھر کہیں تنہائی میں بیٹھا اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں سوچتا رہتا کہ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ اس روز میں آش وٹز کے اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھا

خیالات میں غرق تھا کہ میری نظر تھوڑے فاصلے پر لاش بھٹی کے صحن میں جمع لوگوں پر پڑی۔ دو سو افراد قطاروں میں ایک ایس ایس گارڈ کے سامنے کھڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ رات کے پہرے داروں کی جگہ شاید دن کے پہرے دار لینے والے ہیں اور یہ اسی کی تیاری ہے کیونکہ لاش بھٹیاں دن رات کام کرتی رہتی تھیں۔ بعد میں مجھے ایک قیدی نے بتایا کہ وہ سونڈر کمانڈوز تھے یعنی کمانڈوز بکارِ خاص۔ یہ کمانڈوز بھی قیدیوں میں سے ہی منتخب کیے جاتے تھے۔ انہیں بہت عمدہ خوراک اور سویلین لباس دیئے جاتے تھے۔ ان خصوصی کمانڈوز کو لاش بھٹی کے احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر چار ماہ بعد، اس وقت جبکہ یہ خصوصی کمانڈوز لاش بھٹی اور اس کے احاطے اور اس کی عمارت سے خوب اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو وہ گردن زدنی قرار پاتے تھے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ جب سے آش وٹز کا یہ "کے زیڈ" قائم ہوا تھا، ایسا ہی ہوتا چلا آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ان دیواروں کے پیچھے گزشتہ کئی برس سے کیا ہو رہا ہے؟

میں بیرک ۱۱ میں واپس آیا ہی تھا کہ ڈاکٹر مینگلے بھی وہاں آ گیا۔ اس نے مجھے طلب کیا۔ میں اس کے سامنے حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ مجھے اس کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ میں اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ اس دن اس کے ساتھ کوئی ایس ایس افسر نہیں تھا۔ پہلے اس نے اپنی کار کیمپ آفس پر روکی اور وہاں سے میرے کوائف کا کارڈ لے کر پھر اس نے کار چلا دی۔ کار خاردار تاروں کی باڑھ کے درمیان سے گزرنے والے بھول بھلیوں جیسے راستے پر بڑھتی رہی۔ خاردار تاروں سے گھرے ہوئے احاطوں کے درمیان بیرکیں اور چھوٹی چھوٹی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ کار ایک سیکشن سے دوسرے سیکشن سے گزرتی رہی۔ ہر سیکشن کے گیٹ پر محافظوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ ۲۰ منٹ اس سفر کو ہو گئے تھے لیکن خاردار تاروں سے گھرے ہوئے احاطوں کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ آش وٹز کا "کے زیڈ" کتنا طویل و عریض تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بعض اوقات تو ادھر [illegible] "کے زیڈ" میں جسے فیکٹری کہا جاتا [illegible] لاکھ [illegible] قیدی ہوا کرتے تھے۔ اس فیکٹری کی وسعت کا اندازہ قیدیوں کے لیے یوں بھی مشکل تھا کہ ان میں سے ہر شخص تو اسی بیرک یا اسی جگہ مر جاتا تھا جہاں اسے اسٹیشن سے پہنچایا جاتا تھا۔

اسی سفر کے دوران اچانک ڈاکٹر مینگلے نے مجھ سے کہا "میں تمہیں جس جگہ لے جا رہا ہوں وہ کوئی سینی ٹوریم نہیں ہے لیکن وہاں کے حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہیں۔ خاص طور پر تمہارے کام کے لیے۔"

اس سفر کا اختتام خاردار تاروں سے گھری ہوئی ایک عمارت پر ہوا۔ یہ عمارت لاش بھٹی کی تھی۔ آہنی دروازے سے گزر کر کار عمارت کے سامنے جا کر رکی۔ ایس ایس گارڈز نے ڈاکٹر مینگلے کو سلیوٹ کیا۔ ڈاکٹر اتر کر عمارت کی طرف بڑھا اور گارڈ کے افسر سے سوال کیا "کمرا تیار ہے؟"

"جی ہاں" ایس ایس افسر نے جواب دیا۔

بیس منٹ بعد ڈاکٹر مینگلے مجھے وہاں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ اس دوران میں اس نے یہاں مجھے وہ کمرا دکھایا تھا جہاں اب مجھے رہنا تھا اور جو میرے یہاں آنے سے پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے یہاں پوسٹ مارٹم کا کمرا دکھایا تھا۔ میرے کمرے میں میرے آرام کے لیے ہر وہ چیز موجود تھی جو ایک قیدی کسی قید خانے میں تصور بھی نہیں کر سکتا اور پوسٹ مارٹم کے کمرے میں ہر وہ اوزار موجود تھا جس کا تصور کوئی ڈاکٹر کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ہر قسم کی ادویات بھی وافر مقدار میں موجود تھیں۔

لیکن میں تو انجانے خوف میں مبتلا تھا۔ موت کے خوف میں۔ حالانکہ موت اس کیمپ کے قیدیوں کے لیے ایک اٹل حقیقت تھی۔ پھر بھی اس موت کا خوف از سرِنو مجھ پر طاری تھا۔ اور اس وجہ سے کہ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں بھی ایک خصوصی کمانڈو تھا۔ ایسا کمانڈو جس کی زندگی کا عرصہ صرف چند مہینوں پر مشتمل تھا۔ میں بیرک نمبر ۱۱ سے نکل کر لاش بھٹی میں آ گیا تھا۔ یہاں سے کوئی خصوصی کمانڈو، کوئی قیدی زندہ باہر نہیں جاتا تھا۔ مجھے جو سویلین ڈریس دیا گیا تھا۔ وہ بھی خصوصی کمانڈوز کی وردی تھی۔

میرے آنے کی خبر وہاں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے لگے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے میرے لیے کمرا تیار کیا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ میرا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے میرے سامنے ایس ایس گارڈز کے افسر سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی ایس ایس افسر مجھ سے تعرض نہ کرے۔ میں ان میں سے کسی کا ماتحت نہیں۔ میں صرف ڈاکٹر مینگلے کے احکامات کا پابند تھا۔ مجھے صبح و شام حاضری کے لیے بھی دوسرے خصوصی کمانڈوز کے ساتھ موجود ہونا ضروری نہ ہوگا۔ میں ہی اس لاش بھٹی کے تمام ایس ایس عملے کا [illegible]

تعداد ۴۰ کے قریب تھی۔ میں ہی ان ۸۶۰ خصوصی کمانڈوز کا بھی معالج تھا جو اس لاش بھٹی میں کام کرتے تھے۔ میں اس لاش بھٹی میں کام پر مامور بیماروں کو صبح وشام دیکھنے کا بھی پابند تھا اور مجھے بیماروں کے بارے میں روزانہ ایک رپورٹ ایس ایس کمانڈنٹ کو بھی دینا ضروری تھا۔

اب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ جو مجھ سے ملنے آئے تھے، لاش بھٹی کی دوسری منزل پر چلا گیا جہاں تمام خصوصی کمانڈوز رہتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا کمرا تھا۔ کمانڈوز کے سونے کے لیے دیواروں کے ساتھ برتھیں بنی ہوئی تھیں۔ ہر برتھ پر ریشمی چادریں بچھی تھیں۔ کمرا خوب روشن تھا۔ یہاں کمانڈوز کے سامان سے ان کی "خوش حالی" ظاہر تھی لیکن یہ خوش حالی ان مرنے والوں کے سامان کے طفیل تھی جن کی لاشیں اسی جگہ جلادی گئی تھیں۔

کھانے کے لیے ہم جس میز پر بیٹھے وہ بھی ریشمی میزپوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پلیٹیں چینی کی اور بہت قیمتی تھیں۔ کھانے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ ٹماٹر کی چٹنی، جیلی، جام، مارملیڈ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بھی ہمارے ان ہم قوموں کی تھیں جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ یہ اشیائے خوردنی مختلف ممالک کی تیار کردہ تھیں۔ کھانے کے بعد سگریٹ نوشی کا دور بھی ہوا۔ یہ سگریٹیں بھی جرمنی کی نہیں تھیں، مفتوحہ ممالک کی تھیں، جہاں سے جرمنوں کی نظروں میں ان لوگوں کو پکڑ کر لایا گیا تھا جو کم تر نسل کے تھے اور ان میں یہودی سب سے زیادہ تھے۔

کھانے کے بعد ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس میز کے گرد پولینڈ، فرانس، یونان، اٹلی، جرمنی، یوگوسلاویہ کے علاوہ کئی اور ممالک کی بھی نمائندگی موجود تھی لیکن ہم سب جرمن زبان جانتے تھے اس لیے ہم جرمن زبان میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ہی کسی نے مجھے ان لاش بھٹیوں کی تاریخ کے بارے میں بتایا تھا۔ ہزاروں قیدیوں نے شب و روز محنت کر کے انہیں پتھروں اور کنکریٹ سے تعمیر کیا تھا۔ ان کی تعمیر انتہائی سرد موسم میں مکمل ہوئی تھی اور وہ بھوک و پیاس سے نڈھال دن رات ان کی تعمیر کرنے میں اپنی جان کھپاتے رہتے تھے۔ انتہائی سرد موسم میں بھی ان کے جسم پر سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی مناسب لباس نہیں ہوتا تھا۔ ان لاش بھٹیوں کی تعمیر کے بعد ان کو اپنے ہاتھوں سے بنانے والے ہی سب سے پہلے ان..... میں جلائے گئے تھے۔

○☆○

انجن کی سیٹی کی آواز سن کر میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ گیا۔ یہاں وہ جگہ صاف نظر آتی تھی جہاں آش وٹز پہنچنے والی مال گاڑیوں سے قیدیوں کو اتارا جاتا تھا۔ اس مرتبہ جو ٹرین آئی تھی بہت لمبی تھی۔ نصف گھنٹے کے اندر ہی ٹرین سے آنے والے قیدیوں کی درجہ بندی مکمل ہو گئی اور بائیں ہاتھ والے گروپ کے قیدی چل پڑے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت میں ہل چل مچ گئی۔ بلند آوازوں میں احکام جاری ہوئے۔ آنے والوں کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لاش بھٹیوں کی اس فیکٹری کی مختلف مشینیں چل پڑیں۔ آگ کے شعلوں کو بھڑکانے اور لاش جلانے والی چتا میں مطلوبہ درجہ حرارت پیدا کرنے کے لیے ہوا دانوں میں بڑے بڑے پنکھے چلنے لگے۔ چتا کے طور پر استعمال ہونے والا کمرا ۵۰۰ فٹ طویل تھا۔ یہ کمرا بہت روشن تھا۔ اس میں سفید چمک دار پینٹ کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں پندرہ لاش بھٹیوں کے منہ کھلتے تھے جن کے دہانے پر فولادی جالیاں نصب تھیں اس کے ساتھ ہی دیوار میں پانچ بڑے بڑے فولادی دروازے تھے۔ چتا کمرے کا فرش پکا تھا۔

۵ منٹ بعد قیدی اس فیکٹری کے گیٹ سے داخل ہوئے۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بچوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ وہ اپنی ماؤں کے کپڑے تھامے لڑھکتے ہوئے چل رہے تھے۔ شیر خوار بچے اور چھوٹے بچے اپنے والدین کی گود میں تھے۔ ابھی یہ لوگ عمارت تک نہیں پہنچے تھے کہ ان کی نظر با ہر ان نلکوں پر پڑیں جو گھاس پر پانی چھڑکنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے جلدی جلدی اپنے سامان سے برتن نکالے اور.... انہیں پانی سے بھرنے لگے۔ ان پر ایک عجیب سی دیوانگی طاری تھی۔ اس دیوانگی کا سبب یہ تھا کہ پانچ دن کے سفر کے دوران میں انہیں پینے کے لیے پانی نہیں ملا تھا۔ یہاں آنے والے تمام قیدیوں کی یہی حالت ہوتی تھی اور وہ اس قسم کے مناظر کے عادی ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک یہ قیدی اپنی پیاس نہیں بجھالیں گے وہ آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس لیے وہ خاموشی سے ان لوگوں کی دیوانگی کے اس مظاہرے کو دیکھتے رہے۔ پیاس بجھانے اور برتنوں کو پانی سے بھر لینے کے بعد وہ پھر قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ایس ایس گارڈز کے اشارے پر آگے بڑھے۔ اب وہ ایک چبوترے پر پہنچ گئے تھے، جہاں سے سیڑھیاں ایک طویل و عریض زیر زمین ہال میں اترتی تھیں۔ اس ہال میں بڑے نمایاں اور جلی حروف میں "حمام اور جراثیم کشی" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے

یہ کمرا دو سو گز طویل تھا۔ اس کی دیواریں سفید تھیں۔ ہر طرف ستون تھے۔ دیواروں اور ستون کے ساتھ بینچیں پڑی تھیں۔ بینچوں کے اوپر کپڑے لٹکانے والے ہینگرز نمبوار لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ یورپ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں یہ الفاظ لکھے تھے کہ ہر شخص اپنے کپڑے اور جوتے باندھ دے اور اپنے ہینگر کا نمبر یاد رکھے تاکہ جب وہ غسل کرکے واپس آئے تو اسے اپنے کپڑے اور ملبوسات تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ یہ ہدایت اس لیے ضروری تھی کہ نازی جرمنی کو ان ملبوسات اور جوتوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس اقدام کے نتیجے میں جوتے اور کپڑے جو ہزاروں کی تعداد میں ہوتے خلط ملط ہونے کا خدشہ نہیں رہتا تھا۔

اس ہال یا کمرے میں تین ہزار افراد تھے۔ ابھی انہوں نے اطمینان کا ایک سانس بھی نہ لیا تھا کہ کچھ نازی فوجی وہاں آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ سب لوگ دس منٹ کے اندر اندر اپنے تمام کپڑے اتار دیں۔ سب لوگ جن میں بوڑھے، بچے، جوان، ماں باپ، بھائی بہن، بہو اور بیٹیاں.... شامل تھے، اس حکم پر بھونچکا رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے کیا کہا گیا ہے۔ شاید انہوں نے جرمن زبان کے الفاظ صحیح طور پر نہیں سنے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ سنا تھا وہ درست تھا۔ دوبارہ زیادہ بلند آواز میں، دھمکانے والے لہجے میں یہی حکم دہرایا گیا۔ یہ ان کی غیرت اور عزت نفس پر حملہ تھا لیکن یہ لوگ اس قوم سے تعلق رکھتے تھے جو ہر ظلم کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اس ہدایت کو بھی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ جو لوگ بوڑھے، مفلوج اور معذور تھے انہیں بے لباس کرنے میں خصوصی کمانڈوز نے مدد کی جب تمام لوگ بے لباس ہو گئے تو کمرے کے دوسرے کنارے پر بنا ہوا خود کار دروازہ کھل گیا۔ قیدیوں کو اس دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں جانے کی اور خصوصی کمانڈوز کو واپس باہر آنے کی ہدایت دی گئی۔ ان ہدایات پر عمل کیا گیا۔

تین ہزار قیدی، ننگ دھڑنگ، فرش پر نظریں جمائے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے جتنا بڑا تھا لیکن اس کمرے میں ہینگر نہیں تھے، بینچیں نہیں تھیں۔ البتہ اس کمرے میں لوہے کی چادروں کے چوکور ستون ضرور تھے جن میں بے شمار سوراخ تھے۔ جونہی تمام قیدی اس کمرے میں آئے خود کار دروازہ پھر بند ہو گیا اور ساتھ ہی اس کمرے کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔

کم و بیش اسی وقت انٹرنیشنل ریڈ کراس کی ایک کار لاش بھٹی فیکٹری کے گیٹ سے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کار سے ایک ایس ایس افسر اور ایک ڈپٹی ہیلتھ آفیسر اترے۔ ڈپٹی ہیلتھ آفیسر کے ہاتھ میں لوہے کی چادروں سے بنے ہوئے چار کنستر تھے۔ وہ کار سے اتر کر گھاس کے قطعے میں پہنچ گیا جہاں ہر تیس گز کے فاصلے پر سیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے پائپ زمین سے اوپر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر گیس ماسک لگایا اور پائپ پر سے کنکریٹ ہی کا بنا ہوا ڈھکنا ہٹایا اور اس میں لوہے کے ڈبے سے کوئی دانے دار چیز انڈیل دی۔ یہ چیز نیچے کسی محلول میں جا گری اور فوراً ہی اس سے گیس نکلنی شروع ہوئی اور یہ گیس لوہے کے جالی دار ستونوں کے سوراخوں سے باہر نکلنے لگی۔ چند ہی منٹ میں یہ گیس اس کمرے میں بھر گئی جس میں تین ہزار ننگ دھڑنگ قیدی دھکیلے گئے تھے۔ ۵ منٹ کے اندر اندر وہ سب مر چکے تھے۔ یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہی طریقہ کار تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔

بیس منٹ بعد ہوا دانوں کے بڑے بڑے پنکھے چلا دیے گئے تھے۔ مقصد اس کمرے سے مہلک گیس کا اخراج تھا جس میں تین ہزار لاشیں پڑی تھیں۔ دروازے کھل گئے۔ اس کے ساتھ ہی چند ٹرک بھی وہاں پہنچ گئے۔ مرنے والوں کے کپڑے، جوتے اور دیگر سامان ان ٹرکوں میں لاد دیا گیا اور ٹرک وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مقتل کا دروازہ بھی کھل گیا۔ زہریلی گیس اگرچہ صاف ہو گئی تھی لیکن اس کمرے کے کونوں، لاشوں کے درمیان خلا اور دروازوں کی خلاؤں میں زہریلی گیس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے دو گھنٹے بعد بھی انسان کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے جب اس کمرے میں خصوصی کمانڈوز کا پہلا گروپ داخل ہوا تو ان سب کے چہروں پر گیس ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ یہ کمرا اب پھر پوری طرح روشن تھا اور ایک نہایت ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔

انسانی لاشیں پورے کمرے میں ادھر ادھر بکھری نہیں پڑی تھیں بلکہ ایک طرف ایک ڈھیر کی صورت میں چھت تک پڑی ہوئی تھیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ کمرے میں ایک طرف لاشوں کا ٹیلا بنا ہوا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ زہریلی گیس پہلے فرش کے ساتھ ساتھ پھیلتی تھی اور جوں جوں گیس کی مقدار بڑھتی جاتی تھی، اس کی تہ بلند ہوتی جاتی۔ یہاں تک کہ چھت تک زہریلی گیس بھر جاتی۔ اس وجہ...

مرنے والے گیس سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کو روند ڈالتے۔ اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں وہ دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو روندتے، کچلتے، بھنبھوڑتے اوپر ہونا چاہتے۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آتا کہ اس کوشش میں وہ اپنی ہی بیویوں، بچوں اور بزرگوں کو کچل رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں اس ڈھیر میں سب سے نیچے دبی ہوئی تھیں اور سب سے اوپر سب سے زیادہ تنومند اور مضبوط اعضا والے لوگوں کی لاشیں تھیں۔ تمام لاشوں کے چہروں اور جسموں پر خراشوں، کھروچوں اور نیل کے نشانات تھے۔ ان کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ان کے چہرے پھولے ہوئے اور نیلے تھے۔ اس قدر مسخ ہوگئے تھے ان کے چہرے کہ ان کی شناخت بھی ممکن نہ تھی۔ اس کے باوجود کبھی کبھار کوئی کمانڈو ان لاشوں میں اپنے کسی عزیز یا دوست کو شناخت بھی کرلیتا تھا لیکن اس کی موت پر افسوس کا اظہار کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ حالانکہ میرا یہاں کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں یہاں آگیا تھا۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ موت کی اس فیکٹری میں کیا کیا کام ہوتے ہیں۔

پھر کمانڈوز کا ایک دستہ وہاں آگیا۔ ان سب نے گھٹنوں تک آنے والے ربر کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ یہ لوگ لاشوں کے اس ٹیلے کے گرد کھڑے ہوگئے اور پائپوں سے ان لاشوں پر پانی کی دھاریں مارنے لگے کیونکہ یہ تمام لاشیں مختلف آلائشوں اور گندگی سے آلودہ تھیں۔ ان کی صفائی ضروری تھی۔ لاشوں کو نہلانے کے بعد ان لاشوں کو جو آپس میں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں، الگ کرنے کا کام شروع ہوگیا۔ کمانڈوز نے لاشوں کی کلائیوں کو رسی کے ٹکڑوں سے باندھا اور پھر انہیں گھسیٹتے ہوئے برابر کے کمروں میں لفٹوں کے پاس لے گئے۔ اس کمرے سے چار بڑی بڑی لفٹیں چل رہی تھیں۔ کمانڈوز نے ہر لفٹ میں بیس بیس لاشیں بھریں اور پھر انہوں نے گھنٹی بجائی۔ لفٹیں چل پڑیں۔ یہ لفٹیں اس لاش بھٹی کے اس کمرے میں جاکر رکیں جو چتا کے طور پر کام آتا تھا۔ لفٹوں کے رکتے ہی لفٹوں کے سلائڈنگ دروازے کھل گئے۔ وہاں موجود کمانڈوز نے ان لاشوں کو لفٹوں سے نکال کر بھٹیوں کے سامنے لے جاکر رکھ دیا۔

یہ کام جب ختم ہوگیا تو لاشیں جلانے والے کمانڈوز آگئے۔ انہوں نے ہتھ گاڑی جیسے ٹھیلوں پر تین تین چار چار لاشیں رکھیں۔ یہ ٹھیلے لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ بھٹیوں کے خود کار دروازے کھلے اور یہ ٹھیلے ان دروازوں میں پھسلتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ ٹھیلے واپس آگئے۔ بھٹیوں کے دروازے بند ہوگئے۔

۲۰ منٹ کے اندر وہ لاشیں جل کر راکھ ہوچکی تھیں۔ ہر لاش بھٹی میں پندرہ پندرہ الاؤ کام کررہے تھے اور اس فیکٹری میں چار لاش بھٹیاں تھیں، جو دن رات اسی کام میں مصروف رہتی تھیں گویا ایک دن میں کئی ہزار لوگوں کو جلا کر راکھ بنادیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ جلائے جانے والوں کی راکھ اٹھانے کے لیے ٹرک مامور تھے جو اس انسانی راکھ کو دریائے وسچولا کے حوالے کردیتے تھے۔



پیتھالوجی کی یہ لیبارٹری جس کے لیے مجھے منتخب کیا گیا تھا، ڈاکٹر مینگلے کی سفارش پر چند روز قبل ہی مکمل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مختلف قسم کے تجربات کے لیے لاشیں ہر وقت وافر تعداد میں دستیاب تھیں اور تجربات کے لیے زندہ انسان بھی۔ ڈاکٹر مینگلے کو سب سے زیادہ دلچسپی ان اسباب کو دریافت کرنے سے تھی جن کی بنا پر جڑواں بچوں کی ولادت ہوتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ نازی فلسفے کے تخلیق کاروں کا نظریہ تھا کہ دنیا پر حکومت کرنے کا حق صرف اعلیٰ نسل کی جرمن قوم کو تھا۔ نازی اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ آرین ہیں۔ خالص آرین ہونے کی بنا پر وہ سب سے برتر قوم ہیں اور انہیں پوری دنیا پر حکومت کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ جرمنوں کی تعداد میں جلد از جلد اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ جرمن مائیں جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ جڑواں بچوں کو جنم دیں تاکہ خالص جرمن افراد کی تعداد کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ ہوجائے اور وہ چیک، ہنگری اور پولینڈ میں بسنے والے لوگوں کی جگہ لے سکیں جنہیں کم تر نسل کے انسان سمجھا جاتا تھا اور اس لیے زندہ رہنے کا حق دار نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن فی الحال وہ محض اس لیے زندہ رکھے جارہے تھے کہ ان کا وجود جرمنی کے لیے ضروری تھا۔

جڑواں بچوں کی پیدائش کا راز تلاش کرنے کے لیے، جڑواں بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی لاشیں "آش وٹز" میں آسانی سے دستیاب ہوسکتی تھیں۔ ضروری تھا کہ ان طبی تجربات کے لیے جڑواں بچے اور جوان ایک ہی وقت میں اور صحت مند حالت میں مرے ہوں تاکہ دونوں پر بیک وقت تجربات کیے جاسکیں، ان کا ایک ہی وقت میں پوسٹ مارٹم کیا جاسکے اور ان کے صحت مند اعضا کا تقابلی جائزہ کرکے ان کی مماثلتوں اور ان کے درمیان فرق کا تعین کیا جاسکے۔ "آش

ونز" میں ایسی لاشیں معقول تعداد میں حاصل ہونا کوئی مسئلہ بھی نہ تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر مینگلے جو ٹرین سے آنے والے لوگوں کی درجہ بندی کرتا تھا، پہلے ہی مرحلے میں جڑواں بچوں اور جوانوں کو الگ کرلیتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو خوشی خوشی اس لیے اس کے حوالے کردیتے تھے، سائنسی نقطہ نظر سے کیونکہ ان کے بچے ڈاکٹر مینگلے کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں اس لیے شاید ان سے اچھا سلوک کیا جائے۔ اس طرح وہ پستہ قد اور طویل قامت افراد کو طبی تجربات کے لیے چھانٹ کر الگ کرلیتا تھا۔

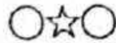
ان جڑواں بچوں اور دیگر افراد کو جو تجربات کے لیے ضروری تھے "آش ونز" میں اچھی طرح رکھا جاتا تھا، انہیں خوراک بھی عمدہ دی جاتی تھی اور لباس بھی ان کے معقول ہوتے تھے تاکہ وہ تجربات سے قبل بیمار نہ ہوں اور تجربات کے لیے انہیں صحت مند حالت میں موت کے گھاٹ اتارا جاسکے۔ جڑواں بچوں کے سلسلے میں زیادہ احتیاط برتی جاتی تھی۔ "آش ونز" کی موت کی فیکٹری دنیا میں واحد جگہ تھی جہاں جڑواں بھائی بہنیں ایک ہی وقت میں مرسکتے تھے ورنہ عام حالات میں ایسا ناممکن ہی تھا۔ زندگی کے مختلف تقاضوں کی بنا پر جڑواں بھائی بہن الگ ہوہی جاتے ہیں اور پھر ان کی اموات بھی مختلف اوقات میں ہوتی ہیں۔ "آش ونز" میں ایسا نہیں تھا۔

ڈاکٹر مینگلے کی طرف سے مجھے سب سے پہلے جو جڑواں بچے طبی معائنے اور تجزیے کے لیے بھیجے گئے وہ دو برس کے تھے۔ میں نے یہ لاشیں وصول کرتے ہوئے ان بچوں کے بارے میں فائلیں بھی وصول کی تھیں۔ فائلوں میں ابتدائی طبی معائنے کی رپورٹیں، ایکسرے رپورٹیں، مصورہ کے بنائے ہوئے کچھ خاکے وغیرہ تھے۔ ان کی صرف پیتھالوجیکل رپورٹ نہیں تھی۔ ان کے اندرونی اعضاء کے بارے میں رپورٹ مجھے فراہم کرنا تھی۔

یہ دونوں شیرخوار بھائی ایک ہی وقت میں مرے تھے اور اب ان کی لاشیں چیرپھاڑ کے لیے میز پر پڑی تھیں۔ میں اگرچہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بارہا یہ کام کرچکا تھا لیکن اس وقت جن حالات میں مجھے یہ فرض انجام دینا پڑ رہا تھا، یہ کام میرے لیے ناگوار تھا لیکن مجھے بہرحال یہ کام کرنا تھا، میں مجبور تھا۔

اس شام جب ڈاکٹر مینگلے وہاں آیا تو ان جڑواں بھائیوں کے بارے میں میری پیتھالوجیکل رپورٹ تیار تھی۔ ڈاکٹر مینگلے نے میری رپورٹ کو غور سے پڑھا۔ وہ میرے کام سے پوری طرح مطمئن تھا، لیکن اس نے میرے کام کی تعریف نہیں کی، صرف اتنا کہا "یہ رپورٹیں اعضائے انسانی، نسلی اور ارتقائی تحقیق کے انسٹی ٹیوٹ کو برلن بھیجی جائیں گی اس لیے مجھے پوری توجہ اور محنت سے یہ کام کرنا ہوگا۔"

تب مجھے پتا چلا کہ "آش ونز" میں جو طبی تجربات اور تحقیق ہوتی ہے اس کو پرکھنے اور جانچنے کا کام دنیا کے ایک انتہائی مشہور تحقیقی مرکز کے اعلیٰ حکام کرتے ہیں۔



اگلے روز جڑواں بچوں کے چار جوڑے میرے پاس بھیجے گئے۔ ان جڑواں بچوں کا تعلق خانہ بدوشوں کے کیمپ سے تھا۔ ان کی عمریں دس برس سے کم تھیں۔ آٹھوں بچے بھی بیک وقت ہی مرے تھے۔

میں نے ان جڑواں بچوں میں سے ایک جوڑے کی چیرپھاڑ شروع کی۔ سب سے پہلے میں نے ان کے کاسۂ دماغ کو کھولا اور ان کے بھیجوں کو نکال کران کا معائنہ کیا، پھر ان کے سینے چاک کیے، پھر ٹھوڑی کے نیچے چیرا لگا کران کی زبانیں نکالیں، پھر سانس کی نالی کے ساتھ پھیپھڑے وغیرہ باہر

گل جی

پاکستان کے ممتاز مصور۔ وہ 1926ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے ہائیڈرالک انجینئرنگ اور ہارپر یونیورسٹی سے سائل مکینیکل میں ایم ایس کی ڈگریاں لیں لیکن مصوری کو بطور پیشہ اپنایا اور تجریدی آرٹ میں بے پناہ تجربہ حاصل کیا۔ انہوں نے دنیا کی مشہور شخصیات کے پورٹریٹ بھی بنائے ہیں، جن میں فرانس کے چارلس ڈیگال، امریکا کے صدر ریگن، افغانستان کے ظاہر شاہ، سعودی عرب کے شاہ فیصل، ایران کے رضا شاہ پہلوی، پرنس کریم آغا خان اور پرنس صدرالدین کے علاوہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور قائداعظم کے پورٹریٹ بنائے۔ 1988ء میں قائداعظم ایوارڈ کے علاوہ ستارۂ امتیاز، پرائڈ آف پرفارمنس اور جاپان فاؤنڈیشن ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

مرسلہ: افضل میو، شیخوپورہ

آ گئے۔ ان کے تفصیلی جائزے اور معائنے کے لیے میں نے انہیں دھو ڈالا۔ غرض جو کچھ مجھے کرنا تھا، ترتیب وار کرتا رہا۔

اب ان بچوں کے دل دو الگ الگ طشتریوں میں میرے سامنے تھے۔ تب مجھے ایک عجیب سی چیز نظر آئی۔ میں چونک گیا۔ دونوں کے دلوں کے بائیں جوف میں بہت باریک سا سرخ نشان تھا۔ یہ نشان دل کے رنگ سے مختلف تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نشان انجکشن کی سوئی کا تھا لیکن دل میں انجکشن تو مریضوں کے اس وقت لگائے جاتے ہیں جب ان کی حالت بہت نازک ہوتی ہے اور "آش وٹز" میں مریضوں کی اتنی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ پھر عجیب بات یہ تھی کہ دونوں ہی جڑواں بھائیوں کے دلوں میں انجکشن لگایا گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان دلوں کو کھولنے کے کام کا آغاز کیا۔

جو کام میں کر رہا تھا اس میں عموماً دل کے بائیں جوف کا خون نکال کر اس کا وزن کیا جاتا ہے لیکن ان بچوں کے جو دل میرے سامنے تھے ان میں یہ کام نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ جوف میں خون نہیں تھا۔ ان کے جوف میں خون تو لوتھڑے کی صورت میں جما ہوا تھا۔ میں نے ایک دل میں جمے ہوئے خون کا لوتھڑا چمٹی سے نکالا اور اس کو سونگھا۔

میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ اس لوتھڑے سے کلوروفارم کی مخصوص بو آ رہی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کے دلوں میں کلوروفارم کا انجکشن لگایا تھا جس کی وجہ سے خون جم گیا تھا۔ خون کے جمنے سے دل کے والو بند ہو گئے تھے اور ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔

تب نازی جرمنوں کی میڈیکل سائنس کے انتہائی سفاکانہ اور غیر انسانی راز کا انکشاف مجھ پر ہوا۔ یہ شیطان صفت صرف گیس چیمبروں میں لوگوں کو ہلاک نہیں کرتے تھے بلکہ کلوروفارم کے انجکشن لگا کر بھی یہاں انسانوں کو ہلاک کیا جاتا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میری ٹانگیں کپکپا کر رہ گئیں لیکن مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا، سو میں نے کیا۔ میں نے اپنی رپورٹ تیار کی لیکن اس رپورٹ میں، میں نے ان حقائق کا ذکر نہیں کیا۔ میں ان کے بارے میں ڈاکٹر مینگلے کی ابتدائی رپورٹ پڑھ چکا تھا۔ اس رپورٹ میں ان بچوں کی موت کے اسباب کا ذکر تھا نہ اس بات کا کہ ان کی اموات کن حالات میں ہوئی۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں نے لاشوں کو سی کر انہیں کمانڈوز کے حوالے کر دیا تاکہ وہ انہیں جلا کر راکھ کر دیں۔ صرف ان اعضا کو میں نے بوتلوں اور جاروں میں محفوظ کر لیا جو برلن کے اینتھروپولوجیکل انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین کے لیے دلچسپی کا سبب ہو سکتے تھے۔ ان اعضا کو بہت احتیاط سے پیک کر کے برلن روانہ کیا جاتا تھا اور پیکٹوں پر "جنگی سامان، انتہائی اہم" کی مہر لگا دی جاتی تھی تاکہ ان کو جلد از جلد منزل پر پہنچایا جا سکے۔

اس کے بعد میں نے لاشوں کے باقی تینوں جوڑوں کی چیر پھاڑ کی۔ ان کی موت بھی کلوروفارم کے انجکشنوں سے ہوئی تھی۔ میں نے ان کی رپورٹیں بھی تیار کر لیں، لیکن ان کی موت کی وجہ کے خانے کو سادہ چھوڑ دیا۔ سہ پہر بعد ڈاکٹر مینگلے وہاں آیا۔ میں نے اپنی رپورٹیں اس کے حوالے کر دیں۔ یہ رپورٹیں اس نے وہیں بیٹھ کر پڑھیں۔ لاشوں سے نکالے گئے اعضا کو برلن بھیجنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ میں اپنی رپورٹ بھی برلن روانہ کر دوں اور موت کی وجہ کا خانہ بھی پُر کر دوں۔ وجہ کا تعین میری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا تاہم ضروری تھا کہ ان تمام کی موت کے اسباب مختلف ہوں۔

رپورٹیں مجھے دیتے ہوئے اس نے قدرے متاسفانہ انداز میں کہا "تم نے خود دیکھ لیا ہوگا، یہ سب کے سب آتشک کے مرض میں مبتلا تھے۔ انہیں دق اور سل کی بیماری بھی تھی۔ ان کا زندہ بچنا محال تھا۔" اس سے زیادہ اس نے کچھ نہ کہا لیکن اس نے بہرحال اشارتاً ان کی موت کا سبب تو بتا ہی دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ "آش وٹز" میں آتشک، دق اور سل کے مریضوں کا علاج دوسری دواؤں سے نہیں، کلوروفارم کے انجکشن دل میں لگا کر کیا جاتا ہے۔

○☆☆○

ڈاکٹر مینگلے جا چکا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن میں چیر پھاڑ کے اسی کمرے میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ "آش وٹز" کے ایسے رازوں سے واقف ہونے کے بعد میرا یہاں سے زندہ بچ نکلنا محال ہے۔ پھر میں کرسی سے اٹھا۔ مشینی انداز میں آلاتِ جراحی کو دھو کر انہیں ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ اچانک دل ہلا دینے والی ایک چیخ سے میں کپکپا کر رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد کسی جسم کے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ اس کے فوراً بعد پھر ویسی ہی چیخ ابھری اور کھٹ کی آواز آئی اور پھر دھپ کی آواز۔ میں نے ایسی دو چیخیں سنی تھیں جن کے بعد کھٹاک اور دھپ کی آوازیں ابھری تھیں۔ پھر میں نے بھاری قدموں کی دور ہوتی آوازیں سنیں اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

جو کچھ بھی ہوا تھا، چیر پھاڑ کے کمرے کے برابر والے

ہال میں ہوا تھا۔ اس کمرے کو لاشوں کے اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں اس کمرے میں پہنچا۔ جو آوازیں میں نے سنی تھیں اس کے بعد مجھے یقین تھا کہ میں کوئی غیر معمولی منظر ضرور دیکھوں گا۔ ایسا ہی ہوا، کمرے میں ایک طرف عورتوں کے پھٹے ہوئے گندے غلیظ لباس، ٹوٹے پھوٹے جوتے، چشمے اور باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، اور اس کمرے میں ہر طرف ہی برہنہ عورتوں کے جسم بکھرے ہوئے تھے۔ مڑے تڑے جسم، اپنے ہی خون میں لتھڑے ہوئے جسم۔ ان میں سے کئی عورتیں ابھی زندہ تھیں۔ وہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہی تھیں، سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں، دبی دبی کراہیں ان کے منہ سے ابھر رہی تھیں۔ میں نے ان عورتوں کے سروں کو اٹھا کر دیکھا جو ابھی زندہ تھیں، جو مرنے والی تھیں، جن کی سانس کا دھاگا ابھی ان کے جسموں میں اٹکا ہوا تھا۔

تب مجھ پر انکشاف ہوا، یہاں انسانوں کو صرف گیس اور کلوروفارم کے انجکشن سے نہیں مارا جاتا۔ یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ایک تیسرا طریقہ بھی ہے۔ یہاں لوگوں کی گدی میں گولی مار کر بھی ہلاک کیا جاتا ہے۔ میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ ان عورتوں کی گدی میں چھ ملی میٹر کی گولی ماری گئی ہے۔ گولی چونکہ سر یا گردن پھاڑ کر دوسری طرف سے باہر نہیں نکلتی تھی اس لیے میں اپنے تجربے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان عورتوں کو ہلاک کرنے کے لیے نرم سیسے کی گولی استعمال کی گئی ہوگی۔ اس قسم کی گولی کھوپڑی کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔

میں باہر آگیا۔ ایک کمانڈو سے جس سے میری اس عرصے میں خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی، میں نے پوچھا کہ یہ عورتیں کہاں سے آئی تھیں تو اس نے بتایا "انہیں "سی" بیرکس سے یہاں لایا گیا تھا۔ ہر شام ایک ٹرک کے ذریعے ۲۰ عورتوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ ان سب کو گدیوں میں گولی مار کر انہیں موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔"

○☆○

اگلے روز میں مریضوں کو دیکھنے کے لیے "وزٹ" پر نکلا۔ اس نوعیت کی یہ میری پہلی مصروفیت تھی۔ سب سے پہلے میں ایس ایس گارڈز کے کوارٹروں کی طرف گیا۔ لاش بھٹیوں میں کام کرنے والا ہر شخص ہی کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا تھا۔ قیدیوں کی بات تو علیحدہ ہے، ایس ایس گارڈز بھی اعصاب شکن محنت اور ذہنی دباؤ کے تحت کام کرتے تھے۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں خصوصی کمانڈوز کے کوارٹرز کی طرف گیا۔ یہ لوگ اگرچہ قیدی تھے لیکن نازیوں نے انہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ ویسے بھی خصوصی کمانڈوز کی حیثیت میں کام کرنے کے لیے نہایت صحت مند اور تنومند افراد کو منتخب کیا جاتا تھا۔ پھر بھی ان کی حالت بہت قابلِ رحم تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے والدین، اپنی بیویوں، بیٹیوں، بچوں، عزیزوں، دوستوں اور اپنے ہم قوموں کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارتے اور ان کی لاشوں کو جلاتے تھے۔ ان کا مستقبل بہت محدود تھا۔ لاش بھٹیوں کی چار برس کی تاریخ سے وہ واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کی حیثیت سے ان کی زندگی کی مدت صرف چار ماہ ہے۔ یہ مدت ختم ہوتی تو ایس ایس فوجیوں کی ایک کمپنی آتی، خصوصی کمانڈوز کو کھدیڑ کر عقبی حصے میں لے جاتی، مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ ماری جاتی اور خصوصی کمانڈوز لاشوں میں تبدیل ہو جاتے۔ نصف گھنٹے بعد خصوصی کمانڈوز کا نیا دستہ وہاں پہنچ جاتا۔ وہ اپنے مردہ ساتھیوں کا لباس اتارتے، ایک گھنٹے بعد مردہ کمانڈوز کی لاشیں راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوتیں۔ خصوصی کمانڈوز کے ہر نئے دستے کا پہلا کام اپنے پیش روؤں کی لاشیں جلانا ہوتا۔ خصوصی کمانڈوز کو دیکھنے کے لیے جب میں وزٹ پر جاتا تو ہر مرتبہ دو چار کمانڈوز گڑگڑا کر مجھ سے التجا کرتے کہ میں انہیں کوئی زود اثر زہر دے دوں تاکہ وہ اپنی زندگی ختم کر لیں لیکن ہمیشہ میں انکار کر دیتا۔ آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آخر میں نے ان کی درخواست کو کیوں رد کر دیا۔ وہ سب مر چکے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ چشم زدن میں ہی مار ڈالے گئے لیکن یہ ایسی موت تھی جو انہیں پسند نہ تھی۔ وہ تو اپنی خوشی سے اپنی جان لینا چاہتے تھے۔ وہ نازی قاتلوں کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتے تھے۔

لاش بھٹی نمبر ایک سے فارغ ہو کر میں لاش بھٹی یا موت کی فیکٹری نمبر دو پہنچا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہ "فیکٹری" بھی اپنے نقشے کے اعتبار سے فیکٹری نمبر ایک جیسی ہی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ وہ کمرا جو فیکٹری نمبر ایک میں چیر پھاڑ کے لیے میرے استعمال میں تھا، یہاں زرگری کے کام کے لیے مخصوص تھا۔ "آش وٹز" میں موت کی جو چار "فیکٹریاں" یا لاش بھٹیاں کام کر رہی تھیں وہاں سے حاصل ہونے والا تمام سونا یہاں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تمام ہیرے، جواہرات اور قیمتی پتھر بھی یہاں لائے جاتے تھے۔ جوہری اور زرگر یہاں قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات کی

درجہ بندی کرتے اور سونے کو پگھلا کر انہیں ۱۴۰ گرام وزنی بسکٹوں میں ڈھال دیتے۔ یہاں روزانہ ۶۵ سے ۷۵ پاؤنڈز سونا پگھلا کر بسکٹوں کی صورت میں ڈھالا جاتا تھا۔

موت کی اس "فیکٹری" میں قائم زرگری کے اس شعبے کے حوالے سے کئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ لاش بھٹیوں میں سونا اکٹھا کرتے وقت چوری کا ایک نظام شروع سے موجود تھا۔ یہاں سے کچھ سونا کمانڈوز کی جیبوں میں منتقل ہوجاتا تھا۔ اسی طرح مرنے والوں کے کپڑوں کی جیبوں، یا ان کے لباس کے استروں میں چھپائے ہوئے قیمتی ہیرے جواہرات کی تلاش کے دوران بھی بہت سے قیمتی پتھر خصوصی کمانڈوز کی جیبوں میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ کام بہت خطرناک تھا کیونکہ ایس ایس گارڈز ان کی نگرانی پر موجود ہوتے لیکن بہرحال ایسا ہوتا تھا اور اس وقت سے یہ کام ہورہا تھا جب یہاں خصوصی کمانڈوز کا پہلا دستہ کام پر آیا تھا۔ شروع میں تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر خصوصی کمانڈوز ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آخر یہ لوگ کس قدر پستی میں اتر گئے ہیں کہ اس قدر گھٹیا کام کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کررہے ہیں۔ ویسے بھی مرنے والوں کی ان اشیا کے اصل اور قانونی وارث تو یہی خصوصی کمانڈوز تھے۔

یہ خصوصی کمانڈوز اس طرح چرائے ہوئے سونے کو بسکٹوں میں تبدیل کرانے کے لیے موت کی فیکٹری نمبر دو کے اسی "کارخانے" کے سناروں کی خدمات حاصل کرتے تھے جہاں سونا پگھلایا اور ڈھالا جاتا تھا اور پھر سونے کے ان بسکٹوں سے ضروری اشیا حاصل کرلیتے تھے۔ یہ کام مشکل اور خطرناک ضرور تھا لیکن بہرحال ہورہا تھا۔ اس کا ایک پورا نظام قائم تھا۔

یہ نظام خصوصی کمانڈوز کے پہلے دستے نے قائم کیا تھا۔ اس نظام میں تبادلے کی اکائی سونے کے یہی بسکٹ تھے جن کا وزن ۱۴۰ گرام تھا کیونکہ وہاں اس سے کم وزن کے بسکٹ تیار ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے پاس ڈھلائی کا دوسرا سانچہ بھی نہ تھا۔ اس کام میں کچھ ایس ایس گارڈز بھی شریک ہوتے لیکن تمام خطرات خصوصی کمانڈوز ہی کو مول لینے پڑتے۔ خصوصی کمانڈو یہ سونا کاغذ میں لپیٹ کر گیٹ تک پہنچتا، وہاں متعین گارڈ سے دبے لہجے میں بات کرتا، وہ گیٹ سے اِدھر اُدھر ہوجاتا۔ سامنے گزرتی ہوئی ریلوے لائن کے پار بیس، پچیس پولش باشندوں کی ایک جماعت کام کیا کرتی تھی۔ خصوصی کمانڈو اشارہ کرتا، ان مزدوروں کا انچارج اشارہ پاکر گیٹ کی طرف آتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا ہوتا۔ خصوصی کمانڈو سے سونا لیتا اور تھیلا اس کے حوالے کردیتا۔ اس تھیلے میں مطلوبہ سامان ہوتا۔

اس کارروائی کے بعد خصوصی کمانڈو گارڈ ہاؤس میں واپس جاتا۔ تھیلے سے سو، ڈیڑھ سو سگریٹیں اور برانڈی کی ایک بوتل نکالتا۔ ایس ایس گارڈ جلدی سے وہاں داخل ہوکر یہ چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیتا۔ سرکاری طور پر ایس ایس گارڈ کو روزانہ صرف دو سگریٹیں ملا کرتی تھیں اور شراب تو ان کے لیے قطعی ممنوع تھی، لیکن موت کے اس کارخانے میں جسے "کے زیڈ" کہا جاتا تھا، یہ دونوں چیزیں مل جاتی تھیں۔ ایس ایس گارڈ اور خصوصی کمانڈوز یہ دونوں چیزیں بے تحاشا استعمال کرتے تھے۔

اسی طریقے سے مکھن، انڈے، پیاز اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء بھی یہاں پہنچ جاتی تھیں۔ اس کام میں چونکہ سب ہی کمانڈوز شریک ہوتے تھے اور ایس ایس گارڈز بھی لہٰذا یہ اشیا سب میں برابر برابر تقسیم ہوجاتیں۔ اس طریقے سے نازی جرمنی کا سرکاری اخبار بھی یہاں آجاتا تھا۔ اس روز یہاں کا دورہ کرتے ہوئے مجھے اس کا ایک شمارہ دیا گیا تھا۔

غرض اس روز چاروں لاش بھٹیوں کے پہلے وزٹ پر مجھے یہاں کی زندگی کے بارے میں کئی نئی باتوں کا علم ہوا۔



ایک روز علی الصباح مجھے ٹیلی فون پر ہدایت دی گئی کہ فوراً چنا گھاٹ پہنچوں۔ چنا گھاٹ، لاش بھٹی یا موت کی فیکٹری نمبر چار سے کوئی ڈھائی تین فرلانگ دور تھی۔ میں نے اس کے بارے میں صرف تذکرہ سنا تھا، کبھی ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر مجھے بتایا گیا تھا کہ چنا گھاٹ پر بہت سی ادویات اور چشمے جمع ہوگئے ہیں جو مجھے لے کر آنا ہیں تاکہ ان کی درجہ بندی کرکے انہیں جرمنی کے مختلف علاقوں میں بھیجا جاسکے۔

چنا گھاٹ چونکہ "کے زیڈ" کے احاطے سے باہر اور ایس ایس گارڈز کی پہلی اور دوسری لائن کے درمیان تھا اس لیے میں نے درخواست کی کہ وہاں پہنچنے کے لیے مجھے اور دو دوسرے افراد کو پاس جاری کیا جائے۔ میری یہ درخواست منظور کرلی گئی۔

میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ گیٹ سے باہر نکل کر ہم چنا گھاٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ چنا گھاٹ کیا تھا، ایک قدیم طرز کی عمارت تھی۔ نازیوں نے اس بستی کے

تمام مکانوں کو منہدم کرکے آش ونز کا ایک زیڈ بنادیا تھا۔ صرف یہی ایک عمارت اصلی حالت میں رہ گئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی اس عمارت کے پاس جب ہم پہنچے تو جلتے ہوئے گوشت کا بھپکا ہماری ناک سے ٹکرایا۔ طبیعت مکدر سی ہوگئی۔

چتا گھاٹ دراصل وہ عمارت تھی جہاں ایسے قیدیوں کو لایا جاتا تھا جن کے لیے اس کے زیڈ کے چاروں موت فیکٹریوں میں کوئی گنجائش نہیں نکل پاتی تھی چنانچہ ان فاضل قیدیوں کو یہاں بھیج دیا جاتا تھا جہاں ان کے لیے بدترین قسم کی موت منتظر ہوتی۔

عمارت کے احاطے میں پانچ ہزار دہشت زدہ افراد موجود تھے ان کے چاروں طرف مسلح ایس ایس گارڈز کھڑے تھے۔ کئی گارڈز شکاری کتے لیے چاق وچوبند کھڑے تھے۔ تین تین، چار چار سو قیدیوں کو احاطے سے اس عمارت کے اندر لے جایا جاتا جہاں ان سب کو زدوکوب کرتے ہوئے ایک ہال میں پہنچادیا جاتا۔ یہاں انہیں لباس اتارنے کی ہدایت کی جاتی جب یہ قیدی لباس اتار دیتے تو انہیں دوسرے کمرے سے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچادیا جاتا۔

سامنے آڑے ترچھے راستے پر دونوں طرف مسلح ایس ایس گارڈز کھڑے ہوتے۔ یہاں سے چتا تک کا راستہ ۵۰ گز کے قریب تھا۔ ایک خصوصی کمانڈو اس جماعت کو اس راستے پر چلنے کے لیے کہتا۔

چتا کیا تھی۔ ۵۰ گز لمبا، ۶ گز چوڑا اور تین گز گہرا ایک گڑھا تھا جس کے اندر انسانی لاشیں جلائی جارہی تھیں۔ اس چتا کے دونوں پہلوؤں پر تنگ پگ ڈنڈیاں تھیں ان کے کنارے پانچ پانچ گز کے فاصلے پر ایس ایس فوجی کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ۶ ملی میٹر کے پستول تھے۔ وہ اپنے شکاروں کا انتظار کررہے تھے۔ ان پستولوں سے قیدیوں کی گدی میں گولی ماری جاتی تھی اور انہیں چتا میں پھینک دیا جاتا تھا حالانکہ وہ ابھی مرا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بدقسمت اپنا انجام سامنے دیکھ کر رورہے تھے، چلارہے تھے، رحم کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن ان کی فریاد سننے اور ان پر رحم کھانے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ چتا گھاٹ پر مامور قاتلوں کا انچارج مولے نامی شخص تھا۔ اس سے زیادہ سفاک شیطان صفت قاتل میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کے مقابلے میں تو ڈاکٹر مینگلے بہت مہذب اور رحم دل معلوم ہوتا تھا۔ مولے کے مقابلے میں تو لاش بھٹی نمبر ایک کا منتظم مسفیلڈ کہیں زیادہ معقول شخص تھا۔ وہ اگر یہ دیکھتا کہ پہلی گولی سے اس کا شکار نہیں مرا ہے تو اس کو دوسری گولی مار کر عذاب سے نجات دے دیتا تھا لیکن مولے ایسی معمولی اور غیر اہم باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ چتا گھاٹ پر تو بیشتر لوگوں کو زندہ حالت میں شعلوں کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ اس کام کو وہ بہت تیزی کے ساتھ مکمل کرتا تھا اور اگر کوئی خصوصی کمانڈو قیدی کو لانے میں دیر کرتا اور ایس ایس فوجیوں کا ہاتھ رک جاتا تو اس کمانڈو کی شامت ہی آجاتی۔

ان بدقسمت قیدیوں میں اکثر کچھ ایسے سرکش بھی ہوتے جو اپنے اس انجام کو دیکھ کر اس کمانڈو سے الجھ پڑتے جو انہیں گھسیٹ کر ایس ایس کے قاتلوں کے سامنے لے جارہا ہوتا۔ مولے یہ دیکھتے ہی ہولسٹر سے پستول نکالتا اور عموماً ۴۰، ۵۰ گز دور سے فائر کرتا اور سرکش قیدی کمانڈو کے ہاتھوں میں دم توڑ کر جھول جاتا۔ مولے کا نشانہ بڑا سچا اور پکا تھا۔ میں نے کبھی اس کے نشانے کو خطا ہوتے نہیں دیکھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اسے کسی خصوصی کمانڈو کی کارکردگی پسند نہ آتی تو مولے اس کو بھی گولی کا نشانہ بنادیتا۔

چتا گھاٹ پر جب دو چتائیں کام کرتی تھیں تو یہاں روزانہ ۶ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ میرے علم میں یہ بات آئی کہ گیس، کلوروفارم کے انجکشن، گدی میں گولی مارنے کے علاوہ اس طریقے سے بھی یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔



ایک روز میں صبح اٹھا تو طبیعت بلاوجہ بشاش تھی۔ یہ بشاشت بہت ہی عارضی ثابت ہوئی۔ ناشتے پر ایک خصوصی کمانڈو نے مجھے بتایا کہ آج پورا کے زیڈ سخت قرنطینے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی شخص کو بیرکوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ایس ایس فوجی اپنے شکاری کتوں کے ساتھ بیرکوں کے باہر موجود تھے۔

آج نازی چیکوسلواکیہ سے آنے والے قیدیوں کے کیمپ کا صفایا کرنے والے تھے۔

چیک کیمپ میں ۱۵ ہزار قیدی تھے۔ انہیں کسی خرکار کیمپ سے وہاں لایا گیا تھا۔ خرکار کیمپ یا جبری مشقت کے کیمپ سے یہاں لائے جانے کے بعد ان کی درجہ بندی نہیں ہوئی تھی بلکہ ان سب کو ہی ان کی عمر یا صحت کا لحاظ کیے بغیر کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ دوسرے شعبوں کی طرح اس کیمپ کے قیدی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

یہ لوگ دو برس سے اس کیمپ میں مقید تھے۔ آج اس قید سے ہی نہیں بلکہ زندگی کی قید سے بھی ان کی رہائی کا وقت

آگیا تھا۔ "آش ونز" کے "کے زیڈ" میں ہی نہیں بلکہ نازیوں کے بنائے ہوئے ایسے تمام مراکز میں پکڑ کر لائے جانے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا تھا۔ بھیانک اور دہشت ناک غیر قدرتی موت!

ان دنوں "آش ونز" میں ہنگری سے روزانہ قیدی یہاں پہنچ رہے تھے۔ جنہیں موت کی فیکٹریوں کی اصطلاح میں "مال" کہا جاتا تھا۔ بعض دن تو بیک وقت دو دو ٹرینیں یہ "مال" لے کر پہنچتی تھیں۔اس وجہ سے یہاں قرنطینہ کیمپ، سی کیمپ اور ڈی کیمپ کے علاوہ ایف سیکشن میں قیدیوں کا بے پناہ ہجوم ہوگیا تھا۔ کیمپوں میں رہائش کی گنجائش ختم ہوگئی تھی۔ نئے قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنا ضروری تھا۔

چیک کیمپ میں مقید بچوں اور بوڑھوں کی حالت دو برس کی غیر انسانی قید کی وجہ سے...... بہت پتلی تھی۔ وہ بے انتہا کمزور اور لاغر ہوگئے تھے۔ کھال ان کی ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ وہ چلتے پھرتے پنجر تھے، زندہ لاشیں تھے۔ بوڑھے تو چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ ان بوڑھوں اور بچوں کے مرنے کا وقت آپہنچا تھا۔ ان کی موت "آش ونز" میں آنے والے قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی کیونکہ آنے والے قیدی ابھی صحت مند تھے، وہ کام کرسکتے تھے۔

ہنگری سے قیدیوں کی آمد کا سلسلہ ایک ہفتے قبل شروع ہوا تھا۔ ان نئے قیدیوں کی وجہ سے چیک کیمپ کے قیدیوں کا راشن بہت کم کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی اور اب تو حالت یہ تھی کہ راشن کی سخت کمی ہوگئی تھی چنانچہ آش ونز کے زیڈ کے منتظمین نے اس کا یہ حل نکالا کہ چیک کیمپ کا راشن بالکل بند کردیا کیونکہ اس کیمپ کے قیدی از کار رفتہ ہوگئے تھے۔ ان کو راشن دینا، راشن کو ضائع کرنے کے مترادف تھا اور نازی اس فضول خرچی کے قائل نہیں تھے۔

تمام بیرکوں کو بند کرنے کا حکم اس روز علی الصباح جاری ہوا تھا۔ سیکڑوں ایس ایس فوجیوں نے چیک کیمپ کو گھیر لیا تھا اور انہیں کیمپ کے احاطے میں جمع کرلیا گیا تھا۔ پھر انہیں ٹرکوں میں سوار کرایا جانے لگا تو ہر طرف سے چیخوں کراہوں اور بین کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگی۔ دو برس کی قید کے بعد وہ یہاں کے حالات سے واقف ہوگئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آج ان کے خاتمے کا دن ہے۔ آج انہیں موت کے گھاٹ اتارا جانے والا ہے۔

چیک کیمپ میں ۱۲ ہزار قیدی تھے۔ ان میں سے صرف ۱۵۰۰ سو ایسے مرد و زن کو چنا گیا جو جسمانی اعتبار سے اب بھی نازی جرمنی کے لیے جبری مشقت کرسکتے تھے۔ ان کے علاوہ آٹھ ڈاکٹروں کو بھی الگ کرلیا گیا تھا اور باقی تمام قیدیوں کو موت فیکٹری نمبر دو اور نمبر تین روانہ کردیا گیا۔ اگلے دن چیک کیمپ ویران پڑا تھا۔ وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ جلی ہوئی انسانی لاشوں کی راکھ سے بھرے ہوئے ٹرک دریائے وسچولا کی طرف جارہے تھے۔

یوں آش ونز کے قیدیوں کی تعداد میں ایک روز کے اندر ۱۲ ہزار کے لگ بھگ "یونٹ" ختم ہوگئے اور "آش ونز" کے ریکارڈ میں ایک خونی صفحے کا اضافہ ہوگیا۔ ڈاکٹر مینگلے نے اس صفحے پر لکھا "قیدیوں میں ٹائی فس کی وبا پھیل جانے کی وجہ سے آج آش ونز کے کیمپ کے چیک سیکشن کو پوری طرح صاف کردیا گیا" اس عبارت کے نیچے اس قاتل 'خونی' جنونی اور کرمنل ڈاکٹر نے اپنے دستخط ثبت کردیئے۔

O☆O

چیکوسلواکیہ کیمپ کے قریب ہی سی کیمپ واقع تھا۔ اس کیمپ میں ہنگری کی یہودی خواتین کو رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کیمپ سے روزانہ ہی خواتین کو دوسرے دور دراز واقع کیمپوں کو روانہ کردیا جاتا تھا پھر بھی اس کیمپ میں اکثر اوقات ۶۰ ہزار عورتیں موجود رہتی تھیں۔ اس انتہائی گنجان آباد کیمپ میں ایک روز ڈاکٹروں نے ایک عورت میں گردن توڑ بخار کی علامات دیکھیں۔ انہوں نے ڈاکٹر مینگلے کو اس بات سے آگاہ کردیا۔ ڈاکٹر مینگلے نے فوراً ہی اس بیرک کو جس میں وہ خاتون مقیم تھی اور اس کے دائیں بائیں والی بیرکوں کو قرنطینہ میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ قرنطینہ صبح سے شام تک بمشکل بارہ گھنٹے جاری رہا اور اس کے بعد ان تینوں بیرکوں میں رہنے والی خواتین کو لاش بھٹیوں کے حوالے کردیا۔ ڈاکٹر مینگلے اسی موثر طریقے سے متعدی بیماریوں کی روک تھام کا قائل تھا۔

اس تجربے کے بعد ڈاکٹر محتاط ہوگئے اور انہوں نے متعدی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے بارے میں ڈاکٹر مینگلے کو آگاہ کرنے سے گریز شروع کردیا۔

ایک روز علی الصباح مجھے ڈاکٹر مینگلے کا یہ پیغام ملا کہ میں فوراً ایف کیمپ کے کمانڈر کے پاس رپورٹ کروں۔ یہ وہی کیمپ تھا جس میں مجھے آش ونز کے زیڈ پہنچنے کے بعد رکھا گیا تھا اور جہاں چند افراد میرے مختصر قیام کے بعد میرے گہرے دوست بن گئے تھے۔ مجھے ڈاکٹر مینگلے کا یہ پیغام سن کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس طرح مجھے لاش بھٹی کے مسموم

ماحول اور مسموم بوجھل فضا سے نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینے کی مہلت مل رہی تھی۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے اپنی بیوی اور بیٹی یاد آئی۔ ان سے بچھڑے ہوئے مجھے تین ماہ ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں یا جلا کر راکھ کردی گئی ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آیا وہ ابھی تک آش وٹز کے زیڈ کے خواتین سیکشن میں مقیم ہیں یا انہیں کسی دور افتادہ کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس مجھے یقین دلاتی تھی کہ وہ دونوں ابھی آش وٹز میں ہی ہیں لیکن کہاں؟ آش وٹز تو خاردار تاروں کے درمیان گھری ہوئی بیرکوں کی ایک طویل و عریض پر پیچ بھول بھلیاں تھیں۔ میں اکثر ادھر ادھر امید بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا لیکن خاردار تاروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایف کیمپ کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ کے ایک طرف محافظوں کی چوکی تھی۔ اس کی کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اپنی وردی کے کوٹ کی ڈھیلی ڈھالی آستین کھینچی۔ اپنا نمبر اے ۸۴۵۰ بتایا۔ ابھی میں نے اپنی آستین کو واپس نیچے کیا ہی تھا کہ ڈیوٹی انچارج کی نظر میری کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑ گئی جو ڈاکٹر مینگلے کے حکم پر مجھے دی گئی تھی کیونکہ اپنے کام کے سلسلے میں اکثر مجھے اس گھڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔

ڈیوٹی انچارج تو غصے سے لال پیلا ہوگیا اور دہاڑ کر بولا "تم ہو کون لاٹ صاحب جو یہ گھڑی باندھے ہوئے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گالی بکی اور کہا "اور یہاں ایف کیمپ میں کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا "میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ ڈاکٹر مینگلے نے مجھے بلایا ہے لیکن اگر آپ مجھے اس کیمپ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو کوئی بات نہیں۔ میں واپس لاش بھٹی چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے ڈاکٹر مینگلے کو ٹیلی فون پر بتادوں گا۔"

ڈاکٹر مینگلے کا نام سن کر تو ڈیوٹی انچارج کی جیسے نانی مرگئی۔ اس کا نام سن کر آش وٹز میں بڑے بڑے سورماؤں کا پتّا پانی ہوجاتا تھا۔ ڈیوٹی انچارج کا لہجہ بدل گیا۔ شریفانہ لہجے میں بولا "آپ کیمپ میں کتنی دیر رہیں گے؟ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں یہاں سب کچھ درج کرنا ہوتا ہے۔"

میں نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت دس بجے ہیں۔ دو بجے تک تو میں یہاں رہوں گا ہی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک میرا کام ختم ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ یہ تحفہ پاکر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کیمپ کمانڈر کے کمرے میں موجود تھا جس نے مجھے ایک اور کمرے میں پہنچادیا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مینگلے دو اور افراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مینگلے نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک آش وٹز کا ہیڈ سرجن ڈاکٹر تھیلو تھا اور دوسرا جنرل میڈیکل سروس کا ڈاکٹر وولف۔

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے علم ہوگیا کہ میری طلبی کا سبب کیا تھا۔ ڈاکٹر وولف نے بتایا "میں اس وقت ایک سائنسی تحقیق کررہا ہوں۔ اس تحقیق کو جامع انداز میں مکمل کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے ڈاکٹر مینگلے سے کہا تھا کہ تم سے میری ملاقات کرادے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر اپنی بات آگے بڑھائی "تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اس کیمپ میں ڈائریا عام ہے۔ قے اور اسہال کے ۹۹ فی صد مریض مرجاتے ہیں۔ اس مرض کی علامات کیا ہیں' یہ مرض کیسے ہوتا ہے' اس کے بارے میں میں سب کچھ جانتا ہوں کیونکہ میں نے اس کے ہزاروں مریضوں کا معائنہ کیا ہے اور ان کے نوٹس انتہائی احتیاط سے تیار کیے ہیں۔ پھر بھی میرا کام ابھی نامکمل بلکہ ناقص ہے کیونکہ سائنسی تحقیق کا تقاضا ہے کہ ڈائریا کے مریضوں کی پیتھالوجیکل رپورٹ بھی اسی تحقیقی کام کے ساتھ شامل ہو اور وہ بھی کم از کم ۱۵۰ مریضوں کی۔"

تو گویا اس کیمپ میں ایک اور ڈاکٹر ایک خاص مرض پر تحقیق کررہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ڈائریا کے مرض کے انسان کے اندرونی اعضا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور آش وٹز کیمپ میں اس مرض سے مرنے والے مریضوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر مینگلے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "اگر تم روزانہ سات لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرو تو تم یہ کام تین ہفتے میں مکمل کرسکتے ہو۔"

مجھے اس سے اختلاف تھا' میں نے کہا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام پوری صحت کے ساتھ اور عمدگی سے کیا جائے تو دن میں صرف تین لاشوں کا پوسٹ مارٹم میرے لیے ممکن ہوگا۔"

کچھ بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ میں ڈائریا سے مرنے والوں کی صرف تین لاشوں کا روزانہ پوسٹ مارٹم

کروں گا۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں بیرک ہاسپٹل نمبر ۲۱ میں اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ میں ان کے لیے اپنی جیبوں میں بہت سی دوائیں بھر کر لے گیا تھا جسے پا کر وہ سب بہت خوش ہوئے۔ میں نے انہیں سگریٹیں بھی دیں اور پھر ہم لوگ حالات پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ وہ سب کے سب اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس تھے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا، ان کی ہمت بندھائی کہ وہ مایوس نہ ہوں، حوصلے بلند رکھیں۔ پھر میں نے انہیں جنگ کی صورتِ حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ روزانہ اخبار کے مطالعے کی وجہ سے جنگی صورتِ حال کے بارے میں میری معلومات بہت جامع تھیں اگرچہ ان معلومات کی بنیاد نازی حکومت کا سرکاری اخبار تھا۔ وہ محاذ کی صورتِ حال کی صحیح رپورٹ نہیں دیتا تھا، پھر بھی جھوٹ کے اس پردے سے اکثر حقائق کا چہرہ نظر آ ہی جاتا تھا۔

دو بجے میں اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر واپس لاش بھٹی آ گیا۔ اس دن کے بعد سے مجھے ڈاکٹر وولف کی طرف سے روزانہ ڈائریا سے مرنے والے مریضوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے ملنے لگیں اور ڈاکٹر مینگلے نے میری مدد کے لیے مجھے تین افراد کا عملہ بھی فراہم کر دیا۔ یہ عملہ اس نے قیدیوں میں سے ہی منتخب کیا تھا۔ ان میں سے دو ڈاکٹر تھے اور ایک پراگ کے پیتھالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کا... لیبارٹری اسسٹنٹ تھا۔ ان سب کو آش وٹز میں آئے ہوئے چار برس ہو چکے تھے۔

O☆O

خصوصی کمانڈو ڈاکٹر کی حیثیت سے اس صبح میں چاروں موت فیکٹریوں کے دورے پر تھا۔ چاروں فیکٹریاں اپنی پوری استعداد کے مطابق کام کر رہی تھیں۔ گزشتہ رات ان فیکٹریوں میں یونان کے ان یہودیوں کو جلایا گیا تھا جو بحیرۂ روم کے جزیرے کورفو سے لائے گئے تھے۔ ان سب کو ۲۷ روز تک پانی اور خوراک کے بغیر رکھا گیا تھا۔ پہلے انہوں نے لانچوں میں اور پھر مال گاڑی کے ڈبوں میں سفر کیا تھا جب "مال" کی یہ "کھیپ" آش وٹز پہنچی تھی اور مال ڈبوں کے دروازے کھول کر انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ باہر آ کر قطاروں میں کھڑے ہو جائیں تو ان میں سے ایک بھی باہر نہ آیا۔ آدھے تو اس سفر کے دوران ہی مر چکے تھے اور باقی بے ہوش تھے، اس لیے ان سب کو موت کے کارخانوں میں بھیج دیا گیا۔

اس روز موت کی فیکٹری نمبر چار میں ایک بہت ہی سنگین کیس میرا منتظر تھا۔ ایک کمانڈو نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی۔ یہاں کبھی کبھار کوئی کمانڈو اپنی زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتا تھا۔ نیند کی گولیاں حاصل کرنا کمانڈوز کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ جب موت کی بھٹیوں کے حوالے کیے جانے والے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم افراد کے اتارے ہوئے ملبوسات کی تلاشی لیا کرتے تو یہ گولیاں بہت وافر تعداد میں انہیں مل جاتی تھیں۔

اس روز جو مریض میری توجہ چاہتا تھا اس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ سب اسے کیپٹن کہا کرتے تھے۔ وہ ایتھنز کا رہنے والا تھا، فوج میں کپتان رہ چکا تھا اور یونان کے شاہی خاندان کے بچوں کا معلم تھا۔ تین برس سے آش وٹز میں مقید تھا اور پندرہ بیس دن قبل اسے خصوصی کمانڈوز کے دستے میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں کو آش وٹز پہنچتے ہی گیس چیمبر بھیج دیا گیا تھا۔ خصوصی کمانڈوز کے دستے کے کئی افراد بے ہوش کپتان کے بستر کے گرد جمع تھے۔ میں جب اسے دیکھنے کے لیے گیا تو انہوں نے بڑے ملتجیانہ انداز میں اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! اس غریب کو مر جانے دو۔ دیکھو ڈاکٹر! اس کو بچانے کی کوشش نہ کرو۔ ذرا دیکھو تو یہ کس قدر سکون سے سو رہا ہے۔ سب مصیبتوں سے اسے جیسے نجات مل گئی ہے۔"

لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ میں ڈاکٹر تھا، زندگی بچانا میرا کام تھا۔ میں موت کا ڈاکٹر نہیں تھا، میں مینگلے نہیں تھا۔ میں نے کپتان کی زندگی بچانے کے لیے، خواب آور گولیوں کا اثر توڑنے کے لیے اس کے انجکشن لگا دیا لیکن اپنا یہ فرض ادا کر کے جب میں موت کے اس کارخانے سے نکل کر اگلے کارخانے کی طرف بڑھا تو میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں نے اس کی زندگی بچا کر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے سکون سے مر جانے دیتا۔ مرنا تو اب بھی اسے تھا لیکن اب وہ ٹھیک ہونے کے بعد چند دن اور عذاب جھیلے گا اور پھر اذیت کی موت مر جائے گا۔ میں نے اس پر ظلم کیا تھا، اسے اس کی پسند کی موت بھی مرنے کی اجازت نہ دی تھی۔

جرمنی اپنی تاریخ کے ایسے بھیانک دور سے گزر رہا تھا جہاں جرمن قوم کے سب سے اعلیٰ انسانی نسل یعنی آریا ہونے کے خناس نے تمام سچائیوں کو غلط قرار دے دیا تھا۔ اب یہاں ہر طرف جھوٹ اور مکر و ریا کا دور تھا۔ اس خبط میں

مبتلا ہو کر وہ صرف جرمنوں کو دنیا پر حکمرانی کرنے کا حق دار سمجھتے تھے اور انہوں نے یورپ کی دیگر اقوام کو گردن زدنی قرار دے دیا تھا۔ یہودیوں کو جرمنوں نے نہ صرف اپنا بلکہ نسل انسانی کا سب سے بڑا دشمن قرار دے دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہودی صرف کوتاہ قامتوں اور معذوروں کی نسل تھی۔ یہ نسل باقی انسانوں کو نجس وناپاک کر رہی تھی۔ ان کے درمیان رہتے ہوئے ان میں ایسے جراثیم منتقل کر رہی تھی جس کی بنا پر باقی نسلوں کے لوگ بھی کوتاہ قامت اور معذور ہو رہے تھے اس لیے یہودیوں کا نام ونشان کرہ ارض سے مٹانا ضروری تھا۔

جرمن اپنی اس کوشش کو مقدس جنگ قرار دیتے تھے۔ ان کی نظروں میں روسی، وحشی اور درندے تھے۔ منگولوں کی کمتر نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انسانی تہذیب کے لیے خطرہ تھے۔ فرانس آتشک اور سوزاک کے امراض میں مبتلا قوم تھی۔ اپنی تباہی اور خاتمے کی راہ پر چل رہی تھی۔ انگریز، وزیراعظم سے لے کر عام آدمی تک ایک شرابی قوم تھی، خواب دیکھنے والی قوم۔ مزے دار بات تو یہ تھی کہ جرمنوں نے وقتی مصلحتوں کے تقاضے کے تحت جاپانیوں کو آرین جیسی اعلیٰ مخلوق قرار دے دیا تھا جبکہ ہر اعتبار سے وہ منگولی تھے۔

غرض جرمنی اس وقت صرف جھوٹ، فریب اور ریا سے عبارت خوابوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ ان کی زندگی جھوٹے فلسفوں اور نظریات کے تابع تھی۔ جرمن دوشیزاؤں اور بیواؤں کو اجازت تھی کہ جس جرمن مرد سے چاہیں اختلاط کریں، بچے پیدا کریں اور حکومت سے تعریفی سند حاصل کرلیں۔ اس طرح پیدا ہونے والے بچوں کی ولدیت کا تعین کرنا عورتوں کا کام تھا۔ یہ عمل ضروری تھا کیونکہ جرمن قوم اور آریائی نسل کو جلد از جلد عددی اعتبار سے بڑھانا وقت کا تقاضا تھا۔ آنے والے دور میں، فتح عظیم حاصل کرنے کے بعد جرمن قوم ہی کو تو دنیا پر حکمرانی کرنا تھی۔

اور جھوٹ کا یہ فلسفہ، یہ نظریہ جرمنی میں ہر جگہ ایک عملی حقیقت بن گیا تھا۔ آش وٹز کی یہ کارگہہ ممات بھی اسی فلسفے اور نظریے کی عملی تصویر اور تعبیر تھی۔ یہاں جن کمروں پر "حمام" کے الفاظ لکھے تھے وہ درحقیقت گیس چیمبرز تھے۔ انسانوں کو جس زہریلی گیس یعنی سائیکلون گیس سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا اس کے ڈبوں پر چسپاں لیبلوں پر یہ عبارت لکھی ہوتی تھی "زہر۔ فصلوں کے طفیلی کیڑوں کو مارنے کے لیے"

موت کی ان فیکٹریوں میں جگہ جگہ سائن بورڈوں پر یہ عبارت لکھی تھی "کام، ذریعۂ نجات ہے" اس عبارت کا اصل مفہوم کیا تھا اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال ہی کافی ہے۔ ایک روز آش وٹز ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹرین آکر رکی۔ مال گاڑی سے تین سو قیدیوں کی کھیپ اتاری گئی۔ ان تمام قیدیوں کا رنگ زرد تھا۔ چمڑی ہڈیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ ان زندہ لاشوں کو جب موت کی فیکٹری میں لایا گیا تو مجھے دو ایک افراد سے گفتگو کا موقع مل گیا۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لُبِّ لباب یہ تھا کہ تین ماہ قبل آش وٹز سے تین ہزار قیدیوں کو ایک ایسی فیکٹری میں کام کے لیے بھیجا گیا تھا جہاں گندھک کا تیزاب تیار ہوتا تھا۔ وہاں کام کرتے ہوئے ۲۷۰۰ افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوگئے تھے، ان میں سے صرف یہی ۳۰۰ باقی بچے تھے اور یہ سب کے سب گندھک کے زہر سے متاثر تھے۔

یہاں واپس آنے سے قبل انہیں بتایا گیا کہ انہیں علاج معالجے کے لیے ایک ریسٹ کیمپ میں بھیجا جارہا ہے۔ نصف گھنٹے بعد میں نے ان سب کو خون میں لت پت چتا گھاٹ پر پڑے دیکھا تھا۔ وہ سب نجات پاگئے تھے۔ ان کی گُدّیوں میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ جرمن بعض معاملات میں نہایت کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جتنی گیس سے ۵۰۰ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا اتنی ہی گیس سے پانچ ہزار افراد بھی موت کی وادی میں پہنچائے جاسکتے تھے۔ اس لیے جرمن ایک ہزار سے کم افراد کو مارنے کے لیے وہ گیس استعمال کرکے فضول خرچی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اس سے کم تعداد میں جب لوگوں کو مارنا ہوتا تو پہلے انہیں گولی سے اڑا دیا جاتا پھر ان کی لاشوں کو چتا میں جلادیا جاتا۔

دنیا کو دھوکا دینے کی ایک اور مثال بھی عرض کرتا چلوں۔ جرمن اکثر دنیا کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ اپنے قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اکثر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیا کرتے تھے۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں آش

گائیگر کاؤنٹر

Geiger couwter

ایک سائنسی آلہ اسے تابکار شعاعوں کی موجودگی معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نام جرمن ماہر طبیعیات ہینز گائیگر (Hans Geiger، 1945-1882ء) کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: نیاز احسن، راولپنڈی

وئز کے قیدیوں میں ہزاروں تہنیتی کارڈ تقسیم کئے گئے اور قیدیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے یہ کارڈز اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام روانہ کریں لیکن ان پر کسی بھی صورت میں آش وئزیا برکناؤ کے نام نہ لکھیں بلکہ شہر کا نام "ایم والڈسی" تحریر کریں۔ "ایم والڈسی" سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے قریب ایک سیاحتی مرکز تھا۔ قیدیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کارڈ بھیج دیئے گئے۔ چند دن بعد ہزاروں کی تعداد میں ان تہنیتی کارڈوں کے جواب موصول ہوئے لیکن اس وقت تک وہ تمام افراد جن کے نام یہ جواب آئے تھے، موت کی بھٹیوں میں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ میں نے جواب میں موصول ہونے والے ان کارڈوں کو اپنی آنکھوں سے نذر آتش ہوتے دیکھا تھا۔ ان کارڈوں کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

○☆○

میں اپنے کمرے میں لیٹا کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ خصوصی کمانڈوز کا انچارج ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا "ڈاکٹر! جلدی چلئے، لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے ایک لڑکی ملی ہے۔ وہ زندہ ہے۔"

میں نے اپنا میڈیکل بیگ سنبھالا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ لاش بھٹیوں کی اب تک کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بچی کو گیس چیمبر کے برابر اس کمرے میں منتقل کردیا جہاں خصوصی کمانڈوز لباس تبدیل کرتے تھے۔ بچی کو بینچ پر لٹا کر میں نے تلے اوپر اس کے تین انجکشن لگائے۔ بچی کا جسم بالکل یخ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بچی پر ایک بھاری اوورکوٹ ڈال دیا۔ ایک ساتھی کچن سے چائے اور گرم گرم سوپ لے آیا۔ ہم میں سے ہر کوئی اس بچی کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بچی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ رفتہ رفتہ کھانسی ختم ہوئی، سانسوں کی بے ترتیبی ختم ہوگئی۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی عود کر آئی۔ وہ بس ایک ٹک چھت کو گھورے جارہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عود کر آئیں، ساتھ ہی ایک انجانا سا خوف، دہشت اور حیرانی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے۔ شاید تمام گزرے ہوئے واقعات اسے یاد آنے لگے تھے۔ ہر ہر یاد کے ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑتی جارہی تھی۔

اس بچی کا زندہ بچ جانا ایک حیرت انگیز اور انہونا واقعہ تھا۔ اس کے زندہ بچ جانے کا میرے نزدیک ایک ہی سبب ہو سکتا تھا۔ میرے خیال میں وہ بے ہوش ہو کر منہ کے بل گیلے فرش پر گر گئی تھی۔ فرش کی نمی ہی نے اس کی جان بچالی تھی کیونکہ سائیکلون گیس نمی میں اثر نہیں کرتی۔

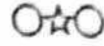
ہم سب اس بچی کے گرد جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر مینگلے کا معاون مسفیلڈ وہاں آگیا۔ وہ ڈاکٹر مینگلے سے زیادہ بے رحم اور شقی القلب تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تمام ساتھی پریشان ہوگئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ ہرچند کہ میں جانتا تھا کہ مسفیلڈ پر کسی اپیل، کسی درخواست کا اثر نہیں ہوگا پھر بھی میں نے اس لڑکی کی جان بچانے کے لیے اس سے گفتگو کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ تین ماہ کے عرصے میں میرے اور اس کے درمیان کچھ بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ میری باتوں کو توجہ اور غور سے سنتا تھا۔ جرمن وہ قوم ہے جو انسانی صلاحیتوں کی قدر کرتی ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو ایجادات اور سائنسی تحقیق سے وابستہ ہوتے ہیں، اس قوم کی نظروں میں واجب الاحترام ہوتے ہیں۔ پھر میں تو یہاں ڈاکٹر مینگلے کے ساتھ طبی تحقیق میں مصروف تھا۔ روزانہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرتا تھا اور مسفیلڈ یہاں لوگوں کو ہلاک کرکے انہیں لاشوں میں تبدیل کرنے کے کام پر مامور تھا۔ اس بنا پر وہ خود اپنے آپ کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس طبی تحقیق سے وابستہ سمجھتا تھا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نہ صرف میرے کام سے خوش ہے بلکہ میری طبی آرا اور میرے کام سے متاثر بھی ہے اس وجہ سے بھی مسفیلڈ میرا کچھ لحاظ کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس بچی کی زندگی بچانے میں مجھے اپنی کوششوں کے کامیاب ہونے کا یقین نہ تھا۔

میں نے مسفیلڈ سے اس لڑکی کے بارے میں گفتگو کی۔ اس نے میری باتیں بڑے غور سے سنی تھیں اور اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا تھا اور جس معاملے میں اس سے مدد کا خواہش مند تھا وہ اس سلسلے میں قطعی بے بس تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بچی اس لاش بھٹی کے کارخانے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ اس بچی کو لاش بھٹی کے کارخانے کے گیٹ کے سامنے چھوڑ دیا جائے۔ گیٹ کے باہر ہر وقت خواتین کمانڈوز کے دستے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بچی ان خواتین کے ساتھ ہی کام ختم ہونے کے بعد عورتوں کی بیرکوں میں واپس جاسکتی تھی۔ وہ وہاں ہزاروں عورتوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ کسی کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن مسفیلڈ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس؟

کہتا تھا کہ اگر اس لڑکی نے وہاں دوسروں کو اپنی کہانی سنادی تو ہم سب کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

"نہیں ڈاکٹر! کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس لڑکی کو مرنا ہی ہوگا۔" مسفیلڈ نے فیصلہ سنادیا۔

نصف گھنٹے بعد اس لڑکی کو مار ڈالا گیا۔ اس کی گُدّی میں گولی مار کر اسے زندگی سے چھٹکارا دے دیا گیا تھا لیکن اس لڑکی کو گولی مارنے کا کام مسفیلڈ نے خود نہیں کیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے کسی اور شخص کو مامور کیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، ورنہ وہ اس طرح لوگوں کو قتل کرکے بہت خوش ہوا کرتا تھا۔



لاش بھٹی کے کارخانے کی دوسری منزل پر جرمن ایس ایس فوجیوں کے رہائشی کمروں کے ساتھ ہی ایک بڑا کمرا تھا جس میں بڑھئی کام کرتے تھے۔ یہ بڑھئی ہر اس آرڈر کی تعمیل کرتے تھے جو انہیں دیا جاتا تھا اور ان دنوں وہ مسفیلڈ کے آرڈر پر ایک RECAMIER کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ ریکیمر ایک خاص قسم کا ڈبل بیڈ ہوتا ہے جسے بوقت ضرورت بڑے صوفے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مسفیلڈ کا حکم تھا کہ یہ ریکیمر جلد از جلد تیار کیا جائے۔

یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن لاش بھٹی کے کارخانے میں ناممکن نام کا کوئی لفظ موجود نہ تھا۔ جب کوئی آرڈر آجاتا تو ہر صورت میں اس کی تعمیل اور تکمیل کرنا ہوتی تھی۔ لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں بہت سا تعمیراتی سامان بکھرا پڑا تھا، سو اسی تعمیراتی سامان سے ریکیمر کے لیے لکڑی حاصل کرلی گئی۔ اس کے لیے اسپرنگ ان آرام کرسیوں سے حاصل کیے گئے جو یورپ کے مختلف ملکوں سے یہاں لائے جانے والے قیدی اس لیے ساتھ لائے تھے کہ اس طرح ان کے بوڑھے اور بیمار والدین کے لیے سفر نسبتاً آسان ہوسکتا تھا۔ لاش بھٹی کے کارخانوں میں سیکڑوں کی تعداد میں ایسی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہم لوگ اکثر کام ختم کرنے کے بعد ان پر بیٹھ کر سستایا کرتے تھے۔

میں اس ریکیمر کی تیاری کے ہر ہر مرحلے کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ کاریگروں نے اپنا کام نہایت مہارت اور عمدگی سے کیا تھا۔ دو فرانسیسی الیکٹریشنوں نے اس ریکیمر میں ایک بلب لگایا تھا اور ریڈیو کے لیے اس میں ایک طاق بنادیا گیا تھا۔ ریکیمر جب مکمل ہوگیا تو یہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے مسفیلڈ کے گھر مین ہائم روانہ کیا جانے والا تھا۔

اس ریکیمر کی تیاری کے دوران ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور پھر اس خیال نے ایک چھوٹے سے منصوبے کی صورت اختیار کرلی۔ ہم سب جانتے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کی حیثیت سے جلد ہی ہم قصۂ پارینہ بن چکے ہوں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہاں سے زندہ نکلنا ہمارے لیے محال ہے، ہمیں آخر کار یہیں ختم ہوجانا ہے۔ ہم سے پہلے خصوصی کمانڈوز کے گیارہ دستے یہاں ختم ہوچکے تھے اور وہ اپنے ساتھ ان لاش بھٹیوں اور ان کے مقابلوں کے ہولناک راز اپنے سینوں میں لیے اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارا انجام بھی یہی ہونا ہے۔ کسی دن اچانک ہم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور ہماری جگہ خصوصی کمانڈوز کا تیرہواں دستہ لے لے گا۔ اس کے باوجود ہم چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح باقی دنیا کو موت کے ان کارخانوں کے بارے میں سب کچھ بتادیں۔ کسی نہ کسی طرح باقی دنیا کے علم میں یہ بات لے آئیں کہ وہ لوگ جو خود کو تمام انسانوں سے افضل اور اعلیٰ سمجھتے ہیں، کس قدر بے رحم اور ظالم ہیں، کتنے سفاک اور شقی القلب ہیں۔ دنیا کو لاش بھٹیوں کے ان کارخانوں کے خوفناک حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم یہاں سے دنیا کے نام کسی قسم کا کوئی پیغام روانہ کرسکیں۔ یہ پیغام اگر چند برس بعد بھی دنیا کے علم میں آیا تب بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس طرح بھی یہ حقائق کم از کم تاریخ میں رقم تو ہوجائیں گے۔

میرے اس خیال کی تائید سب ہی ساتھیوں نے کی۔ سب کو معلوم تھا کہ ایک ہولناک غیر طبعی موت ان کا مقدر ہے۔ سو ہم نے فیصلہ کیا کہ لاش بھٹیوں کے حالات پر مشتمل ایک دستاویز تیار کی جائے اور اس پر تمام خصوصی کمانڈوز کے دستخط ہوں اور اس دستاویز کو ریکیمر کے اندر چھپادیا جائے۔ یہ ریکیمر مسفیلڈ کے گھر چلا جائے گا اور کبھی نہ کبھی تو اس میں چھپی ہوئی دستاویز دنیا کے سامنے آہی جائے گی۔

غرض اس دستاویز کا مسودہ تیار کیا گیا۔ اس میں تفصیل کے ساتھ آشوٹز کی ان لاشوں بھٹیوں کے کارخانوں میں پیش آنے والے ہولناک واقعات بیان کیے گئے تھے۔ ان لاش بھٹیوں کے نازی ناظموں کے نام بھی درج کیے گئے تھے۔ قیدیوں کو انسانیت سوز ٹارچر سے گزارنے والوں کے نام بھی اس میں دیئے گئے تھے۔ ساتھ ہی ہم نے اپنے اندازے سے یہ بھی بتایا تھا کہ ان لاش بھٹیوں کے قیام سے اب تک کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ یہاں لوگوں کو بڑے پیمانے پر قتل کرنے

کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔

یہ تمام تاریخ تین بڑے چرمی پارچوں پر لکھی گئی۔ چوتھے پارچے پر خصوصی کمانڈوز کے دستے کے دو سو ارکان نے دستخط کیے اور ان پارچوں کو جست کے ایک سلنڈر میں بند کر کے انہیں سیل کر دیا گیا۔ اس ٹیوب کو دو ٹین کے کنستروں کے درمیان رکھ کر ان میں روئی اور دوسری چیزیں بھر کر اوپر کپڑا منڈھ دیا گیا تھا۔ اس قسم کی دوسری دستاویز کو لاش بھٹی کے کارخانے نمبر دو کے صحن میں دفن کر دیا گیا تھا۔

○○○

ہر روز شام سات بجے کے قریب موت کے ان کارخانوں کے گیٹ میں ایک ٹرک داخل ہوتا تھا۔ اس ٹرک میں ۱۰۰، ۱۵۰ مرد اور عورتیں بھرے ہوتے جنہیں یہاں ہلاک کرنے کے لیے لایا جاتا تھا۔ یہ وہ بیمار افراد ہوتے تھے جنہیں نام نہاد اسپتال کے ڈاکٹر لاعلاج قرار دے دیتے تھے۔ اس اسپتال میں ایسے مریضوں کی ہر روز چھانٹی ہوتی تھی۔ جونہی یہ ٹرک احاطے میں داخل ہوتا، اس میں سوار بدقسمت افراد کی آہ و فغاں سے لاش بھٹیوں کے کارخانے کے در و دیوار گونج اٹھتے۔

میں روزانہ کے اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا اس لیے ٹرک آنے سے پہلے ہی میں موت کے اس کارخانے کے ایک دور دراز حصے میں پائن کے درختوں کے کنج میں جا بیٹھتا لیکن وہاں بھی ریوالور سے گولیاں چلنے کی آوازیں اور انسانی چیخیں میرے کانوں میں گونج ہی جاتی تھیں لیکن بہت مدھم بہت ہلکی۔

ایک روز میں اس طرح راہِ فرار اختیار نہ کر سکا۔ شام پانچ بجے میرے لیے ایک لاش چیر پھاڑ کے لیے لائی گئی۔ یہ لاش ایک ایس ایس نازی افسر کی تھی جس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی لاش کی چیر پھاڑ کے دوران میں ایک ایس ایس کیپٹن جو کورٹ مارشل کا ایک جج تھا اور ایک کلرک میرے سر پر مسلط تھے۔ سات بجے کے قریب جب میں پوسٹ مارٹم کے بارے میں اپنا بیان معتمد کلرک کو لکھوا رہا تھا کہ قیدیوں سے بھرا ہوا ٹرک احاطے میں داخل ہوا۔ میں نے اس ٹرک کو کھڑکی سے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس ٹرک میں سوار قیدی خلافِ معمول خاموش تھے۔ نہ چیخ پکار، نہ شور و غوغا، نہ بین۔ میں نے سوچا کہ یہ بدقسمت قیدی شاید اس قدر کمزور اور بیمار ہیں کہ آنے والی موت کے خیال سے بھی ان میں چیخنے چلانے کی سکت نہیں رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان بے چاروں میں تو اتنی جان بھی نہ تھی کہ ٹرک سے اتر ہی جاتے۔

ٹرک کے ساتھ آنے والا ایس ایس گارڈ [illegible] چیخ چیخ کر قیدیوں سے ٹرک سے اترنے کے لیے کہہ [illegible] لیکن قیدیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹرک ڈرائیور [illegible] نے ٹرک کے میکنزم کو حرکت دی اور ٹرک کا پچھلا حصہ [illegible] آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور پھر اس میں سوار تمام قیدی [illegible] کی طرح نیچے فرش پر گر گئے۔ کسی کا سر کسی کا [illegible] کنکریٹ کے فرش سے ٹکرایا اور پھر ایک [illegible] دلدوز چیخیں ہوا میں منتشر ہو گئیں۔ بڑی کربناک [illegible] دردناک چیخیں تھیں وہ۔

ایس ایس کورٹ مارشل جج بھی ان چیخوں سے [illegible] ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ سب آخر کیا ہے؟“ [illegible] کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ میں نے ایس ایس کیپٹن کو [illegible] بتایا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے [illegible] ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ [illegible] یہ منظر اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

باہر خصوصی کمانڈوز نے قیدیوں کے کپڑے اتار کر [illegible] طرف ڈھیر کر دیے اور انہیں عریاں حالت میں بھٹی کے [illegible] کی طرف ہانک کر لے گئے۔ آج ان لوگوں کو ہلاک کرنے [illegible] ڈیوٹی مسٹر فیلڈ کی تھی۔ خصوصی کمانڈوز نے ان تمام قیدیوں [illegible] ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ مسٹر فیلڈ بھٹیوں کے سامنے [illegible] تھا۔ ایک ایک کر کے قیدی اس کے سامنے لائے جاتے [illegible] اور وہ ان کی گدی پر ریوالور رکھ کر گولی چلا دیتا [illegible] میں ۱۰۰ افراد لاشوں میں تبدیل ہو گئے [illegible] تمام لاشیں بھٹیوں میں جل کر راکھ بن چکی تھیں۔

بعد میں مسٹر فیلڈ میرے پاس [illegible] اسے دل میں کچھ تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور [illegible] درد تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، اسٹیتھواسکوپ [illegible] کے دل کی دھڑکنوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نبض تیز [illegible] تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کی طبیعت کی خرابی [illegible] وہ کام ہے جو وہ کر کے آیا ہے۔ [illegible] اٹھا۔ اس نے غصے سے کہا [illegible] سو آدمیوں کو [illegible] ایک ہزار کو [illegible] فرق نہیں پڑتا [illegible] یہ تو اس کا سبب ہے کہ [illegible] ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ [illegible]

○○○

ایک رات میں حسبِ معمول مطالعہ میں مصروف [illegible]

کہ اچانک لائٹ غائب ہو گئی اور سائرن زور سے بجنے لگا۔ یہ ہوائی حملے کے خطرے کا اشارہ تھا جب کبھی ایسا ہوتا تو ہم خصوصی کمانڈوز کو مسلح ایس ایس گارڈز مخصوص ہوائی حملے سے بچاؤ کی پناہ گاہ میں لے جاتے۔ یہ پناہ گاہ درحقیقت لاش بھٹیوں کا گیس چیمبر تھی۔

اس روز بھی خصوصی کمانڈوز کو گیس چیمبر میں بند کردیا گیا۔ ہم دو سو افراد اسی گیس چیمبر میں موجود تھے جہاں ہزاروں جیتے جاگتے انسانوں کو زہریلی گیس سے مارا جاچکا تھا۔ اس گیس چیمبر میں بند ہم میں سے ہر شخص اس خیال سے دہشت زدہ تھا کہ ابھی ایس ایس گارڈز چمنیوں سے سائیکلون گیس کے چار کیس نیچے پھینکیں گے اور تھوڑی دیر بعد ہم سب لاشوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ایس ایس گارڈز ایسا کرسکتے تھے۔ وہ پہلے بھی ایسا کرچکے تھے۔ ہم سے پہلے خصوصی گارڈز کے گیارہویں دستے کے نصف جوانوں کو ایس ایس گارڈز نے "ڈی" کوارٹرز سے بیرک نمبر ۳ میں منتقل کردیا تھا۔ یہ بیرک علاقۂ ممنوعہ میں تھی۔ ان لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ اوپر سے یہی احکام آئے ہیں کہ خصوصی کمانڈوز اب لاش بھٹیوں کی عمارت میں نہیں بلکہ اسی بیرک میں رہا کریں گے۔ اسی روز شام کے وقت ان میں سے نصف لوگوں کو غسل اور لباس کی تبدیلی کے لیے ڈی کوارٹرز لے جایا گیا۔ اس مرتبہ انہیں پھر بتایا گیا کہ ان میں سے آدھے افراد ایک شفٹ میں لاش بھٹیوں میں کام کریں گے اور باقی نصف خصوصی کمانڈوز دوسری شفٹ میں۔ ڈی کوارٹرز میں پہلے ان لوگوں کو غسل کرایا گیا اور پھر انہیں ایک اور کمرے میں جراثیم سے پاک لباس تبدیل کرنے کے لیے دھکیل دیا گیا۔ یہ کمرا درحقیقت جراثیم کشی کا چیمبر تھا اور اسی لیے اسے میکانیکی انداز میں اس طرح سیل کردیا گیا تھا کہ اس کے اندر ہوا کا گزر ممکن نہیں ہوتا تھا۔ عموماً یہ کمرا قیدیوں کے جوؤں بھرے ملبوسات کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اس روز اس کمرے کو چار سو انسانوں کو موت کی نیند سلانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور پھر ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے کے لیے ٹرکوں سے منتقل کردیا گیا تھا۔

ہوائی حملے کا خطرہ ٹل جانے کا سائرن تین گھنٹے کے بعد بجا تھا۔ اس تین گھنٹے کے دوران ہم دو سو افراد پر کیا گزری یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہر لمحے بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم کب زہریلی گیس سے ہمارا خاتمہ کردیا جائے۔ تین گھنٹے بعد جب ہمیں وہاں سے نکالا گیا تو میں نے دور دور تک خاردار تاروں سے جنگلوں میں گھرے ہوئے احاطوں کو پھر روشن دیکھا۔ تازہ ہوا میں دوبارہ سانس لینا بڑا خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

اگلے دن جب میں لاش بھٹی کے کارخانے نمبر دو کی راؤنڈ پر تھا تو وہاں کے خصوصی کمانڈوز کے انچارج نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ گزشتہ شب بلیک آؤٹ کے دوران میں مزاحمتی مکتی فوج کے لوگ اس کیمپ کے ایک ویران حصے میں خاردار تار کی باڑھ کو کاٹ کر اندر داخل ہوئے اور انہوں نے تین سب مشین گنیں اور ۲۰ دستی بم اندر پہنچادیے تھے۔ خصوصی کمانڈوز کے چند لوگوں نے صبح ان چیزوں کو دیکھا تو انہوں نے اس اسلحہ کو کہیں چھپادیا۔

یہ ایک چھوٹی سی مگر اچھی اور اہم خبر تھی۔ اس خبر سے مستقبل کے لیے اچھی توقعات قائم ہوتی تھیں۔ ہمیں یقین تھا کہ جن ہاتھوں نے یہ اسلحہ کیمپ میں پہنچایا ہے وہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ویسے بھی جو اطلاعات کبھی کبھار، کسی نہ کسی طریقے سے ہم تک پہنچتی تھیں ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مزاحمتی تحریک سے تعلق رکھنے والے گروپ کیمپ سے بیس، پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔ ان دنوں ہوائی حملے کے خطرے کی بنا پر کم وبیش روزانہ ہی بلیک آؤٹ ہوا کرتا تھا اس لیے یہ امید بھی تھی کہ مزاحمتی مکتی فوج کے لوگ آئندہ بھی ہمیں اسی طرح اسلحہ فراہم کرتے رہیں گے۔ اسی خیال کے پیش نظر لاش بھٹیوں کے تینوں کارخانوں کے خصوصی کمانڈوز اور بعض قیدیوں نے مل کر ایک خفیہ تنظیم بھی قائم کرلی تھی۔ یہ کام نہایت رازداری سے ہورہا تھا کیونکہ اس میں ہر ہر قدم پر موت ہماری منتظر تھی۔ ہم سب زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اس کیمپ سے نکل کر بھاگنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں اگر ہم میں سے بیشتر مرجاتے اور دو تین افراد ہی نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے تب بھی جیت ہماری ہی ہوتی کیونکہ وہ دو تین افراد دنیا کو موت کی ان فیکٹریوں کے ہولناک اور خوفناک رازوں سے آگاہ کردیتے۔

○☆○

خانہ بدوشوں کے کیمپ میں ساڑھے چار ہزار نفوس قیدی تھے۔ ان سب کو بھی ٹھکانے لگانے کا وقت آگیا تھا۔ انہیں بھی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے وہی تمام اقدامات کیے گئے تھے جو چیک کیمپ کے قیدیوں کو ہلاک کرنے کے لیے اختیار کیے گئے تھے۔ ایس ایس گارڈز نے ان کی بیرکوں کو گھیرلیا اور پھر اپنے شکاری کتوں کی مدد سے تمام خانہ بدوش قیدیوں کو بیرکوں سے نکال کر قطاروں میں کھڑا

کردیا گیا۔ ان میں ڈبل روٹی اور خشک گوشت کا راشن تقسیم کیا گیا۔ خانہ بدوشوں کو بتایا گیا تھا کہ انہیں یہاں سے کسی اور کیمپ میں منتقل کیا جارہا ہے۔ خانہ بدوشوں نے اس اطلاع کو سچ جانا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا کہ یہ سب تیاریاں انہیں لاش بھٹیوں کے حوالے کرنے کے لیے کی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرف ان کا خیال بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اگر انہیں مارنا ہی مقصود تھا تو بھلا انہیں خوراک دینے کی کیا ضرورت تھی؟

ایس ایس گارڈ کی یہ مخصوص حکمت عملی تھی۔ انہیں ان بد قسمت قیدیوں سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہوں نے تو یہ حکمت عملی اس لیے اختیار کی تھی کہ اس طرح وہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو ذہنی طور پر مطمئن کرکے بڑی آسانی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے تھے اور کوئی "ناخوش گوار" واقعہ بھی پیش نہیں آتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایس ایس گارڈز نے اپنا کام نہایت آسانی سے مکمل کرلیا۔ لاش بھٹیوں کے کارخانے نمبر ایک اور دو کی بلند چمنیاں رات بھر شعلے اگلتی رہیں اور تمام کیمپ ان منحوس شعلوں سے روشن رہا۔

اگلے روز خانہ بدوشوں کے کیمپ پر جہاں سے ہر وقت شور اور ہنگامے کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی، قبرستان کا سناٹا طاری تھا۔ اگر کچھ آوازیں تھیں تو تیز ہوا سے آپس میں ٹکرانے والے خاردار تاروں کی یا کھلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے باربار چوکھٹوں سے ٹکرانے کی۔ فرق اگر تھا تو یہ تھا کہ اس مرتبہ نازیوں نے یہودیوں کو بھٹیوں میں نہیں جلایا تھا بلکہ جرمنی اور آسٹریا سے پکڑ کر لائے گئے ان خانہ بدوشوں کو لقمۂ اجل بنایا تھا جو مذہباً کیتھولک عیسائی تھے۔ صبح تک ان ساڑھے چار ہزار خانہ بدوش قیدیوں کے جسم نقرئی راکھ میں تبدیل ہوچکے تھے اور یہ راکھ لاش بھٹیوں کے احاطے میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ساڑھے چار ہزار خانہ بدوشوں میں سے صرف ۱۴۴ افراد کی لاشیں، بھٹیوں میں نہیں جلائی گئی تھیں کیونکہ یہ جڑواں لوگوں کے ۷۲ ایسے سیٹ تھے جن کی مجھے، ڈاکٹر مینگلے کی ہدایات کے مطابق چیر پھاڑ کرنا تھی اور جڑواں افراد کے اندرونی اعضا کی ساخت اور دیگر خصوصیات کے بارے میں اپنے مشاہدات قلمبند کرکے اپنی رائے پیش کرنا تھی۔ اس میں ہر عمر کے جڑواں افراد کے سیٹ تھے۔ نوزائیدہ بچوں سے لے کر ۲۱ برس کی عمر تک کے نوجوانوں کی لاشیں اس ڈھیر میں شامل تھیں۔

میں نے ان لاشوں کی چیر پھاڑ کی۔ ان کے بارے میں اپنے مشاہدات اور نتائج پر مبنی تفصیلی رپورٹ تیار کی اور ڈاکٹر مینگلے کو پیش کردی۔ اس تمام عمل کے دوران میں کئی ایسی باتیں میرے مشاہدے میں آئی تھیں جو اب تک کے مشاہدات اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے مختلف تھیں۔ ان خلافِ معمول حقائق پر میں نے ڈاکٹر مینگلے سے تفصیلی مباحثہ کیا۔ ایسے موقعوں پر نہ تو میں موت کے اس کیمپ کا قیدی رہتا تھا نہ ڈاکٹر مینگلے منتظم اعلیٰ۔ ہم دونوں اس طرح سنجیدگی سے بحث کرتے تھے گویا ہم کسی میڈیکل کانفرنس میں مباحثے میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان مباحثوں میں، میں ڈاکٹر مینگلے کے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کرتا تھا اور بے دھڑک ہوکر کرتا تھا لیکن وہ ڈاکٹر مینگلے جو قیدیوں سے کسی قسم کی رو رعایت کا قائل نہ تھا، ان مباحثوں میں میرے اختلافی نقطۂ نظر پر قطعی برہم نہ ہوتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے اخذ کردہ نتائج کے حق میں قائل کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے۔ انہی مباحثوں کی وجہ سے ڈاکٹر مینگلے میرا قدرے احترام کرنے لگا تھا اور اپنی طبی تحقیق کے لیے مجھے ضروری سمجھنے لگا تھا۔ اسی بنا پر وہ اکثر مجھ سے نہایت مہربانی سے پیش آتا۔ مجھے خود سگریٹ پیش کرتا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مینگلے کا یہ رویہ کیمپ کے ایس ایس گارڈز کے لیے بھی حیران کن تھا۔

ایک دن ڈاکٹر مینگلے، پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کو نہ تو اتنا خوش دیکھا تھا، نہ کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی لیکن اس روز وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے مجھے دو تین لطیفے سنائے، ایک مزاحیہ نظم سنائی اور خوب خوب ہنسا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور میں نے اس سے اپنی خواہش بیان کردی کہ اگر وہ اجازت دے تو میں اس کیمپ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کرلوں؟ میں نے کہنے کو تو اپنی درخواست پیش کردی تھی لیکن اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ سے بہت بڑی حماقت ہوئی ہے لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ڈاکٹر مینگلے نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور کہا "تو تم شادی شدہ ہو اور تمہاری ایک بیٹی بھی ہے؟"

"جی ہاں ڈاکٹر کیپٹن! میں شادی شدہ ہوں، میری بیٹی کی عمر ۱۵ برس ہے" میں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

"تمہارے خیال میں، وہ اب بھی کیمپ میں موجود ہیں؟" ڈاکٹر مینگلے نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ اس لیے کہ تین ماہ قبل جب ہم یہاں آئے

"تھے تو آپ نے انہیں چھانٹ کروائیں ہاتھ والی قطار میں بھیج دیا تھا؟" میں نے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے انہیں کسی دوسرے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہو" ڈاکٹر مینگلے نے کہا اور اچانک مجھے لاش بھٹیوں اور ان سے اٹھنے والے دھوئیں کا خیال آیا۔ کیا پتا، انہیں کسی "اصلی کیمپ" میں بھیج دیا گیا ہو، میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے کرسی پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے کچھ آگے جھکا بیٹھا تھا۔ نہ معلوم کیا خیالات تھے جنہوں نے اس کے ذہن پر یلغار کردی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھ سے کہا "میں تمہیں ایک پاس دیے دیتا ہوں تاکہ تم کیمپ میں جاکر اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کر سکو لیکن۔" یہ کہہ کر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر، میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ڈاکٹر مینگلے اس کے بعد کچھ کہے بغیر مجھے ایک پاس دے کر چلا گیا۔ میں خوش خوش اپنے کمرے میں آیا۔ میرے ہاتھ میں پاس تھا۔ میں نے اس پاس پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔

"قیدی نمبر ۵۰-۸۳ اے کو اجازت ہے کہ وہ آش وٹز کیمپ میں جہاں چاہے، جاسکتا ہے۔ دستخط ڈاکٹر مینگلے، منتظم اعلیٰ۔"

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آش وٹز کیمپ میں ایسا واقعہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاس تو مجھے مل گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کہاں کروں۔ اتنا میں جانتا تھا کہ عورتوں کو کیمپ "سی" کیمپ B-3 اور کیمپ FK 4 میں رکھا گیا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ہنگری سے پکڑ کر لائی جانے والی عورتیں کیمپ "سی" میں رکھی گئی تھیں اس لیے میں نے وہیں سے اپنی تلاش کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز میں بہت جلد بیدار ہوگیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ طرح طرح کے خوف ناک خیالات نے میرے ذہن میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی۔ میں تین ماہ کے عرصے میں اس کیمپ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ یہ تین ماہ اس کیمپ میں تین صدیوں کے برابر تھے۔ اس عرصے میں یہاں بہت کچھ ہوتا تھا۔ اس کیمپ کے خونی احاطے میں قیدیوں کے لیے نہ زندگی آسان تھی نہ موت۔

میں لاش بھٹی کے کارخانے کے ایس ایس آفس میں داخل ہوا اور انہیں بتایا کہ میں آش وٹز کیمپ کے دورے پر جارہا ہوں۔ ڈاکٹر مینگلے کے دیئے ہوئے پاس کی بنا پر وہ کوئی اعتراض بھلا کیا کرسکتے تھے۔ چنانچہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کی تلاش کے مشن پر روانہ ہوگیا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ صبح کا وقت تھا لیکن سورج کی تمازت بہت تیز تھی۔ سی کیمپ اگرچہ قریب تھا لیکن مجھے گھومتے ہوئے پُرپیچ راستوں سے گزر کر تین کلومیٹر کا راستہ طے کرنا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سا نامعلوم خوف میرے حواس پر طاری تھا۔

بہرحال میں نیوٹرل زون سے گزر رہا تھا جس کے دونوں طرف خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی اور ان میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ کیمپ کے قواعد کے مطابق نیوٹرل زون میں تاروں کی بھول بھلیوں سے گزرنے والوں پر ایس ایس گارڈز کبھی فائر نہیں کرتے تھے۔ میرے قریب سے موٹر سائیکلوں پر سوار گشتی اہل کار گزرتے رہے، ان کے سینوں پر "کیمپ پولیس" کے نشانات آویزاں تھے۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔

آخر میں "سی" کیمپ پہنچ گیا۔ میرے سامنے ایک بڑا آہنی گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے سامنے، گارڈ ہاؤس تھا۔ چند ایس ایس فوجی گارڈ ہاؤس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا، سرتاپا جائزہ لیا۔ میں یہاں ایک غیر متوقع مہمان تھا لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے کہ پوچھ گچھ کا کام تو اس گارڈ کا تھا جو گارڈ ہاؤس کی کھڑکی کے پار کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں کھڑکی پر پہنچا، گارڈ کو اپنا نمبر بتاتے ہوئے میں نے ڈاکٹر مینگلے کا پاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ پاس کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھی سے گیٹ کھولنے کے لیے کہا اور مجھ سے دریافت کیا کہ میں کتنی دیر اندر رہوں گا۔ ظاہر ہے اسے یہ تفصیل اپنے رجسٹر میں درج کرنا تھی۔

فارسیہ

خلیج فارس میں ایک جزیرہ۔ سعودی عرب اور ایران کے ساحلوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ جزیرہ العربیہ کی طرح، جو اس سے چودہ میل جنوب میں ہے اور رقبے میں ایک مربع میل سے کم ہے۔ یہ جزیرہ حکومت ایران کے ماتحت ہے، جس نے ایک موسمیاتی مرکز قائم کر رکھا ہے اور ایران ہی کا محکمہ روشنی یہاں جہاز رانی کے لیے روشنی کا انتظام کرتا ہے۔

مرسلہ: تسنیم اسلم، لاہور

"بارہ بجے تک" میرا جواب تھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔ دو گھنٹے کا وقت بہت زیادہ تھا لیکن میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ اس کو پیش کردیا۔ یہ وہاں ایک عام رشوت تھی۔ سگریٹ کے پیکٹ نے اپنا کام دکھایا۔ اس نے خاموشی سے رجسٹر میں اندراج کرلیا اور میں کھلے ہوئے آہنی گیٹ سے "سی" کیمپ کے اندر داخل ہوگیا۔

سی کیمپ کی مرکزی سڑک کے دونوں طرف بیرکیں بنی ہوئی تھیں جن کا سبز رنگ اڑ چکا تھا اور ان کی خستہ حالی کا مظہر تھا۔ یہ بیرکیں بھی اتنی ہی اُجڑی ہوئی، ویران اور برباد معلوم ہوتی تھیں جتنی ان میں مقید عورتیں۔ میں نے عورتوں کی ایک جماعت کو ایک بڑا آہنی برتن اٹھا کر لے جاتے دیکھا جس میں گرم پتلا سوپ بھرا ہوا تھا۔ اس کیمپ میں عورتوں کو دوپہر کا کھانا دن کے دس بجے ہی دے دیا جاتا تھا۔ ایک طرف ہائی ویز کے محکمے میں کام کرنے والے قیدی کیمپ کی سڑکوں کی مرمت کے لیے پتھر اٹھا کر لے جارہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھاس کے قطعات پر چند عورتیں بیٹھی خلا کو گھور رہی تھیں۔ ان کے پاس شاید گفتگو کے لیے تمام موضوعات ختم ہوچکے تھے۔ ان کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے، ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور وہ بڑا افسوسناک منظر پیش کررہی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت مضحکہ خیز لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے جھانکنے والے جسم پر نہایت بدنما اور سڑے ہوئے زخم موجود تھے۔ جن سے کچ لہو اور پیپ بہہ رہی تھی۔ اسی کیمپ سے خواتین کو چھانٹ کر دوسرے کیمپوں میں بھیجا جاتا تھا۔ یہاں موجود خواتین کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جرمن نہایت احتیاط سے عورتوں کو چھانٹ کر بے گار کے لیے دوسرے کیمپوں میں بھیجتے تھے کیونکہ یہاں جتنی بھی عورتیں مجھے نظر پڑی تھیں سب کمزور اور بیمار تھیں۔ کوئی بھی محنت مشقت کے قابل نہ تھی گویا یہ سب کی سب لاشیں بھٹیوں کا ایندھن بننے والی تھیں۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔

میں پہلی بیرک کی طرف بڑھ گیا۔ ہر طرف سے شور غوغا بلند ہوا۔ وہ سب کی سب بیک وقت مجھ سے مخاطب تھیں۔ ان عورتوں میں بھی حرکت پیدا ہوئی جو زمین پر گٹھری بنی پڑی تھیں یا اپنے چاروں ہاتھ پیروں کی مدد سے زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔ وہ سب کی سب لپک کر میری طرف آئیں۔ ان میں سے کم از کم تیس، بتیس عورتوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ سب مجھے گھیرے ہوئے تھیں اور اپنے شوہروں اور بچوں سے متعلق مجھ سے دریافت کررہی تھیں۔

انہوں نے اگر مجھے پہچانا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ کہ میں نسبتاً بہتر حالات میں زندگی گزار رہا تھا جس کی وجہ سے میں اب بھی انسان دکھائی دیتا تھا جبکہ میرے لیے انہیں شناخت کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ سب بالکل ہوکر رہ گئی تھیں۔ ان عورتوں کے درمیان خود کو گھرا پا کر ان کے سوالات سے میں بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان عورتوں کے ہجوم میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ ہر کوئی مجھ سے اپنے شوہروں، بیٹوں کے بارے میں سوال کررہی تھی۔ تین ماہ سے وہ غیر انسانی حالات میں زندگی گزار رہی تھیں۔ اس عرصے میں وہ اس کیمپ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھیں اسی لیے ہر عورت اپنے عزیزوں کے انجام سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے لاش بھٹیوں کی حقیقت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ کیا واقعی قیدیوں کو بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردیا جاتا ہے۔ کیا انہیں زندہ جلایا جاتا ہے یا پہلے گیس سے ہلاک کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان تمام حقائق کو جھٹلاتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

میں نے کہا "لاش بھٹیوں کے بارے میں آپ نے کچھ سنا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ویسے بھی اب جنگ ختم ہونے والی ہے اور ہم جلد ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں گے" میں نے مزید دلاسا دیا اور دل ہی دل میں خود کو بھلا بھی کہتا رہا۔

بہرحال وہاں سے مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ میں مایوس ہوکر اگلی بیرک کی طرف گیا۔ اس بیرک کا انچارج نازیوں نے سلوا کیہ کی نوجوان لڑکی کو بنایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بیرک میں میری بیوی اور بیٹی کے ناموں کا اعلان کرادے۔ بیرک میں دس گیارہ سو کے قریب عورتیں تھیں۔ سب دعائیں پڑھ رہی تھیں، رو رہی تھیں یا تکلیف سے کراہ رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔ اس شور بے ہنگم میں پکارنے والی ایک آواز صدا بہ صحرا ثابت ہورہی تھی۔ وہ سلوا کین لڑکی پورے بیرک میں گھوم کر میری بیوی اور بیٹی کے نام پکارتی رہی لیکن جواب میں کوئی عورت نہ آئی۔ مایوس ہوکر میں وہاں سے نکلا اور اگلی بیرک کی طرف گیا۔

مزید واقعات اگلے شمارے میں ...

اٹارنی کو ایک نہایت دھمکی آمیز خط بھیجا۔ یہ وہی تاریخ تھی جب چیپ مین کو عدالت نے سزائے موت سنائی تھی۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔ ”تم نے چیپ مین کو پکڑ لیا ہے۔ اب دیکھنا کہ ہم کیا کرتے ہیں...... نمبر 1۔ اسٹیوبن ویل سے تمام چوہوں کا صفایا کردیں گے۔ نمبر 2۔ ہم بین ہینز کو موت کے گھاٹ اتاردیں گے۔ نمبر 3۔ ہم تمہیں جان سے مارڈالیں گے۔“

اس کے چند دنوں کے بعد چیپ مین کے رفقانے اپنی دھمکی نمبر 1 کو عملی جامہ پہنادیا۔ انہوں نے اسٹینٹن موٹر کمپنی کے گیراج کو جہاں سے انہوں نے لنکن کار چرائی تھی اور جس کی کلرک کیتھرائن نے عدالت میں چیپ مین کے خلاف تباہ کن گواہی دی تھی، جلا کر راکھ کرڈالا اس کے نقصان کا تخمینہ دولاکھ ڈالر لگایا گیا۔

اس کے چار ماہ کے بعد 14 اگست کو ڈچ نے اپنی دوسری دھمکی کو عملی جامہ پہنایا یعنی بین ہینز کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا جس کی سادہ طبیعت نے اسے سرکاری گواہ بنادیا تھا۔ ڈچ اینڈرسن اور اس کا ایک شریک جرم انڈیانا پہنچے اور ایک عورت کی مدد سے بین اور اس کی بیوی کو ٹیلی فون کے ذریعے ان کے گھر سے باہر بلوایا۔ اور جب وہ باہر نکل کر ان کی کار کے قریب آئے تو انہوں نے ان دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ میری تو وہیں ڈھیر ہوگئی لیکن بین ہینز اتنی دیر زندہ رہا کہ ادھر سے گزرنے والے ایک شخص کو قاتلوں کے بارے میں بتادیا۔ قتل کی اتنی بہیمانہ واردات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے بہت تیزی سے حرکت کی اور رات گئے تک ڈچ اینڈرسن کے شریک جرم وولف کو پکڑ لیا لیکن ڈچ اینڈرسن غائب ہوچکا تھا۔

لیکن ڈچ اینڈرسن اپنی تیسری دھمکی کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ یعنی اسٹیٹ اٹارنی کو جان سے مارڈالنے کی دھمکی...... وہ عارضی طور پر مشی گن کے ایک مقام سگی گن میں جا چھپا تھا اور بین ہینز اور میری کی ہلاکت سے پیدا ہونے والے ہنگامے کے سرد ہونے کا انتظار کررہا تھا کہ اس کی تقدیر نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

31 اکتوبر کی رات کو وہ چاکلیٹ خریدنے کے لیے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر ایک اسٹور میں پہنچا۔ اسٹور کے کیشیئر نے اسے پہچان لیا اور چپکے سے ایک پولیس مین کو خبر کردی۔ وہ پولیس مین، ڈچ کا تعاقب کرنے لگا اور اس نے ڈچ کو ایک نیم تاریک گلی میں پہنچ کر للکارا۔ دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا اور اس خونی جھڑپ میں ڈچ اور وہ پولیس مین دونوں ہی ہلاک ہوگئے۔

جب یہ خبر چیپ مین تک پہنچی تو وہ واضح طور پر بل گیا۔ ڈچ کی موت نے اس سے آزادی کی آخری آس بھی چھین لی۔ لیکن اس نے قانونی جنگ جاری رکھی۔ تاخیری حربے، ساعت در ساعت، عذر در عذر کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر وہ مقدمہ سپریم کورٹ میں پہنچ گیا۔ یہاں چیپ مین کے وکلاء نے یہ بحث شروع کردی کہ ریاستہائے متحدہ کے صدر کو قیدی کی مرضی کے خلاف اس کی سزا کو کالعدم قرار دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن سپریم کورٹ نے صدر کے اس حکم کو جائز قرار دیا۔

سزائے موت سنائے جانے کے ایک سال بعد مورخہ 5 اپریل 1926ء کو پھانسی پر عمل درآمد کیے جانے سے چودہ گھنٹے پہلے ایک بورڈ بیٹھا۔ چیپ مین کو اس بورڈ میں پیش کیا گیا تاکہ وہ آخری بار اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکے۔ اس موقع پر چیپ مین نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنا کیس بیان کیا، ہینز اور میری کی ہلاکت سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی۔ بورڈ نے بڑے صبر وتحمل سے سارے بحث ومباحثے سنے اور پھر اپنا فیصلہ سنادیا...... چیپ مین کو اب آدھی رات کو پھانسی دی جانی تھی۔

ویدرس فیلڈ کے چرچ نے رات کے بارہ بجنے کی منادی کی۔ اس وقت فضا ہلکی ہلکی کہر آلود تھی۔ قیدی چیپ مین کو کچھ ہی دیر پہلے جیل کے پادری کے پاس لے جایا گیا تھا تاکہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے لیکن اسے اپنے کیے پر نادم یا پشیمان نہ پاکر واپس اس کی پھانسی کی کوٹھری میں پہنچادیا گیا۔

اب وہ، وارڈن اور چار پہرے داروں کی معیت میں پھانسی کے چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے لب سلے ہوئے تھے۔ وہ ایک لفظ ادا کیے بغیر چبوترے پر جا چڑھا اور جب اس کی مشکیں کس دی گئیں اور سیاہ نقاب سے اس کا چہرہ چھپادیا گیا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ پہرے دار نے پھانسی کا پھندا احتیاط سے اس کے گلے میں ڈال کر کس دیا۔ پھر اشارہ پاکر وارڈن نے فرش پر بنے ہوئے چھوٹے سے تختے کو لات مار کر ہٹادیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ کے بعد گریری پارک کے نواب جیرالڈ چیپ مین کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔





عقوبت خانہ

قسر آذر

انسان اشرف المخلوقات قرار پایا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے مرتبے کا لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ کتنا گرسکتا ہے۔ ظلم پر اترآئے تو کس طرح حیوانوں سے بدترین جاتا ہے اسی کا ایک نمونہ پیش کررہا ہوں۔ گوکہ ان واقعات کو گزرے عرصہ ہوگیا ہے لیکن اب بھی ان میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں جو ان ایام کو یاد کرکے لرزاٹھتے ہیں

دل کو دہلا دینے والے واقعات کا ذکر، اس کی دوسری اور آخری کڑی

میری تلاش تیسری بیرک میں بار آور ثابت ہوئی۔ باقی بیرکوں کی طرح اس بیرک میں بھی دیواروں کے ساتھ تلے اوپر لکڑی کے تختوں سے قیدیوں کے لیٹنے کے لیے برتھیں بنائی گئی تھیں۔ اس بیرک کی نگراں نے میری درخواست پر دو چھوٹی بچیوں کو دو مختلف سمتوں میں روانہ کیا، وہ بچیاں برتھوں کے ہر سلسلے کے پاس ٹھہر کر میری بیوی اور بیٹی کے نام پکارتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری بیوی اور بیٹی کو لے کر واپس آگئیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آرہی تھیں۔ خوف اور دہشت سے ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ان جانے سے خوف میں مبتلا تھیں کہ نہ معلوم اب ان کا کیا حشر ہونے والا ہے جو انہیں نام لے کر طلب کیا جارہا

ہے۔ پھر جب انھوں نے مجھے دیکھا' مجھے پہچانا تو زمین نے جیسے ان کے پیر پکڑ لیے۔ مجھے زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ انھیں شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے بڑھ کر ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شدتِ جذبات سے ان کے لیے کچھ کہنا مشکل تھا' ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ بس وہ مجھ سے لپٹی آہستہ آہستہ سسکتی اور بلکتی رہیں۔ میں نے انھیں تسلی اور دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن جواب میں ان کی سسکیاں اور زیادہ بلند ہو گئیں۔ اس دوران میں کئی عورتیں ہمارے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ اس ماحول میں میرے لیے اپنی بیوی اور بیٹی سے گفتگو کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بیرک کی اور سیئر سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنا چھوٹا سا کمرا دے دے تاکہ میں اپنی بیوی اور بیٹی سے تنہائی میں کچھ باتیں کرسکوں۔ نگراں نے میری درخواست قبول کرلی۔ ہم تینوں اس کے کمرے میں آگئے۔

انھوں نے پچھلے تین ماہ کی بپتا مجھے سنائی۔ ان کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ بھوک اور سردی نے ان کی زندگی کو عذاب بنادیا تھا۔ ان کی بیرک بری طرح ٹپکتی تھی جس کی بنا پر ان کے کپڑے کبھی خشک نہیں ہو پاتے تھے۔ خوراک کے نام پر جو کچھ بھی انھیں دیا جاتا تھا' اسے حلق سے اتارنا مشکل تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ کبھی پوری نیند نہ سو پاتی تھیں۔ بیرک کے جس گوشے میں انھیں جگہ ملی تھی وہ صرف سات افراد کے لیے تھی لیکن وہاں ۲۳ افراد کو ٹھونس دیا گیا تھا جو عورتیں بڑے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں وہ یہاں بھی اپنی سابقہ حیثیت کا رعب جمانے کی کوشش کرتی تھیں۔ سوتے وقت وہ ایک دوسرے کو دھکے دیا کرتی تھیں تاکہ انھیں تھوڑی سی زیادہ جگہ مل جائے اور وہ قدرے بہتر طریقے سے سو سکیں۔ یہاں ہر عورت اپنی اصل شخصیت کھو چکی تھی۔ ایک نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو بس اپنی ہی فکر تھی' دوسرے کے لیے کوئی بھی معمولی سا ایثار کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میری بیٹی نے مجھے بتایا کہ وہ زمین پر سویا کرتی تھی۔ میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنے اور اپنے کام کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ میں خصوصی کمانڈوز میں شامل ہوں تو وہ پریشان اور خوف زدہ ہو گئیں۔ کیمپ میں تین ماہ کی زندگی کے دوران انھیں بھی معلوم ہو گیا تھا کہ خصوصی کمانڈوز چلتی پھرتی لاشیں ہی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کے دن گنے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک مقررہ وقت پر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود میں نے انھیں تسلی اور دلاسے دیے اور اگلے روز آنے کا وعدہ کرکے ان سے رخصت ہو کر واپس آگیا۔

میرے ساتھیوں کو جب یہ علم ہوا کہ میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو کیمپ میں تلاش کرلیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے ان میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اگلے روز میں نے اسٹور سے گرم کپڑے' چادریں' موزے اور ضرورت کی دیگر اشیاء حاصل کیں جن میں ٹوتھ برش' نیل کٹر اور کنگھے بھی شامل تھے۔ دوا خانے سے میں نے وٹامن کی گولیاں' مرہم پٹی کا سامان اور مختلف دیگر ضروری دوائیں حاصل کیں۔ شکر' جام' مکھن اور ڈبل روٹیاں بھی بڑی تعداد میں حاصل کیں اور ایک بھاری' پھولا ہوا تھیلا لے کر اس کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تین ہفتے تک میرا روزانہ یہی معمول رہا لیکن میں ہر روز اس خوف سے دہشت زدہ رہتا تھا کہ نہ معلوم کس دن یہ سلسلہ بند ہو جائے۔ کس دن ہماری موت کے پروانے جاری کردیے جائیں۔ ایک روز میں حسبِ معمول چیرپھاڑ میں مصروف تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مینگلے اور ڈاکٹر تھیلو بھی وہاں موجود تھے۔ وہ دونوں میری موجودگی سے لاتعلق ہو کر آش وٹز کے عقوبتی کیمپ کے انتظام کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر مینگلے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جب وہ کوئی فیصلہ کرلیتا تھا اور اس فیصلے سے وہ کسی کو آگاہ کرنا چاہتا تھا تو یہ اس کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے ڈاکٹر تھیلو کو اپنا فیصلہ سنادیا "سی کیمپ کی قیدی بیمار اور کمزور عورتوں کو خوراک فراہم کرنا اب میرے بس میں نہیں ہے۔ اگلے دو ہفتوں کے دوران میں مجھے ان عورتوں سے نجات حاصل کرنا ہی ہوگی۔"

ڈاکٹر مینگلے نے سی کیمپ کی قیدی عورتوں کے لیے موت کی سزا کا فیصلہ سنادیا تھا۔ میرا دل ڈوب کر رہ گیا۔ جونہی ڈاکٹر مینگلے اور ڈاکٹر تھیلو وہاں سے گئے' میں بھی پاس لے کر لاش بھٹی کے احاطے سے نکل کر ڈی کیمپ پہنچ گیا۔ اس کیمپ میں ایس ایس گروپ نے اپنا عارضی دفتر قائم کررکھا تھا۔ یہ گروپ غیر ملکی قیدیوں کو جرمنی کے مختلف علاقوں میں بکھری ہوئی مختلف فیکٹریوں میں بیگار کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ میں اس گروپ کے انچارج کے پاس پہنچا اور اس کو ڈاکٹر مینگلے کا پاس دکھا کر اپنا تعارف کرایا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میری بیوی اور بیٹی سی کیمپ میں قیدی ہیں۔ ڈاکٹر مینگلے کی ہدایت سے میں نے انھیں تلاش کرلیا ہے اور ان کی حتی الامکان

رہا ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ سی کیمپ کے تمام قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جانے والا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ میری بیوی اور بیٹی کو بیگار کے لیے یہاں سے کہیں اور بھیج دے۔ اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔

اس ہفتے سی کیمپ سے تین ہزار قیدیوں کو جرمنی کی جنگی فیکٹریوں میں بھیجا جانے والا تھا۔ ایس ایس گروپ کے انچارج نے مجھے بتایا "یہ فیکٹریاں جرمنی میں بیگار قیدیوں کے لیے بہترین ہیں کیونکہ وہاں قیدیوں کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ صحت مند اور زندہ رکھنے کے لیے خوراک دی جاتی ہے اور رہائش فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرسکیں اور فیکٹریوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔"

میں اس کی میز پر سو سگریٹوں کے پیکٹ رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میری بیوی اور بیٹی نے قیدیوں کے سلیکشن کے دوران اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں تو وہ انہیں بیگار کے لیے جرمنی کی کسی فیکٹری میں بھیج دے گا۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا۔ ڈی کیمپ سے میں سیدھا سی کیمپ گیا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے ملاقات کی لیکن انہیں اس بات پر راضی کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی کہ وہ جرمنی کی کسی فیکٹری میں بیگار کے لیے اپنی خدمت رضاکارانہ طور پر پیش کردیں۔ ظاہر ہے میں انہیں اصل بات تو بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اصل بات بتا دیتا تو وہ رونا دھونا شروع کردیتیں اور پھر اگر اصلیت کا علم جرمنوں کو ہوجاتا تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے انہیں راضی بھی کرلیا۔ دو دن بعد وہ دونوں سی کیمپ سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئیں۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ میں خوش بھی تھا اور غمگین بھی۔ خوش اس لیے کہ میری بیوی اور بیٹی فوری موت کے شکنجے سے دور چلی گئی تھیں، غم زدہ اس لیے کہ اب میرے لیے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی زندگی کیا تھی، ہر وقت موت کا خوف تھا۔ کسی وقت بھی ہم سے ہماری زندگی چھینی جاسکتی تھی۔ ہرچند کہ ان دنوں ایسے آثار پیدا ہوچکے تھے کہ جنگ کسی وقت بھی ختم ہوسکتی تھی۔ جرمنی کی تیسری جمہوریہ کی قبر کھودی جاچکی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ اس وقت جو قیدی بھی آش وٹز جیسے عقوبت خانوں سے جس قدر دور تھ
اس کے زندہ رہنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ تھے۔ اس
مطلب یہ بھی تھا کہ میرے زندہ بچ رہنے کے امکانات دن بدن کم ہوتے جارہے تھے۔ میرا تعلق خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ ویں گروپ سے تھا۔ ہم سے پہلے خصوصی کمانڈوز کے گیارہ گروپ لاش بھٹیوں کے ان کارخانوں میں فرائض انجام دینے کے بعد ہلاک کردیے گئے تھے۔ ہر گروپ کی عمر صرف چار ماہ ہوتی تھی۔ غالباً جرمنوں کا نہایت محتاط اندازہ یہی تھا کہ خصوصی کمانڈوز سے جو کام لیا جاتا ہے، انسانی اعصاب اس کا بوجھ اور تناؤ چار ماہ سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتے۔ خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ویں یعنی ہمارے گروپ کے کام کی مدت بھی کم و بیش پوری ہوچکی تھی۔ صرف چند دن باقی تھے۔ ایک یا دو ہفتے کی ہماری زندگی اور تھی۔ پھر ہمیں بھی لاش بھٹیوں میں جل کر راکھ ہوجانا تھا۔

سی کیمپ میں مقید عورتوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے پر کام شروع ہوچکا تھا۔ ہر روز اس کیمپ سے ۵۰ ٹرکوں میں بھر کر چار ہزار قیدی عورتوں کو لاش بھٹیوں کے کارخانے لایا جاتا تھا۔ ہر ٹرک میں ۸۰ کے قریب عورتیں سوار ہوتی تھیں۔ کچھ عورتیں موت کے خوف سے چیخیں مار رہی ہوتیں، کچھ بالکل گم صم۔ خوف سے ان کے اعضا اور زبانیں جیسے مفلوج ہوجاتی تھیں۔ دس دن کے اندر سی کیمپ کے تمام قیدیوں کو زندگی سے نجات دے دی گئی۔ ۴۵ ہزار عورتیں چار ماہ کی انتہائی اذیت ناک زندگی گزار کر، نہایت ذلیل و رسوا ہوکر زندگی کے اس جہنم سے چھٹکارا حاصل کرگئیں۔ سی کیمپ پر گمبھیر اداسی طاری ہوگئی۔

میرا خیال تھا کہ خصوصی کمانڈوز کے ۱۲ویں گروپ کا یہ آخری کام تھا اور اس کے بعد اب خود انہیں ختم ہوجانا تھا۔ موت کس قدر قریب آگئی تھی، اس کا ہم سب کو احساس تھا اس لیے ہر کوئی ہی خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس... لیے اب کسی سے بات کرنا بھی دوبھر تھا۔ ہمیں ہر وقت ایس ایس کے ان جلادوں کا انتظار تھا جو ہمیں قتل کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو علی الصباح واچ ٹاور سے گولی چلنے کی زور دار آواز آئی۔ کسی محافظ نے ایک قیدی کو گولی سے اڑادیا تھا جو نیوٹرل زون سے باہر چلا گیا تھا۔ مرنے والا ایک روسی افسر تھا۔ وہ جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ سے فرار کی کوشش میں ناکام ہوگیا تھا اور اسے خطرناک قرار دے کر آش وٹز کے عقوبت خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ

اس نے آش وٹز سے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور گارڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

مرنے والا اگر آش وٹز کا عام قیدی ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ معاملہ وہیں رفع دفع ہو جاتا مگر وہ ایک جنگی قیدی تھا۔ اس کا نام اس کے کوائف اور تفصیلات کیونکہ کیمپ کے ریکارڈ میں موجود تھے اس لیے جنگی قیدیوں کے عالمی چارٹر کے مطابق اس کی موت کے اسباب سے متعلق رپورٹ کی تیاری ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر مینگلے کی سربراہی میں ایک پولیٹکل کمیشن قائم کر دیا گیا تھا اور مجھے روسی افسر کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر کے اپنی رپورٹ ڈھائی بجے تک مینگلے کو فراہم کرنی تھی۔

ڈاکٹر مینگلے روسی افسر کی لاش میرے حوالے کر کے ۹ بجے چلا گیا تھا۔ اگر وہ اکتوبر کی ٦ تاریخ نہ ہوتی تو میں لاش کا پوسٹ مارٹم تیس چالیس منٹ میں مکمل کر لیتا مگر وہ ١٦ اکتوبر کا دن تھا۔ خصوصی کمانڈوز کے چار ماہ کی مدت کا آخری دن۔ اگلے روز ہمیں مار کر بھٹیوں میں جلا دیا جانا تھا اس لیے ہم کو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ ہم صرف موت کے منتظر تھے۔ میرے احساسات کیا تھے میں بیان نہیں کر سکتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس کا احساس تک اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ میں روسی افسر کی لاش کو چیر پھاڑ کی میز پر چھوڑ کر وہاں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ کسی پل قرار ہی نہیں آ رہا تھا اس لیے میں اپنے کمرے سے اٹھ کر اس کمرے میں آ گیا جہاں لاشوں کو بھٹیوں میں جھونکا جاتا تھا۔ کمرے میں سیکڑوں لاشیں پڑی تھیں لیکن انہیں بھٹیوں میں جھونکنے والے خصوصی کمانڈوز بہت بے دلی سے کام کر رہے تھے بلکہ بیشتر کمانڈوز دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں وہاں سے چلا آیا اور پہلی منزل پر پہنچا جہاں خصوصی کمانڈوز رہا کرتے تھے لیکن اس دن وہاں کا منظر بھی بدلا ہوا تھا۔ عام طور پر صبح کو حاضری اور ناشتے کے بعد نائٹ شفٹ میں کام کرنے والے کمانڈوز واپس آ کر سو جاتے تھے یا آرام کرتے تھے لیکن اس روز وہاں کوئی بھی نہیں تھا حالانکہ اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ میں ایک کمرے سے گزر کر عقبی برآمدے کی طرف گیا تو دیکھا سب کے سب اسپورٹس کے کپڑے بوٹ اور سویٹر پہنے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں کھڑے باتوں میں مصروف ہیں۔ ایک کمرے میں میں نے دیکھا کہ بعض ساتھی اپنے کپڑے اور سامان سوٹ کیسوں میں بھر رہے ہیں۔ لگتا تھا کہ سب کام کسی منصوبے کے تحت ہو رہے ہیں لیکن منصوبہ کیا تھا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

میں خصوصی کمانڈوز کے سربراہ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں نائٹ شفٹ کے مختلف انچارجوں کو موجود پایا۔ ان میں انجینئر میکینک ہیڈ شوفر اور گیس کمانڈوز کا انچارج شامل تھے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمانڈوز کے سربراہ نے میز سے ایک بوتل نکال کر ایک گلاس میں برانڈی انڈیلی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں تمام برانڈی پی ڈالی۔ برانڈی نشے اور سرور سے زیادہ موت کے خوف کو کم کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی تھی۔

ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ خصوصی کمانڈوز کے ١٢ ویں گروپ یعنی ہم لوگوں کو کم از کم دو روز تک قتل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے اس کے باوجود ٨٦٠ خصوصی کمانڈوز کے اس گروپ نے بہت سوچ بچار کے بعد اسی روز رات کو کیمپ سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ کیمپ سے نکلنے کے بعد ہم سب یہاں سے دریائے وچولا کے موڑ کا رخ کریں گے۔ اس موسم میں کیونکہ دریا میں پانی بہت کم تھا اس لیے ہم آسانی سے اس کو پار کر سکتے تھے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد ہم سب اس جنگل کا رخ کرتے جو وہاں سے ٨ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ جنگل پولینڈ کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا اور ہم اس جنگل میں مہینوں بحفاظت رہ سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہماری ملاقات ان مزاحمتی گروپوں میں سے کسی گروپ سے ہو جاتی جو نازیوں کے خلاف سرگرم تھے۔

اس پلان پر عمل درآمد کے لیے ہمارے پاس مناسب تعداد اور مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود بھی موجود تھا جو گزشتہ چند روز کے اندر آش وٹز کے اسلحہ ساز کارخانوں سے کیمپ کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں انتہائی دھماکا خیز مادے کے سو بکس بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس پانچ مشین گنیں اور ٢٠ دستی بم بھی تھے۔

اس گفتگو میں شامل ایک شخص نے کہا تھا "ہماری کارروائی کیونکہ اچانک اور غیر متوقع ہوگی اس لیے ہم صرف ریوالوروں کے ذریعے ہی محافظوں پر قابو پا کر انہیں غیر مسلح کر دیں گے۔ اس کے بعد ہم ایس ایس فوجیوں کو بھی اسی طرح اچانک قابو میں کر لیں گے اور انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیں گے پھر جب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہے گی تو ان کا قصہ تمام کر دیں گے۔"

طے یہ ہوا کہ حملے کے لیے اشارہ ٹارچ کے ذریعے لاش/

کارخانہ نمبر ایک سے دیا جائے گا اور کارخانہ نمبر ۲ یہ سگنل کارخانہ نمبر ۳ کو اور وہ نمبر چار کو تیار رہنے کا سگنل دے گا۔ مجھے یہ منصوبہ قطعی قابلِ عمل معلوم ہوا کیونکہ ان دنوں صرف لاش بھٹی کے کارخانہ نمبر ایک ہی میں کام ہوا کرتا تھا اور اگر اس کارخانے میں کام شام چھ بجے بھی بند ہوا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نائٹ شفٹ میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز کو کام پر نہیں جانا ہوگا۔ جب کبھی اس قسم کی صورتِ حال پیش آتی تھی تو ایس ایس کے گارڈز بھی اپنی نگرانی میں کمی کردیتے تھے۔ ہر لاش بھٹی کارخانے میں تین تین ایس ایس گارڈ ہوتے تھے۔

ہمارا یہ اجلاس شام تک کے لیے ملتوی ہوگیا۔ ہدایت یہ تھی کہ جب تک سگنل نہ دیا جائے، ہر شخص معمول کے مطابق اپنا کام انجام دے تاکہ کسی کو کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں پھر بھٹیوں والے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ وہاں موجود کمانڈوز پہلے سے بھی زیادہ ست انداز میں کام کررہے تھے۔ وقت ست روی سے گزرتا رہا۔ لنچ ٹائم ہوگیا، ہم آہستہ آہستہ اپنی خوراک زہر مار کرتے رہے۔ کھانے کے بعد ہم صحن میں آگئے۔ زرد اور پھیکی پھیکی دھوپ کی نرم نرم گرمی نہ معلوم کیوں مجھے اس وقت بہت بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہماری نگرانی پر مامور تینوں میں سے کوئی بھی ایس ایس گارڈ آس پاس کہیں دکھائی نہ دیتا تھا لیکن یہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔ پہلے بھی اکثر ایسا ہوچکا تھا۔ وہ یقیناً اپنے کمرے میں موجود تھے، احاطے کا دروازہ بند تھا۔ باہر ایس ایس کا گارڈ ہمیشہ کی طرح اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میں نے اطمینان سے ایک سگریٹ پی۔ یہ خیال ہی بہت فرحت بخش تھا کہ چند گھنٹوں بعد ہم موت کے اس کارخانے کے احاطے سے باہر ہوں گے۔ اس احساس نے میرے ذہن پر پڑے ہوئے اس سیاہ پردے کو بھی غائب کردیا تھا جس نے میرے ذہن کو اس عقوبت خانے میں آنے کے پہلے روز سے ملفوف کر رکھا تھا۔ پھر ایک اور احساس بھی اطمینان بخش تھا کہ اگر میں فرار کی اس کوشش میں ناکام بھی ہوگیا، مارا بھی گیا تب بھی میں کسی گھاٹے میں نہیں رہوں گا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ لیا۔ ہمیں اب جلد از جلد روسی جنگی قیدی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرکے ڈاکٹر مینگلے کے آنے سے قبل اپنی رپورٹ تیار کرنا تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کردیا۔ ہمیں اپنا کام کرتے ہوئے بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک زبردست دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے۔ اس کے بعد بازگشت کی خاموشی میں مشین گن سے فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ لاش بھٹی کے کارخانے نمبر تین کی سرخ ٹائلوں والی چھت اور اس کو سہارا دینے والے شہتیر دھماکے سے اڑ گئے تھے اور اب وہاں سے آگ کے شعلے اور دھواں ابھر رہا تھا۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ پوسٹ مارٹم کے کمرے کے عین سامنے مشین گنوں سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اچانک یہ سب کچھ کیا ہونے لگا ہے۔ ہمارے منصوبے پر تو رات کو عمل درآمد ہونا تھا۔ اس وقت اس قسم کا کوئی ہنگامہ ہمارے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں دو ہی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو ہم میں سے کسی نے غداری کی تھی اور ہمارے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے ایس ایس گارڈز نے جوابی کارروائی کی تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ کسی مزاحمتی گروپ نے کیمپ پر حملہ کردیا تھا۔

دھماکے اور فائرنگ کے فوراً بعد آش وٹز نمبر ایک اور آش وٹز نمبر ۲ سے سائرن بجنے لگے۔ پے در پے چند اور دھماکے ہوئے جو پہلے دھماکے سے زیادہ شدید اور ہولناک تھے۔ اس کے ساتھ ہی مشین گنوں سے بھی مسلسل فائرنگ شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد فیلڈ مشین گن کی فائرنگ کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ باہر کیا ہورہا ہے اس لیے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت یہیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں موجود رہوں اور اس بات کا انتظار کروں کہ اس ہنگامے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ان حالات میں کمرے سے باہر جانا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی سے ۸۰ سے ۱۰۰ جنگی ٹرکوں کو آتے دیکھا۔ پہلا ٹرک ہمارے لاش بھٹی کے کارخانے کے سامنے آکر رکا اور اس میں سے آدھی کمپنی چھلانگیں لگا کر باہر آئی جس نے خاردار تاروں کی باڑھ کے سامنے جنگی انداز میں پوزیشن سنبھال لی۔

معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ خصوصی کمانڈوز نے لاش بھٹی کے کارخانۂ اول پر قبضہ کرلیا تھا اور وہ ہر کھڑکی اور دروازے سے ایس ایس کے جوانوں پر فائرنگ کررہے تھے اور دستی بم ماررہے تھے۔ ان کا دفاع خاصا موثر معلوم ہورہا تھا کیونکہ میں نے کئی جرمن فوجیوں کو زخمی ہوکر یا مرکر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر جرمنوں نے ایک نئی چال چلی۔ وہ پچاس تربیت یافتہ شکاری

کتوں کو لے آئے اور انہیں خصوصی کمانڈوز پر حملہ کرنے کے لیے ہشکارا مگر اس دن میں نے ایک عجیب اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ ان تربیت یافتہ کتوں نے جو اشارہ پاتے ہی شکار کو چیر پھاڑنے کے لیے لپک پڑتے تھے، حملہ کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اپنی جگہ ہی خوف زدہ انداز میں غراتے رہے، ان کے کان پیچھے کی طرف جھک گئے تھے اور انہوں نے اپنی دُمیں ٹانگوں میں دبالی تھیں اور وہ خوفزدہ ہوکر اپنے آقاؤں کے پیچھے دبک گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کتوں کو ایسے قیدیوں پر حملے کی تربیت دی گئی تھی جو دھاری دار، ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے تھے جبکہ خصوصی کمانڈوز اس قسم کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ ممکن ہے ان خونخوار شکاری کتوں کے خوف زدہ ہونے کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اب تک کمزور اور غیر مسلح قیدیوں کو شکار کرتے رہے تھے اور ہوسکتا ہے کہ وہ اس جنگی ماحول سے خوف زدہ ہوگئے ہوں، جس میں ہر طرف بارود اور انسانی خون کی بو بسی ہوئی تھی اور زبردست دھماکے ہورہے تھے۔

حالات پر قابو پانے کے لیے مزید کمک طلب کرلی گئی۔ خصوصی کمانڈوز کے لیے زیادہ دیر تک جرمنوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ جرمنوں کو ہر اعتبار سے ان پر برتری حاصل تھی۔ وہ زیادہ دیر تک لاش بھٹی کے کارخانے میں بند ہوکر مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اس لیے انہوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ چیختے چلاتے، نعرے لگاتے ہوئے وہ لاش بھٹی کے کارخانے کے عقبی دروازے سے نکلے، فائرنگ کرتے ہوئے انہوں نے خاردار تاروں کی باڑھ پار کی جسے پہلے ہی کاٹا جاچکا تھا اور وہاں سے نکل کر وہ دریائے وسچولا کی طرف بڑھ گئے۔

دس منٹ تک دونوں طرف سے لڑائی کا خوب زور رہا۔ زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اور پھر اچانک جیسے یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا اسی قدر غیر متوقع طور پر...... ختم بھی ہوگیا۔ ماحول پر گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ لاش بھٹی کے کارخانے کے سامنے پوزیشنیں سنبھالے ہوئے جرمن فوجیوں نے پیش قدمی شروع کردی۔ انہوں نے عمارت کے چاروں طرف سے حملہ کردیا۔ جرمن فوجیوں کا ایک گروپ پوسٹ مارٹم کے کمرے میں داخل ہوا، انہوں نے ہم پر بندوقیں تان کر ہم پر مکوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کردی۔ وہ ہمیں صحن میں لے آئے اور ہمیں زمین پر اوندھے منہ ہوکر پیٹ کے بل لیٹ جانے کا حکم دیا۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد بلند آواز میں ہمیں خبردار کیا گیا "جس شخص نے حرکت کی، جس کسی نے سر اٹھایا اس کی گردن میں گولی ماردی جائے گی" چند منٹ بعد قدموں کی آوازوں اور دیگر سرگرمیوں کے شور سے میں نے اندازہ لگایا کہ جرمن فوجی کئی اور خصوصی کمانڈوز کو گھیر کر واپس لے آئے ہیں۔ انہیں بھی ہمارے پہلو بہ پہلو زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جانے کے لیے کہا گیا۔ تین چار منٹ بعد ایک اور گروپ کو لایا گیا اور انہیں بھی زمین پر لٹادیا گیا۔ اسی حالت میں جرمن فوجی ہمارے سروں، شانوں اور پیٹھ پر ڈنڈے برساتے رہے۔ میں نے اپنے چہرے پر گرم گرم خون کی لکیریں نیچے آتی محسوس کیں پھر خون کی یہ لکیریں میرے ہونٹوں کی باچھوں میں جذب ہوکر میری زبان کو نمکین بنانے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ بس پہلے ڈنڈے کی ضرب سے مجھے تکلیف محسوس ہوئی تھی، اس کے بعد مجھے کسی ضرب کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں، سر چکرا رہا تھا، ذہن بالکل ماؤف ہوچکا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں موت سے قبل...... طاری ہونے والی غشی میں ڈوبتا چلا جارہا ہوں۔

اچانک میں نے کار کے آنے کی آواز سنی۔ میں نے سوچا کہ یہ ڈاکٹر مینگلے ہی ہوگا۔ جرمن فوجی اس کی آمد کے منتظر تھے۔ میں نے پھر بھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ پھر میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ تھوڑی دیر بعد کسی فوجی نے بلند آواز میں کہا "ڈاکٹر، کھڑے ہوجائیں" ہم چاروں اٹھے اور اٹینشن حالت میں کھڑے ہوکر اپنی قسمت کے بارے میں فیصلہ سننے کا انتظار کرنے لگے۔ ڈاکٹر مینگلے نے ہم چاروں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میرا چہرہ اور لباس خون اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ اسی حالت میں، میں ڈاکٹر مینگلے کے سامنے گیا۔ اس کے پہلو میں تین فوجی بھی کھڑے تھے۔ ڈاکٹر مینگلے نے سوال کیا "اس ہنگامے میں تم لوگوں نے کیا کردار ادا کیا تھا؟"

"ہم اس ہنگامے میں شامل نہیں تھے" میں نے جواب دیا "ہم روسی افسر کی لاش کا پوسٹ مارٹم کررہے تھے کہ یہ ہنگامہ شروع ہوگیا۔ دھماکے کی وجہ سے پوسٹ مارٹم میں خلل پڑگیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی نامکمل حالت میں ابھی تک ٹائپ رائٹر میں موجود ہے۔ ہم اس تمام ہنگامے کے دوران میں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں ہی موجود رہے تھے، پھر یہ حضرات ہمیں پکڑ کر یہاں لے آئے۔"

جرمن فوجی کمانڈر نے میرے بیان کی تصدیق کی اور ڈاکٹر مینگلے نے گہری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا "جاؤ، منہ ہاتھ دھوکر اپنے کام میں لگ جاؤ۔"

میں اپنے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی ہم بیس قدم ہی گئے ہوں گے کہ ہم نے مشین گنوں سے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ باقی تمام خصوصی کمانڈوز زندگی کی قید سے آزاد کردیے گئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اپنے قدموں کی رفتار تیز کردی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا اور بستر پر گر پڑا۔ اس وقت اپنے تمام جسم سے ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔

اس قدر کچھ ہوگیا تھا لیکن ابھی تک صرف تین ہی بجے تھے۔ میں زندہ تھا لیکن اپنے زندہ بچ جانے پر نہ مجھے خوشی تھی نہ افسوس۔ میں جانتا تھا کہ مجھے زندگی کی جو مہلت ملی ہے وہ عارضی ہے' کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔ مجھے ڈاکٹر مینگلے اور ایس ایس گارڈز کی ذہنیت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ میں اگر زندہ تھا تو محض اس لیے کہ ڈاکٹر مینگلے کو اپنے کام کے لیے میری ضرورت تھی۔ میں اس کیمپ میں واحد ایسا ڈاکٹر تھا جو ڈاکٹر مینگلے کی ضروریات پوری کرسکتا تھا۔

جب میرے اعصاب قدرے پُرسکون ہوگئے تو میں نے بستر چھوڑ دیا۔ میں اپنے ایک خاص مشن پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر کیمپ میں یہ ہنگامہ کیسے شروع ہوا تھا' کیا ہم سے کسی نے غداری کی تھی اور کیا جرمن فوجیوں نے خصوصی کمانڈوز کی اس بغاوت کو مکمل طور پر کچل دیا تھا۔ میں بھٹیوں کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں میرے ساتھیوں' خصوصی کمانڈوز کی برہنہ لاشیں پڑی تھیں۔ وہ سب اس عقوبتی کیمپ کی جہنمی آزمائشوں سے چھٹکارا پاگئے تھے۔ ان کی لاشوں کو ٹھیلیوں پر لاد کر یہاں لایا گیا تھا۔ ان میں اُن لوگوں کی بھی لاشیں تھیں جو لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں گولیوں سے موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے اور وہ بھی جو اس کیمپ سے فرار ہوتے ہوئے باہر کہیں نہ کہیں مارے گئے تھے۔ بہرحال اس بغاوت کو پوری طرح کچل دیا گیا تھا اور لاش بھٹیوں کے کارخانہ دوم' سوم اور چہارم سے لاشیں جمع کرکے یہاں لائی گئی تھیں۔ اب یہاں ان لاشوں کو بھٹیوں میں جھونکنے کے کام میں تیس نئے خصوصی کمانڈوز کام کررہے تھے' جنہیں نہایت عجلت میں فوری طور پر بھرتی کیا گیا تھا۔

میں ایک ایس ایس افسر کے پاس کھڑا تھا۔ وہ لاشوں کے ہاتھوں پر گدے ہوئے نمبروں کو ریکارڈ کررہا تھا۔ میرے پوچھے بغیر اس نے بتایا کہ ۲۳ خصوصی کمانڈوز لاپتا ہیں۔ ان کے علاوہ سات کے سوا باقی تمام خصوصی کمانڈوز مارے جاچکے ہیں۔ زندہ بچنے والے سات خصوصی کمانڈوز میں ہم چار ڈاکٹرز بھی شامل تھے۔ ہمارے علاوہ ڈانسمو اور ہوا دانوں کا انچارج' ہیڈ شوفر اور ہرفن مولا قسم کا شخص چیپل زندہ بچنے والوں میں سے تھے۔ اسی چیپل نے مجھے تمام واقعات جس طرح وہ پیش آئے' بتائے تھے۔ چیپل نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں ہے۔

"دو بجے کے قریب' لاش بھٹی کے کارخانہ سوم میں ایس ایس فوجیوں کا ایک ٹرک آیا تھا۔ اس دستے کے کمانڈر نے خصوصی کمانڈوز کو احاطے میں جمع ہونے کا حکم دیا لیکن کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے حرکت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ شاید ایس ایس کمانڈر کو ہمارے منصوبے کی بھنک مل گئی تھی۔ بہرحال اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اگر وہ خصوصی کمانڈوز کے سامنے کوئی جھوٹی کہانی گھڑ کر ان کا اعتماد حاصل کرلے تو اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ اس لیے اس نے احاطے کے وسط میں کھڑے ہوکر ایک مختصر سی تقریر کی۔ ایسی تقریر جو صرف کوئی ایس ایس کمانڈر ہی کرسکتا تھا" اس نے کہا۔

"لوگو! تم نے یہاں بہت دنوں کام کیا ہے۔ اب اعلیٰ حکام کی ہدایت پر تمہیں ایک قافلے کی شکل میں یہاں سے ریسٹ کیمپ بھیجا جارہا ہے۔ وہاں تم لوگوں کو اچھا لباس ملے گا اور کھانے کو بھی خوب ہوگا۔ تمہاری زندگی بہت آرام سے گزرے گی۔ اب میں جن لوگوں کے نمبر پکار رہا ہوں وہ آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہوتے چلے جائیں۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے قیدیوں کے نمبر پکارنا شروع کردیئے۔ سب سے پہلے اس نے ہنگری سے تعلق رکھنے والے خصوصی کمانڈوز کے نام پکارے۔ ان کی تعداد ایک سو تھی۔ یہ لوگ آش وٹز کیمپ میں نئے نئے آئے تھے اس لیے وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہوگئے۔ ان کی آنکھوں سے جرأت اور ہمت کے بجائے خوف جھانک رہا تھا۔ ایس ایس گارڈز کے ایک دستے نے آگے بڑھ کر انہیں اپنی تحویل میں لیا اور ڈی کیمپ کی بیرک نمبر ۳ میں لے جاکر بند کردیا۔

دوسری طرف لاش بھٹی کے کارخانہ سوم میں قیدیوں کے نمبر پکارے جاتے رہے۔ اب یونانی قیدیوں کی باری تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر قطار میں کھڑے ہونے کے لیے تیار نہ تھا کافی ردّوکد کے بعد وہ بہرحال قطار میں لگ گئے۔ اس کے بعد پولینڈ کے قیدیوں کی باری آئی۔ وہ بھی قطار بنانے کے لیے تیار نہ تھے' ساتھ ہی انہوں نے دبی دبی زبان سے احتجاج کرنا اور گالیاں دینی شروع کردیں۔ جرمن فوجی نمبر پکارتا رہا لیکن کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

اچانک سنل وائز کی ایک بوتل اس جرمن افسر کے قدموں میں جا گری اور ایک دھماکے سے پھٹ گئی۔ دھماکے سے سات ایس ایس جرمن فوجی اڑ گئے۔ وہ یا تو مر گئے تھے یا شدید زخمی تھے۔ مرنے والوں میں ایس ایس جرمن فوجیوں کے گروپ کا کمانڈر بھی شامل تھا۔ وہ دھماکا خیز بوتل پولینڈ کے ایک قیدی نے پھینکی تھی۔ باقی ایس ایس فوجیوں نے باغیوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ قیدیوں نے پسپا ہو کر لاش بھٹی کی عمارت میں پوزیشنیں سنبھال لیں اور وہاں سے انہوں نے دھماکا خیز مادے سے بھری ہوئی بوتلیں ایس ایس جرمن فوجیوں پر پھینکنا شروع کر دیں۔ جواباً ایس ایس فوجیوں نے احاطے میں قطار بنائے ہوئے یونانی قیدیوں کو بھون ڈالا۔ وہ سب کے سب وہیں مارے گئے۔ انہیں جان بچا کر بھاگنے کا موقع تک نہ مل سکا۔

ایس ایس جرمن فوجی فائرنگ کرتے، گولیاں برساتے ہوئے لاش بھٹی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ پولینڈ کے قیدی مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے سوا اب ان کے سامنے کوئی اور راہ بھی نہیں تھی۔ موت بہرحال ان کا مقدر تھی اس لیے وہ اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ جرمن فوجیوں کو لے کر مرنا چاہتے تھے۔ وہ دھماکا خیز بوتلوں سے حملے کر رہے تھے جس کی بنا پر جرمنوں کے لیے آگے بڑھنا محال تھا۔ اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ تمام علاقہ اس دھماکے سے لرز اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام حملہ آور جرمن فوجی کھیت ہو گئے جو لاش بھٹی کی دیواروں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ لاش بھٹی کی چھت اس دھماکے سے اڑ گئی، چھت کو سہارا دینے والے شہتیر، اینٹیں اور پتھر اڑ کر چاروں سمت دور دور تک جا گرے، دھوئیں اور شعلوں کے مرغولے آسمان کی طرف بلند ہونے لگے۔

گیسولین سے بھرے ہوئے چار ڈرم پھٹنے سے یہ دھماکا ہوا تھا جس سے لاش بھٹی کے کارخانۂ سوم کی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور اس کے اندر پناہ لیے ہوئے خصوصی کمانڈوز اس ملبے کے ڈھیر میں دب کر مر گئے تھے۔ جو دو چار کمانڈوز باقی بچے تھے انہوں نے خود کو جرمن فوجیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جرمن فوجیوں نے مشین گن سے فائرنگ کر کے اس جنگ کو جلد ہی ختم کر دیا۔ اسی دوران ہنگری کے تقریباً ایک سو قیدی احاطے میں جا کھڑے ہوئے اور انہیں وہیں پر گولیوں سے اڑا دیا گیا۔

غرض لاش بھٹی کے کارخانۂ سوم میں اس طرح قیدیوں کی بغاوت کا آغاز ہوا جبکہ کارخانۂ اول میں معمول کے مطابق کام ہوتا رہا تا آنکہ کارخانۂ سوم دھماکے سے نہ اڑ گیا۔ دھماکے کی آواز سے کارخانۂ اول میں سراسیمگی پھیل گئی۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ گھبرا کر بھٹیوں پر کام کرنے والے کمانڈوز نے کام چھوڑ دیا اور کمرے کے ایک کونے میں جمع ہو گئے اور مشورہ کرنے لگے کہ اس صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ایک ایس ایس گارڈ وہاں پہنچا اور اس نے نہایت سخت لہجے میں کمانڈوز سے دریافت کیا کہ کس کی اجازت سے انہوں نے کام چھوڑا ہے۔ کمانڈوز کے انچارج نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن ایس ایس گارڈ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے اپنی چھڑی کے مڑے ہوئے سرے سے انچارج کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ اس قسم کی بھاری اور موٹی چھڑی ہر ایس ایس گارڈ کے پاس ہوتی تھی۔ خصوصی کمانڈوز میں یہ بات پہلے سے پھیلی ہوئی تھی کہ اسی ایس ایس گارڈ نے اسی چھڑی سے پہلے بھی ایک کمانڈو کے سر پر اس قدر زور سے ضرب لگائی تھی کہ اس کمانڈو کا سر پھٹ گیا تھا اور اس نے موقعے پر ہی گر کر دم توڑ دیا تھا۔ تاہم کمانڈوز کا موجودہ انچارج بہت صحت مند اور طاقت ور تھا، وہ اس ضرب سے لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ خون سے تر بہ تر تھا لیکن وہ اب بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے بوٹ میں اڑسا ہوا چاقو نکالا اور پلک جھپکتے میں یہ چاقو اس جرمن گارڈ کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ جرمن گارڈ لڑکھڑا کر گرا۔ دو دیگر کمانڈوز نے اس گارڈ کو اٹھایا اور ایک بھٹی کا منہ کھول کر گارڈ کو بھٹی میں پھینک دیا۔

اگرچہ یہ واقعہ چند سیکنڈ میں پیش آیا تھا لیکن شور و غل سن کر ایک اور ایس ایس گارڈ وہاں آ گیا اور اس نے اپنے ساتھی کو دہکتی ہوئی بھٹی میں گرتے دیکھ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے واپس ہوتا، خصوصی کمانڈوز نے اس کو بھی گرا لیا اور قابو میں کر کے بھٹی میں جھونک دیا۔ اس کے بعد خصوصی کمانڈوز نے مشین گنیں، دستی بم اور ڈائنامائٹ کے بکس نکال لیے۔ ایس ایس گارڈز اور خصوصی کمانڈوز کے درمیان فائرنگ شروع ہو گئی۔ کسی کمانڈو نے ایس ایس گارڈ کی طرف ایک دستی بم پھینکا۔ سات جرمن ہلاک یا زخمی ہوئے۔ دوسری طرف کئی کمانڈوز بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن اگلے لمحے میں جب چند ایس ایس گارڈز اور کام آ گئے تو سارے گارڈز جن کی تعداد ۲۰ تھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب وہ گیٹ پر پہنچے تو ایس ایس گارڈز کی کمک آ گئی۔ ان سب،

ے چٹ کر حملہ کیا اور پانسا پلٹ گیا۔

اب اس لاش بھٹی کے کارخانے میں ہم صرف سات خصوصی کمانڈوز باقی بچے تھے۔ ۲ وہ خصوصی کمانڈوز بھی رات کو پکڑ لیے گئے جو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ دریائے وچولا پار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور بے حد تھک گئے تھے اس لیے انہوں نے ایک گھر میں پناہ لے لی تھی لیکن گھر کے مالک نے علاقے کو چھاننے والی ایس ایس فوجیوں کی ایک کمپنی کو اطلاع دے دی اور انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا' ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ مشین گن کے فائر سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ بعد دو ایس ایس گارڈ لڑکھڑاتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے' ان کے چہرے خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ جو ایس ایس گارڈ' مفرور قیدیوں کو گرفتار کرکے لائے تھے' انہوں نے لاش بھٹی کے کارخانۂ اول کے احاطے میں پہنچتے ہی ان گارڈز پر حملہ کردیا تھا۔ انہوں نے گارڈز کا اسلحہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ سب اگرچہ مارے گئے تھے لیکن مرنے سے پہلے وہ تمام گارڈز کے چہرے بگاڑ گئے تھے۔ میں نے خاموشی سے آنے والے گارڈز کے زخمی چہروں کی مرہم پٹی کردی۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ اپنے ان آخری مفرور ساتھیوں کی گرفتاری اور موت پر ہوا تھا۔ اس قدر کوشش کے باوجود' اتنی جانوں کے ضائع ہونے کے باوجود ہم میں سے ایک بھی شخص وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ ایک بھی شخص اگر وہاں سے فرار ہوجاتا تو دنیا کو کم از کم اس جہنم زار قید خانے کے حقائق کے بارے میں علم تو ہوجاتا۔

بہرحال قیدیوں کی یہ بغاوت آش وٹز کے اس عقوبت خانے کے قیام کے بعد سے اس وقت تک ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اس بغاوت میں ۸۵۳ قیدی اور ۷۰ ایس ایس جرمن گارڈز ہلاک ہوئے تھے۔ لاش بھٹی کا کارخانۂ سوم پورے طور پر جل کر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکا تھا اور کارخانۂ چہارم کا ساز و سامان اور اس کا تمام نظام اس بری طرح متاثر ہوا تھا کہ وہاں مظلوموں کو گیس سے ہلاک کرکے ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے کا کام نہیں ہوسکتا تھا۔

O☆O

چند دن بعد ہی لاش بھٹیوں کے دونوں کارخانوں میں زندگی پھر معمول پر آگئی۔ خصوصی کمانڈوز کے بارہویں گروپ کے خاتمے کے بعد نئے گروپ نے جگہ لے لی تھی۔

بارہویں گروپ کے ہم سات افراد ابھی تک زندہ تھے اور موت کا انتظار کررہے تھے۔ روسی جنگی قیدی کے پوسٹ مارٹم کے بعد ہمارے پاس کوئی لاش نہیں بھیجی گئی تھی اس لئے میں نے اپنے نائبین کو مصروف رکھنے کے لئے آلاتِ جراحی کی صفائی اور پوسٹ مارٹم کے کمرے کو درست کرنے اور صاف کرنے پر مامور کردیا تھا لیکن یہ کام بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔ ہم ہر روز مقررہ وقت پر وہاں جاتے اور مقررہ وقت پر وہاں سے واپس آجاتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مینگلے بھی اس دن کے بعد سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ روسی جنگی قیدی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی لینے کے لئے نہیں آیا تھا۔

ان خالی دنوں میں ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے بس سوچتے رہتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ میرے ساتھی کیا سوچتے تھے ' مجھے معلوم نہیں تھا۔ اپنے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ میرے خیالات منتشر تھے۔ ایک لمحے میں ماضی کا کوئی واقعہ یاد آجاتا' پھر مجھے اپنی بیوی اور بچی کا خیال آتا کہ نہ معلوم وہ کس حالت میں ہوں گی' اس کے بعد اچانک اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوتا' ۱۱ویں گروپ کے مرنے والے ان کمانڈوز کی یاد آتی جن سے میرے گہرے مراسم پیدا ہوگئے تھے اور وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ کبھی لاش بھٹیوں کے کارخانے کے نظام کے بارے میں' میں سوچا کرتا۔ غرض خیالات کی رو تھی جو پل پل اور لمحہ لمحہ ایک یاد سے دوسری یاد کی طرف' ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف بھٹکتی رہتی تھی۔

کبھی کبھی مجھے اپنے اوپر بھی غصہ آتا تھا کہ میں نے کیوں اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو آش وٹز کے اس شیطان ڈاکٹر کے حوالے کردیا تھا' جس میں انسانیت کی کوئی رمق نہیں تھی۔ جو انسان کی کوئی توقیر نہیں کرتا تھا' جو تازہ تازہ قتل کئے جانے والے انسانوں کی لاشوں کی چیر پھاڑ مجھ سے کراتا تھا اور جن کا گوشت کھاد کے طور پر کھیتی باڑی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور جن کے گوشت کو بجلی کے انکیوبیٹرز میں رکھ کر بیکٹیریا کی افزائش کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے اس بات پر فخر کرتا تھا کہ جرمن حکومت نے اسے اس کیمپ کی خونی دیواروں کے اندر بیک وقت دو' تین اور تین سے زائد بچوں کی پیدائش کے اسباب کی تحقیق پر مامور کیا تھا اور وہ اسی تحقیق کے لیے گھنٹوں خوردبین سے آنکھ لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ نسلی برتری کے فلسفے کے سحر میں گرفتار جرمن حکومت اس تحقیق کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ وہ ایک سے زائد بچوں کی پیدائش کا راز معلوم کرکے کوئی ایسا قیمی

فارمولا ایجاد کرنا چاہتے تھے جس کو استعمال کر کے خالص جرمن آریائی نسل میں تیزی سے اضافہ کیا جاسکے۔ ڈاکٹر مینگلے اس راز کو دریافت کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے آش وتز کا یہ عقوبتی کیمپ نہایت مناسب جگہ تھی جہاں اسے اپنے شیطانی تجربات اور ابلیسی تحقیق کے لیے ضروری انسانی نمونے مطلوبہ تعداد میں دستیاب تھے اور انہیں ان انسانوں کو اپنے تجربات کے لیے قتل کرنے کے مکمل اختیارات بھی حاصل تھے۔

قیدیوں کی بغاوت کے بعد اس دن جب ڈاکٹر مینگلے پہلی مرتبہ پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا تو وہ بہت تھکا ماندہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھا وہاں آیا تھا۔ اس روز بھی یہودی قیدیوں سے بھری ہوئی ایک ٹرین اسٹیشن پہنچی تھی۔ یہ قیدی ریگا کے یہودی باڑے سے لائے گئے تھے۔ یہ قیدی ٹرین سے اترے اور چھنٹائی کے لیے قطاروں میں کھڑے کردیئے گئے۔ اس دن ڈاکٹر مینگلے نے ہر ہر قیدی کو بائیں ہاتھ کی طرف جانے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ اشارہ ان کے لیے سزائے موت کا حکم تھا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے وہ پلیٹ فارم پر کئی گھنٹے بارش میں کھڑا رہا تھا۔ ان دنوں لاش بھٹیوں کے دونوں کارخانے اپنی پوری گنجائش کے مطابق صبح سے شام تک کام کررہے تھے۔ اب بھٹیوں میں جلانے کے لیے زندہ انسانوں کی نئی کھیپ آگئی تھی اس لیے کام کو تیزی سے مکمل کرنے کے لیے خصوصی کمانڈوز کی تعداد بڑھا کر ۸۶۰ کردی گئی تھی۔

ڈاکٹر مینگلے اپنا کوٹ اور ٹوپی اتارے بغیر ہی پوسٹ مارٹم کی ٹیبل کے پاس آکھڑا ہوا جو بارش سے بری طرح بھیگ گئے تھے۔ لیکن ڈاکٹر مینگلے کو جیسے اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا "کیپٹن اپنی ٹوپی اور کوٹ مجھے دے دیجئے" میں بھٹیوں کے کمرے میں لے جاکر انہیں خشک کرکے لے آتا ہوں۔ وہاں یہ پانچ منٹ میں بالکل سوکھ جائیں گے۔"

ڈاکٹر مینگلے نے جواب دیا "فکر نہ کرو، پانی میری جلد کے نیچے تو نہیں جاسکتا" اس کے بعد اس نے روسی جنگی قیدی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ طلب کی۔ میں نے وہ رپورٹ ڈاکٹر مینگلے کے حوالے کردی اور اس نے رپورٹ پڑھنا شروع کردی۔ شاید تین چار سطر پڑھنے کے بعد ہی اس نے رپورٹ واپس مجھے دے کر کہا "میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تم یہ رپورٹ پڑھ کر سناؤ۔"

میں نے چند لائنیں ہی پڑھی تھیں کہ اس نے مجھے خاموش کردیا "چھوڑو، اسے جانے دو۔ اب شاید اس کی ضرورت نہ ہو" یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے پار خالی نظروں سے خلا میں گھورنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس شخص کو کیا ہوگیا ہے۔ کیا یہ بھی آش وتز کی ہولناکیوں سے متاثر ہوگیا تھا لیکن یہ شخص ایسا نہیں تھا۔ اسے تو انسانوں کو بہیمانہ انداز میں قتل کرنے اور ان کی لاشوں کو اپنے تجربے کی بنیاد بناکر لطف آتا تھا۔ وہ تو آدم خور تھا۔ اس وقت موقع مناسب جان کر میں نے آخر اس سے کہہ ہی دیا۔

"کیپٹن، آخر اس تمام تباہی کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور بڑے عجیب سے انداز اور لہجے میں کہا "میرے دوست، یہ تباہی تو بس یونہی جاری رہے گی۔ جاری رہے گی" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے واپس ہوا، دروازے کے قریب پلٹ کر اس نے کہا "فکر نہ کرو ڈاکٹر اگلے چند روز کے اندر تمہارے پاس بہت دلچسپ کام آنے والا ہے۔"

میں اپنی جگہ کپکپاکر رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے پھر جڑواں افراد کی لاشیں میرے پاس پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔



ان دنوں پھر لاش بھٹیوں کے کارخانوں میں بڑی سرگرمی تھی۔ نئی لاشوں کو جلانے کے لیے بھٹیاں تیار کی جارہی تھیں۔ خصوصی کمانڈوز بھٹیوں کی صفائی کررہے تھے، ان کے بھاری دروازوں کے قبضوں میں تیل دے رہے تھے، ان پر پینٹ کررہے تھے، ڈائنمو اور ہوادان دن دن بھر چلتے رہتے تھے۔ ماہرین ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے اور ان بھٹیوں کی کارکردگی کو بے نقص بنانے میں مصروف تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ اعلان کردیا گیا تھا کہ "لٹزمان اسٹاڈٹ" کے یہودی باڑے سے انسانوں کی تازہ کھیپ ان بھٹیوں میں جلانے کے لیے آنے والی تھی۔

لٹزمان اسٹاڈٹ کا یہودی باڑہ جرمنوں نے ۱۹۳۹ء میں قائم کیا تھا۔ ابتدا میں اس باڑے میں ۵ لاکھ افراد تھے۔ یہ لوگ جرمنی کی ان بڑی بڑی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے جو شب و روز جنگی سازو سامان تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ اپنی محنت کے عوض انہیں ان باڑوں کے لیے خاص طور پر جاری کی جانے والی کرنسی میں اجرت ادا کی جاتی تھی۔ یہ اجرت اس قدر ناکافی ہوتی تھی کہ اس سے وہ پیٹ بھر کر کھانے کے لیے اشیاء بھی خرید نہ سکتے تھے۔ سخت محنت اور کم ہی نہیں بلکہ ناقص غذا کے نتیجے میں اس یہودی باڑے میں شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ وہ مختلف قسم کی بیماریوں

میں مبتلا ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۳ء کے موسم سرما میں اس یہودی باڑے کی آبادی صرف ۷۰ ہزار نفوس پر مشتمل رہ گئی۔ اور اب ان ستر ہزار افراد کا بھی آخری وقت آگیا تھا۔

وہاں سے ان بدقسمت افراد کی آمد دس ہزار افراد کے گروپوں کی صورت میں شروع ہوئی تھی۔ ان آنے والوں میں سے ۹۵ فی صد افراد بائیں طرف بھیج دیے جاتے تھے جو ان کی فوری موت کی راہ تھی۔ صرف ۵ فی صد افراد کو دائیں طرف بھیجا جاتا تھا۔ موت ان کا بھی مقدر تھی لیکن فوری طور پر نہیں، کچھ عرصے بعد۔

یہودی باڑے میں پانچ برس کی اذیت ناک زندگی گزارنے کے بعد جسمانی اور اخلاقی طور پر وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ مسلسل محنت اور ناقص غذا نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ انہیں اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ جرمنی میں ان کی نسل کو لعنتی قرار دے کر دنیا ہی میں واصل جہنم قرار دینے کا فیصلہ کردیا گیا تھا۔ اب جبکہ وہ یہودی باڑے سے آش وٹز پہنچے تھے، انہیں یقین تھا کہ وہ یہاں قتل گاہ میں آئے ہیں پھر بھی وہ جیسے اپنے انجام سے بالکل بے پروا تھے۔ ان میں زندہ رہنے کی ذرا سی بھی خواہش نہیں تھی۔

ان لوگوں میں سے جب ایک کبڑا شخص گزرا تو وہ ڈاکٹر مینگلے کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کبڑے شخص کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ تھی اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۵ برس کا ایک دبلا پتلا، طویل قامت اور خوش شکل نوجوان بھی تھا۔ البتہ اس میں ایک جسمانی نقص تھا۔ اس کی ایک ٹانگ خراب تھی۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے اس کی ٹانگ پر فولاد کی ایک پٹی باندھ دی گئی تھی اور اس کے لیے خاص طور پر موٹے تلے کا جوتا بنایا گیا تھا جو اس کے پیر میں تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹے تھے۔ ڈاکٹر مینگلے نے سوچا کہ ان باپ بیٹوں کی صورت میں اسے اپنا یہ نظریہ ثابت کرنے کے لیے ایک ٹھوس ثبوت مل گیا ہے کہ یہودی ایک ناقص نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے باپ بیٹے، دونوں کو علیحدہ کھڑا کردیا اور اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا، پھر انہیں ایس ایس گارڈز کے حوالے کردیا کہ انہیں لاش بھٹی کے کارخانۂ اول میں پہنچادیا جائے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ اس روز کارخانۂ اول میں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ ایک ایس ایس گارڈ میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجھے گیٹ پر طلب کیا گیا ہے۔ باپ بیٹے گیٹ پر موجود تھے۔ میرے نام ڈاکٹر مینگلے کا پیغام تھا "یہ دونوں افراد بھیجے جارہے ہیں۔ ان کا طبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ ان کے جسم اور ہاتھ پیروں کی پیمائش احتیاط سے ہونی چاہیے۔ رپورٹ میں ان کے بارے میں تمام ضروری اور دلچسپ معلومات درج ہونی چاہئیں۔ خاص طور پر ان وجوہ کا تعین کیا جانا چاہیے جن کی بنا پر ان میں مختلف جسمانی نقائص پیدا ہوئے ہیں۔"

دوسرا پیغام مسفیلڈ کے لیے تھا۔ میں اس کو پڑھے بغیر ہی اس کے مضمون سے واقف ہوچکا تھا۔ میں نے ایس ایس گارڈ سے کہا کہ وہ یہ پیغام مسفیلڈ کو پہنچادے۔

یہودی باڑے میں ۵ برس کا اذیت ناک عرصہ گزارنے کے بعد انسان کی کیا حالت ہوجاتی ہے، ان باپ بیٹے کی حالت اور ان کے چہرے کی بے رونقی اس کا ثبوت تھی۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھے، سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں انہیں صحن میں لے آیا جس میں اس وقت دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں انہیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں لے آیا، انہیں... دلاسا دیتا رہا۔ شکر ہے کہ اس وقت کمرے میں کوئی لاش نہیں تھی۔

معلوم ہوا کہ باپ لٹزمان اسٹاؤٹ کا ایک باعزت شہری تھا، کپڑے کا بیوپار کرتا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان امن کا جو عرصہ گزرا تھا، اس میں وہ اپنے بیٹے کو اکثر طبی معائنے اور علاج کے لیے ویانا لے جایا کرتا تھا جہاں اپنے وقت کے بہترین معالج اور ماہرین تھے۔ میں نے سب سے پہلے باپ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ کسی ضروری تفصیل کو نظرانداز نہیں کیا۔ سب سے زیادہ توجہ اس کو ریڑھ کی ہڈی پر دی۔ معائنے سے معلوم ہوا کہ اس کے کبھ کا سبب ریڑھ کی ہڈیوں کے مہروں کا نقص تھا۔ میں نے اس کا نہایت توجہ سے معائنہ کیا تھا اس کے باوجود اس میں کسی اور بیماری یا مرض کی علامات میں دریافت نہیں کرسکا تھا۔ اس دوران میں یہ تسلی بھی دیتا رہا کہ اسے شاید کسی ورک کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔

لڑکے کا معائنہ کرنے سے قبل میں نے اس سے طویل گفتگو کی۔ وہ بہت خوش شکل بھی تھا اور ذہین بھی لیکن ۵ برس کی اذیت ناک زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کا اعتماد بری طرح مجروح ہوگیا تھا۔ خوف اور دہشت سے کپکپاتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں ان اذیتوں اور غیر انسانی مشقتوں اور جانوروں جیسی زندگی کی تفصیلات بیان کیں جو اس نے یہودی باڑے میں برداشت کی تھیں۔ اس باڑے میں اس کی

ماں مرگئی تھی کیونکہ اس نے کئی ہفتے تک محض اس لیے کچھ نہیں کھایا تھا کہ اس طرح وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو چند نوالے زیادہ کھانے کے لیے دے سکتی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ پہلے ہی برس میں اپنے شوہر اور بچے کی زندگی کو طول دینے کے لیے خود لقمۂ اجل بن گئی تھی۔

اور اب وہ دونوں باپ بیٹے "لاش بھٹیوں کے کارخانۂ اول میں تھے۔ میں قسمت کی اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں نوحہ کناں تھا۔ میں ایک یہودی ڈاکٹر تھا اور اپنے ان ہم مذہب افراد کی موت سے قبل طبی اور نظام الاعضاء کے نقطۂ نظر سے ان کا تفصیلی معائنہ کررہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس معائنے کے بعد انہیں قتل کردیا جائے گا اور ان کی لاشیں میرے پاس چیر پھاڑ کے لیے آئیں گی لیکن میں یہ فرائض انجام دینے پر مجبور تھا۔ میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ آخر یہ سب کیوں تھا، کیا سبب تھا کہ ہماری نسل پر یہ عذاب پے درپے نازل ہورہے تھے، وہ کیا گناہ تھے جس کی سزا یوں ہمیں دی جارہی تھی۔ یہ مشیت ایزدی تو ہرگز نہیں ہوسکتی۔ یزداں اتنا ظالم تو نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ سب کیا تھا؟ پہلی مرتبہ یہ سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ پہلی مرتبہ۔۔۔ ہاں غالباً پہلی مرتبہ میں پاگل پن کی حد پر آپہنچا تھا۔

میں نے خود پر بدقت تمام قابو پایا اور اس ۱۵ سالہ نوجوان کا معائنہ شروع کیا۔ اس کے بائیں پیر کے نقص کا سبب یہ تھا کہ اس کی پنڈلی کی ایک "مچھلی" یا بونگ کم تھی۔ ماہر ہاتھوں نے اس کی ٹانگ کے کئی آپریشن کیے تھے جس کے نشانات موجود تھے۔ ان آپریشنوں کے نتیجے میں اس کی ٹانگ چھوٹی ہوگئی تھی تاہم پنڈلی پر پٹی باندھ کر اور اس پر خصوصی موزے چڑھانے کے بعد وہ چل پھر سکتا تھا۔

معائنے کے بعد میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ وہ کچھ کھانا پسند کریں گے تو انہوں نے بتایا کہ کئی وقت سے ایک کھیل بھی اڑ کر ان کے منہ میں نہیں گئی ہے۔ میں نے ایک خصوصی کمانڈو سے کہا کہ ان کے لیے کھانا لے کر آئے۔ گوشت اور نوڈلز کی دو پلیٹیں لائی گئیں۔ یہ وہ خوراک تھی جو ان دنوں باہر ملنا محال تھی۔ دونوں باپ بیٹے مر بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ان کی زندگی کا آخری طعام ہے۔

کوئی نصف گھنٹے بعد ہی ڈاکٹر مسفیلڈ، چار خصوصی کمانڈوز کے ساتھ وہاں آدھمکا اور ان دونوں کو بھٹیوں والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں معمول کے مطابق ان کے کپڑے اتروائے گئے۔ اس کے بعد مسفیلڈ کا ریوالور دو مرتبہ چلا، دونوں باپ بیٹے مرگئے۔ ان کی لاشیں سیمنٹ کے فرش پر پڑی تھیں، خون میں لت پت۔ ڈاکٹر مسفیلڈ نے نہایت فرمانبرداری سے ڈاکٹر مینگلے کے احکام کی تعمیل کی تھی۔

اور اب پھر میری باری تھی۔ ان دونوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں پہنچادی گئیں۔ دونوں لاشیں ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں اب بھی گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں اس تمام واقعے سے ذہنی طور پر شدید نڈھال تھا۔ ان لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ یہ کام میں نے اپنے نائبین پر چھوڑ دیا اور خود صرف مختلف تفصیلات نوٹ کرتا رہا۔ اس پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں اس سے زیادہ کوئی نئی بات سامنے نہ آسکی جس کا میں پہلے ہی ان کی زندگی میں ان کے طبی معائنے میں چلا چکا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے جسمانی نقائص میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایسے نقص ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نازی ان باپ بیٹوں کی مثال کو یہودیوں کے خلاف اپنے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔ وہ یہودیوں کو کم تر درجے کی انسانی نسل قرار دے سکتے تھے۔

اس روز ڈاکٹر مینگلے کم وبیش دس ہزار افراد کو زہریلی گیس سے ہلاک کرکے اور انہیں لاش بھٹیوں میں جلا کر سہ پہر کے وقت پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا اور بہت غور سے اس نے دونوں باپ بیٹوں کے بارے میں میری ان دو رپورٹوں کا مطالعہ کیا جو ان کی موت سے پہلے اور موت کے بعد تیار کی گئی تھیں۔ رپورٹیں پڑھنے کے بعد ڈاکٹر مینگلے نے کہا "ان لاشوں کو جلایا نہیں جائے گا۔ ان کے ہڈیوں کے ڈھانچے برلن کی اینتھروپولوجیکل میوزیم کو بھیجے جائیں گے۔ ڈاکٹر، ان کے ہڈیوں کے ڈھانچے تیار کرنے کے کیا طریقے ہیں؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"دو طریقے ہیں جناب" میں نے کہا "پہلا یہ کہ لاشوں کو لائم کلورائڈ میں ڈال دیا جائے۔ اس طرح دو ہفتے کے اندر گوشت گل سڑ کر ہڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد ڈھانچے کو گیسولین سے غسل دیا جاتا ہے، جس سے تمام چکنائی صاف ہوجاتی ہے اور ڈھانچا خشک ہوجاتا ہے، ہڈیاں سفید ہوجاتی ہیں اور ان کی بو بھی ختم ہوجاتی ہے۔"

میں سانس لینے کو رکا ہی تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے دریافت کیا "اور دوسرا طریقہ؟"

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان لاشوں کو پانی میں ڈال کر ابالا جائے اور اس حد تک ابالا جائے کہ گوشت آسانی سے

...سے جدا کیا جا سکے۔ اس کے بعد انہیں گیسولین سے غسل دے دیا جائے" میرا جواب تھا۔

"تو پھر ڈھانچے تیار کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے" ڈاکٹر مینگلے یہ حکم دے کر چلتا بنا۔

آش وٹز میں احکام دے دیے جاتے تھے۔ قیدیوں کو یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ ان احکام کی تعمیل کے لیے ضروری سامان وہ کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں۔ قیدیوں کو بس ہر قیمت پر احکام کی تعمیل کرنا ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک نہایت سنگین اور اہم مسئلے کا سامنا تھا۔ آخر میں ان دونوں لاشوں کو کس چیز میں ابالوں؟ میں نے یہ مسئلہ ڈاکٹر مسفیلڈ کے سامنے رکھا کہ مجھے دو لاشوں کو ابالنے کے لیے کسی بڑے برتن کی ضرورت ہے۔ اس تصور سے وہ بھی لمحے بھر کے لیے دہشت زدہ ہوگیا تھا لیکن بس یہ لمحاتی تاثر تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کہا "صحن میں لوہے کے دو بڑے ٹب پڑے ہیں۔ عام طور پر یہ ٹب اسٹور ہاؤس والوں کے استعمال میں رہتے ہیں لیکن میں انہیں استعمال کرسکتا ہوں۔" ساتھ ہی اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان دونوں ٹبوں کو کھلے صحن میں اینٹوں کے عارضی چولہے بنا کر ان پر رکھ دوں اور ان کے نیچے آگ جلا کر اپنا کام کروں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ خصوصی کمانڈوز کو آگ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے پر لگا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں لکڑیاں جمع ہوگئیں' اس دوران میں ٹبوں میں پانی بھر کر ان میں لاشیں ڈال کر ٹبوں کو چولہوں پر چڑھایا جاچکا تھا۔ لکڑیاں جمع ہوگئیں تو ان ٹبوں کے نیچے آگ جلا دی گئی۔ چند خصوصی کمانڈوز کو آگ جلائے رکھنے پر مامور کردیا گیا۔ چند گھنٹے بعد میں نے لاشوں کو ٹیسٹ کیا۔ گوشت اب آسانی سے ہڈیوں سے جدا ہوسکتا تھا۔ میں نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا لیکن ٹب چولہوں پر ہی رہنے دیے کیونکہ اب انہیں ٹھنڈا بھی تو ہونا تھا۔

میرے پاس اب کوئی کام نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں بہت خاموش تھا۔ میرے وجود کے اندر بھی سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آش وٹز میں یہ سب سے ہولناک تجربہ تھا جس سے میں گزرا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ لاش بھٹیوں کو گرم کیا جارہا تھا۔ انسانوں کی نئی کھیپ کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی لاشوں کو جلانے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس مخصوص شور سے میرے کان بخوبی واقف تھے۔ شام کا دھندلکا تیزی سے اندھیارے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ ٹب جن میں لاشوں کو ابالا گیا تھا ٹھنڈے ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اب دوسرے مرحلے پر کام کرنا تھا۔

میں بستر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ میرا ایک معاون ہانپتا' کانپتا میرے پاس آیا۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "ڈاکٹر! جلدی کرو' پولینڈ کے قیدیوں نے لاشوں کا گوشت کھانا شروع کردیا ہے۔"

میں تو جیسے پاگل ہوگیا تھا۔ بھاگم بھاگ میں موقعے پر پہنچا۔ چار افراد' قیدیوں کی دھاری دار وردی پہنے لوہے کے ٹبوں کے قریب کھڑے تھے' ان کے چہروں پر عجیب وحشت برس رہی تھی۔ یہ چاروں پولینڈ کے تھے' پیشے کے اعتبار سے راج تھے۔ کام ختم کرنے کے بعد صحن میں آگئے تھے اور ان ایس ایس گارڈز کے منتظر تھے جو انہیں یہاں سے آش وٹز ون میں لے جانے والے تھے۔ بہت زیادہ بھوکے تھے۔ اتفاقاً ان ٹبوں کے پاس آنکلے۔ یہ سمجھے کہ شاید خصوصی کمانڈوز کے لیے گوشت پکایا جارہا ہے' انہوں نے موقع غنیمت جانا۔ وہ خصوصی کمانڈوز جو ان ٹبوں کی نگرانی پر مامور تھے' چند منٹ کے لیے وہاں سے جاچکے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی گوشت کھانا شروع کردیا۔ ابھی دو چار لقمے ہی حلق سے اترے تھے کہ ان ٹبوں کی نگرانی پر مامور محافظ وہاں آگئے۔ انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو شور مچادیا۔ پولینڈ کے وہ قیدی جو گوشت کھا رہے تھے' رک گئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ انسانی گوشت ہے تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔

ڈھانچے کو گیسولین سے غسل دینے کے بعد میرے معاونین نے تمام ہڈیاں نہایت احتیاط سے جمع کیں اور انہیں اس میز پر لاکر رکھ دیا جہاں ایک گزشتہ شام میں نے ان دونوں کا معائنہ کیا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے اس کارگزاری پر بے حد خوش تھا۔ وہ کئی افسروں کے ساتھ آیا تھا اور سب اس میز کے گرد کھڑے ہو کر موٹی موٹی طبی اصطلاحات کے حوالے سے اس طرح تبادلۂ خیال میں مصروف تھے جیسے انہوں نے طبی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی کوئی انوکھی بات دریافت کرلی ہو حالانکہ ان باپ بیٹوں کے جسمانی نقائص میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ دنیا کے ہر کونے میں ہر نسل اور ہر مذہب کے افراد میں ایسے نقائص پائے جاتے ہیں لیکن جرمنوں کو تو بس یہودیوں کی تذلیل کا کوئی بہانہ ہاتھ آنا چاہیے تھا پھر وہ تحقیر و تذلیل کے لیے ایسی ایسی سائنسی تاویلات پیش کرتے کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بہرحال پھر ان ڈھانچوں کو نہایت احتیاط سے مضبوط اور موٹے کاغذوں کے بڑے بڑے تھیلوں میں بند کرکے برلن

بھیج دیا گیا۔۔۔ ان تھیلوں پر موٹے موٹے حروف میں یہ الفاظ تحریر کیے گئے تھے۔ "ارجنٹ۔ قومی دفاع" ان ڈھانچوں کے وہاں سے جانے کے بعد میرے ذہن کو قدرے سکون ملا تھا۔

لٹزمان اسٹاؤٹ کے یہودی باڑے سے آنے والے یہودیوں کو بھٹیوں میں جلا کر راکھ کرنے کا عمل ایک ہفتے میں مکمل ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد خزاں کا موسم آگیا۔ آسمان پر ہر وقت بادل اور دھند چھائی رہتی۔ آش ونز کے اس عقوبت خانے کی بیرکوں پر ہر وقت کہر اور دھند کی چادر پھیلی رہتی۔ پھر بارشوں کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ٹھنڈ تھی کہ ہڈیوں کے گودے میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ میں جدھر بھی نکل جاتا بس وہی خاردار تار نظر آتے تھے جن سے بجلی کی لہر ہر وقت گزرتی رہتی تھی۔ یہاں سے فرار کی ہر امید دم توڑ گئی تھی۔ زندگی ان خاردار تاروں کی باڑھ سے باہر تھی۔ ان کے اندر بس موت تھی۔

لٹزمان اسٹاؤٹ کے یہودی باڑے سے آنے والوں کو راکھ ہوئے تین دن گزرے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کا انچارج ایک عورت اور دو بچوں کو پکڑ لایا۔ وہ پانی میں شرابور تھے اور سردی سے بُری طرح کپکپا رہے تھے۔ وہ راکھ ہونے والوں کی آخری کھیپ میں شامل تھے اور کسی طرح وہاں سے بچ نکلے تھے۔ انہوں نے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپ کر پناہ حاصل کی تھی۔ ان کے تمام ساتھی اور عزیز و اقارب ان کی آنکھوں کے سامنے جل کر خاک ہو گئے تھے۔ سردی اور خوف سے گنگ، وہ لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی ایسا کرشمہ ہو جائے کہ وہ اس جہنم سے بچ نکلیں۔ تین دن تک وہ سردی اور بارش میں وہیں چھپے رہے۔ ان کے پاس نہ کھانے کو تھا، نہ سردی اور بارش سے بچنے کے لیے کوئی سامان۔ پھر خصوصی کمانڈوز کے انچارج کی نظر ان پر پڑ گئی۔ اس وقت ان تینوں پر نیم غشی طاری تھی۔ انچارج ان کی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس حالت میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے وہ ان کو لے آیا تھا۔

عورت کی عمر ۳۰ برس تھی لیکن وہ پچاس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسفیلڈ کے قدموں میں گر گئی۔ وہ بُری طرح بلک رہی تھی۔ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی جن کی عمریں دس اور بارہ برس کی تھیں۔ اس نے یہودی باڑے میں قائم ملبوسات تیار کرنے والی فیکٹری میں ۵ سال مشقت کی تھی۔ وہ اب بھی کام کرنے کے لیے تیار تھی، ہر کام کرنے کے لیے راضی تھی۔

لیکن اس عورت کی یہ تمام التجائیں بے سود اور بے [illegible] تھیں۔ یہاں کسی کے لیے رحم اور معافی کا کوئی تصور نہ [illegible] یہاں صرف موت تھی اور ڈاکٹر مسفیلڈ تو رحم نام کے [illegible] جذبے سے ہی ناواقف تھا۔ اس کے باوجود مسفیلڈ نے [illegible] تینوں کو خود گولی نہیں ماری، اس نے یہ کام کسی اور کو سونپ دیا۔

○☆○

ان تینوں ماں بیٹوں کی یہ ایک اور چھوٹی سی کہانی تھی [illegible] ہم اگر پاگل پن سے بچنا چاہتے تھے تو لازماً ایسے واقعات [illegible] فراموش ہی کر دینا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہمارے لیے [illegible] طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ امید اور روشنی کی کوئی کرن کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

اکتوبر ختم ہو گیا تھا، نومبر ۱۹۴۴ء کا مہینہ تھا۔ برف بار [illegible] شروع ہو چکی تھی۔ ہر چیز نے سفید لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ سرد [illegible] بستہ ہوائیں اور تیز ہو گئی تھیں۔ سارے پرندے رفتہ رفتہ غائب ہو گئے تھے، بس کوّے تھے جو اڑتے نظر آتے تھے۔ چ [illegible] دن خاموشی کے بعد لاش بھٹی کے کارخانے میں پھر معمول [illegible] سرگرمیوں کی آوازیں شروع ہو گئیں۔ ہواداتوں کے پنکھے [illegible] چلنے لگے تھے، بھٹیاں گرم کی جا رہی تھیں۔ یہ اطلاع ہر شخص کو مل چکی تھی کہ چیکوسلواکیہ کے "تھریسے سائن اسٹاؤٹ" کے یہودی باڑے سے قیدیوں کی ایک نئی کھیپ لائی جا رہی ہے جسے جلد از جلد بھٹیوں میں جلانا ہے۔

جمہوریہ چیکوسلواکیہ کے قیام کے بعد سے "تھریسے سائن اسٹاؤٹ" کا قصبہ ایک فوجی چھاؤنی تھا۔ اس پر قبضے [illegible] بعد سے جرمنوں نے اس قصبے کی حیثیت ہی تبدیل کر دی [illegible] اور اسے ایک مثالی یہودی باڑے کی شکل دے دی گئی [illegible] اس باڑے میں آسٹریا، ہالینڈ اور چیکوسلواکیہ کے یہودیوں [illegible] رکھا گیا تھا جن کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اس باڑے میں رہنے والوں کی زندگی نسبتاً بہتر تھی۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض آزادی سے انجام دیتے تھے، انہیں خط و کتابت [illegible] بھی اجازت تھی۔ ریڈ کراس کی تنظیم اس یہودی باڑے [illegible] امداد بھی فراہم کرتی تھی۔ عالمی ریڈ کراس کی جماعتیں اکثر یہودی باڑے کا دورہ کرتی تھیں اور یہاں کے ماحول [illegible] قیدیوں کے حالات کے بارے میں اچھی رپورٹیں دیتے [illegible] اس یہودی باڑے کو جرمنوں نے دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لیے کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ اس باڑے [illegible] بارے میں عالمی ریڈ کراس کی رپورٹوں کے ذریعے جرمن [illegible]

کے قائم کردہ عقوبت خانوں اور لاش بھٹیوں کے بارے میں پھیلنے والی خبروں کا توڑ کیا جاتا تھا۔

لیکن اب جبکہ تیسری جرمن جمہوریہ اپنے زوال کے دہانے پر آگئی تھی تو عالمی رائے عامہ کی بھی اسے کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے مصنوعی انسانیت کی نقاب بھی اتار پھینکی تھی اور اس نے بڑی تیزی سے ان تمام یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کردیا تھا جو اس کی قید میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چیکوسلواکیہ کے اس مثالی یہودی باڑے کے لوگوں کے مرنے کی بھی باری آگئی تھی۔ جب یہ لوگ آش وِتز پہنچے تو وہ جسمانی طور پر اچھی حالت میں تھے۔ ہر ایک کے پاس مندرجہ ذیل حکم نامہ تھا۔ یہ حکم نامہ جرمن جمہوریہ کی اس سرکاری ایس ایس کمیٹی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا جو بیگار کے لیے محنت کشوں کو بھرتی کرتی تھی۔ حکم نامے کا متن کچھ اس نوعیت کا تھا۔

"جرمن جمہوریہ کے زیرِ انقلاب فلاں 'فلاں' یہودی کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اسے لازمی بے گار کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ بے گار پر روانہ ہونے سے قبل وہ اپنے پیشہ ورانہ کام کے تمام اوزار اور سازو سامان موسم سرما میں استعمال کیے جانے والے کپڑے اور ایک ہفتے کی خوراک کمیٹی کے نمائندے کے پاس جمع کرادے۔ روانگی کی تاریخ کا اعلان پبلک نوٹس کے ذریعے کیا جائے گا۔"

لازمی بے گار کی کہانی ایک سفید جھوٹ تھا۔ اس کا مقصد کسی شور شرابے اور کسی رکاوٹ کے بغیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد بعض ضروری اوزار و آلات اور گرم ملبوسات جمع کرنا تھا جن کی جرمن آبادی کو شدید ضرورت تھی۔ غرض اس قسم کے حکم نامے کی آڑ میں ۲۰ ہزار افراد کو گیس چیمبروں میں ہلاک کرکے ان کی لاشیں بھٹیوں میں جلادی گئی تھیں۔ اور یہ بیس ہزار افراد نادار یا معذور نہیں تھے بلکہ نوجوان اور صحت مند تھے۔ ان سب کو انسانوں سے راکھ میں تبدیل کرنے کے عمل میں صرف ۴۸ گھنٹے لگے تھے۔

دو ہفتے بعد ایسے ہی بدقسمت افراد سے بھری ہوئی مزید ٹرینوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ بھی تمام افراد کو بائیں طرف بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ان افراد کے عزیز و اقارب تھے جو ان کی آمد سے قبل موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ ان میں سے ہر فرد کے پاس اس قسم کا حکم تھا جن میں ان سے کہا گیا تھا کہ انہیں اپنے شوہروں اور والد کے پاس بھیجا جارہا ہے تاکہ وہ اپنے شوہر اور والد کے ساتھ وہیں قیام کرسکیں جہاں وہ ملازم ہیں۔ وہاں ان کے لیے عمدہ رہائش گاہیں ہیں اور عمدہ خوراک بھی۔ تاہم سفر کرنے والوں کو ایک ہفتے کے راشن کا خود انتظام کرنا ہوگا۔

اس شیطانی نوٹس کی آڑ میں ۲۰ ہزار عورتوں اور بچوں کو آش وِتز بھیجا گیا تھا اور انہیں بھی گیس چیمبوں میں ہلاک کرکے بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردیا گیا۔

۱۷ نومبر ۱۹۴۴ء کو علی الصباح ایک ایس ایس گارڈ میرے کمرے میں آیا اور اس نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ اعلیٰ کمان سے حکم آیا ہے کہ اب سے کسی بھی قیدی کو ہلاک کرنا ممنوع ہے۔ کسی بھی قیدی کو عقوبتی کیمپ میں کسی بھی طریقے سے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ اتنے بہت سے جھوٹ اور افترا کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرے لیے اس اطلاع پر یقین کرنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار اس پر بھی کردیا تھا لیکن اس نے پہلے سے زیادہ زوردار طریقے سے مجھے یقین دلایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ احکام ابھی ابھی ریڈیو پر ایس ایس فوجیوں اور لاش بھٹیوں کے کارخانوں کے انچارجوں کو موصول ہوچکے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین نہ تھا۔

بہرحال جلد ہی اس کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ مویشیوں کی حمل و نقل کے استعمال ہونے والے پانچ ڈبوں پر مشتمل ایک مال گاڑی اسٹیشن پر آکر رکی تھی۔ اس مال گاڑی سے ۵۰۰ قیدی لائے گئے تھے۔ یہ تمام کے تمام قیدی بیمار اور معذور تھے۔ وہ سب کے سب لاش بھٹیوں کے کارخانہ اول و دوم کے درمیان پلیٹ فارم پر اترے تھے۔ یہاں ایس ایس گارڈز سے قیدیوں کے ساتھ آنے والے محافظوں کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار ان قیدیوں کو دوبارہ ڈبوں میں سوار ہونے کی ہدایت کی گئی اور یہ ٹرین ایف کیمپ یعنی اسپتال کی بیرکوں کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آش وِتز بھیجے جانے والے بیمار اور معذور قیدیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تھا بلکہ انہیں آش وِتز کے اسپتال کی بیرکوں میں رکھا گیا تھا۔ ان کو علاج معالجے اور آرام کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

اس کے ایک گھنٹے بعد سلواکیہ کے ۵۰۰ قیدیوں کو لے کر ایک اور ٹرین آش وِتز پہنچی تھی۔ وہ سب پلیٹ فارم پر اترے۔ میں پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس پلیٹ فارم پر آنے والے قیدیوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتارنے اور بعض کو کیمپوں میں رکھنے کے لیے انتخاب ہوتا تھا۔ مرنے کے لیے منتخب

ہونے والے بائیں ہاتھ کی طرف بھیج دیے جاتے تھے لیکن اس روز بلا کسی استثنا کے تمام قیدیوں کو دائیں ہاتھ پر ڈی کیمپ کی سمت بھیج دیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے اندر خوشی کی لہر دوڑتی محسوس کی تھی۔ ایس ایس کے گارڈ نے مجھے جو خبر دی تھی وہ درست تھی۔ اس میں کوئی چھل اور فریب کی بات نہ تھی۔

آش وٹز کے عقوبت خانے کے قیدیوں کے لیے یہ ایک نیک شگون تھا۔ ان کے زندہ بچ جانے کی امید پیدا ہو چلی تھی لیکن خصوصی کمانڈوز کے لیے یہ ایک برا شگون تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کا انجام قریب آگیا ہے۔ یہ خصوصی کمانڈوز کا تیرہواں گروپ تھا جو ان دنوں آش وٹز میں کام کر رہا تھا اور اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس گروپ کو چار ماہ کی مدت سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

آش وٹز میں زندگی ایک نئے انداز سے شروع ہوگئی تھی۔ اب لوگوں کو قتل نہیں کیا جا رہا تھا لیکن آش وٹز کیمپ کے ساتھ جو خونیں ماضی وابستہ تھا اس کو چھپانا بھی ضروری تھا۔ لاش بھٹیوں کو توڑنا اور چتا گھاٹ کی خندقوں کو پاٹنا لازمی تھا، ساتھ ہی ان تمام لوگوں کا خاتمہ بھی ناگزیر تھا جو اس کیمپ میں قیدیوں کے قتل عام اور ان پر ہولناک مظالم میں شریک تھا یا ان کے چشم دید گواہ تھے۔

انسانوں کے قتل عام کی کہانی صرف آش وٹز تک محدود نہیں تھی۔ انسانوں کو گیس چیمبروں میں ہلاک کر کے ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے والے کارخانوں کا جال اور بھی کئی مقامات پر پھیلا ہوا تھا۔ مثلاً ایک "ٹری بلنکا" آش وٹز اور برکناؤ میں اس قسم کے بڑے بڑے کارخانے موجود تھے جہاں کئی لاکھ انسانوں کو اسی طرح سفاکانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ ان کیمپوں میں پہنچنے والے قیدی اپنی آمد کے چند گھنٹوں بعد راکھ میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اب موت کے ان کارخانوں سے چند ہزار افراد کے زندہ بچ نکلنے کی امید پیدا ہو چلی تھی۔

خصوصی کمانڈوز کے انجام کے خیال سے میرا ذہن بہت پراگندہ ہو گیا تھا اس لیے میں اس ایس ایس جرمن فوجی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس نے صبح کے وقت مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ اب قیدیوں کو ہلاک نہیں کیا جایا کرے گا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر خصوصی کمانڈوز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ کمرے میں تنہا تھا اور میں اس سے اطمینان کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کر سکتا تھا۔

میرے سوال پر اس نے کہا "خصوصی کمانڈوز [illegible] بارے میں ہے" وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا "ہاں کے بارے میں بھی فیصلہ ہوا ہے۔ چند دن بعد تم لوگوں کو سامان حرب تیار کرنے والے ایک زیر زمین کارخانے میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ کارخانہ بیلاؤ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

مجھے اس کی بات پر قطعی یقین نہ آیا۔ لیکن پہلی مرتبہ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ مجھے جھوٹی تسلی دینے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ میں نے چند دن قبل اس کا علاج کیا تھا۔ شدید علیل تھا اور میرے علاج سے صحت یاب ہو گیا تھا شاید اسی بنا پر وہ مجھے کوئی بری خبر سنانا نہیں چاہتا تھا۔



ہمارے شب و روز پھر اسی بے کیفی کے عالم میں گزرنے لگے۔

وہ بھی عجیب سا دن تھا۔ سہ پہر کے دو بجے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ بادل بہت گہرے اور نیچے تھے، برف باری کا سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا۔ اچانک بھٹیوں کی کمرے کی راہداری سے زوردار آواز تحکمانہ انداز میں ابھری۔

"تمام خصوصی کمانڈوز احاطے میں جمع ہو جائیں۔"

اس کے بعد یہی حکم دو تین مرتبہ دہرایا گیا۔ ہر مرتبہ حکم دینے والے کی آواز پہلے سے زیادہ کرخت تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے کے دروازے کے باہر بھاری بھاری قدموں کی آواز ابھری، ایک ایس ایس گارڈ نے دروازہ کھولا اور کرخت لہجے میں کہا "سنا نہیں تم نے، چلو باہر چلو۔"

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بوجھل قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ لاش بھٹی کے کارخانہ اول کے احاطے میں پہنچا، جہاں دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔ چاروں طرف ایس ایس گارڈز مشین گنیں ان پر تانے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ میں نے آس پاس کے ماحول پر آخری اور الوداعی نظر ڈالی۔ احاطے میں کہیں کہیں اب بھی برف جمی ہوئی تھی، پائن کے درخت برف کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ تمام ماحول بہت پرسکون تھا۔

تمام خصوصی کمانڈوز کی حاضری لی گئی۔ سب کے سب موجود تھے۔ اس کے بعد ہمیں بھٹیوں کے کمرے میں ہنکا دیا گیا۔ تمام ایس ایس گارڈز باہر رہ گئے۔ انہوں نے دروازہ اور کھڑکیوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ان کی مشین گنوں نے ہمیں نشانے پر لے رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے بند

کھڑکیوں پر پھسلنے والی آہنی چادریں چڑھا دی گئیں۔ اب اس کمرے سے ہمارے نکلنے کے تمام امکانات مسدود ہو چکے تھے۔ کمرے میں کارخانہ دوم میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز بھی موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھٹیوں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کارخانہ چہارم میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز بھی اندر دھکیل دیے گئے۔ ہم ۴۴ افراد اب اس کمرے میں بند موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں بس یہ معلوم نہیں تھا کہ جرمن ہمیں کس طریقے سے موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں گیس چیمبر میں ہلاک کیا جا سکتا ہے لیکن شاید خصوصی کمانڈوز کو اس طرح مارنا وہ پسند نہ کریں۔ میں نے سوچا، وہ ہمیں مشین گن سے فائر کر کے بھی ہلاک کر سکتے تھے لیکن اس کمرے میں ایسی کوئی کارروائی مناسب نہ ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس عمارت ہی کو دھماکے سے اڑا دیتے۔ اس طرح موت کا یہ کارخانہ بھی تباہ ہو جاتا اور ساتھ ہی ہمارا کام بھی تمام ہو جاتا۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ فاسفورس کا بم اس کمرے میں کسی کھڑکی سے پھینک دیتے۔ یہ بھی ہمیں قتل کرنے کا ایک موثر طریقہ تھا۔ جرمنوں نے یہ طریقہ اس سے قبل ماکو کے یہودی باڑے سے آنے والوں کو قتل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔

میں سوچتا رہا کہ ہم زندہ لاشوں کو مردہ بنانے کے لیے جرمن کیا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن فوری طور پر میں اس بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اچانک کمرے کا آہنی دروازہ کھلا۔ ایس ایس گارڈز کے انچارج اشٹائن برگ نے دروازے پر آکر چیخ کر کہا "تمام ڈاکٹر باہر آجائیں۔"

میں اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ باہر آگیا۔ ایس ایس گارڈز نے ہمیں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اشٹائن برگ کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کاغذ پر لکھے ہوئے نمبروں میں سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کے نمبر قلم زد کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور کاغذ واپس اشٹائن برگ کو دے دیا۔ اشٹائن برگ نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور ہم سے کہا کہ ہم اپنے کمرے میں واپس جائیں اور اگلے حکم تک کمرے میں ہی ٹھہریں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

اگلے روز لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں پانچ ٹرک داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا مال فرش پر الٹ دیا۔ یہ مال خصوصی کمانڈوز کی لاشوں پر مشتمل تھا۔ ان لاشوں کو جلانے کے لیے ۳۰ خصوصی کمانڈوز پر مشتمل نیا گروپ ترتیب دے دیا گیا تھا۔ مرنے والے کمانڈوز کی لاشیں بری طرح جھلسی ہوئی تھیں۔ ان کو شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

میں اب تک یہاں لوگوں کو... قتل کرنے کے پانچ طریقوں سے واقف تھا۔ قیدیوں کو زہریلی گیس سے، چتا گھاٹ پر، کلوروفارم کے انجکشنوں سے، گدی میں گولی مار کر اور فاسفورس بموں سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ یہ لوگوں کو ہلاک کرنے کا چھٹا... طریقہ تھا جو سامنے آیا تھا۔

ہمارے ساتھی خصوصی کمانڈوز کو رات کے وقت ایک قریبی جنگل میں لے جا کر انہیں آگ لگانے والے بموں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ہم چار اگر ابھی تک زندہ تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جرمنوں کو ہم سے کوئی ہمدردی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ابھی ہم سے کچھ اور کام لینے تھے اور اسی لیے انہوں نے ہماری موت کو ملتوی کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے ہمیں ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔ اس طرح زندہ رہنے پر ہمیں کوئی خوشی نہ تھی۔

غرض اس طرح آش وٹز میں خصوصی کمانڈوز کا تیرہواں گروپ بھی ہلاک کر دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے دن خاموشی اور اکتاہٹ اور بددلی کے ساتھ گزرنے لگے۔ ہمارے پاس کوئی کام نہ تھا۔ ہم بس خالی الذہنی کی کیفیت میں اس خونی چار دیواری کے احاطے میں ٹہلتے رہتے۔ ہمیں نہ تو کوئی کام دیا جاتا تھا نہ ہمارے لیے کرنے کا کوئی کام تھا۔ اس عمارت میں ہم صرف چار نفوس باقی رہ گئے تھے۔ وہ تین افراد جو موت کے اس کارخانے میں کام کرتے تھے وہ خصوصی کمانڈوز میں شامل نہیں تھے۔ انہیں آش وٹز کے کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ وہ صرف ان افراد کی لاشیں جلانے روزانہ یہاں آتے تھے جو اسپتال میں دم توڑ دیتے تھے۔

ہم اپنے انجام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہماری تنہائی کا عالم یہ تھا کہ مسفیلڈ بھی ہم سے بات کرنے یا ہمارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ اس کی تو شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کو غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب اس آش وٹز کیمپ میں اس کا کردار ختم ہو گیا ہے اور جلد ہی اس کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ بس اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا۔ شاید وہ ماضی کو بھولنا اور مستقبل کے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر مینگلے خلافِ توقع آگیا اور ہمیں تلاش کرتا ہوا ہمارے کمرے میں آگیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اوپر

سے حکم آیا ہے کہ آش وٹز کو مکمل طور پر تباہ کردیا جائے۔ وہ اس وقت اس کیمپ میں موجود انسانوں کی بات نہیں کر رہا تھا بلکہ موت دینے والے اس ادارے کی بات کر رہا تھا جو آش وٹز کیمپ کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے کہا تھا کہ لاش بھٹیوں کے دو کارخانے تباہ کردیے جائیں گے۔ تیسرا کارخانہ اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں جلانے کے لیے کام کرتا رہے گا۔ پوسٹ مارٹم کا کمرہ اور اس کا عملہ یعنی میں اور میرے تینوں ساتھیوں کو کارخانہ چہارم میں منتقل کردیا جائے گا۔ وہی کارخانہ قائم رہے گا۔ پہلا اور دوسرا کارخانہ تباہ کردیا جائے گا۔ جبکہ نمبر تین تو اکتوبر کی بغاوت میں پہلے ہی تباہ ہوچکا تھا۔

یہ ایک تاریخی اور مسرت کا موقع تھا۔ اگلے روز قیدیوں کی ایک جماعت وہاں آئی اور اس نے دو گروہوں میں تقسیم ہوکر موت کی اس فیکٹری کو ڈھانے کا کام شروع کردیا۔ اس فیکٹری کی دیواریں، یکے بعد دیگرے ڈائنا مائٹ کے دھماکوں سے منہدم ہورہی تھیں۔ یہ جرمنی کی تیسری جموریہ... کی تباہی کی بھی علامت تھی۔ یہودیوں نے اس کارخانے کی دیواریں اٹھائی تھیں، وہی ان دیواروں کو ڈھا رہے تھے۔ موت کے ان کارخانوں کو تباہ کرنے کا کام تمام قیدی بڑے جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ ان کے چہرے امید سے چمک رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے کمرے کی وہ تمام اشیا جو منتقل کی جاسکتی تھیں، پیک کردی گئی تھیں۔ چیر پھاڑ کی میز کی سنگ مرمر کی سلوں کو منتقل کردیا گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں پوسٹ مارٹم کا دوسرا کمرہ کارخانہ چہارم میں قائم ہوگیا تھا اور ہم بھی وہیں منتقل ہوگئے تھے۔

اگلے دس دن کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک شام جبکہ ہم ڈنر کھا رہے تھے، ڈاکٹر مسفیلڈ شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا وہاں آپہنچا اور میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر آگے جھکتے ہوئے کہا "گڈ ایوننگ بچو! میں ایک بات تمہیں بتادوں۔ بہت جلد تم ماردیے جاؤ گے، لیکن تمہارے بعد ہماری بھی باری آئے گی، ہم بھی ماردیے جائیں گے۔" ایک شرابی کے منہ سے شراب کے نشے میں ایک حقیقت بیان ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے جرمن محافظوں کو بھی ختم ہونا تھا۔

میں نے گرم گرم چائے میں گرم رم ملا کر مسفیلڈ کو پیش کی۔ اس نے جلد جلد اسے حلق سے انڈیل لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس روز مسفیلڈ جیسے سب کچھ اگل دینا چاہتا تھا۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اس کی بیوی ایک ہوائی حملے میں مار[ی] جاچکی ہے اور اس کا بیٹا روسی محاذ پر لڑ رہا ہے اور پھر اس [نے] بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ [رو]سی فوجیں آش وٹز سے بہ مشکل چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ تمام جرمنی فرار ہورہا ہے، ہر شخص سڑکوں پر آگیا ہے۔ [ہر] شخص بھاگ رہا ہے۔ ہر شخص سرحدی علاقوں کو چھوڑ [کر] مغرب کی طرف پناہ کے لیے دوڑ رہا ہے۔"

مسفیلڈ کے الفاظ ہمارے لیے بڑے خوش آئند تھے۔ اس کی مایوسی ہمارے لیے امید کی کرن تھی۔ ایک عجیب سرخوشی ہم پر طاری تھی۔ پہلی مرتبہ یقین آنے لگا تھا کہ [ہم] زندہ بچ جائیں گے۔

○☆○

امید و بیم کی اسی کیفیت میں ۱۹۴۵ء کا نیا سال شروع ہوگیا۔ وہ یکم جنوری کی تاریخ تھی۔ ہر چیز برف کی چادر میں لپٹی سو رہی تھی۔ میں احاطے میں ٹہل رہا تھا کہ براؤن رنگ کی ایک بڑی گاڑی احاطے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی قیدیوں کو لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی وجہ سے ہم لوگ اسے "براؤن ٹونی" کہا کرتے تھے۔ اس میں سے ایک طویل قامت جرمن افسر ڈاکٹر کلائن اترا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے میجر تھا۔ یہ شخص نہایت تند خو، بدمزاج اور ظالم تھا۔ میں نے قواعد کے مطابق اسے سلیوٹ کیا۔ وہ آش وٹز کیمپ کی بیرک نمبر دس سے سو افراد کو لے کر آیا تھا۔

کلائن نے کارخانہ چہارم کے ایس ایس گارڈز کے انچارج سے کہا "لو آفیسر، سالِ نو پر تمہارے لیے کچھ کام آیا ہے۔"

انچارج نشے میں دھت تھا، اس کے لیے تو پیروں پر کھڑا ہونا بھی دوبھر ہورہا تھا۔ سالِ نو کے موقعے پر وہ کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر کام بھی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا۔ میجر کلائن جن ایک سو افراد کو لے کر آیا تھا وہ سب کے سب عیسائی تھے اور پولینڈ کے رہنے والے۔ ایس ایس گارڈز کے انچارج کو بہرحال یہ کام کرنا ہی تھا۔ تمام قیدیوں کو بھٹیوں کے کمرے کے برابر والے خالی کمرے میں لے جایا گیا اور انہیں فوری طور پر لباس اتارنے کا حکم دیا گیا۔ اس دوران کلائن، ایس ایس گارڈز کے انچارج کے ہمراہ احاطے میں ٹہلتا رہا۔

میں جلدی سے اس کمرے میں پہنچا جہاں آنے والے قیدی لباس اتارنے میں مصروف تھے اور پھر میں نے ان سے

شروع کردیے۔ ایک قیدی نے بتایا کہ اس نے کراکاؤ میں اپنے چند عزیزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ گسٹاپو نے اسی لیے اس کو گرفتار کیا تھا۔ اس پر مزاحمتی تحریک کا ساتھ دینے کا الزام تھا۔ اسی الزام میں اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو سزائے موت سنادی گئی۔ اس نے بتایا کہ اسے یہاں یہ کہہ کر لایا گیا ہے کہ اب اسے کسی بیگار پر بھیجا جارہا ہے اور اس سے قبل اسے غسل کرنا ہے۔

ایک اور قیدی کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے بلیک مارکیٹ سے ایک پاؤنڈ مکھن خریدا تھا۔ یہ ایک سنگین جرم تھا کیونکہ اس طرح اس نے افراطِ زر پیدا کرنے میں تعاون کیا تھا جو ایک سنگین جرم تھا۔ ایک اور شخص کو اس لیے موت کی سزا دی گئی تھی کہ وہ علاقۂ ممنوعہ میں جانکلا تھا۔ اس کو مزاحمتی تحریک کا جاسوس قرار دیا گیا تھا۔ اسی قسم کے الزامات باقی لوگوں پر بھی تھے۔

ان دنوں کیونکہ خصوصی کمانڈوز نہیں تھے اس لیے ان قیدیوں کو ہلاک کرکے بھٹیوں میں جلانے کا کام ایس ایس گارڈز نے انجام دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کلائن وہاں سے روانہ ہوگیا۔ ان قیدیوں کی ہلاکت بہرصورت ۱۷نومبر کے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی جس کے تحت قیدیوں کو ہلاک کرنے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ آج سو افراد کو کورٹ مارشل کے احکام کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ دن آتے رہے' جاتے رہے۔ آش وتز کا ماحول آہستہ آہستہ تبدیل ہورہا تھا۔ ہر نئے دن کے ساتھ جرمن فوجیوں کے چہروں پر تاریکی چھاتی جارہی تھی۔ بے یقینی سے پیدا ہونے والی وحشت ان کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔ ڈاکٹر مینگلے' آش وتز سے فرار ہوگیا تھا اور اس کی جگہ نئے ڈاکٹر نے لے لی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب اس کیمپ کو "ZAT" کے بجائے "KAT" "ورک کیمپ" کا نام دے دیا گیا تھا۔

سوئے اتفاق کہ پہلی جنوری کا ایک اخبار میری نظروں سے گزرا۔ اس اخبار سے مجھے روسی فوجوں کی یلغار کے بارے میں معلوم ہوا۔ بھاری توپ خانے کی گولہ باری کی آوازیں آش وتز میں بھی سنائی دیتی تھیں۔ بعض اوقات دھماکے اتنے شدید ہوتے کہ کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ بُری طرح بج اٹھتے اور دیواریں لرز کر رہ جاتیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ دھماکوں کی آوازیں شدید ہوتی جارہی تھیں اور قریب آتی جارہی تھیں۔

۱۷جنوری کو میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا حالانکہ میں تھکا ہوا بھی نہ تھا۔ قریب ہی پتھر کے کوئلے کا اسٹوو جل رہا تھا اور اس کی نرم نرم آنچ اعصاب کے لیے بڑی فرحت بخش تھی۔ نصف شب کے قریب پے در پے' زوردار دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ فضا میں ہر طرف آگ کی لکیریں پھیل رہی تھیں۔ مشین گنیں تڑاتڑ گولیاں برسا... رہی تھیں' دھماکے ہورہے تھے۔ میں نے دروازوں کے کھلنے' بند ہونے اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ خلافِ معمول بھٹیوں کے کمرے کے دروازے کھلے تھے۔ ایس ایس گارڈ کے کمروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جرمن گارڈ بہت عجلت میں اور گھبرا کر بھاگ نکلے ہیں۔ کارخانے کا گیٹ بھی کھلا پڑا تھا۔ کہیں بھی کوئی جرمن گارڈ نظر نہیں آرہا تھا۔ واچ ٹاورز بھی خالی تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے یہاں واچ ٹاورز کو خالی دیکھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا واپس آیا۔ اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا' انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ جلدی جلدی ہم نے کپڑے بدلے' ہم بھی یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تیار تھے۔ ایس ایس گارڈز کے فرار ہونے کے بعد ہم یہاں ایک لمحے کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے آٹھ مہینے گزارے تھے اور پل پل موت کا انتظار کیا تھا۔ اس کیفیت میں یہ آٹھ مہینے ہمیں آٹھ سال کیا آٹھ صدیاں معلوم ہوتے تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سردی کے اس شدید موسم کے لیے ہمارے پاس بہترین اور آرام دہ گرم کپڑے تھے۔ سوئٹر' اوور کوٹ' جوتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بہت غنیمت تھیں کیونکہ ان دنوں درجۂ حرارت منفی دس درجے تھا۔ ہم سب نے خوراک کے دو پاؤنڈ والے ڈبے لیے' جیبوں میں دوائیں اور سگریٹیں بھرلیں۔ اب ہم ایک طویل سفر کے لیے تیار تھے۔ موت کی کھائی سے زندگی کی وادی کی طرف سفر کے لیے۔

ہم آزادی کی توقع لیے آش وتز سے نکلے۔ ہمارا رُخ برکناؤ کی طرف تھا۔ وہاں بھی موت کے کارخانے تھے' وہاں بھی زندہ لوگوں کو مار کر اور بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردینے والا پورا نظام موجود تھا۔ اس سمت آسمان روشن تھا۔ شاید برکناؤ کا موت کا کارخانہ بھی جل رہا تھا۔

بھٹیوں والے کمرے کے سامنے سے ہوتے ہوئے ہم اس کمرے کے سامنے سے گزرے جس میں سونا ذخیرہ کیا جاتا

تھا۔ اس کمرے میں اب بھی سونے سے بھرے ہوئے صندوق رکھے تھے لیکن ہمیں اس دولت اور اس سونے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انسان کی زندگی جب داؤ پر لگی ہو تو دنیا کی ہر دولت اس کے لیے ہیچ ہوجاتی ہے۔ زندگی اور آزادی سے زیادہ قیمتی کوئی شے نہیں۔

ہم مین گیٹ سے بھی گزر گئے۔ آج ہمیں کوئی روکنے والا نہ تھا' آج ہم پر کوئی گولیاں برسانے والا نہ تھا۔ یہ بھی کیسی عجیب تبدیلی تھی۔ چند گھنٹے پہلے ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہم برکناؤ کے چھوٹنے سے جنگل سے اسی راستے سے گزر رہے تھے جس راستے سے گزر کر لاکھوں افراد موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے لیکن ہم زندگی کی طرف جارہے تھے۔

ہمارا خیال درست ثابت ہوا۔ برکناؤ جل رہا تھا' ایس ایس گارڈ کے کمرے' جن میں اس عقوبتی کیمپ کا ریکارڈ موجود تھا' جل رہے تھے۔ ان سے آگ کے شعلے بلند ہورہے تھے۔ برکناؤ کیمپ کے گیٹ کے سامنے کوئی تین ہزار افراد جمع تھے' وہ شاید روانگی کے حکم کے منتظر تھے۔ میں بے دھڑک ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ یہاں کوئی شخص مجھ سے واقف نہ تھا۔ اب میں خصوصی کمانڈوز کے دستے کا رکن نہیں تھا' اب میں موت کے کارخانوں کے خونی رازوں کا امین نہیں تھا اس لیے اب میں موت کا حق دار بھی نہیں رہا تھا۔ یہاں میں بس ایک عقوبتی کیمپ کا قیدی تھا۔ موجودہ حالات میں میرے لیے یہی بہترین موقع تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔ ہر شخص برکناؤ سے فرار ہورہا تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ہمیں شاید زیادہ دور نہ لے جاسکیں۔ دو ایک دن میں روسی فوجیں ہمیں آلیں گی لیکن ایسا وقت آنے سے پہلے ہی ایس ایس فوجی ہمیں چھوڑ کر بھاگ لیں گے۔ فی الحال ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ دونوں فوجوں کے درمیان سے گزرتے چلے جائیں۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ آخری ایس ایس گارڈ بھی کیمپ چھوڑ کر جاچکا تھا۔ آخری گارڈ نے آہنی گیٹ بند کرکے مین سوئچ بورڈ سے بجلی کی سپلائی منقطع کردی تھی۔ برکناؤ کا وسیع وعریض عقوبتی کیمپ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ یہ کیمپ بھی لاکھوں انسان کا مرگھٹ تھا' ایک قبرستان تھا۔ ایسا قبرستان جس میں ایک قبر بھی نہیں تھی۔

ایس ایس گارڈز ایک کمپنی ہمیں اپنے گھیرے میں لے کر چل رہی تھی۔ ہم اپنے نئے ساتھیوں سے گفتگو کررہے تھے' اپنے بارے میں بتارہے تھے ان کی کہانیاں سن رہے تھے۔ ہم سب کی کہانیاں ایک جیسی ہی تھیں۔ المناک اور بھیانک۔ ہمارے ساتھ ہماری بے یقینی بھی چل رہی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ ایس ایس گارڈز ہمیں کسی نئے قید خانے تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں یا راستے میں ہی ہمیں چھوڑ بھاگیں۔

ہم نے ۵ کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ بائیں پہلو سے زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم پر سب مشین گن سے فائرنگ ہورہی تھی۔ انہیں ہلکے ٹینک کی مدد بھی حاصل تھی۔ ایس ایس گارڈز نے جواباً فائرنگ شروع کردی اور ہم سے زمین پر لیٹ جانے کے لیے کہا۔ ہم پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی خندقوں میں اتر گئے۔ کچھ دیر دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی پھر اچانک فائرنگ کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سناٹا پھیل گیا۔ ہم نے پھر اپنا سفر شروع کردیا۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹنے لگا اور روشنی ہونے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے ۱۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلیا ہے' اس کے باوجود ہم ابھی تک برف پر ہی چل رہے تھے۔ راستے بھر ہمیں جگہ جگہ برتن' کمبل اور لکڑی کے جوتے بکھرے پڑے ملے جنہیں ہم سے آگے جانے والی خواتین کے قافلے نے غالباً پھینک دیا تھا۔ چند کلومیٹر کا... مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں اور بھی دردناک مناظر دیکھنے کو ملے۔ ہر چالیس' پچاس گز کے بعد سڑک کے کنارے خندقوں میں ایک دو خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کے بعد کئی کلومیٹر تک یہی منظر تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ یہ وہ بدقسمت افراد تھے جو کمزوری اور تھکن کی وجہ سے مزید چل نہیں سکتے تھے اور ایس ایس گارڈز نے ان کی گردن میں گولی مار کر ان کی زندگی کا سفر مختصر کرکے انہیں موت کی وادی میں پہنچادیا تھا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ وحشت اور بربریت اور موت بھی ہماری ہم سفر تھی۔ ہمیں ان سے ابھی تک نجات نہیں ملی تھی۔ ایس ایس گارڈز کو غالباً یہ ہدایت تھی کہ وہ کسی قیدی کو زندہ پیچھے نہ چھوڑیں۔ ان لاشوں کو دیکھ کر ہماری رفتار خود بہ خود تیز ہوگئی۔ ہماری زندگی کا انحصار چلتے رہنے پر ہی تھا۔

کچھ وقت اور گزرا۔ اب خود ہمارے قافلے میں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جو شخص بھی تھک کر گرتا' لڑکھڑاتا یا بیٹھ جاتا' اس کو مار دیا جاتا۔ پھر وقفے وقفے سے ایسا ہونے لگا۔ دس منٹ نہ گزرتے کہ کوئی نہ کوئی فرد

گولی سے ماردیا جاتا۔
دوپہر کے وقت ہم "چیل سو" پہنچے۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ قیام کیا۔ ہم نے ایک اسٹیڈیم میں ایک گھنٹا آرام کیا۔ جس کے پاس خوراک تھی اس نے تھوڑا بہت کھایا۔ ایک گھنٹے بعد ہم پھر برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک ہفتہ گزر گیا، دو ہفتے گزر گئے۔ ۲۰ دن تک چلتے رہنے کے بعد ہم دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے ایک اسٹیشن پر پہنچے۔ اس دوران ہم نے ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ راتوں کو ہم آسمان تلے سخت سردی میں سوتے تھے۔ موسم کی سختیاں جھیلتے ہوئے جب ہم ریٹی بور پہنچے تھے تو صرف دو ہزار نفوس تھے۔ ایک ہزار افراد کو راستے میں گولی سے ہلاک کردیا گیا تھا۔ اسٹیشن پر مال گاڑی ہماری منتظر تھی۔ ٹرین کو دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔ ہم ڈبوں میں سوار ہوگئے۔

ہم نے وہ رات اسی اسٹیشن پر ڈبوں میں گزاری۔ اگلے روز صبح کے وقت گاڑی میں حرکت ہوئی۔ ٹرین کا یہ سفر بھی پانچ دن کا تھا۔ شدید سردی میں ہمارے ساتھی ہلاک ہوتے رہے۔ آخر ہم ماؤ تھاسن کے عقوبت خانے پہنچ گئے۔ یہی ہماری منزل تھی۔ وہاں ہماری تعداد صرف ۱۵۰۰ رہ گئی تھی۔
باقی جو لوگ ہمارے ساتھ نہیں پہنچ سکے تھے، ان میں سے کئی راستے میں موقع پاکر فرار ہوگئے تھے۔

ماؤ تھاسن کا عقوبت خانہ ایک ایسی پہاڑی پر واقع تھا جس کے دامن میں اسی نام کا ایک شہر آباد تھا۔ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہ کارخانہ ایک قلعہ نما شہر تھا۔ اس کی فصیلیں پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ دور سے یہ ازمنۂ وسطیٰ کا کوئی قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ قلعہ چونکہ نیا نیا تعمیر ہوا تھا اس لیے اس کی دیواریں اس حُسن سے محروم تھیں جو قدامت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی کی تیسری جمہوریہ نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جرمنی نے جب فرانس پر قبضہ کیا تھا تو وہاں سے ۴۰ ہزار ری پبلکن افراد کو پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ یہودی بھی یہاں گرفتار کرکے لائے گئے تھے۔ انہی قیدیوں نے پہاڑ کاٹ کر پتھر تراشے تھے اور انہیں سات کلومیٹر کے فاصلے سے یہاں تک ڈھو کر لائے تھے اور ان پتھروں سے یہ قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعے کے وہ معمار اس کی تعمیر کرتے کرتے مرکھپ گئے تھے۔ انہیں اس کی دیواروں کے اندر قیدیوں کے لیے بنائی جانے والی بیرکوں میں ایک رات بھی گزارنا نصیب نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود یہ بیرکیں کبھی غیر آباد نہیں رہی تھیں۔ یورپ کے

مقبوضہ ممالک میں جرمنوں کے خلاف جدوجہد کرنے والی خفیہ تنظیموں، مکتی فوجوں اور مزاحمتی تحریکوں کے ارکان اور یہودیوں کو گرفتار کرکے یہاں لایا گیا تھا۔ ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں میں تھی۔ یہاں چند دن گزارنے کے بعد وہ مار کر اور جلا کر راکھ کردیے گئے تھے۔

اور اب ہمارا قافلہ جس کا ہر فرد طویل سفر اور بھوک سے نڈھال اور چور تھا، پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے اس قلعے کو جانے والے برف پوش گھومتے ہوئے راستے پر بڑھ رہا تھا، اپنے نئے قید خانے کی طرف جہاں نامعلوم مصائب اور عذاب اس کے منتظر تھے۔ آخر ہم اس عقوبت خانے کے گیٹ پر پہنچ کر قطار بنا کر کھڑے ہوگئے۔ اس وقت شام کا دھندلکا تیزی سے پھیل رہا تھا۔

میں نے اپنے ہم سفر ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ آش وٹز کے پوسٹ مارٹم روم میں میرے ساتھ کام کرنے والے چاروں ساتھیوں میں سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ نشر کو تو میں نے "چیل سو" کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی حالت تو چیل سو پہنچتے پہنچتے ہی غیر ہوگئی تھی۔ وہ شاید وہیں مرکھپ گیا تھا۔ ڈاکٹر کورنربٹی بور تک ساتھ تھا۔ اس کے بعد وہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا، وہ ٹرین کے سفر کے دوران ہی موقع پاکر فرار ہوگیا تھا۔ رہا ڈاکٹر کوروگ، تو اس کی ذہنی حالت تو آش وٹز میں ہی خراب ہوتی جارہی تھی۔ اسے میں نے اور میرے دوسرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر مینگلے اور سفیلڈ سے بچایا تھا۔ انہیں ذرا سی بھی خبر ہوجاتی کہ کوروک ذہنی طور پر غیر متوازن ہوتا جارہا ہے تو وہیں اس کی زندگی ختم ہوجاتی۔ آش وٹز سے فرار ہوتے وقت اس نے مجھے وصیت کی تھی۔

"نکولس، میرے دوست! تم تو بڑے مضبوط اعصاب کے شخص ہو۔ بلا کی خود اعتمادی ہے تم میں۔ مجھے یقین ہے کہ تم زندہ بچ نکلو گے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جانتا ہوں کہ میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ میں ختم ہوچکا ہوں میرے دوست" میں نے اس کی ہمت بندھانا چاہی تو اس نے مجھے خاموش کردیا "مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ دیکھو! مجھے معلوم ہے کہ میری بیوی اور بیٹی دونوں گیس چیمبر میں ہلاک ہوچکی ہیں لیکن میں اپنے بارہ برس کے بیٹے کو "گوس زیک" کے پادریوں میں چھوڑ آیا تھا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر تم زندہ سلامت اپنے گھر پہنچ جاؤ میرے اس بیٹے کو ان پادریوں سے لے کر اسے اپنے بیٹے کی طرح پالنا۔ وعدہ کرو نکولس، میں جانتا ہوں، میں صرف چند دن کا مہمان ہوں۔"

میں نے ڈاکٹر کوروگ سے وعدہ کرلیا تھا اور اس کو نبھانے کا عزم بھی رکھتا تھا۔

ڈاکٹر کوروگ ہمارے ساتھ آش وٹز سے نکلا تھا لیکن وہ چیل سو بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔

گیٹ پر ہماری حاضری لی گئی جس کے بعد ہمیں ایک تنگ اور پرپیچ راستے سے غسل خانوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دوسرے کیمپوں سے اور بھی قیدی ہم سے پہلے آچکے ہیں۔ اس چھوٹی سی تنگ جگہ میں کوئی دس ہزار افراد موجود تھے۔ قلعے کی دیواروں میں تیز ہوا اپنا سر پٹخ رہی تھی اور سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جس پہاڑ پر یہ کیمپ بنایا گیا تھا وہ کوہ الپس کے سلسلے کا آغاز تھا۔ یہاں موسم بہت شدید ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں سے ہمیں چالیس، چالیس افراد کے گروپ میں غسل کے لیے بھیجا جائے گا۔ میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ سب لوگوں کو غسل کرنے میں تین دن لگ جائیں گے۔

اس کیمپ میں محافظوں کی حیثیت سے خطرناک جرمن قیدیوں کو متعین کیا گیا تھا۔ یہ جرمن قیدی قتل، ڈکیتی جیسے خطرناک جرائم کے ارتکاب میں مختلف جیلوں میں سزا کاٹ رہے تھے اور افرادی قوت کی کمی کی بنا پر انہیں گارڈز کے فرائض سونپے گئے تھے۔ اس روز ان کا کام قیدیوں کو گروہوں کی صورت میں غسل کے لیے بھیجنا تھا۔ وہاں ایک اور بات سامنے آئی۔ قیدیوں میں سب سے پہلے آریائی نسل سے تعلق رکھنے والوں کو غسل کے لیے بھیجا جارہا تھا۔ آریائی نسل کے قیدیوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس فیصلے کے نتیجے میں ہم یہودی قیدیوں کا نمبر تیسرے دن سے پہلے آنا ممکن نہ تھا۔ اس سخت سردی میں دو دن تک یہاں اس حالت میں انتظار کرنا، زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وجہ یہ تھی کہ غسل سے پہلے کوئی قیدی بیرک میں نہیں جاسکتا تھا اور بیرک میں جاکر اپنا اندراج کرائے بغیر کسی کو نہ تو خوراک مل سکتی تھی نہ سونے کے لیے جگہ۔ ہم لوگ جو طویل سفر سے پہلے ہی تھکے ہوئے تھے، جو تھکن اور بھوک سے پہلے ہی نیم جان تھے، غسل کے انتظار میں دو دن کے اندر مر بھی سکتے تھے کیونکہ اس عرصے میں ان کی ٹانگیں بھی جواب دے سکتی تھیں اور نیند کے غلبے سے بھی وہ برف پر گر بھی سکتے تھے اور پھر کبھی ان کو اٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ میرے چاروں طرف کوئی ایک سو قیدی تو پہلے ہی برف پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور کسی کو بھی ان کی کوئی پروا نہ تھی۔ کیونکہ

وہاں تو ہر شخص کو اپنی زندگی بچانے کی فکر تھی۔ ہر شخص خود کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

میں نے خطرے کو بھانپ لیا اور ایک فیصلہ کرلیا۔ میں لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتا زبردستی آگے بڑھتا رہا اور غسل خانوں کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں کئی محافظ موجود تھے۔ چالیس افراد کا ایک گروپ غسل خانوں کی طرف جانے کے لیے وہاں موجود تھا۔ وہ سب آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ میں محافظوں کے انچارج کے سامنے پہنچا اور بڑے پُراعتماد لہجے میں اس سے کہا "میں آش وٹز سے آنے والے قافلے کا ڈاکٹر ہوں۔ مجھے غسل کے لیے پہلے بھیجا جائے۔"

انچارج نے میرا غور سے سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید وہ میرے عمدہ لباس، میرے پُراعتماد لہجے اور جرمن لہجے پر میرے عبور کی وجہ سے متاثر ہوگیا۔ مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر اس نے سیڑھیوں پر متعین محافظوں سے کہا "ڈاکٹر کو اندر جانے دو۔"

میں تنہا سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ میں اب فوری طور پر موت سے محفوظ تھا۔ حمام کی گرم ہوا نے میری سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی ٹانگوں میں نئی توانائی اور قوت بھردی تھی۔ کئی ہفتوں کے بعد ایسا گرم ماحول جو میسر آیا تھا۔ پھر گرم پانی کے غسل نے میرے اعصاب کو اور بھی سکون بخشا۔ جرمنوں کے خیال میں ہمارے لباس جراثیم سے آلودہ تھے اس لیے انہوں نے مجھ سے میرا اوورکوٹ، سوئیٹر اور تمام دیگر کپڑے لے لیے البتہ جوتے رہنے دیے جو بڑے عمدہ اور اچھے تھے۔ مجھے اپنے گرم اور آرام دہ لباس کے چھن جانے پر افسوس تھا لیکن انہوں نے جوتے چھوڑ دیے تھے، یہی غنیمت تھا۔ سرد موسم اور برف میں جوتے بھی انسان کی زندگی بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جوتے پہن کر برہنہ حالت میں ہم یخ بستہ ہوا میں بیرکوں کی طرف روانہ ہوئے۔ شکر ہے کہ یہ راستہ طویل نہ تھا۔ پچاس گز کے فاصلے پر بیرک تھی۔ بیرک نمبر ۳۳ جہاں ہمیں قرنطینہ میں رکھا جانا تھا۔ وہاں ہمیں قیدیوں والا دھاری دار لباس دیا گیا۔ لباس پہن کر ہم ایک اور شخص کے پاس گئے۔ اس نے ہمیں ایک چوتھائی ڈبل روٹی اور گوشت کی چربی سے بنا ہوا مارجرین دیا اور ایک مگ گرم کافی کا بھی۔ دس دن کے بعد یہ خوراک ہمیں شاہی ضیافت معلوم ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد میں بیرک کے ایک دور افتادہ کونے میں پڑ کر سوگیا۔

ہم تین دن تک اسی بیرک میں رہے۔ اس دوران ہی ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ خوراک بھی غنیمت تھی، جس کی وجہ سے نئی آزمائشوں اور نئی سختیوں کو جھیلنے کے لیے جسم میں توانائی پیدا ہوگئی تھی۔ بیرک میں قیام کے تیسرے روز ایک جرمن جرنیل ایک ایس ایس افسر کے ساتھ وہاں آیا اور اس نے حکم دیا کہ جو قیدی آش وٹز میں کام کرچکے ہیں، وہ آگے آجائیں۔

یہ حکم سن کر خون میری رگوں میں منجمد ہوگیا۔ جرمن ایک نہایت منظم قوم ہیں، ہر کام نہایت قرینے سے کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یقیناً ان کے پاس آش وٹز میں کام کرنے والے قیدیوں کی فہرست ہوگی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ایسے قیدیوں کے نمبر پکارتے۔ جرمنوں کو یقیناً آش وٹز میں کام کرنے والے خصوصی کمانڈوز کی تلاش تھی۔ وہ ان کو ختم کردینا چاہتے تھے کیونکہ یہ کمانڈوز آش وٹز کے موت کے کارخانے میں ہونے والے گھناؤنے اور بھیانک واقعات سے دنیا کو آگاہ کرسکتے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی مجھے نہیں جانتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں آش وٹز میں خصوصی کمانڈوز کے گروپ میں شامل تھا اس لیے میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ چند سیکنڈ کا یہ عرصہ بہت طویل معلوم ہوا۔ جب کوئی آگے نہ آیا تو جرمن جرنیل وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ایک اور مرحلہ جیت لیا تھا۔

اسی رات ہمیں ماؤتھاسن ریلوے اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہاں ہمیں پھر مال گاڑی میں سوار کرادیا گیا۔ ہم سب سات ہزار افراد تھے۔ ہمیں "میلک ان ڈرلاوناؤ" کے عقوبت خانے لے جایا گیا۔ یہ سفر مختصر تھا۔ یہاں قیدیوں کے لیے حالات ماؤتھاسن سے زیادہ بہتر تھے۔ یہ عقوبت خانہ بھی پہاڑ پر بنایا گیا تھا۔ دراصل یہ پہلے ایک جیل تھا جسے بعد میں عقوبت خانے میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ یہاں بھی ہزاروں افراد کو قتل کرکے ان کی لاشوں کو جلاکر راکھ کردیا گیا تھا۔ اس عقوبت خانے سے پہاڑ کے دامن میں بہتا ہوا دریائے ڈینیوب بھی نظر آتا تھا۔ وہی دریائے ڈینیوب جو میرے شہر اور میرے ملک سے گزرتا تھا۔ اس دریا کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ہمارا گھر اب زیادہ دور نہیں ہے۔

○☆○

۱۹۴۵ء کا موسم بہار شروع ہوچکا تھا۔ اپریل کے آغاز کے ساتھ ہی درختوں پر سبز پتے ابھر آئے تھے، کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ دریائے ڈینیوب کے کنارے جو چند ماہ پیشتر سفید برف سے ڈھکے ہوئے تھے، سبز ہوگئے تھے۔ سبز مخملیں گھاس

نے برف کی جگہ لے لی تھی۔ "میلک ان ڈرڈوناؤ" کے عقوبتی کیمپ میں ہمیں آٹھ ہفتے گزر چکے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کچھ کام نہ کرنے کے باوجود مجھ پر بے حد تھکن اور نقاہت طاری ہوتی جارہی تھی۔ اگر یہ امید نہ ہوتی کہ ہماری رہائی اور آزادی کے دن قریب آچکے ہیں تو شاید میں کبھی کا مرچکا ہوتا لیکن کیا میں زندہ تھا؟

یہاں ہر چیز بکھر رہی تھی' ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ جرمنوں کے تیسری جمہوریہ کی عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ اس عمارت کے منہدم ہونے کے آثار ہمارے سامنے آرہے تھے۔ شکست خوردہ جرمن فوجیں اس عقوبت خانے کے سامنے سے گزر کر ملک کے اندرونی حصوں کی طرف جاتی نظر آتی تھیں۔ یہ سلسلہ لامتناہی تھا۔ دریائے ڈینیوب کی سطح بلند ہوگئی تھی۔ اس پر تیرتے ہوئے بجرے اور کشتیاں ان شہروں کے باسیوں کو منتقل کرنے میں مصروف تھیں جنہیں خالی کردیا گیا تھا۔ دنیا پر ہزاروں برس حکومت کرنے کا خواب جو نازی جرمنوں نے دیکھا تھا' چکناچور ہوچکا تھا۔ نسلی برتری کے غرور میں مبتلا قوم مایوسی کا شکار تھی۔

۷ اپریل ۱۹۴۵ء کو اس عقوبت خانے کے احاطے کو رات کے وقت روشن رکھنے والی تیز روشنیاں گل رہیں۔ تاریکی اور خاموشی اس عقوبت خانے پر مسلط رہی۔ کیمپ کو خالی کرکے اس کے گیٹ بند کردیے گئے تھے۔ وہاں موجود سات ہزار قیدیوں کو اندرون ملک منتقل کردیا گیا۔ سات روز کے سفر کے بعد ہم "اے بنسی" کے عقوبت خانے پہنچے۔ یہ چوتھا عقوبت خانہ تھا جس کے گیٹ سے میں گزرا تھا۔

یہاں بھی حالات مختلف نہ تھے۔ قیدیوں سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ جرمن فوجیوں کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ ان کے چہرے مایوسی' خوف اور شکست کے احساسات کی زندہ تصویر بن گئے تھے۔ نہ معلوم کس امید پر وہ اب بھی یہ فرائض انجام دے رہے تھے۔

۵ مئی ۱۹۴۵ء کو "اے بنسی" کے واچ ٹاور پر سفید جھنڈا لہرادیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نازیوں کے غرور کا سرنیچا ہوگیا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ہٹلر مرچکا تھا۔ صبح نو بجے سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسی لمحے ایک امریکی لائٹ ٹینک وہاں آیا۔ اس ٹینک پر تین امریکی فوجی سوار تھے۔ انہوں نے اس عقوبتی کیمپ کا قبضہ لے لیا۔

ہم آزاد ہوگئے۔

○☆○

میں نے بیماری کی حالت میں بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ یہ سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ہر طرف موت اور تباہی کے مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ جو شہر کبھی ہنستے بستے تھے' زندگی کی رونقوں سے معمور تھے' اب کھنڈر اور قبرستان بن کر رہ گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں جس گھر کی طرف جارہا ہوں وہ بھی کھنڈر بن گیا ہوگا۔ وہ بالکل خالی ہوگا' بھائیں بھائیں کررہا ہوگا' اس کی ہر چیز لوٹ لی گئی ہوگی۔ وہاں نہ میرے والدین ہوں گے نہ میری بیوی اور بیٹی۔ پھر مجھے اس خالی گھر میں خوفناک اور بھیانک یادوں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوگی۔ کیسا اذیت ناک خیال تھا یہ۔ عقوبتی کیمپوں میں خوفناک تجربوں سے گزرنے کے بعد بھیانک تنہائی میں زندگی گزارنا کتنا بڑا عذاب ہوتا' یہ میں ہی جانتا تھا۔

آخر میں اپنے شہر میں' اپنے گھر میں آگیا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا' سوائے درودیوار کے کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ عمارت بھی قید خانوں جیسی ہی تھی۔ خالی گھر' خالی کمرے' نہ کوئی آواز' نہ دوست' نہ غم گسار۔ بس یادیں تھیں جو میرے سینے میں دفن تھیں۔

مجھے واپس لوٹے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا' ہلکی ہلکی آنچ کمرے میں پھیلی ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اپنے خوابوں سے چونک اٹھا۔ ابھی میں کرسی سے اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری بیوی اور بیٹی کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ صحت اچھی تھی۔ چند دن پہلے ہی وہ برگن بیلسن کے عقوبت خانے سے رہا ہوئی تھیں۔ یہ عقوبت خانہ جرمنی کا سب سے بدنام عقوبت خانہ تھا۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ بُری طرح بلک رہی تھیں۔ پھر وہ کئی گھنٹے تک عقوبتی کیمپ کے واقعات کو یاد کرکے سسکتی رہیں۔

میرے لیے زندگی پھر بامقصد ہوگئی تھی۔ اب مجھے پھر کسی کے لیے زندہ رہنا تھا۔ ڈاکٹر گوروگ کے بیٹے کو بھی تلاش کرنا تھا لیکن میں نے ایک قسم کھائی تھی۔ اب میں کبھی جراحی کے نشتر کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔



برلن سے فرار

ثمر عباس

آدھی دنیا پر محیط مقتل' تذلیل انسانی کا دوسرا نام جنگِ عظیم دوئم ہے۔ اس پُرآشوب دور میں انسانوں کو چیونٹیوں کی طرح مسلا جارہا تھا۔ جو بدقسمت قیدِ ستم میں گرفتار ہوجاتے وہ پرکٹے پرندے کی طرح صرف پھڑپھڑاتے رہتے کیونکہ قیدیوں پر ہر ظلم روا تھا۔ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح سسک سسک کر جی رہے تھے' قیدِ ستم کاٹ رہے تھے جبکہ نازیوں کے عقوبت خانے سے رہا ہونے کا تصور بھی عبث تھا۔ مگر کچھ باہمت ایسے بھی تھے جو درِقفس وا کرنے کے لیے جان کی بازی لگارہے تھے۔ ایسے ہی دو باہمت سپاہیوں کی روداد' قصۂ بیداد جنھوں نے ہر پہرے کو توڑ کر ناممکن کو ممکن کردکھایا۔

اس دورِ ابتلا کا ستم نامہ جسے جنگِ عظیم دوم کہتے ہیں

چار ماہ کیا ہوتے ہیں یہ تو آپ بخوبی جانتے ہوں گے؟ میں یعنی رابرٹ اور جیک اتنی مدت کے لیے ساگان کیمپ میں خفیہ طور پر ایک سرنگ کھودتے رہے تب جا کر ہمیں رہائی نصیب ہوئی تھی لیکن اس کے بعد ہم اپنے وطن انگلستان کیسے پہنچے یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ آیئے میں ابتدا سے آپ کو اس کا احوال سناتا ہوں۔

وہ ایک سیاہ اور الم ناک رات تھی جب ہم نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہم نے اپنے اس منصوبے میں کسی اور قیدی کو شریک نہیں کیا تھا اور چپکے چپکے ساری تیاریاں کرلی تھیں۔ کپڑوں کے چند جوڑے۔ کھانے کا کچھ سامان اور نقد رقم رکھ لی تھی ..... یہ وہ رقم تھی جو ہمارے مختلف ساتھیوں کی جیبوں میں بچ گئی تھی اور گستاپو کے بھیڑیوں کے ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رہی تھی۔

سرنگ تیار ہوئی تو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس میں چھلانگ لگادی۔ اندر گہری تاریکی تھی، اس لیے ہول اٹھ رہا تھا۔ جیک مجھ سے پہلے آگے جا چکا تھا اور سرنگ کا باقی ماندہ حصہ کھود رہا تھا۔ دراصل آخری حصے پر سے سڑک گزرتی تھی' ہم نے وہ حصہ چھوڑا ہوا تھا تاکہ کدال کی دھمک سے اوپر موجود گارڈ کسی شک وشبے کا شکار نہ ہوجائیں۔ راستہ دیکھنے کے لیے میں نے ٹارچ روشن کرلی۔ جیک کہیں نظر نہ آیا۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھتا رہا۔ حبس بڑھ گیا تھا اور سانس لینا دشوار ہوا جارہا تھا۔ فرار ہونے کے لیے ہم نے اس وقت کا



انتخاب کیا تھا جب گارڈز اپنی ڈیوٹی تبدیل کرتے ہیں۔ ڈیوٹی پر آنے والوں اور وہاں سے جانے والوں دونوں کو جلدی ہوتی ہے اس لیے وہ کسی اور طرف توجہ نہیں دے پاتے۔

جیک آگے جا کر رک گیا، وہ اپنی کدال سے سرنگ کا باقی حصہ کھود رہا تھا اور پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے نقشہ دیکھا اور پھر اس سے کدال لے کر کھدائی میں مدد کرنے لگا۔ جب میں نے اوپر کی طرف ضربیں لگائیں تو ایک سوراخ ہو گیا۔ پھر سرنگ میں تازہ ہوا آنے لگی۔ ہم نے گہرے گہرے سانس لیے تو زندگی واپس آتی محسوس ہوئی۔

میں نے سوراخ میں سر ڈال کر اوپر دیکھا۔ ہم کیمپ سے کافی فاصلے پر نکل آئے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا رُواں رُواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ جیک نے سامان کی گٹھڑیاں باہر پھینک دیں اور سرنگ سے نکل گیا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ گارڈز اپنی ڈیوٹیاں تبدیل کر رہے تھے۔ اسٹیٹ گارث کا وہ علاقہ ایک جنگل سے ملحق تھا۔ چنانچہ ہمیں جان بچنے کی توقع تھی۔ اس لیے کہ جب ہماری گمشدگی کا پتا چلتا تو کیمپ میں لگا ہوا سائرن یقیناً بجا دیا جاتا اور اس کے بعد ہماری تلاشی زور شور سے ہوتی۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا، اس لیے ہم شکر ادا کر رہے تھے۔

ہم گرد اور دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ ہمارے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ ہم نے ایک نہر کے قریب جا کر ہاتھ منہ دھویا اور اس کے بعد کپڑے تبدیل کیے۔ تب جا کر ہم خود کو معقول انسانوں کی قبیل میں شامل کر سکے۔

کپڑے پھینکنے کا مسئلہ تھا۔ انہیں وہاں ڈال دیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ کسی گارڈ کی نظر ان پر پڑ جاتی۔ اس لیے ہم نے کافی وقت کے بعد ایک گڑھا کھودا اور کپڑوں کو اس میں دبا دیا۔ مٹی برابر کرنے کے بعد ہم نے ان پر جھاڑیاں ڈال دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے سمت کا تعین کیا اور بھاگنے لگے اس لیے کہ جب ہماری گمشدگی کا پتا چلتا تو وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ ہم کیمپ سے جتنی دور نکل جاتے یہ ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کتوں کے ساتھ نکلتے ہیں جو قیدیوں کی بو پا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں۔

جنگل میں کافی دور تک بھاگنے کے بعد میں نے نقشہ نکالا اور جائزہ لیا۔ ہم ریلوے اسٹیشن سے نزدیک تھے۔ میں نے جیک کے سامنے تجویز رکھی کہ ہمیں اسٹیشن تک چلنا چاہیے، تاکہ ہم اس علاقے سے نکل سکیں۔ جب ہم وہاں پہنچ گئے تو ہم نے ایک بنچ پر بیٹھ کر اپنے سانس درست کیے اس کے بعد پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہاں موجود لوگوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

میں قطار میں لگ گیا۔ وہاں لوگوں کے کاغذات دیکھنے کے بعد ہی ٹکٹ دیے جا رہے تھے۔ جیک نے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹکٹ خریدنے کی کیا ضرورت ہے، ہم اس کے بغیر سفر کیوں نہ کریں؟''

''اس میں پھنسنے کا اندیشہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

جیک سر ہلاتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو قدرے اطمینان ہوا کہ وہاں ایک لڑکی ٹکٹ تقسیم کر رہی ہے۔ وہ مسکرا کر مسافروں سے سوال کرتی اور اس کے بعد انہیں ٹکٹ تھما دیتی۔ لیکن جب ایک بار اس نے ایک مسافر سے اس کے شناختی کاغذات دیکھنے کے لیے طلب کیے تو مجھے پسینا آ گیا۔ کاغذات تو ہمارے پاس بھی تھے مگر جعلی۔ انہیں بہت مہارت سے تیار کیا گیا تھا اس لیے کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم دل ناہمواری سے دھڑک رہا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے رقم کھڑکی میں رکھ دی۔ ''مہربانی کر کے دو ٹکٹ عنایت فرمایئے۔ میں آپ کا زندگی بھر احسان نہیں بھولوں گا۔ ارے ہاں! میں اپنے شناختی کاغذات تو دکھانا بھول ہی گیا۔'' میں نے اداکاری کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اس لڑکی نے ایک ادائے دلبری سے کہا۔ ''رہنے دو، تم مجھے شریف انسان لگتے ہو۔''

اس نے ٹکٹ دے دیے تو میں نے مٹھی میں دبا لیے اور ہاتھ باہر کھینچ لیا۔ پھر میں نے جیک کو اشارہ کیا کہ وہ قریب آ جائے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے کیسے کام ہو گیا۔ ٹرین شور مچاتی ہوئی آئی تو پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ متحرک ہو گئے۔ ٹرین سے بہت سے آدمی اور عورتیں اتریں۔

اس میں سے اترنے والوں کو دیکھ کر میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا لیا۔ اس لیے کہ اس میں وہ ڈاکٹر بھی شامل تھا جو کیمپ میں ہمارا علاج کرتا تھا۔ میں نے جیک کو کہنی ماری اور منہ اس کی طرف سے پھیر لیا۔ احتیاطاً منہ پر ہاتھ بھی رکھ لیا تھا۔ اس وقت احساس ہوا کہ ہم نے کیمپ سے فرار ہوتے وقت اپنی ڈاڑھیاں تو مونڈ ڈالی تھیں۔ اس لیے ڈاکٹر تو کیا اب اس کا باپ بھی شناخت نہیں کر سکے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے ہمارا نوٹس نہیں لیا اور اپنی دھن میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ زندگی اس

وقت پل میں تولہ پل میں ماشہ ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوتا، جیسے اب ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے فرشتۂ اجل قریب آ گیا ہے، مگر پھر امید کا چراغ فروزاں ہو جاتا تھا اور جینے کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تل دھرنے کی جگہ نہ ہو۔ اس کے باوجود مسافر دھکم پیل کر کے اپنے لیے جگہ بنا رہے تھے۔ اچانک مجھے ایک جرمن پولیس افسر دکھائی دیا۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک بڑھیا کے نزدیک ٹھہر گیا اور اس سے جرمن زبان میں کچھ پوچھنے لگا۔ بڑھیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ وہ ہم لوگوں کے بارے میں استفسار کر رہا ہے۔

میں نے جیک کو کہنی ماری اور سرگوشی میں کہا۔ ”اگر ہم مزید یہاں کھڑے رہے تو دوبارہ کیمپ میں پہنچ جائیں گے اور فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑے کر دیے جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس ٹرین میں کسی نہ کسی طرح سے سوار ہو جائیں۔“

جیک دوڑ کر سب سے نزدیکی ڈبے کی طرف گیا اور لوگوں کو دھکا دیتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ گو ہمارے سانس سینے میں رکنے لگے تھے اور لوگ ہمیں مسلے ڈال رہے تھے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو اب موسلوں سے کیا ڈرنا؟

سرکتے سرکاتے ہم کافی آگے چلے گئے کہ اگر وہ افسر اندر آ بھی جائے تو ہم تک نہ پہنچ سکے اور لوگوں میں دب کر رہ جائے۔ ٹرین چل پڑی اور وہ جرمن افسر دوسرے ڈبے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ہماری منزل فرینکفرٹ تھی۔ دو گھنٹے بعد ٹرین وہاں پہنچ گئی۔ ہمیں پیشگی معلوم تھا کہ وہ صرف آٹھ منٹ کے لیے ٹھہرے گی۔ چنانچہ ہم لوگوں کو کہنیوں سے دھکیلتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اب ہمیں پلیٹ فارم سے نکلنا تھا۔ اس کے لیے دو قطاریں بنی دکھائی دیں۔ ہم ایک میں کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ کاغذات کی چیکنگ ہو رہی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو جاتا تو ہم پھر گرفتار ہو جاتے اور اسی کیمپ میں پہنچا دیے جاتے۔ اس بار ہماری ایسی درگت بنتی کہ ہم خودکشی پر مجبور ہو جاتے۔ یا اپنا گلا خود گھونٹ لیتے۔

”ارے! یہاں سے چلو۔“ جیک گھبرا کر بولا۔

”یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“

”احمق عام لوگوں کے لیے دوسرا دروازہ ہے۔ یہ تو ہم فوجی افسران کی لائن میں کھڑے ہو گئے ہیں۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

ہم وہاں سے پلٹ کر دوسری لائن کی طرف چل پڑے۔ کسی نے ہمارا نوٹس نہیں لیا۔ ہم وہاں سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اب شہر میں گھومنا عذاب تھا۔ اس لیے کہ ہم جرمنی سے نابلد تھے، کسی سے پوچھتے تو کیا پوچھتے؟ سائن بورڈ جرمنی زبان میں تھے اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم کچھ دیر بے مقصد گھومتے رہے، لیکن اب آرام کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس لیے کہ سرنگ کھودتے ہوئے ہی تھکن سے چور چور ہو گئے تھے اور اس کے بعد سے مسلسل سفر میں تھے اور ہم نے ایک پل بھی آرام نہیں کیا تھا۔

جی چاہ رہا تھا کہ سڑک کے بیچوں بیچ لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جو کچھ بھی ہو دیکھا جائے گا۔ خواہش تو یہی تھی مگر اس پر عمل نہیں کر سکے۔ سہ پہر سے شام ہو گئی تو ہم ایک پارک کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں چند جوڑے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ہم نے سب کا جائزہ لیا کہ ان میں سے کوئی نازی افسر تو نہیں ہے؟ وہ بے ضرر سے لگے۔ لہٰذا ہم ایک طرف جا کر گھاس پر لیٹ گئے۔ آنکھیں خود بہ خود بند ہو گئیں۔

معلوم نہیں کتنی دیر تک سوتے رہے۔ پارک کے نگران کے جھنجوڑنے پر آنکھ کھلی۔ وہ جرمنی میں اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے فرانسیسی میں معذرت کی اور وہاں سے نکل آئے۔ کیمپ میں ایک فرانسیسی سے میں نے اس کی زبان سیکھ لی تھی جو اس وقت کام آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ انگریزی سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ اس لیے کہ انگریزی بولنے کا مطلب خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔

”اب ہوٹل والوں سے پوچھنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں کوئی کمرا مل جائے۔“

ہم ایک ہوٹل کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے اور اس سے فرانسیسی میں پوچھا کہ وہاں کوئی کمرا خالی ہے؟ دربان نے نفی میں سر ہلایا اور انگلی سے اشارہ کیا کہ ہم اس طرف چلے جائیں۔ دو تین ہوٹلوں میں پوچھنے پر پتا چلا کہ وہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

”یہ صورتِ حال تو لندن سے بھی بدتر ہے۔“ جیک نے جھنجلا کر کہا۔

ہم یونہی گھومتے ہوئے ایک ویران سے علاقے میں پہنچے تو ایک زمین دوز راستہ نظر آیا۔ ممکن ہے وہ کوئی پناہ گاہ رہی ہو۔ ہم اس میں چلے گئے اور فرش پر سفری تھیلے رکھ کر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ سخت بھوک لگ رہی تھی مگر

آنکھیں بند کرتے ہی نیند آگئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری روح قبض کر لی گئی ہو اور میں دوسرے جہان میں پہنچ گیا ہوں۔

صبح ہوتے ہوتے ہماری آنکھ کھل گئی۔ اس لیے کہ سردی بہت تھی اور ہماری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بھوک بھی لگی تھی۔ ایک دو کا ذکر کیا، پیٹ میں چوہوں کی فوج دوڑ رہی تھی۔

وہ نواحی علاقہ تھا جہاں ہم پناہ لیے ہوئے تھے، اسے چھوڑ کر ہم شہر کی طرف آگئے۔ شہر کی دکانیں ابھی بند تھیں لیکن مزدور طبقہ جاگ گیا تھا اور وہ کام پر جا رہے تھے۔ ہم اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ وہاں سے ناشتا کیا جا سکتا تھا اور ٹرینوں کے اوقات بھی معلوم کیے جا سکتے تھے۔ ہمیں ہر حال میں ساحلی علاقے کی طرف جانا تھا تاکہ کسی بحری جہاز کے ذریعے سے سوئیڈن تک پہنچ سکیں۔

جب ریلوے اسٹیشن تک پہنچے تو اس کے ویٹنگ روم میں بہت سے لوگ بیٹھے نظر آئے۔ وہ صبح کا اکا ناشتا کر رہے تھے۔ ہم نے بھی کاؤنٹر پر جا کر سینڈوچز اور کافی لے لی۔ اس کے بعد وہاں سے ہال میں گئے جہاں ٹرینوں کی آمد و رفت کے اوقات درج تھے۔ جیک نے جرمنی کی تھوڑی شُدبُد حاصل کر لی تھی اور کام چلانے کے لیے دو چار الفاظ بھی بول لیا کرتا تھا۔

''کرسٹین جانے والی ٹرین ایک گھنٹا دس منٹ کے بعد آئے گی۔'' اس نے ٹرین شیڈول دیکھ کر بتایا۔

''مگر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟''

''ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر تو جا سکتے ہیں۔ وہاں کسی بنچ پر لیٹ بیٹھ کر گزارا کر لیں گے۔'' وہ بولا۔

مجھے اس کی تجویز معقول لگی تو میں نے اس کی ہتھیلی پر رقم رکھ دی اور اشارہ کیا کہ ٹکٹ خرید کر لائے۔ وہ تھوڑی سی دیر میں واپس آگیا۔ جب ہم نے آگے بڑھ کر ٹکٹ کلکٹر کے ہاتھ پر اپنے ٹکٹ رکھے تو وہ جھنجلا کر بڑبڑانے لگا۔ جیک نے دونوں ٹکٹ اس سے لے لیے۔ ہم وہاں سے دور ہٹ گئے۔

''خدا خیر کرے، یہ کس بات پر برہم ہو رہا ہے؟'' میں نے خشک حلق کے ساتھ پوچھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اگر ہمیں کرسٹین جانا ہے تو یہ ٹکٹ بے کار ہیں، اس لیے کہ یہ تو برلن جانے کے ٹکٹ ہیں۔''

''اب انہیں واپس کرنا بھی ایک عذاب ہے۔'' وہ اندیشے اور وسوسے سے بولا۔

''پھر کیا کریں؟'' میں نے اپنی ناک رگڑتے ہوئے پوچھا۔

''مناسب یہ ہوگا کہ ہم کرسٹین کے ٹکٹ خرید لیں اور ان ٹکٹوں کو بھول جائیں۔ گویا نالی میں پھینک دیں۔ اس طرح سے ہم اس کے غیر ضروری سوالات کے جواب دینے سے بچ جائیں گے۔''

''مجھے تمہاری تجویز سے اتفاق ہے۔'' میں نے کہا۔

جیک ایک بار پھر کھڑکی پر گیا اور اس نے کرسٹین کے دو ٹکٹ خرید لیے جو بلا حیل و حجت کے مل گئے۔ ہمیں ایسا لگا جیسے ہم نے ایک اور معرکہ سر کر لیا ہے۔ اس وقت ہمارا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا اور ہم ہر ایک بات پر چونک جاتے تھے۔ ہر شخص جرمن کی خفیہ پولیس گسٹاپو کا ایجنٹ دکھائی دیتا تھا۔ کوئی بھی شخص اگر غور سے دیکھ لے تو نانی یاد آجاتی تھی۔ دل گواہی دینے لگتا تھا کہ وہ ہماری طرف سے مشکوک ہے اور تھوڑی دیر بعد اس کے پستول کی نال ہماری کمر میں چبھنے لگے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا اس لیے ہم اسے قسمت کی دل نوازی سمجھ رہے تھے۔

جب ٹرین آکر رکی تو ہم ایسے ڈبے میں سوار ہو گئے جس میں مسافر پہلے سے ٹھنسے ہوئے تھے تاکہ اگر کوئی پولیس والا تلاشی لینے کی غرض سے سوار ہو تو اسے ہمارے سلسلے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ ہم ایک ڈبے میں گھس بیٹھ کر سوار ہو گئے۔ لیکن ابھی وہاں کھڑے ہوئے دو منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے ایک جرمن افسر ڈبے میں داخل ہوا اور اس نے برہمی سے کچھ کہا تو مسافر باہر جانے لگے۔

سمجھ میں تو نہ آیا کہ یہ کیا ہوا؟ لیکن پوچھنے کی بھی کسی سے جرات نہ ہوئی۔ اس لیے کہ اتنی جرمنی خاک نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوسروں کی نظروں میں کیوں آتے؟ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ اس ڈبے میں روس کے قیدیوں کو سوار کرایا جا رہا ہے۔

جب لوگوں کو ہم نے دوسرے ڈبے میں سوار ہوتے دیکھا تو ہم بھی اسی میں چلے گئے اور ٹوائلٹ کے قریب منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ کرسٹین کا اسٹیشن آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور ٹرین ہر اسٹیشن پر ٹھہر جاتی تھی۔ اندیشوں اور وسوسوں سے ہم ڈپریشن کا شکار تھے۔ سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ اس لیے کہ ڈبا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹرین کے ڈبے کے بجائے اسے مویشی خانہ کہنا بہتر ہوگا۔

دس بجے کے قریب ٹرین کرسٹین پہنچ گئی۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کی آبادی بھی کم تھی۔ چنانچہ ہمیں پریشانی

ہوئی کہ ہم فرینکفرٹ کے مقابلے میں خود کو کیسے چھپا میں گے؟ بڑی آبادی والے شہر میں کسی کو تلاش کرنا دشوار ہوتا ہے لیکن کم آبادی والے قصبے میں سب ایک دوسرے کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔

ہم اس قصبے کے مضافات کی طرف نکلنا چاہتے تھے۔ اس لیے راستے کا تعین کرتے ہوئے ایک طرف کو چل دیے۔ آبادی کم ہوتی چلی گئی اور دیہات نظر آنے لگا۔ اب ہم ایک نہر پار کرنے کے بعد دوسری طرف جا سکتے تھے۔ مگر نہر پر بنے ہوئے پل پر ایک سپاہی ٹامی گن لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم ٹھٹک گئے۔

''آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا ہے۔'' جیک نے سرگوشی میں کہا۔

''بہتر ہوگا کہ ہم لوٹ چلیں۔ یہ کاغذات دیکھے بغیر آگے نہیں جانے دے گا۔'' میں نے اس کی تائید کی پھر ہم اسی گلی میں الٹے قدموں سے مڑ گئے جہاں سے آئے تھے۔ قسمت ہماری رہنمائی کر رہی تھی اور ہم موت کے شکنجے میں جانے سے بچ گئے تھے۔

ہمیں ایک پبلک پارک دکھائی دیا تو ہم نے اس میں بیٹھ کر بسکٹ اور سینڈوچز کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ ''ہمیں کیمپ سے فرار ہوئے سترہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' جیک نے کہا۔

''ہاں، اسی پر تو حیرت ہے کہ اگر انہوں نے سارے اسٹیشنوں پر عملے کو آگاہ کر دیا ہوگا تو ہم اب تک کیوں بچ رہے ہیں؟'' میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''بس قسمت ساتھ دے رہی ہے۔'' جیک نے قیاس آرائی کی۔

''آؤ اب چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم پارک سے اٹھ کر ایک طرف کو چل پڑے۔ وہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ اس میں اچانک ایک باوردی سپاہی نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر ہمارے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ میں نے جیک کو کہنی مار کر اس سے فرانسیسی بولنا شروع کر دی۔ وہ زور شور سے اس کا جواب دینے لگا۔ خیریت گزری کہ سپاہی کو شبہ نہیں ہوا اور اس نے ہم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور منہ پھیر کر چلا گیا۔

''اگر ہم کسی کیفے میں بیٹھ جائیں تو اچھا وقت گزر جائے گا۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

جیک نے اس سے اتفاق کیا۔ وہاں کافی پینے کے دوران میں نے کہا کہ اگر ہم رات کو سفر کریں تو بہتر ہوگا۔ ''مگر ہم وقت کہاں گزاریں گے؟'' جیک نے پوچھا۔

''ہم اپنے وطن میں ہوتے تو کہاں جاتے؟''

''کسی پارک، لائبریری یا پھر تفریحی مقام پر۔'' وہ بولا۔

''اور سنیما کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گڈ! اس کیفیت میں بھی تمہارا دماغ خوب چلتا ہے۔'' اس نے داد دینے والے انداز میں کہا۔

''قسمت ہمارے ساتھ کیا کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہم کل کیمپ سے فرار ہوئے ہیں اور آج سنیما گھر کی طرف جا رہے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد بالآخر ایک سنیما ہاؤس نظر آیا۔ ہم اس میں داخل ہو گئے۔ میں نے جیک سے کہا کہ اگر ہم سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں تو اچھا وقت کٹے گا۔ اس نے سر ہلایا اور میرے ساتھ اس طرف چلا گیا۔ ہم نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹیکے تو نیند کی دیوی ہمیں اپنے دیس میں لے گئی۔ ڈھائی گھنٹے بعد جب فلم ختم ہوئی تو ہم ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ''فلم کیسی تھی، تم نے تو دیکھی ہوگی؟''

کرشین سے ہمیں اسٹیٹن کی طرف جانا تھا اس لیے کہ وہ بحیرہ بالٹک کا ساحلی شہر تھا۔ وہاں ایک بندرگاہ تھی، جہاں بحری جہاز آتے تھے۔ اگر کوئی مناسب جہاز مل جاتا تو ہم سویڈن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو ہمارے منصوبے میں شامل تھا۔

جب ہم سنیما ہال سے نکلے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور تاریکی پھیل رہی تھی۔ ہم اسٹیشن پر پہنچ گئے اور بکنگ آفس پر جا کر اسٹیٹن کے دو ٹکٹ طلب کیے۔ بکنگ کلرک نے ہمارے شناختی کاغذات دیکھنے پر اصرار کیا۔ میں نے مجبوراً وہی جعلی کاغذات جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے انہیں نہایت غور سے دیکھا۔ مگر وہ ان میں کوئی جعل سازی نہ پکڑ پایا۔ لہٰذا اس نے دو ٹکٹ پھاڑ کر ہماری طرف بڑھا دیے۔

میں کھڑکی سے ہٹا تو سینے پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے منوں وزنی چٹان سینے پر رکھ دی ہو۔ یہ جو امید و بیم کی کیفیت ہوتی ہے وہ بھی انسان کو مار ڈالتی ہے۔ انسان زندہ رہتے ہوئے بھی کئی بار مر جاتا ہے۔

ٹرین آئی تو ہم اس میں زبردستی سوار ہوئے، اس لیے

کہ جنگ کی وجہ سے لوگ بے اطمینانی کا شکار تھے اور ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ اس ٹرین میں راہ داریوں تک میں لوگ سوار تھے۔ ہم نے اپنے سفری تھیلے کو تکیہ بنا کر سرہانے رکھا اور ٹانگیں پسار لیں۔ معلوم نہیں کب تک سوتے رہے۔ آنکھ ٹکٹ چیکر کی چیخم دھاڑ پر کھلی۔ اس کے ساتھ دو پولیس والے بھی تھے۔ چیکر ٹکٹ چیک کرنے کے دوران مغلظات بک رہا تھا اور جو اسے مطمئن نہ کر پاتا تھا وہ اسے گھونسے اور لاتیں مارنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کا یہ سلوک دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ اب زندگی کے چند لمحات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اب فرشتہ اجل کے ہاتھوں میں جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ہم سے پہلے ایک بڑھیا تھی۔ اس نے چیکر کی طرف ایک کاغذ کا پرزہ بڑھا دیا۔ چیکر اسے دیکھ کر غم و غصے کا شکار ہو گیا۔ "یہ تو لانڈری کی پرچی ہے۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "اسے جا کر ٹرین سے نیچے پھینک دو۔" اس نے ایک پولیس افسر سے کہا۔

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ڈبے کے آخر میں لے گئے۔ پھر چند مسافروں کے منت سماجت کرنے پر انہوں نے اسے وہیں ڈال دیا۔ جب چیکر نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا غصہ دور نہیں ہوا تھا اور اس کے منہ سے نکلنے والا جھاگ ہونٹوں کے کناروں پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف ٹکٹ بڑھائے اور سر جھکا لیا۔ اس نے ٹکٹوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور واپس کر دیے۔ اس کے بعد وہ آگے چلا گیا۔

اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا اور ہم اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ جب ہم پلیٹ فارم پر اترے تو بارش ہو رہی تھی۔ جیک کانپ گیا۔ وہ بولا۔ "اگر ہمیں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملی تو خدا ہی حافظ ہے۔ ہم دو چار گھنٹوں کے بعد چوہے بن جائیں گے اور صبح ان لوگوں کو ہماری لاشیں ملیں گی جنہیں یہ عجائب گھر میں رکھوا دیں گے۔"

"تم درست کہتے ہو۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے ہمیں اپنا سر چھپانے کا بندوبست ہی کرنا ہے، ورنہ ہماری ساری تگ و دو رائیگاں جائے گی۔"

ہم دیر تک بھیڑ کے چھٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب ٹکٹ چیکر اکتاہٹ کا شکار ہو گیا تو ہم گیٹ کی طرف بڑھے، اس نے کاغذات چیک کیے بغیر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو سرد ہوا کے تھپیڑوں نے استقبال کیا۔ بحیرہ بالٹک سے آنے والی ہوائیں جسموں میں چبھی جا رہی تھیں۔ شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم ایک طرف کو چلنے لگے۔ زیادہ تر کھنڈر دکھائی دیے۔ بمبار طیاروں نے شہر کو تہس نہس کر دیا تھا۔

ہم نے ایک ایسے ہی کھنڈر میں پناہ لے لی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مگر بارش کی وجہ سے وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ ہم سردی کی بنا پر کانپ رہے تھے۔ میں نے نقشہ نکال کر دیکھا۔ شمال جنوب کی طرف سمندر تھا۔ اس لیے ہم مغرب کی طرف سفر کر سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کچھ بھی ہو جائے اسی طرف چلا جائے۔ سڑک ویران تھی، لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم نہیں کہاں سے ایک فوجی اپنے بوٹوں کو دھمکتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ اس نے ہم سے سوال کیا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟

جیک نے شکستہ سی جرمنی میں بتایا کہ اس میدان کے پار ہمارے کچھ دوست رہتے ہیں، ان کے ہاں جا رہے ہیں۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ ہم جس سڑک پر چل رہے تھے، اسی پر چلتے چلے گئے، لیکن آگے جا کر وہ بند ہو گئی۔ اسی وقت ہم نے عقب سے بھاری بوٹوں کی دھمک سنی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوجی ہماری طرف سے مطمئن نہیں ہوا تھا، اب ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اب کیا کیا جائے؟" جیک نے پوچھا۔

"ہم اسی دیوار کو عبور کر کے دوسری طرف جا سکیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ جب ہم اس دیوار کے قریب پہنچے تو میں نے جیک کو ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ اس نے دیوار پکڑ لی اور اوپر چلا گیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ نیچے کیے تو میں انہیں تھام کر اوپر چڑھ گیا۔ ہم یونہی دیوار پر بیٹھے رہے۔ وہ فوجی جو ہمارا تعاقب کر رہا تھا اب غائب تھا۔

"وہ کہاں چلا گیا؟" جیک نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ہمیں ڈاج دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سڑک سے گھوم کر ہماری طرف ہی آ رہا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ تنہا کوئی بھی اس دیوار کو پار نہیں کر سکتا۔"

"ارے ہاں! وہ دیکھو۔" جیک نے ایک طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم صحیح کہتے تھے۔ وہ اسی طرف آ رہا ہے۔"

اب وہ دھمک ہمیں سامنے سے سنائی دے رہی تھی اور اس فوجی کا ہیولا بھی نظر آ رہا تھا۔ ہم نے واپس اسی طرف چھلانگ لگا دی اور اسی سڑک پر بھاگنے لگے جس سے وہاں تک آئے تھے۔ کافی دور تک بھاگنے کے بعد ہم اس وقت ٹھہر گئے جب ہمارے سانس پھول گئے۔ اس فوجی کو چکمہ دینے

کے بعد ہمیں بہت ہنسی آرہی تھی۔ گزشتہ رات کی طرح اس رات بھی ہم ایک پناہ گاہ میں داخل ہوگئے۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی چنانچہ ہم نے ٹن کا ایک ڈبا باہر رکھ دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو وہ ڈبا پانی سے بھر چکا تھا، اس میں ستو ملا کر پینے سے بھوک اور پیاس ختم ہوگئی۔ ہمارے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ اب ان کے ساتھ ہم معقول لوگوں میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

ریلوے اسٹیشن نزدیک تھا اس لیے جب ٹرین آئی تو اس کی سیٹی کی آواز آئی۔ مگر ہمیں بندرگاہ تک جانا تھا۔ اپنے کپڑوں سے کیچڑ جھاڑ کر ہم نے نقشہ دیکھا اور بندرگاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں بہت سے بحری جہاز کھڑے نظر آئے۔ لیکن ان سب کا تعلق جرمنی سے تھا اس لیے کہ سواستیکا کا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ جنگی جہاز تھے۔ اس لیے ہمارے لیے سودمند نہیں تھے۔ ہمیں تو کسی مسافر بردار جہاز میں بیٹھنا تھا۔

بندرگاہ کا چکر کاٹنے کے بعد چند جہاز کھڑے نظر آئے جو غیر جانبدار ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان میں سوئیڈن کا جہاز نہیں تھا جس میں سفر کرنے کے ہم متمنی تھے۔ بندرگاہ پر بہت سے آدمی کام کررہے تھے جن میں یوکراین، پولینڈ اور لتھونیا کی تعداد زیادہ تھی۔ ہمیں کسی فرانسیسی کی تلاش تھی۔ وہ کافی دیر بعد نظر آیا۔ ایک بوڑھا تھا جو لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میں نے جیک کو اشارہ کیا تو وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس سے سرگوشی میں باتیں کرنے کے بعد وہ اسے وہاں سے دور لے گیا۔ میں مصلحتاً ان سے فاصلے پر تھا۔ جب وہ مسکراتا ہوا چلا گیا تو میں لپک کر جیک کے قریب پہنچا۔ اس نے بتایا کہ شریف آدمی نے اپنا نام تو نہیں بتایا، لیکن یہ رہنمائی ضرور کی کہ ہمیں ہوٹل گوزنگ تک جانا چاہیے۔ وہ لوگ کام کرا دیتے ہیں۔ گوزنگ ساحلی علاقے میں ہی تھا اور سستا تھا۔

ہوٹل منیجر نے خوش اخلاقی سے استقبال کیا۔ اس کی مسکراہٹ کاروباری تھی۔ اس نے کاغذات دیکھنے کے بعد ہمیں ایک کمرا دے دیا۔ شکر ہے کہ اسے بھی شبہ نہیں ہوا کہ ہمارے کاغذات جعلی ہیں۔ کاغذات دراصل اتنی عمدگی سے تیار کیے گئے تھے کہ ان پر کسی کو شبہ نہیں ہورہا تھا۔

ہم نے منیجر سے بحری جہاز کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی اس لیے ہم نے سوچا کہ اس کے بعد ہم کوئی منصوبہ بنائیں گے۔ جب آرام وہ بستر نصیب ہوا تو میں نے کھانے کے بعد نقشہ نکال لیا۔ جیک میرے اشارے پر نزدیک آگیا۔

''یہ دیکھ رہے ہو، فری ہافن ہے۔ اگر ہم اس کے ریلوے اسٹیشن کا پل پار کرلیں تو یہ سیدھا اس جگہ تک آتا ہے جہاں سے ہم سوئیڈن تک جانے والے جہاز میں سوار ہوسکتے ہیں۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ وہاں سے کوئی جہاز نہ ملا تو ہم رائزواوڈ تک جائیں گے جہاں سے کوئی موٹر بوٹ بھی مل سکتی ہے۔''

''بات تو صحیح ہے۔'' جیک نے مسرت کا اظہار کیا۔

''تو پھر اس خوشی میں سو جائیں اور علی الصباح فری ہافن جانے کی کوشش کریں۔'' میں نے سمجھایا۔

جیک نے بستر پر چھلانگ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وطن پہنچنے کی خوشی میں یقیناً وہ آج رات رنگین خواب دیکھنے والا تھا۔

رات ہم نے جو خواب دیکھے تھے ان پر صبح کے وقت پانی پھر گیا۔ ہوا یوں کہ جب فری ہافن پہنچے تو یہ دیکھ کر دل رنجیدہ سا ہوگیا کہ بندرگاہ کے چاروں طرف خاردار تاروں کی کئی فٹ اونچی باڑ کھنچی ہوئی ہے۔ اس کے لکڑی کے دروازوں پر مسلح گارڈز کھڑے ہیں۔ ان کی نظروں میں دھول جھونک کر جہازوں کی طرف جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم نے اس جگہ کا ایک راؤنڈ لیا۔ جیک نے ایک جہاز کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''وہ جہاز سوئیڈن کا ہے۔ میرا مطلب ہے اس پر اسی ملک کا جھنڈا لگا ہے۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے تصدیقی انداز سے کہا۔ ''مگر ہم وہاں تک کیسے پہنچیں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں رات کو آنا چاہیے۔ ممکن ہے اس وقت پہرا کم ہو۔''

''چلو ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔''

ہم نے اس ساحلی شہر کے مختلف علاقوں میں وقت گزاری کی اور رات کو فری ہافن پہنچ گئے۔ ہمارے خیال یکسر غلط ثابت ہوئے۔ رات کو وہاں پہرے داروں کی نفری میں اضافہ ہوگیا تھا۔ خاردار تاروں کو پھلانگنا ناممکن تھا۔ تاروں کے درمیان اتنی جگہ نہیں تھی کہ اس میں سے گزرا جاسکتا۔ میں نے پہرے داروں کی گشت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ تین منٹ میں اپنی گشت پوری کرتا ہے۔ اگر میں اس وقت کو دھیان میں رکھ کر لکڑی کے پول پر چڑھ کر دوسری طرف چلا جاتا تو کامیاب ہوسکتا تھا اور دیکھ لیا جاتا تو وہاں میری قبر بھی بن سکتی تھی۔ لکڑی کے پولوں پر بلب لگے تھے اور ان سے ایک محدود سا حصہ روشن ہورہا تھا۔ جب پہرے دار دوسری طرف چلا گیا تو میں اس پول پر چڑھ گیا۔ جب بھی میں پھسلنے لگتا تو ان خاردار تاروں کو تھام لیتا۔ میرے ہاتھ لہولہان

ہو گئے۔ کئی بار ایسا لگا جیسے میرے منہ سے اضطراری طور پر چیخ نکل جائے گی اور میں بے موت مارا جاؤں گا۔

ایک بار تو میری آستین خاردار تاروں میں اس طرح سے پھنسی کہ اس سے نجات حاصل کرنے میں نصف منٹ لگ گیا۔ بہرحال جب پہرے دار پلٹا تو میں پول کو پھلانگ کر دوسری طرف جا چکا تھا۔ میں نے سرگوشی میں جیک سے کہا کہ وہ بھی اس طرف آجائے۔ پہرے دار نزدیک آچکا تھا، اس لیے اس نے اس کے واپس جانے کا انتظار کیا۔

میری طرح سے وہ بھی پول کے ذریعے سے دوسری طرف آگیا۔ مگر اس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے جسم کانپ رہا تھا۔ ہم فوراً برتھ پر پڑے ہوئے اسباب کے پیچھے چھپ گئے۔ رومال سے خون صاف کرنے کے بعد ہم نے اپنی تکلیف پر بڑی حد تک قابو پالیا۔ وہاں ہم دیر تک وقت صرف نہیں کر سکتے تھے، اس لیے مال و اسباب کے ڈھیر کی آڑ لیتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔ وہاں سناٹے کی حکمرانی تھی۔ سمندر سے آنے والی سرد ہوا مزاج پوچھ رہی تھی۔

جب ہم اس جگہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں سوئیڈن کا بحری جہاز کھڑا تھا تو یہ دیکھ کر دل ڈوبنے لگا کہ اب وہ وہاں نہیں ہے۔

''ہم اس طرح سے ناکام و نامراد واپس نہیں جائیں گے۔'' جیک نے کہا۔

''پھر؟''

''ہمیں ان جہازوں کا جائزہ لینا چاہیے' ممکن ہے سوئیڈن کی طرح کسی اور غیر جانب دار ملک کا جہاز ہمیں دکھائی دے جائے۔''

میں نے جہازوں کا نام اور ملک کا نام پڑھنا چاہا تو ناکام رہا اس لیے کہ تاریکی کے سبب کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجبوراً مجھے ٹارچ روشن کرنا پڑی۔ پشتے پر جا کر ہم جہازوں کے نام پڑھ رہے تھے کہ تیسرے پشتے کے قریب پہنچے پر اچانک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور ایک سرچ لائٹ کا دائرہ گھومنے لگا۔ ''انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔'' جیک نے وحشت سے کہا۔

پھر اور بہت سی سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں۔ ہم اندھا دھند ایک طرف کو بھاگنے لگے۔ دور سیٹیاں بج رہی تھیں اور پہرے دار آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔ پہلے ہم مال و اسباب کے ایک ڈھیر کے پیچھے جا چھپے اس کے بعد ہم نے تیل کے ڈرموں کی آڑ لے لی۔ ہمارا سانس بری طرح سے پھولا ہوا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم سمندر میں چھلانگ لگا دیں اور تیرتے ہوئے کسی بحری جہاز تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اب یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔'' جیک بولا۔

''اے! شش۔'' میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ جرمن سنتری قریب آرہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم اس پر قابو پالیتے۔ لیکن جب دوسرے سنتری اسے وہاں پڑا دیکھتے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ یقیناً ہم پکڑ لیے جاتے۔ ''وہ گودام دیکھ رہے ہو نا؟'' میں نے جیک سے کہا۔

''ہاں۔''

''ہم کو اس تک پہنچ جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، اس لیے ہمیں تلاش کرنے میں انہیں وقت لگ جائے گا۔''

ہم اس کی طرف دوڑ پڑے تو اس سنتری نے ہمیں دیکھ لیا۔ ''ہالٹ!'' اس نے گونج دار آواز میں کہا۔ اس کی آواز سن کر ہم زگ زیگ انداز میں بھاگنے لگے۔ لیکن جب اس گودام کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کا دروازہ بند ہے۔ چنانچہ ہم دوسرے گودام کی طرف بڑھ گئے۔ دونوں گوداموں کے درمیان ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا جس پر ریلوے کی پٹری بچھی تھی۔ غالباً وہاں کوئی چھوٹی سی ٹرین آتی جاتی تھی تاکہ مال لاد کر لے جا سکے۔ ہم اس پلیٹ فارم کے نیچے جا کر لیٹ گئے۔

باہر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے پر الزامات عائد کر رہے تھے۔ وہ سنتری جو ہمارے پیچھے آرہا تھا اس نے گوداموں کو دیکھا، چاروں طرف ٹارچ گھمائی اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے دماغ میں نہیں آیا کہ ہم ٹرین کی پٹریوں سے چپکے ہوئے درمیان میں لیٹے ہیں۔ اگر اس کے دماغ میں یہ خیال آجاتا تو وہ ہمارے جسم میں اپنی گن سے کئی سوراخ کر دیتا۔ اس وقت جب اس نے ہالٹ کہا تھا اس نے ہمیں زندہ گرفتار کرنا چاہا ہوگا۔

ہم ڈیڑھ گھنٹے تک وہاں پڑے رہے۔ یوں ساکت پڑے رہنے سے جسم اکڑ گیا تھا۔ ہم نے اٹھ کر ہلکی سی ورزش کی تو خون رواں ہو گیا۔ اس کے بعد ہم اسی راستے پر چل پڑے جدھر سے آئے تھے۔ اسی لکڑی کے پول پر چڑھ کر ہم دوسری طرف اتر گئے۔ وہ سنتری واپس آرہا تھا، اس لیے ہم فٹ پاتھ کے نیچے لیٹ گئے اور ساکت ہو گئے۔ جب وہ مڑ

کر چلا گیا تو ہم وہاں سے بھاگ کر سامنے والی گلی میں چلے گئے۔

اس روز بہت سے ایسے مواقع آئے تھے جب ہماری زندگی اور موت میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہا تھا۔ ہم ہوٹل میں آکر بستروں پر لیٹے تو تکیے پر سر رکھتے ہی اتنا غافل ہوگئے۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے جیک کو بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ میں نے اس سے وجہِ اضطراب پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ فرانسیسیوں کے کیمپ کی طرف گیا تھا جو یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔

''اس جگہ کا نام رائی ہر ورڈ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں ــــ جنگی قیدیوں کا ایک کیمپ لگا ہے۔'' اس نے کہا کہ اگر ہم اس کیمپ میں آجائیں تو پھر فرار ہونے پر بات ہوسکتی ہے۔

''کیا اس کیمپ کی نگرانی نہیں کی جاتی؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے سخت پہرا تھا مگر اب ایک سنتری وہاں کھڑا ہوتا ہے جو آنے جانے والوں کو اجازت دیتا ہے۔ ہمیں وہاں رات کو چلنا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' میں نے ہامی بھری۔

رائی ہر ورڈ کا اسٹیشن بہت دور تھا، ہم سورج غروب ہونے پر وہاں پہنچ گئے۔ کیمپ کی باڑ پھلانگ کر اندر جانا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ہم دوسری بیرک میں داخل ہوگئے۔ وہاں آٹھ دس فرانسیسی بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔ وہاں وہ آدمی فرانکو بھی تھا جس سے جیک صبح کے وقت ملاقات کر چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے ان کا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ حجام ہے اور کیمپ کے لوگوں کے بال تراشتا ہے۔

اس نے ہمیں ایک اور ہوٹل کا پتا بتایا، جس کا نام شانگریلا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شانگریلا کا مالک ایسے لوگوں سے تعاون کرتا ہے جنہیں باہر جانا مقصود ہے۔ اس کے علاوہ وہاں سویڈن کے ملاحوں کی ایک بڑی تعداد آتی ہے۔ اگر ہم خود کو سویڈش ظاہر کریں تو کام بن سکتا ہے۔ اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ اگلے دن خود وہاں آئے گا اور کسی شخص سے انہیں ملا دے گا۔

ہم ان لوگوں کا شکریہ ادا کر کے اس کیمپ سے نکل آئے۔ ہماری پونجی تیزی سے ختم ہو رہی تھی، اس لیے اب ہم تشویش کے مراحل میں داخل ہو چکے تھے۔ اگر وہاں سے نکلنے کا بندوبست نہ ہوا تو پھر ہماری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

شانگریلا نسبتاً ایک سستا ہوٹل تھا۔ مگر وہاں بھانت بھانت کے سیاحوں کی بہت بڑی تعداد آتی تھی۔ اگلے دن اس کے کیفے میں ہمیں فرانکو کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ دس بجے تک آگیا۔ ہم نے اس کے لیے قہوہ منگوالیا۔ اس اثنا میں کیفے کا دروازہ کھلا اور قوی ہیکل جرمن اندر آگئے۔ انہیں دیکھ کر ہم پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ گسٹاپو کے ایجنٹ لگ رہے تھے۔

جب ویٹر آگیا تو فرانکو نے بلند آواز سے کہا۔ ''بھئی یہ میرے دوست سویڈن سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں کسی سیاح سے ملوا دینا۔'' اس کے بعد اس نے ہم سے مصافحہ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی جان چھڑالی ہے۔ اب پھندا ہمارے گلے میں پڑنے والا ہے۔

میں نے اپنا سر گھمایا اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا کہ فرار ہونے کی سب سے اچھی راہ کون سی ہوسکتی ہے۔ دائیں جانب ایک تنگ سی راہداری نظر آئی۔ غالباً وہ ٹوائلٹ کی طرف جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کھڑکی بھی نظر آئی۔ جیک نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ قہوہ میز پر رہ گیا اور اس نے کہا کہ وہ ٹوائلٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اس کے جانے کے دومنٹ بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس راہداری میں داخل ہوا تو میں نے ٹوائلٹ کا دروازہ بند دیکھا۔ میں نے اس پر دستک دی اور سرگوشی میں بولا۔ ''جیک! اب باہر آجاؤ۔''

دروازہ کھلا اور جیک کی صورت نظر آئی۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مرتعش آواز میں کہا۔ ''رابرٹ! یہ ہوٹل گسٹاپو کا مرکز ہے، یہاں سے بھاگ چلو۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد ہم کسی سویڈش کا انتظار کیے بغیر ٹوائلٹ کی راہداری کی کھڑکی سے نکل آئے اور دوبارہ کیفے کی طرف نہیں گئے۔ ہمارا قہوہ میز پر ہی دھرا رہ گیا۔

دوسرے دن اس حجام فرانکو نے ہمیں تسلی دی کہ آج ہماری ملاقات ایک سویڈش سے ضرور کرا دے گا۔ وہ بوٹ چلاتا ہے اور اس کا کام لوگوں کو وہاں سے اسمگل کر کے دوسرے ملکوں تک پہنچانا ہے۔ ملنے کے لیے وہی ہوٹل منتخب ہوا۔ ہم نے اسے بتایا کہ وہاں گسٹاپو کے ایجنٹ آتے ہیں۔ تب اس نے ایک پارک میں ملاقات کی تجویز رکھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور اس نے ایک فون بوتھ سے مطلوبہ شخص سے کہا کہ پروگرام تبدیل ہوگیا ہے لہٰذا اسے ایک پارک میں ملنا ہے۔

وہ آدمی انتھونی معقول لگتا تھا۔ اس نے ملائمت سے گفتگو کی اور سوئیڈن لے جانے کے لیے خطیر رقم کا مطالبہ کیا' جو ہم اسے فوری نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی تسلی کے لیے بہت سے سوالات کیے تاکہ یہ شبہ جاتا رہے کہ ہم گسٹاپو کے کوئی ایجنٹ تو نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم کہاں گرفتار ہوئے تھے۔ ہماری رجمنٹ کون سی تھی؟ ہم کب گرفتار ہوئے؟

میں نے اسے بتایا کہ ہم افریقا کے محاذ پر گرفتار ہوئے تھے، میری رجمنٹ کا نمبر 4509 ہے۔ جو جنرل رومیل کی سربراہی میں کام کر رہی تھی۔

''تمہارے جوابات بے حد مناسب ہیں۔ دو انگریزوں کے فرار کی داستان عام ہو چکی ہے۔ گسٹاپو یہاں عام لوگوں کے لباس میں گھوم رہی ہے۔ چاروں طرف خطرات ہیں۔ تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا، لیکن تم کو اس رقم کا بھی خیال رکھنا ہوگا جو میں طلب کر رہا ہوں۔''

''ہمارے پاس سر دست اتنی رقم نہیں ہے۔ جو اس وقت جیب میں ہے وہ میں تمہیں دے دیتا ہوں۔'' میں نے رقم نکال کر اسے دکھائی دی۔

''پھر؟'' اس نے مایوسی سے کہا، وہ مطمئن نہیں تھا۔

''جب ہم سوئیڈن پہنچ جائیں گے تو اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر کے میں تمہیں رقم دلوا دوں گا۔'' میں نے وعدہ کیا۔

وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں؟'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسے میری بے بسی پر رحم آ گیا۔

''او کے' آج رات دس بجے ہاربر پر آ جانا۔ تم نے وہ علاقہ خار دار تاروں سے گھرا دیکھا ہوگا، لیکن سوڈو پہنچ کر میگائرے کو پوچھنا۔ وہ تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ اچھا بائی۔'' اس نے میری جیب میں موجود رقم اپنی جیب میں منتقل کر لی اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

شام تک کا وقت گزارنا ہمارے لیے دشوار ہو گیا۔ ہم نے جیسے تیسے کر کے دن گزارا اور دس بجے رات کو سوڈو پہنچ گئے۔ خاردار تاروں کی باڑ وہاں نہیں تھی اس لیے وہاں سے مچھیرے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاتے تھے۔ میگائرے ایک قوی ہیکل شخص تھا جس کے وطن کا اندازہ میں نہیں لگا پایا۔ شبہ ہوا تھا کہ وہ اسپینی ہے۔ اس نے ہمارا حلیہ تبدیل کرایا اور بالکل مچھیرا بنا دیا۔ ہمیں جو لباس پہننے کے لیے دیے گئے تھے اس میں سے بساند اٹھ رہی تھی اور سانس لینا دشوار تھا۔ لیکن آزادی ملنے کی خوشی میں ہم نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ میگائرے بھی ہمارے ساتھ تھا اس کی خصوصیات کا علم بعد میں ہوا کہ وہ نہایت روانی سے جرمنی بولتا تھا۔ موٹر بوٹ میں مچھلیاں پکڑنے کا سارا سامان تھا اور چند سوکھی مچھلیاں بھی پڑی تھیں۔ بوٹ کو انتھونی ہی چلا رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں بتایا کہ وہ حقیقت میں مچھیرا ہے اور اس کا کام مچھلیاں پکڑنا ہے۔ البتہ بحریہ پولیس کے افسران سے اس کے خوشگوار تعلقات ہیں اس لیے اسے کوئی نہیں روکتا۔

وہ جب جرمنی کی بحری حدود پار کرنے لگا تو تین لانچوں نے ہماری بوٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کے ہاتھوں میں دبی ہوئی ٹارچوں کی روشنی ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ''پہلے تو دو ہی ہوا کرتے تھے۔ اب دو اور کہاں سے آ گئے؟'' ایک افسر نے پوچھا۔

''میرے بھائی ہیں۔ بے روزگاری کا شکار ہیں۔ میرے ساتھ مچھلیاں پکڑ کر گزارا کریں گے۔'' انتھونی بولا۔ اس کے بعد اس نے بوٹ میں رکھی ہوئی لکڑی کی پیٹی سے چند بوتلیں نکالیں اور انہیں تھما دیں۔ ''ہالینڈ کی اسمگل شدہ ہے۔''

''ہاہاہا... رشوت!'' ان میں سے ایک نے کہا اور اس کے ہاتھ سے بوتلیں لے لیں۔ پھر اس نے ایک بوتل کا کاگ اڑایا اور اسے منہ سے لگا لیا۔

وہ واپس ساحل کی طرف چلے گئے۔ مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ انتھونی نے رشوت میں کس چیز کی بوتلیں دی تھیں۔ وہ ہالینڈ کی شراب تھی جسے دیکھ کر انہوں نے سارا قانون بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جب بوٹ وہاں سے آگے بڑھی تو میں نے پوچھا۔ ''کیا بحری پولیس بھی رشوت کی طالب ہوتی ہے؟''

وہ بے ڈھنگے پن سے ہنس کر بولا۔ ''کیوں، کیا وہ انسان نہیں ہوتے؟''

سمندر میں چار دن مسلسل سفر کرنے کے بعد ہم سوئیڈن کی ایک غیر استعمال شدہ بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنے سفارت خانے جا کر اپنی شناخت کرائی اور پھر وعدے کے مطابق انتھونی کو باقی ماندہ رقم دلوا دی۔ میں آج بھی ان ہولناک دنوں کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔



I V–LT I–E

SOUNITY IS WOID WA

دوسری جنگ عظیم کی ناقابل فراموش داستانیں

سرگزشت، سیارہ اور اردو ڈائجسٹ سے انتخاب

